فتاویٰ عثمانی

جلد اوّل

کتاب الایمان والعقائد تا ختم کتاب الحج

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ترتیب و تخریج

مولانا محمد زبیر حق نواز

مکتبہ معارف القرآن کراچی

فتاویٰ عثمانی

پینتالیس ۴۵ سالہ خود نوشتہ فتاویٰ کا مجموعہ

فتاویٰ عثمانی

جلد اول

کتاب الایمان والعقائد، کتاب السنۃ والبدعۃ، کتاب العلم والتاریخ، کتاب التفسیر، کتاب الحدیث، کتاب الدعوۃ والتبلیغ، کتاب التصوف، کتاب الذکر والدعاء، کتاب حقوق المعاشرۃ، کتاب السیر والمناقب، کتاب الطہارات، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجنائز

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

ترتیب و تخریج

مولانا محمد زبیر حق نواز

استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

(Quranic Studies Publishers)

باہتمام : خضر اشفاق قاسمی

طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ، اپریل 2010ء

مطبع : احمد برادرز پرنٹرز، کراچی۔

ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

فون : (021) 35031565, 35031566

ویب سائٹ : www.onlineshariah.com
www.quranicpublishers.com

ای میل : info@quranicpublishers.com

ملنے کے پتے:

- مکتبہ معارف القرآن کراچی
فون: 35031565, 35031566

- ادارۃ المعارف کراچی
فون: 35049733 - 35032020

فہرستِ موضوعات فتاویٰ عثمانی جلد اوّل

صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی کلمات الکفر وأفعال الکفر وما یکون کفرًا وما لا یکون کفرًا﴾ ۷۲

(کفریہ وغیر کفریہ کلمات اور افعال سے متعلق مسائل کا بیان)

موضوعات | صفحہ نمبر

﴿فصل فی الفِرَق والأحزاب الاسلامیة والباطلة والأشخاص المتعلقین بها﴾ ۸۶

(مختلف اسلامی وغیر اسلامی فرقوں اور ان سے متعلق شخصیات کے بیان میں)

﴿کتاب السُّنَّة والبدعة﴾ ۹۹

(سنت اور بدعت سے متعلق مسائل کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب العلم والتاریخ والطب﴾ ۱۲۷

﴿فصل فی المتفرقات﴾

(علم، تاریخ اور طب کے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب التفسیر وما یتعلق بالقرآن﴾ ۲۰۱

(قرآنِ کریم کے ترجمہ اور تفسیر سے متعلق مسائل کا بیان)

کتاب الحدیث وما یتعلق بہ ۲۲۱

(حدیث اور اس سے متعلق مسائل کا بیان)

کتاب الذکر والدعاء والتعویذات ۲۵۷

(ذکر، دُعا اور تعویذات کے بیان میں)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر
﴿کتاب الطهارة﴾	۳۱۱
(طہارت کا بیان)	
﴿فصل فی الوضوء والغسل والتیمم﴾	۳۱۳
(وضو، غسل اور تیمم کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب و مکروہات کا بیان)	

صفحہ نمبر	موضوعات

مضامین	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر
فصل فی الامامۃ والجماعۃ (امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)	۳۸۰

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی السنن والنوافل﴾ ۴۳۴

(سنن اور نوافل نمازوں کے بیان میں)

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی التراویح﴾ ۴۵۹

(تراویح اور شبینہ سے متعلق مسائل)

موضوعات	صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ للہ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ، أَمَّا بَعْدُ:

جب سے آنکھ کھلی، والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے فیض سے گھر میں فتویٰ اور استفتاء کا چرچا دیکھا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے فقہی مسائل گھر کے ان تذکروں کی بنا پر یاد ہوگئے، لیکن کسی کو مسئلہ بتانے یا لکھ کر دینے سے دل ہمیشہ ڈرتا رہا، اور مدرسہ میں پڑھنے کے زمانے میں کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ کسی وقت فتویٰ لکھنے کی کوئی ذمہ داری سر پر آنے والی ہے۔ ۱۳۷۷ھ میں جب میں دارالعلوم کراچی میں ہدایہ اولین وغیرہ پڑھتا تھا اور میری عمر (قمری حساب سے) پندرہ سال تھی، شعبان و رمضان کی تعطیلات کے زمانے میں اُستاذِ مکرّم حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ روزانہ ہمارے گھر پر تشریف لاکر فتویٰ کا کام کیا کرتے تھے، میں بکثرت اُن کے پاس جا بیٹھتا، اور ان کے لکھے ہوئے فتاویٰ پڑھتا رہتا۔ ایک روز حضرتؒ نے ایک استفتاء مجھے دے کر فرمایا کہ ''بتاؤ اس سوال کا کیا جواب ہوگا؟'' مسئلہ طلاق کا تھا اور سیدھا سادا تھا، میں نے صحیح جواب دے دیا، حضرتؒ نے فرمایا ''بس اب یہی جواب اس استفتاء پر لکھ دو۔'' جب لکھنے کا نام آیا تو میرا دل ڈرنے لگا، لیکن حضرت اُستاذؒ نے ہمت بندھائی، میں نے جواب لکھ دیا، اور دستخط کی جگہ چھوڑ دی، حضرتؒ نے اس تحریری جواب کی تصویب فرمائی اور خود دستخط فرمادیئے۔

اس کے بعد ۱۳۷۹ھ (مطابق ۱۹۵۸ء) میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہ کے پاس مشکوٰۃ شریف پڑھنی شروع کی تو حضرتؒ نے ترغیب دی کہ میں اور برادرِ مکرّم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم کتابوں سے مسائل کے جوابات نکالنے کی مشق کریں، چنانچہ اسی زمانے میں حضرتؒ کچھ سوالات دے دیتے تھے اور کتبِ فقہ سے ان کے جوابات نکالنے کا حکم دیتے، ہم کتابوں سے جوابات تلاش کرکے اکثر زبانی اور کبھی تحریری طور پر حضرتؒ کی خدمت میں پیش کرتے، اور وہ ان کی تصویب یا اصلاح فرمادیتے۔

اسی سال جب شعبان و رمضان کی تعطیلات میں گھر جانا ہوا تو حضرت والد صاحب قدس سرہ کے پاس رمضان میں جماعتِ تہجد کے جواز وعدمِ جواز سے متعلق ایک استفتاء آیا ہوا تھا، اور حضرت

والد صاحبؒ اس کا جواب تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے، انہوں نے مجھے حکم دیا کہ اس مسئلے کے بارے میں کتبِ فقہ کی مراجعت کرکے متعلقہ عبارتیں جمع کروں۔ میں نے یہ عبارتیں جمع کیں، اور حضرتؒ سے عرض کیا کہ ”اگر اجازت ہو تو ان عبارتوں کی روشنی میں جو مسئلہ سمجھ میں آ رہا ہے، اسے بطورِ تجویز قلم بند کروں، پھر آپ اس کی اصلاح فرمادیں۔“ حضرتؒ نے اجازت دے دی، اور میں نے اپنی بساط کے مطابق جواب لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا، جس پر حضرت نے معمولی ترمیم و اصلاح کے بعد تصدیق فرمادی، یہ پہلا باقاعدہ فتویٰ تھا جو بندہ نے لکھا اور بعد میں شائع بھی ہوا۔

دورۂ حدیث کے سال میں بھی حضرت مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہ کے پاس مسائل کے استخراج کی مشق جاری رہی، یہاں تک کہ دورۂ حدیث کے بعد باقاعدہ تخصص فی الافتاء میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کے پاس فتویٰ نویسی کی مشق شروع کی۔ اسی وقت یہ اندازہ بھی ہوا کہ فتویٰ کا کام صرف جزئیات یاد کرنے یا کتابوں کی مراجعت کا نام نہیں ہے، بلکہ اس میں اور بھی بہت سے اصول مدنظر رکھنے پڑتے ہیں، اور ان میں سے بہت سی باتیں ایسی ہیں جو لگے بندھے قواعد کے علاوہ مفتی کے اپنے ملکۂ فقہیہ اور اس کے مزاج و مذاق سے تعلق رکھتی ہیں جو صرف کتابیں پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے کسی ماہر مفتی کی طویل صحبت کی بھی ضرورت ہے۔

تخصص کے بعد بھی دارالعلوم میں تدریسی خدمت کے ساتھ تقریباً روزانہ کچھ وقت دارالافتاء میں فتویٰ نویسی کے لئے مخصوص رہا، اور اس طرح بفضلہ تعالیٰ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی نگرانی و سرپرستی میں ۱۳۹۶ھ تک فتویٰ کی خدمت کا سلسلہ اس طرح جاری رہا کہ دارالافتاء کی مستقل ذمہ داری تو دوسرے مفتی حضرات کے سپرد رہی، لیکن کچھ وقت اپنا بھی لگتا رہا، اور جب کبھی ڈاک زیادہ جمع ہوجاتی یا فتویٰ لکھنے والوں کی کمی ہوتی تو حضرت والد صاحب قدس سرہ بندے کو کچھ عرصہ کے لئے تدریس کے علاوہ دوسرے کام چھڑوا کر فتویٰ کی خدمت پر لگادیتے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحبؒ مدینہ منورہ ہجرت فرماگئے، اور برادرِ مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم پر دارالعلوم کے انتظامی امور کی ذمہ داریاں آپڑیں، اور دارالافتاء کے بعض دیگر رفقاء بھی اپنی مجبوریوں کی وجہ سے مستعفی ہوگئے، اس لئے عرصۂ دراز تک دارالافتاء اور درجۂ تخصص کی نگرانی کا کام بندہ کے سپرد رہا، اور خود فتویٰ لکھنے کے علاوہ درجۂ تخصص کے طلبہ کے لکھے ہوئے فتاویٰ پر نظرِ ثانی اور اصلاح کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

اس طرح مختلف زمانوں میں بندے کے لکھے ہوئے فتاویٰ، دارالعلوم کے نقل فتاویٰ کے بہت سے رجسٹروں میں بکھرے ہوئے ہیں، مجھے کبھی یہ خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ میں فتاویٰ کا کوئی مجموعہ مرتب

کر کے شائع کروں۔ خیال یہ تھا کہ دارالعلوم کراچی سے جاری ہونے والے فتاویٰ کا جو مجموعہ زیر ترتیب ہے، اسی میں یہ فتاویٰ بھی آجائیں گے۔ لیکن عزیز گرامی مولانا محمد زبیر حق نواز صاحب نے -جو دارالعلوم کراچی ہی کے فضل و متخصص اور اب ماشاء اللہ اُستاذ و رفیق دارالافتاء ہیں- اپنے طور پر میرے لکھے ہوئے فتاویٰ کو مختلف رجسٹروں سے جمع کرنا شروع کردیا، اور اس کام کا ایک معتد بہ حصہ مکمل کرنے کے بعد بندہ کو مطلع کیا، میں نے اس کو منجانب اللہ سمجھ کر کام کی تکمیل کی اجازت دیدی۔

ماشاء اللہ مولانا محمد زبیر صاحب خود ذی استعداد عالم ہیں، اور انہوں نے نہایت عرق ریزی سے دارالعلوم کراچی کے پرانے رجسٹروں سے، جن میں سے بعض بہت بوسیدہ ہوچکے تھے، فتاویٰ ڈھونڈ نکالے، اور نہ صرف ان کا انتخاب کرکے ان کو ابواب میں مرتب کیا، بلکہ ان کے حوالوں کی تخریج کا کام بھی بڑی جانفشانی اور سلیقے کے ساتھ انجام دیا، جس سے اس مجموعے کی افادیت بہت بڑھ گئی۔ دل سے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کی اس محنت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائیں، اور ان کی عمر، علم اور عمل میں برکت عطا فرماکر انہیں مزید علمی و دینی خدمات کے لئے موفق فرمائیں، آمین۔

مجھے اپنی موجودہ مصروفیات اور اسفار کی کثرت کی بنا پر بہت دقتِ نظر سے تو ان فتاویٰ پر نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا، لیکن ان کا اکثر حصہ میں نے سرسری نظر سے دیکھ لیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید رکھتا ہوں کہ ان شاء اللہ ان کی اشاعت فائدے سے خالی نہ ہوگی۔

اپنے مشائخ کی ہدایت کے مطابق فتویٰ لکھتے وقت اس ذمہ داری کی نزاکت اور سنگینی کا احساس رہتا ہے، اور اپنی بساط کے مطابق احتیاط کی بھی کوشش رہتی ہے، لیکن یہ ذمہ داری ہی ایسی ہے کہ ہر وقت ڈر بھی لگا رہتا ہے کہ کوئی غلطی قابلِ گرفت نہ ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ اس ذمہ داری کی انجام دہی میں اگر کوئی غلطی ہوئی ہے تو اپنے فضل و کرم سے معاف فرمادیں، اور اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرماکر اسے قارئین کے لئے نافع بنادیں، آمین۔

اہلِ علم سے بھی درخواست ہے کہ اگر کوئی غلطی سامنے آئے تو بندہ کو متنبہ فرمادیں، ان شاء اللہ حق واضح ہوجانے کے بعد اسے قبول کرنے میں تأمل نہ ہوگا۔ البتہ نصوصِ فقہیہ کی تعبیر و تشریح میں اختلافِ رائے دوسری چیز ہے، جو ہر دور میں ہوتا رہا ہے، ایسے مواقع پر بھی بفضلہ تعالیٰ اپنے ذہن و قوتِ دلیل کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ پاتا ہوں اور یہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ "اللّٰھم أرنا الحق حقًا وارزقنا اتباعہ وأرنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابہ"۔

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

جامعہ دارالعلوم کراچی

۱۱ر ذوالحجہ ۱۴۲۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى، اَمَّا بَعْدُ:

استاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی ذاتِ گرامی محتاجِ تعارف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وفضل اور تقویٰ وطہارت کے جس بلند مقام سے نوازا ہے، عصرِ حاضر میں اس کی مثال نہیں ملتی، جدید وقدیم علوم میں مہارت نے جہاں آپ کو اکابر کے لئے قابلِ صد رشک شخصیت بنادیا ہے، وہاں علم، تواضع اور سادگی کے حسین امتزاج نے آپ کو عوام کے لئے ہردل عزیز اور پُرکشش علمی وروحانی شخصیت بنادیا ہے۔

آپ تصوف اور دعوت وارشاد میں حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اور عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمہ اللہ کے علوم ومعارف کے ترجمان، اور علمِ فقہ، تفسیر اور علوم القرآن میں اپنے عظیم اور جلیل القدر والد ماجد مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے جانشین اور علمِ حدیث میں محدث العصر علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی علمی روایات کے حامل اور امین ہیں۔

دیگر علوم وفنون کی طرح فقہ اور فتویٰ کے میدان میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ سے بہت بڑا کام لیا ہے، اس سلسلے میں تکملہ فتح الملہم کی فقہی مباحث، بحوث قضایا فقہیہ معاصرہ، فقہی مقالات، احکام الاوراق النقدیہ، عدالتی فیصلے، سمتِ زمین کی تحدید، وغیرہ فقہی میدان میں آپ کی نہایت اہم اور گراں قدر علمی وتحقیقی کتب ہیں، جدید مسائل میں آپ کی رائے کو عالمِ اسلام میں انتہائی مستند سمجھا جاتا ہے اور فقہی مجالس اور مذاکرات میں آپ کی رائے کا نہ صرف پاک وہند میں بلکہ دنیائے عرب میں بھی خصوصی وزن محسوس کیا جاتا ہے۔

معاشیات کے میدان میں آپ ان چند گنی چنی شخصیات میں سرفہرست ہیں جن کی بدولت

آج الحمدللہ دُنیا میں اسلامی بینکنگ کا ایک بلاک وجود میں آرہا ہے، جس میں بفضل اللہ مسلسل ترقی اور پیش رفت ہو رہی ہے۔

فقہی میدان میں آپ کی خدمات کا ایک بہت بڑا حصہ ہزاروں کی تعداد میں آپ کے لکھے ہوئے ان ''فتاویٰ'' کا ہے، جو آپ نے پچھلے تقریباً پینتالیس سالوں میں تحریر فرمائے ہیں، مگر حضرتِ والا کی یہ عظیم الشان علمی، تحقیقی اور فقہی خدمت، شائع نہ ہونے کی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہی اور اب تک منظرِ عام پر نہیں آسکی۔

اگرچہ آپ نے اپنی اعلیٰ علمی صلاحیت کی بناء پر زمانۂ طالب علمی میں ہی فتاویٰ لکھنے شروع کردیئے تھے، (جس میں ''رمضان میں نفل کی جماعت'' سے متعلق ایک مفصل تحقیقی فتویٰ وہ ہے جو آپ نے صرف سولہ سال کی عمر میں لکھا، جبکہ آپ ابھی ضابطے کے فارغ التحصیل بھی نہیں ہوئے تھے بلکہ موقوف علیہ میں پڑھتے تھے) مگر درجہ تخصص اور اس سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے والد ماجد کی زیرِ نگرانی باقاعدہ فتویٰ لکھنا شروع کیا اور اس وقت سے اب تک بحمداللہ یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ اس پورے عرصے کے تقریباً تمام فتاویٰ دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے نقل فتاویٰ کے قدیم و جدید رجسٹروں میں محفوظ ہیں، مگر چونکہ بالکل ابتداء میں دارالافتاء میں فتاویٰ محفوظ رکھنے کا کوئی باقاعدہ اور منظم انتظام نہ تھا، اس لئے دارالافتاء کے بعض دیگر فتاویٰ کی طرح حضرت والا دامت برکاتہم کے شروع کے کچھ فتاویٰ بھی محفوظ نہ رہے۔

بہرحال اس کے باوجود حضرت کے ہزاروں خود نوشتہ فتاویٰ، نقل فتاویٰ کے مختلف رجسٹروں میں چھپے ہوئے ہیں۔

بندہ کے دل میں حضرت کے فتاویٰ کو جمع و ترتیب دینے کا خیال اس طرح پیدا ہوا کہ چند اہم عنوانات پر مشتمل ایسے فتاویٰ جو مفصل اور مدلل ہیں اور ان کی نشاندہی دارالافتاء کے نئے نظام کے مطابق تبویب کے رجسٹروں میں کی گئی ہے، ایک مرتبہ احقر نے ان چند فتاویٰ کو جمع کرکے حضرت کی خدمت میں پیش کیا کہ اگر انہیں شائع کردیا جائے تو مناسب رہے گا، حضرت والا نے ان فتاویٰ کو دیکھ کر فرمایا کہ ''اگر سب فتاویٰ جمع ہوجاتے تو اچھا تھا'' احقر نے اسی وقت حضرت کے سامنے دل میں یہ عزم کرلیا کہ ان شاء اللہ بندہ یہ خدمت ضرور سرانجام دے گا۔ چنانچہ آج سے تقریباً چار سال قبل اللہ تعالیٰ کا نام لے کر یہ کام شروع کردیا۔

جب رجسٹروں سے یہ فتاویٰ جمع کرنا شروع کئے تو کئی مشکلات درپیش ہوئیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ان فتاویٰ کو جمع کرنے کا داعیہ بھی مضبوط ہوتا گیا، ابتدائی طور پر

مشکلات تو یہ پیش آئیں کہ پینتیس، چھتیس سال پہلے بعض رجسٹر اب اتنے بوسیدہ ہو چکے تھے کہ ان کے ایک ایک صفحے کو پلٹنا، دیکھنا اور پھر ان سے فوٹو لینا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ جلدوں کو دیمک لگ چکی تھی، بیچ سے کئی کئی صفحات پھٹے ہوئے اور بعض بالکل غائب تھے، بچا کھچا جو موجود زمانے کی دست برد سے محفوظ رہا وہ انتہائی بوسیدہ ہو چکا تھا۔ یہ خستہ رجسٹر بندہ خود فوٹو اسٹیٹ والے کے پاس لے جاتا اور گھنٹوں دکان پر کھڑے ہو کر انتہائی احتیاط سے ایک ایک صفحے کو پلٹ کر فوٹو اسٹیٹ کرواتا۔

مگر ان مشکل کے ساتھ ساتھ جو حیرت انگیز بات سامنے آئی وہ یہ کہ انہی خستہ اور بوسیدہ رجسٹروں میں حضرت والا دامت برکاتہم کے ایسے مفصل فتاویٰ موجود تھے جو اپنے موضوع پر جامع ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی محقق اور مدلل ہیں۔ اور چند ایسے موضوعات پر بھی حضرت کے تحقیقی فتاویٰ سامنے آئے جن پر دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے کئی ساتھیوں کو فتاویٰ لکھتے وقت تحقیق کی ضرورت پیش آئی اور وہ ساتھی ہفتوں بلکہ مہینوں اس سلسلے میں پریشان رہے، جبکہ حضرت والا دامت برکاتہم کے اس ذخیرے میں ان موضوعات پر پہلے سے تیار شدہ محقق فتاویٰ موجود تھے، مگر پردۂ خفاء میں ہونے کی وجہ سے ان سے استفادہ ممکن نہ تھا۔

جب اس طرح کے کئی فتاویٰ وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے، تو دل میں یہ داعیہ شدید تر ہوتا گیا کہ یہ اہم فقہی ذخیرہ فوری طور پر منظرِ عام پر آنا چاہئے، لہٰذا ۲۲ ذی القعدہ و رجب سن ۱۳۸۲ھ سے اب تک کے فتاویٰ جمع کئے اور صرف وہی فتاویٰ جمع کئے جو حضرت والا دامت برکاتہم کے اپنے لکھے ہوئے ہیں، ورنہ وہ فتاویٰ جن پر حضرت کے تصدیقی دستخط ہیں وہ اس مجموعے سے کئی گنا زیادہ ہیں۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کی اقسام

دراصل حضرت والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کو درج ذیل چار قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے، جن میں سے پہلی تین قسم کے فتاویٰ اس مجموعے میں شامل کئے گئے ہیں۔

۱- وہ فتاویٰ جو دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے باقاعدہ جاری کئے گئے اور دارالافتاء کے نقلِ فتاویٰ کے رجسٹروں میں ان فتاویٰ کا اندراج ہے۔

۲:- سن ۱۳۸۷ھ و ۱۳۸۸ھ کے زمانے میں ''البلاغ'' میں حضرت والا دامت برکاتہم کا ایک دلچسپ علمی سلسلہ ''آپ کے سوال'' کے عنوان سے چلتا تھا، جس میں بہت سے لوگ ''البلاغ'' کی معرفت آپ کے پاس سوالات بھیجتے تھے اور حضرت ''البلاغ'' میں ان کے جوابات دیا کرتے تھے، ان میں بعض انتہائی مفصل اور محقق جوابات بھی ہیں۔ ''البلاغ'' سے وہ تمام فتاویٰ بھی اس

مجموعے میں شامل کئے گئے ہیں، اور چونکہ ان فتاوی کا دارالافتاء کے رجسٹروں میں باقاعدہ اندراج نہیں ہوا تھا اس لئے ان فتاوی کا کوئی نمبر بھی موجود نہیں تھا، جو لکھا جاتا۔ تاہم حاشیہ میں ایسے فتاوی کی نشاندہی کردی گئی ہے۔

۳:- حسنِ اتفاق سے ان فتاوی کی جمع وترتیب کے دوران حضرت والا دامت برکاتہم کو ایک دن اپنے گھر سے اپنے درجۂ تخصص کے زمانے کی ''تمرینِ افتاء'' کی کاپی مل گئی جو حضرت نے احقر کو عنایت فرمائی۔ اس کاپی میں حضرت کے تحریر فرمودہ تمام فتاوی آپ کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تصحیح وتصدیق شدہ ہیں۔ ان میں بعض مفصل اور مدلل فتاوی بھی ہیں۔ مثلاً اس پہلی جلد میں ''تطہیر اشیاء کے طریقوں کی تعداد اور تفصیل'' کے عنوان پر جو فتوی ہے وہ اسی کاپی سے لیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری جلد میں ''حج صرورہ'' سے متعلق ایک تفصیلی فتوی آنے والا ہے۔
اس کاپی کے تمام فتاوی بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

۴:- حضرت نے اپنے کئی متعلقین کو ان کے خطوط کے جوابات میں بھی کئی فقہی سوالات کے جوابات عنایت فرمائے ہیں مگر حضرت کے ذاتی نوعیت کے خطوط کا چونکہ دارالافتاء میں اندراج نہیں ہوتا لہٰذا ایسے فتاویٰ اس مجموعہ میں شامل نہیں ہوسکے۔

مذکورہ چار قسموں میں سے ظاہر ہے کہ کثیر تعداد پہلی قسم کے فتاوی کی ہے جو دارالافتاء سے جاری کئے گئے، ان سب کو اس مجموعے میں شامل کرنے کے بعد بھی یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ یہ حضرت والا کے تمام فتاوی ہیں، کیونکہ رجسٹروں سے ان فتاوی کو جمع کرنے کے دوران ایک افسوسناک بات یہ سامنے آئی کہ سنہ ۱۳۸۴ھ و ۱۳۸۵ھ کا زمانہ جو حضرت کے فتاوی لکھنے کے عروج کا زمانہ تھا اور اس وقت دارالافتاء دارالعلوم میں فتاوی کے نقل کا انتظام بھی موجود تھا مگر اس کے باوجود بعض ناقلین فتاوی نے کئی ضخیم رجسٹروں میں فتاوی نقل کرتے وقت فتوی کے آخر میں مجیب کا نام ہی نہیں لکھا، عجیب بات یہ ہے کہ ہر سوال کے بعد سائل اور مستفتی کا نام تو باالتزام لکھا ہے مگر فتوی کے آخر میں مجیب کا نام چھوڑ دیا۔

ایسے رجسٹر جب سامنے آئے تو بہت افسوس ہوا کہ ان رجسٹروں میں کئی طویل اور مفصل ومحقق فتاوی موجود ہیں، مگر مجیب کی تعیین وتمیز نہ ہونے کی وجہ سے اب یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ اس میں کون سا فتوی کس شخصیت کا ہے؟ ادھر ان فتاوی کے مجیب کی تعیین وتمیز کا اب کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ حضرت والا دامت برکاتہم کے لئے اپنی بے پناہ علمی مصروفیت کی بناء پر ان رجسٹروں کے ایک ایک صفحے کو جانچنا تقریباً ناممکن ہے اور فتاوی نقل کرنے والے حضرات میں سے بعض کا اب انتقال بھی ہوچکا ہے، وہ ہوں بھی تو اب یہ تعیین مشکل ہے کہ کون سا فتوی کس شخصیت کا لکھا ہوا ہے؟ ایسے فتاوی کی تبویب کا

کام کرنے والے متخصصین نے فتووں کو بھی دیکھا، ان حضرات نے بھی مجیب کی تعیین کے بغیر ان پر کام کیا ہے، لہذا مجبوراً ایسے رجسٹروں میں موجود حضرت کے کئی نامعلوم فتاوی بھی اس مجموعے میں شامل نہیں کئے جاسکے۔ اب جب بھی دارالافتاء دارالعلوم کے تمام عمومی فتاوی شائع ہوئے تو شاید ان میں یہ فتاوی بھی شائع ہوکر سامنے آسکیں۔ لہذا بعض فتاوی، شروع میں نقل کا انتظام نہ ہونے کی بناء پر، اور بعض مذکورہ صورتِ حال کی بناء پر اس مجموعہ میں شامل نہیں ہوسکے، اس لئے یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ یہ حضرت والا دامت برکاتہم کے تمام فتاوی ہیں۔

طریقۂ کار

پہلے مرحلے میں حضرت والا دامت برکاتہم کے دستیاب تمام فتاوی کو جمع کیا گیا، اور دُوسرے مرحلے میں ان تمام فتاوی کو ان کے موضوعات کے اعتبار سے الگ الگ کرکے فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق رکھا گیا، اور اس میں جس فتوی میں صرف ایک سوال اور جواب ہے اسے تو متعلقہ موضوع اور باب میں رکھنا آسان تھا، مگر بہت سارے فتاوی ایسے ہیں کہ ان میں مستفتی نے الگ الگ موضوع سے متعلق کئی سوالات کئے ہیں اور ان میں ہر سوال، جواب کا باب اور موضوع الگ ہے، چونکہ ایک ہی کاغذ پر ہونے کی وجہ سے انہیں الگ الگ رکھنا ممکن نہ تھا، لہذا ایسے کئی فتاوی کو باتھ سے الگ لکھا گیا۔

جمع و ترتیب کے بعد تیسرے مرحلے میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان فتاوی میں موجود حوالوں کی تخریج کی جائے، کیونکہ سن ۱۳۸۷ھ وغیرہ کے زمانے میں فتاوی شامیہ کا کوئی مقبول نسخہ رائج تھا، جبکہ آج کل ''ایچ ایم سعید'' کا نسخہ متداول ہے، لہذا اسی نسخے کے مطابق شامی کی عبارات کی تخریج کی گئی ہے، چنانچہ بعض جگہوں پر ''ایچ ایم سعید'' کا پورا لفظ اور کہیں صرف ''سعید'' کا لفظ لکھا گیا ہے، جس سے یہی مراد ہے۔ اسی طرح تفسیر، حدیث اور فقہ کی دیگر کتب کا بھی یہی معاملہ ہے، لہذا ان کتب کے ان نسخوں کے مطابق تخریج کی گئی ہے جو نسخے ہمارے دیار میں رائج اور متداول ہیں۔ چنانچہ ہر عبارت کے شروع یا آخر میں کتاب کے نام کے ساتھ ساتھ مطبع وغیرہ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی علمی فائدے کے پیشِ نظر اس کی تائید میں مزید حوالہ جات بھی لگائے گئے ہیں، کہیں پر عبارات اور کہیں صرف دیگر فقہی کتب کے صفحہ نمبر وغیرہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔

چوتھے مرحلے میں یہ کام کیا گیا کہ جہاں فتوی میں کوئی حوالہ موجود نہیں تھا، وہاں پر حاشیے میں اس فتوی کے حوالے لکھ دیئے گئے ہیں، اور تخریج، تعلیق اور اضافی حوالہ جات کا یہ سارا کام متعلقہ فتوی کے نیچے حاشیے میں کیا گیا ہے، اور ترتیب یہ رکھی ہے کہ سب سے پہلے سوال، پھر جواب اور جواب میں

جہاں جہاں ضرورت تھی وہاں حاشیہ نمبر لگایا گیا ہے، پھر اس فتویٰ کے نیچے یہ لگا کر حاشیہ میں حوالے اور عبارات درج کی گئی ہیں۔

ہر فتویٰ کے آخر میں تاریخ بھی درج کر دی گئی ہے، اور جس فتویٰ پر اکابر میں سے کسی کے دستخط ہیں وہاں ان حضرات کے نام ذکر کر دیئے گئے ہیں، اور مصدق کے دستخط بھی چونکہ عموماً اسی تاریخ یا اس سے ایک آدھ دن بعد میں ہوا کرتے ہیں، لہٰذا مصدق کے نام کے نیچے تاریخ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے صرف حضرت والا دامت برکاتہم کے نام کے نیچے تاریخ درج کی گئی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب فتاویٰ پرانے رجسٹروں سے فوٹو اسٹیٹ کرائے گئے تھے اور فوٹو اسٹیٹ کرتے وقت اصل توجہ فتویٰ پر رہی اور تاریخ بعض اوقات صفحے کے ایک طرف دائیں یا بائیں حصے میں درج ہوتی تھی، اس لئے بعض فتاویٰ کی فوٹو اسٹیٹ میں تاریخ آنے سے رہ گئی، لہٰذا ایسے فتاویٰ میں اندازے سے تاریخ لکھی گئی ہے، لیکن ایسے فتاویٰ کی تعداد بہت کم ہے۔

ہر فتویٰ کے آخر میں تاریخ کے نیچے ''فتویٰ نمبر'' بھی لکھا گیا ہے، اس فتویٰ نمبر سے دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے نقل فتاویٰ کے رجسٹروں کا نمبر مراد ہے، اور یہ نمبر لکھنے کی غرض یہ ہے کہ اگر کبھی دارالافتاء کا کوئی ساتھی اصل کی طرف مراجعت کرنا چاہے تو بوقت ضرورت یہ مراجعت ممکن ہو۔ تاہم بعض فتاویٰ کی فوٹو اسٹیٹ میں ''فتویٰ نمبر'' نہ آسکنے کی بناء پر ایسے فتاویٰ کے آخر میں فتویٰ کا نمبر نہیں دیا جاسکا، مگر ایسے فتاویٰ کی تعداد بھی بہت کم ہے۔

خصوصیات

* چونکہ حضرت والا اپنے مزاج و مذاق کی بناء پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہم اللہ کی علمی روایات کے امین ہیں، لہٰذا ان حضرات کی طرح حضرت کے فتاویٰ کی بھی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں الحمدللہ تحقیق اور اعتدال کا وصف نمایاں ہے۔

* اس مجموعے میں جدید مسائل پر بھی کئی فتاویٰ ہیں، پہلی جلد میں نسبتاً کم ہیں، جبکہ بعد کی جلدوں میں خصوصاً ''فقہ المعاملات'' جس پر حضرت کو خصوصی دسترس حاصل ہے، سے متعلق کئی جدید فتاویٰ ہیں۔

* ویسے تو عوام وخواص کے نزدیک حضرت والا کی رائے کو انتہائی محقق و مستند سمجھا جاتا ہے اور کسی فتویٰ کے مستند ہونے کے لئے حضرت کی تصدیق کو ہی کافی سمجھا جاتا ہے، مگر ان فتاویٰ کی ایک

زائد خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں سے کئی فتاویٰ پر مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا سبحان محمود صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے تصدیقی دستخط موجود ہیں، جس سے ان فتاویٰ کے درجۂ استناد میں مزید تقویت پیدا ہوجاتی ہے۔

* فتاویٰ میں حضرت والا دامت برکاتہم کے تحریر فرمودہ حوالہ جات اور اس کے ساتھ ساتھ حواشی میں ذکر کردہ عبارات اور حوالوں کی بناء پر عوام کے علاوہ اہلِ علم، خصوصاً اہلِ فتویٰ کے لئے بھی اس ذخیرے سے بھرپور علمی و تحقیقی استفادہ آسان ہوگیا ہے۔

احقر کی سوچ اور اندازے کے مطابق یہ کام بہت پہلے منظرِ عام پر آجانا چاہئے تھا، اس کی ترتیب، تخریج اور اضافۂ حوالہ جات کا کام بھی بہت پہلے ہو چکا ہوتا، مگر کمپوزنگ میں اغلاط کی کثرت، اور بار بار کی تصحیح وغیرہ کی بناء پر یہ کام مؤخر ہوتا چلا گیا، بالآخر کافی عرصہ خود کمپوزر کے پاس بیٹھ کر تصحیح کرواکر پہلی جلد کا کام مکمل کیا، اس طرح یہ کام احقر کے اندازے سے تقریباً دو سال تاخیر سے منظرِ عام پر آرہا ہے۔

اس کے باوجود اس میں کہیں نفسِ مضمون کی، کہیں حوالے اور عبارت کی، اور کہیں کمپوزنگ کی غلطیوں کا امکان موجود ہے، اس طرح کی تمام تر غلطیوں کی ذمہ داری احقر پر ہے، حضرت والا دامت برکاتہم کی ذات اس سے بری ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ ایسی غلطیوں سے احقر کو مطلع فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشنوں میں ان کی تصحیح کی جاسکے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت والا دامت برکاتہم کو ان کے مقاصدِ حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور انہیں بعافیت عمر دراز عطا فرما کر ان کا سایہ تادیر ہم سب پر قائم رکھیں، آمین۔

آخر میں قارئین سے احقر، اس کے والدین اور اساتذہ کے لئے بھی دعاؤں کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عافیتِ دارین عطا فرمائیں۔

اور اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنے دربار میں شرفِ قبول سے نواز کر ہمارے لئے اسے ذخیرۂ آخرت بنائیں، آمین۔ انه علی ما یشاء قدیر وبالإجابة جدیر.

احقر

محمد زبیر حق نواز

۱۴۲۵/۱۰/۲۷ھ

اُستاذ و رفیق دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی

کتاب الإیمان و العقائد

(ایمان وعقائد کا بیان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿فصل فی المتفرّقات﴾

(ایمان وعقائد سے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کے نقش کو چومنے، اس جیسے نعل پہننے اور اس کے احترام کا حکم

سوال:- مکرم ومحترم جناب مفتی صاحب، دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، اما بعد!

۱- جو چیز سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر سے متصل ہوئی، اس کی برکات کا انکار تو کوئی جاہل یا ملحد ہی کرے گا، لیکن اس شے کی مثل ہاتھ سے تیار کرلی جائے تو کیا اس میں بھی وہ برکت آجاتی ہے؟ بالفاظِ دیگر متبرک شے کی تصویر بھی متبرک ہوتی ہے؟

۲- آج کل سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کا نقشہ بہت عام ہوگیا، لوگ اس کو چومتے ہیں، برکت کے لئے سر پر رکھتے ہیں، اس کی کیا حیثیت ہے؟ اس نقشے کی یہ حیثیت مسلّم کہ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کی صورت معلوم ہوگئی، روایات حدیث میں مذکور نعل کا سمجھنا آسان ہوگیا۔

۳- کیا اس نقشے کے مطابق نعل بنواکر استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ادا ہمارے لئے نمونہ ہے، آپ کی پگڑی جیسی پگڑی، قمیص جیسی قمیص بنوانا، پہننا سب باعث سعادت اور محبت کا تقاضا ہے، کیا آپ کے جوتے جیسا جوتا پہننا بھی محبت کا تقاضا ہے یا نہیں؟

۴- نیز یہ بھی قابلِ دریافت ہے کہ یہ نقشہ اس وقت عام مروّج تھا یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا؟ آپ کا نعل مبارک صحابہ رضوان اللہ علیہم کے زمانے میں موجود تھا، دیگر مستعمل کپڑوں، برتنوں کی طرح اس کو سنبھال کر رکھا گیا۔ جن حضرات کے پاس یہ موجود نہیں تھا، کیا کسی روایت سے ثابت ہے کہ وہ لوگ کاغذ پر اس کی صورت بناکر برکت حاصل کرتے ہوں؟ اگر ثابت نہ ہو تو آج اس کو باعث ثواب سمجھنا، سفر میں ساتھ رکھنا، برکت کے لئے دکانوں، مکانوں پر لگانا کیا بدعت نہیں ہوگا؟

۵۔ روضۂ اقدس کی تمثال تصویر یعنی فوٹو، بیت اللہ کی تصویر بھی باعث برکت ہے یا نہیں؟ اب لوگ ان کپڑوں اور قالینوں پر نماز پڑھنا بے ادبی سمجھنے لگ گئے ہیں جن پر روضۂ اقدس کی تصویر ہو، اس کی کیا حیثیت ہے؟

۶۔ اب نقشِ خاتم بھی شائع ہوگیا ہے، لوگ اس کے تصور وانوار و برکات کا باعث سمجھنے لگے ہیں، اس کی کیا شرعی حیثیت ہے؟ مجھے خطرہ ہے کہ غلط لوگوں کی طرف سے جلد ہی آپ کی ڈاڑھی مبارک، بغل اور سر کی مثل شائع ہونے کا بھی خطرہ ہے، یہ شروع ہو جائے۔ میرے خیال میں مرتب غلط ہوا، اپنے مرتب خط میں منتقل کر کے سوال و جواب اپنے ماہنامہ "البلاغ" میں شائع فرما دیں تو میرے جیسے کئی تشنہ لوگوں کی رہنمائی ہو جائے گی۔

والسلام

عبدالمجید غفرلہ

ماہ محرم ۱۴۱۶ھ

بخدمت اقدس جناب مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

آپ کا مفصل استفتاء نعلِ مبارک کے نقشے کے بارے میں کافی عرصہ پہلے مل گیا تھا، وہ برابر زیرِ غور رہا، آخر میں مشورے کے لئے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی کی خدمت گرامی میں پیش کیا، ہماری خوش قسمتی ہے کہ حضرت والا خود جواب تحریر فرمانے کے لئے تیار ہوگئے، چنانچہ یہ جواب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی کا لکھا ہوا ہے۔

والسلام

بندہ عبدالرؤف سکھروی

۲۰/۷/۱۴۱۶ھ

مخدومِ گرامی قدر حضرت مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب کے نام آیا تھا، انہوں نے احقر کو مشورے کے لئے بھیجا، احقر نے جو کچھ سمجھ میں آیا، لکھ دیا، اور آنجناب کی خدمت میں اس خیال سے ارسال کر رہا ہوں کہ اگر کوئی غلطی ہو تو آنجناب اس پر متنبہ فرمائیں گے۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی

۲۰/۶/۱۴۱۶ھ

جواب ۱، ۲:- شاید جناب کے علم میں ہوگا کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''زاد السعید'' میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کا نقشہ شائع فرمایا تھا اور اس کو سر پر رکھ کر دُعا کرنے کی بھی فی الجملہ ترغیب دی تھی، اور اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا تھا، بعد میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر حضرت سے خط وکتابت کی جو کفایت المفتی جلد ۲ صفحہ ۶۱ تا ۶۹[۱] اور امداد الفتاویٰ جلد ۴ صفحہ ۳۲۸ تا ۳۳۲[۲] میں مکمل شائع ہوچکی ہے۔ اس خط وکتابت کے مطالعے سے مسئلے کی شرعی حیثیت بڑی حد تک واضح ہوجاتی ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آثارِ متبرکہ کا تعلق ہے جو آپ کے زیرِ استعمال رہے ہوں یا آپ کے جسمِ اطہر سے مس ہوئے ہوں، ان سے تبرک یا انہیں بوسہ دینا یا سر پر رکھنا متعدد صحابہ کرامؓ اور علمائے متقدمین سے ثابت ہے، اور جیسا کہ خود آنجناب نے ذکر فرمایا ہے وہ محلِ اشکال نہیں۔ البتہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آثارِ متبرکہ کی کوئی تصویر بنائی جائے یا اس کا کوئی نقشہ بنایا جائے تو وہ اگرچہ اصل آثار کے مساوی نہ ہوگا، لیکن چونکہ اصل کے ساتھ مشابہت اور مشاکلت کی وجہ سے اس کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فی الجملہ ایک نسبت حاصل ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اپنے شوقِ طبعی اور محبت کے داعیہ سے اس کا بھی ادب کرے اور اسی محبت کے داعیہ سے اسے بوسہ دے یا آنکھوں سے لگائے تو فی نفسہ اس کی ممانعت پر بھی کوئی دلیل نہیں، لہٰذا فی نفسہ ایسا کرنا مباح ہوگا، بلکہ جس محبت کے داعیہ سے ایسا کیا جا رہا ہے وہ محبت ان شاء اللہ موجبِ اجر بھی ہوگی بشرطیکہ اس خاص عمل کو بذاتہ عبادت نہ سمجھا جائے، کیونکہ عبادت کے لئے ثبوتِ شرعی درکار ہے۔ البتہ جواز کے لئے کسی مستقل دلیل کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے لئے ممانعت کی دلیل نہ ہونا بھی کافی ہے۔ اور اس تفصیل میں دونوں صورتیں شامل ہیں، خواہ نقش اصل کے بالکلیہ مطابق ہو یا بالکلیہ مطابق نہ ہو، کیونکہ مشابہت کی وجہ سے فی الجملہ نسبت دونوں کو حاصل ہے۔

یہ تو مسئلے کی اصل حقیقت تھی، لیکن چونکہ ان نازک حدود کو سمجھنا اور ان کی نزاکت کو ملحوظ رکھنا عوام کے لئے مشکل معلوم ہوتا ہے، اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس میں حدود سے تجاوز نہ ہوجائے، مثلاً یہ کہ اس عمل کو بذاتہ عبادت سمجھا جانے لگے یا ادب وتعظیم میں حدود سے تجاوز ہو کر مشرکانہ افعال یا اعتقادات اس کے ساتھ شامل ہوجائیں۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان نقشوں کی عمومی تشہیر اور ان کی طرف ترغیب وغیرہ سے اجتناب ہی کیا جائے، اسی لئے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے اپنے

(۱) کفایت المفتی ج ۲ ص ۹۰ تا ۹۹ (طبع جدید دارالاشاعت)
(۲) امداد الفتاویٰ ج ۴ ص ۳۲۸ تا ۳۲۹ و ۳۳۳ تا ۳۳۶ (طبع [illegible])

رسالہ "نیل الشفاء بنعل المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم" سے بعد میں رجوع فرمایا تھا۔

خلاصہ یہ کہ تشبیہ کی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہئے، لیکن اگر کوئی شخص حدود میں رہ کر مذکورہ افعال کرتا ہے تو اس پر نکیر بھی درست نہیں۔

۳- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعل شریف جیسی نعل بنوا کر پہننے کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں فقہائے کرام کی کوئی تصریح تو نہیں دیکھی، البتہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ معاملہ ذوق کا ہے، اور مذاق مختلف ہوسکتے ہیں، ایک مذاق یہ ہے کہ جس چیز کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار متبرکہ میں سے کسی کے ساتھ مشابہت حاصل ہو وہ تو سر اور آنکھوں پر رکھنے کی چیز ہے، نہ یہ کہ اس کو پاؤں میں استعمال کیا جائے، لہٰذا اگر کوئی شخص اس مذاق کے تحت اسے پہننے سے احتراز کرے تو یہ اس کے مذاق تعظیم ومحبت کا تقاضا ہے، جس پر وہ قابل ملامت نہیں، جیسا کہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ کے بارے میں منقول ہے کہ سبز رنگ کا جوتا بھی اس لئے نہیں پہنتے تھے کہ گنبد خضراء کا رنگ سبز ہے۔ اور دوسرا مذاق یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل اور ہر ادا میں حتی الامکان حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں کی نقل اتارنے کی کوشش کرے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جیسا لباس پہنے، اور اس نقطۂ نظر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک جیسا نعل بنوا کر پہنے اور مقصود اتباع ہو تو بظاہر اس پر بھی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ یہ بھی محبت کا تقاضا ہے۔ چونکہ اس کا مقصود اتباع ہے، اس لئے بظاہر اس میں اہانت کا بھی کوئی پہلو نہیں۔ چنانچہ صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہ کہیں منقول نہیں کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک جیسے جوتے پہننے سے احتراز کا اہتمام کیا ہو، بالخصوص جبکہ اس دور میں جوتوں کی اوضاع میں اتنا تنوع بھی نہیں تھا، لہٰذا جیسا عرض کیا گیا یہ ذوق کی بات ہے اور کوئی ذوق قابل ملامت نہیں۔

۴- یہ بات تلاش کے باوجود نہیں مل سکی کہ آیا یہ نقشہ عام مروج تھا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔

۵، ۶- روضۂ اقدس یا بیت اللہ کی تصویر کا حکم بھی قریب قریب ایسا ہی ہے کہ ان کو اصل کے ساتھ تشابہ کی ایک نسبت تو یہ حاصل ہے، نیز انہیں دیکھ کر اس کا استحضار قوی ہوتا ہے، لہٰذا ان کا احترام کرنا چاہئے، یعنی ان کو کسی موضع اہانت میں استعمال کرنا درست نہیں، جہاں تک ان کے باعث برکت ہونے کا تعلق ہے، یہ بات واضح ہے کہ کسی جگہ ان کے لگانے سے ان شعائر کا بار بار استحضار ہوتا ہے، اور یہ استحضار یقیناً باعث برکت ہے۔

جانمازوں پر ان میں سے کسی بھی قسم کے نقش پسندیدہ نہیں، لیکن اگر کسی جائے نماز پر حرمین شریفین

میں سے کسی کی تصویر اس طرح بنی ہوئی ہے کہ وہ پاؤں کے نیچے نہیں آتی تو اس میں بھی بات کا کوئی پہلو نہیں، البتہ موضع سجود میں بیت اللہ کے سوا کسی اور چیز کی تصویر بالخصوص روضۂ اقدس کی شبیہ میں چونکہ ایہام خلاف مقصود ہو سکتا ہے اس لئے اس سے احتراز مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۷:- نقش خاتم کے بارے میں بھی وہی تفصیل ہے جو نقشِ نگین کے بارے میں عرض کی گئی، البتہ ظاہر ہے کہ ان غیر ذی روح اشیاء کے نقوش پر ذی روح کے نقوش کو ہرگز قیاس نہیں کیا جا سکتا، کہ ذی روح کا نقش یا تصویر بہر صورت ممنوع ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲۰/۶/۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۰۰ ۲۰۳)

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴
۲۰/۶/۱۴۱۶ھ

کفار کے نابالغ بچوں کا کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک بچہ کافر کے گھر پیدا ہوا اور بچپن ہی میں مر گیا، کیا یہ بچہ جنت میں جائے گا یا نہیں؟

جواب:- کافروں کے گھر پیدا ہونے والا بچہ جس کے ماں باپ دونوں کافر ہوں دنیوی احکام کے لحاظ سے کافروں ہی کے حکم میں ہوتا ہے، لیکن آخرت کے احکام کے لحاظ سے اس کا کیا ہوگا؟ جنت میں جائے گا یا جہنم میں؟ اس کے بارے میں علماء کا اختلاف رہا ہے،(۱) صحیح علم اللہ ہی کو ہے، اور اس مسئلے پر دین کا کوئی عملی مسئلہ موقوف نہیں، لہٰذا اس کی تحقیق میں پڑنا ٹھیک نہیں۔ "من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه"(۲)

واللہ اعلم
۱۳۹۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۲۳/۲۷ الف)

سوشلزم کی حمایت کرنے والے کا حکم

سوال:- سوشلزم کی حمایت کرنے والے (سوشلزم معاشی نظام جو کہ اسلام کے خلاف ہے) کا شریعت کی رُو سے کیا مقام ہے؟

۲:- نظامِ مصطفیٰ پر قربان ہونے والے اور مخالفینِ نظامِ مصطفیٰ کا کیا مقام ہے؟

جواب ۱:- سوشلزم کی حمایت اگر اس بناء پر کی جائے کہ سوشلزم کا معاشی پروگرام (معاذ اللہ) اسلام کی معاشی تعلیمات سے افضل ہے، تو یہ صریح کفر ہے۔ اور اگر اس لحاظ سے کی جائے کہ اسلام سے

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے فتاویٰ شامیة "مطلب فی أطفال المشرکین" ج ۲ ص ۹۲ (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) جامع الترمذی، ابواب الزهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ج ۲ ص ۵۵ طبع فاروقی کتب خانہ

احکام صرف عبادات وغیرہ سے متعلق ہیں، اور معیشت میں اسلام کے احکام واجب التعمیل نہیں تو یہ بھی صریح کفر ہے۔ اور اگر کسی غلط فہمی کی بناء پر کہی جائے کہ اسلام کے معاشی احکام سوشلزم کے معاشی احکام کے (معاذ اللہ) موافق ہیں تو شدید گمراہی ہے، یہ تمام عقائد بہرصورت باطل اور واجب الترک ہیں، اور ان سے توبہ واجب ہے۔

۲:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور احکام پر قربان ہونا موجب صد اجر وفضیلت اور بہت بڑی سعادت ہے، اور اس کی مخالفت کفر اور بدترین شقاوت ہے۔

واللہ اعلم
[illegible]

اسمائے حسنیٰ میں سے کون سے اسماء بندوں کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں؟

سوال:- آج کل عموماً باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ "عبد" کے اضافے کے ساتھ نام رکھے جاتے ہیں، مگر عموماً غفلت کی وجہ سے مسمّٰی کو بدون "عبد" کے پکارا جاتا ہے، حالانکہ بعض اسماء باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً عبدالرزاق وغیرہ، اندریں حالات ذیل میں مشکوٰۃ سے متعلق ننانوے اسمائے باری تعالیٰ ج:۱ ص:۲۲۳ سے نقل کرکے درج کر رہا ہوں، تحقیق فرمائیں کہ کون سے اسماء باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، کہ ان کو بدون "عبد" کے مخلوق کے لئے استعمال کرنا ناجائز ہے، اگر ان کے علاوہ مروّجہ اسماء ہوں تو وہ بھی درج فرمادیں مع تحقیق کے، نیز اسماء کے شروع یا آخر میں "محمد" یا "احمد" یا "اللہ" کا اضافہ کیسا ہے؟ مثلاً محمد متکبر، خالق احمد، محمد اللہ، احمد رزاق۔

اللہ، الرحمٰن، الرحیم، الملک، القدوس، السلام، المؤمن، المہیمن، العزیز، الجبار، المتکبر، الخالق، الباری، المصور، الغفار، القہار، التواب، الوہاب، الخلّاق، الرزاق، الفتّاح، الحلیم، العلیم، العظیم، الواسع، الحکیم، الحی، القیوم، السمیع، البصیر، اللطیف، الخبیر، العلی، الکبیر، المحیط، القدیر، المولیٰ، النصیر، الکریم، الرقیب، القریب، المجیب، الحفیظ، المقیت، الودود، المجید، الوارث، الشہید، الولی، الحمید، الحق، المبین، الغنی، المالک، القوی، المتین، الشدید، القادر، المقتدر، القاہر، الکافی، الشاکر، المستعان، الفاطر، البدیع، الغافر، الاوّل، الآخر، الظاہر، الباطن، الکفیل، الغالب، الحکم، العالم، الرفیع، الحافظ، المنتقم، القائم، المحیی، الجامع، الملیک، المتعالی، النور، الہادی،

الغفور، الشكور، العفو، الرءوف، الأكرم، الأعلى، البر، الحفي، الرب، الإله، الأحد، الصمد، الذي لم يلد، ولم يولد، ولم يكن له كفوا أحد.

جواب:- کسی کتاب میں یہ تفصیل تو نظر سے نہیں گزری کہ کون کون سے اسمائے حسنیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہیں، اور کون سے اسماء کا اطلاق دُوسروں پر ہوسکتا ہے، لیکن مندرجہ ذیل عبارتوں سے اس کا ایک اُصول معلوم ہوتا ہے۔

تفسیر روح المعانی میں علامہ آلوسی لکھتے ہیں: "وذكر غير واحد من العلماء أن هذه الأسماء منقسمة إلى قسمين: قسم لا يجوز إطلاقه على غيره سبحانه وتعالى كالله والرحمن، وما يجوز كالرحيم والكريم." (روح المعانی ج ۹ ص ۱۲۳ طبع مکتبہ رشیدیہ لاہور)

در مختار میں ہے: "وجاز التسمية بعلي ورشيد من الأسماء المشتركة، ويراد في حقنا غير ما يراد في حق الله تعالى. وفي رد المحتار: الذي في التاتارخانية عن السراجية: التسمية باسم يوجد في كتاب الله تعالى كالعلي والكبير والرشيد والبديع جائزة الخ."[1] (شامی ج ۵ ص ۲۶۸)۔

وفي الفتاوى الهندية: التسمية باسم لم يذكره الله تعالى في عباده ولا ذكره رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا استعمله المسلمون تكلموا فيه، والأولى أن لا يفعل كذا في المحيط. (فتاوی عالمگیریة ص ۳۶۲ حظر واباحت باب ۲۲)[2]۔

اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

> اسمائے حسنیٰ میں بعض نام ایسے بھی ہیں جن کو خود قرآن وحدیث میں دُوسرے لوگوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے، اور بعض وہ ہیں جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے استعمال کرنا قرآن و حدیث سے ثابت نہیں۔ تو جن ناموں کا استعمال غیر اللہ کے لئے قرآن و حدیث سے ثابت ہے وہ نام تو اوروں کے لئے بھی استعمال ہوسکتے ہیں جیسے رحیم، رشید، علی، کریم، عزیز وغیرہ۔ اور اسمائے حسنیٰ میں سے وہ نام جن کا غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں، وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں، ان کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا الحادِ مذکور میں داخل اور ناجائز وحرام ہے۔
>
> (معارف القرآن ج ۴ ص ۱۳۲ سورۂ اعراف ۱۸۰)

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار (الحظر والاباحة) ج ۶ ص [illegible] (طبع سعيد)

(۲) ج ۵ ص ۳۶۲ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه)

ان عبارتوں سے اس بارے میں یہ اُصول مستنبط ہوتے ہیں:-

نمبر۱- وہ اسمائے حسنیٰ جو باری تعالیٰ کے اسم ذات ہوں یا صرف باری تعالیٰ کی صفات مخصوصہ کے معنی ہی میں استعمال ہوتے ہوں، ان کا استعمال غیر اللہ کے لئے کسی حال جائز نہیں، مثلاً اللہ، الرحمن، القدوس، الجبار، المتکبر، الخالق، الباری، المصوّر، الرزّاق، الغفار، القہار، التواب، الوہاب، الخلاق، الفتاح، القیوم، الرب، المحیط، الملیک، الغفور، الاحد، الصّمد، الحق، القادر المحیی۔

۲- وہ اسمائے حسنیٰ جو باری تعالیٰ کی صفات خاصہ کے علاوہ دوسرے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہوں اور دوسرے معنی کے لحاظ سے ان کا اطلاق غیر اللہ پر کیا جا سکتا ہو، ان میں تفصیل یہ ہے کہ اگر قرآن و حدیث، تعامل امت یا عرف عام میں ان اسماء سے غیر اللہ کا نام رکھنا ثابت ہو تو ایسا نام رکھنے میں مضائقہ نہیں، مثلاً عزیز، علی، کریم، رحیم، عظیم، رشید، کبیر، بدیع، کفیل، ہادی، واسع، حکیم وغیرہ، اور جن اسمائے حسنیٰ سے نام رکھنا نہ قرآن و حدیث سے ثابت ہو اور نہ مسلمانوں میں معمول رہا ہو، غیر اللہ کو ایسے نام دینے سے پرہیز لازم ہے۔

۳- مذکورہ دو اصولوں سے یہ اُصول خود بخود نکل آیا کہ جن اسمائے حسنیٰ کے بارے میں یہ تحقیق نہ ہو کہ قرآن و حدیث، تعامل امت یا عرف میں وہ غیر اللہ کے لئے استعمال ہوئے ہیں یا نہیں؟ ایسے نام رکھنے سے بھی پرہیز لازم ہے، کیونکہ اسمائے حسنیٰ میں اصل یہ ہے کہ ان سے غیر اللہ کا نام رکھنا جائز نہ ہو، جواز کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔

ان اُصولوں پر تمام اسمائے حسنیٰ کے بارے میں عمل کیا جائے، تاہم یہ جواب چونکہ عجلت میں لکھا گیا ہے اور ہر ہر نام کے بارے میں مکمل تحقیق کا موقع نہیں ملا، اس لئے اگر اس میں دوسرے اہل علم سے بھی استصواب کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۶۴/۲۹ ب)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے "یا محمد" کے الفاظ لکھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع اس مسئلے میں کہ ایک مسجد تقریباً پچیس سال قبل تعمیر کی گئی تھی، اور وقت تعمیر جس میں "یا اللہ" اور "یا محمد" کے الفاظ بھی کندہ کرائے گئے تھے اور پچیس سال سے مسلسل موجود تھے، لیکن سوء اتفاق سے ایک نئے امام صاحب مسجد میں تشریف لائے اور انہوں نے لفظ "یا" مسمار کر دیا۔ اب جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا مسجد میں کندہ

کسی لفظ کو یا مسجد کے کسی حصے کو منہدم کیا جا سکتا ہے؟ کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟ اگر "یا اللہ" "یا محمد" کے الفاظ کو بعینہٖ برقرار رکھا جائے تو اس میں کوئی شرعی قباحت موجود تھی؟ براہِ کرم مذکورہ بالا استفتاء کا مستند و معتبر جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیے، ساتھ ہی ساتھ اس بارے میں یہ بھی بتائیں کہ اس نازیبا حرکت اور گستاخی کا کفارہ کیا ادا کیا جائے؟

جواب:- حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے "یا محمد" کے الفاظ لکھنا بے ادبی ہے،(۱) اس زمانے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی سوائے بعض کفار و مشرکین کے کوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نام لے کر نہ پکارتا تھا، اور کفار بھی اکثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس بے ادبی کو گوارا نہ کرتے تھے بلکہ کنیت سے پکارتے تھے، اس کے علاوہ اس ندا میں عقیدۂ فاسدہ کا ایہام ہے، اس لئے یہ لفظ اس طرح لکھنا درست نہیں۔ اگر کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے خیال سے اس کے ساتھ لفظ "یا" مٹا دیا تو اس کو مسجد کی بے ادبی یا گستاخی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ تعظیمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و محبتِ رسول کا تقاضا تھا جو اس نے کیا، البتہ اس کی وجہ سے اگر مسجد میں کوئی بدزیبی پیدا ہوگئی یا مرمت کی ضرورت پڑ گئی ہو تو اسی شخص کو چاہئے کہ مسجد کی مرمت کراوے، اور اگر وہ تنگ دست ہو تو دوسرے مسلمانوں کو اس معاملے میں اس کی مدد کرنی چاہئے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۸۸/۹/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۵۹/۲۰ الف)

اگر کسی کو چھ کلمے یاد نہ ہوں تو اس کا کیا حکم ہے؟

سوال:- جب کوئی آدمی کلمۂ توحید پڑھ لے تو وہ مسلمان ہو گیا، پھر عام طور پر جو مشہور ہے اور نماز و وظائف کے چھوٹے چھوٹے رسالوں میں جو چھ کلمے لکھے ہوئے ہیں اور عام طور سے بچوں کو یاد کرائے جاتے ہیں، کیا یہ کلمے بھی اسلام کی بنیاد شمار کئے جائیں گے یا نہیں؟ اگر یہ کلمے کسی کو یاد نہ ہوں تو اس کے اسلام میں فرق ہوگا یا نہیں؟

اور پانچویں کلمے کے الفاظ میں فرق ہے، بعض رسالوں میں "استغفر اللہ ربی من کل ذنب اذنبتہ ... الخ" اور بعض رسالوں میں "استغفر اللہ انت ربی و انا عبدک ... الخ" ہے، دوسری قسم کے الفاظ عام نہیں ہیں، اس کی وجہ سے دو آدمیوں میں لڑائی ہو رہی ہے، براہِ کرم اس کی وضاحت فرمادیں۔

---

(۱) لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا (سورۃ النور: ۶۳) [illegible] اس سے بچنے کی تفصیل [illegible] معارف القرآن ج ۶ ص ۴۵۵ [illegible]

جواب:- اسلام کی بنیاد دراصل ان عقائد پر ہے جو ایمانِ مفصل میں بیان کئے گئے ہیں، لہٰذا ان عقائد پر ایمان رکھنا تو مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح کلمۂ توحید یا کلمۂ شہادت چونکہ اپنے عقائد کا اجمالی اعلان ہے، اس لئے یہ ہر مسلمان کو یاد ہونا چاہئے، باقی جو کلمات نماز وغیرہ کی کتابوں میں لکھے ہیں، انہیں بچوں کی تعلیم کی آسانی کے لئے لکھ دیا گیا ہے، ورنہ درحقیقت ان کا وہ مقام نہیں جو کلمۂ توحید، کلمۂ شہادت یا ایمانِ مفصل کا ہے۔ اگر یہ کلمات کسی کو یاد نہ ہوں تو اس سے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ البتہ چونکہ ان کلمات کا پڑھنا بہت موجب اجر وثواب ہے اور مسلمانوں کو ان کا ورد رکھنا چاہئے اس لئے بچوں کو یہ تمام کلمات سکھا دینے چاہئیں، اور کلمۂ استغفار میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں استغفار کے مختلف صیغے وارد ہوئے ہیں، ان میں سے جو صیغہ بھی پڑھ لیا جائے مقصود حاصل ہے، کیونکہ معنی کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے درود شریف کے مختلف صیغے احادیث سے ثابت ہیں، لہٰذا اس مسئلے پر جھگڑا کرنا انتہائی غلط ہے، مسلمانوں کو اس طرح کے نزاعات سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۷/۱/۱۳۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۵۳/۲۰ و)

کلمۂ طیبہ کے ساتھ "صلی اللہ علیہ وسلم" پڑھنا

سوال:- کیا کلمۂ طیبہ کے ساتھ "صلی اللہ علیہ وسلم" پڑھنا جائز ہے یا کلمۂ طیبہ صرف "لا إله إلا الله محمد رسول الله" ہی ہے؟ بندہ کلمہ کے ساتھ زیادتی کی بناء پر "صلی اللہ علیہ وسلم" پڑھنے سے روکتا ہے، صرف اس خدشے سے کہ کلمہ میں اضافہ جائز نہیں ہے، کیا میرا ایسا روکنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- کلمہ تو "لا إله إلا الله محمد رسول الله" ہی ہے، لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۲۱) ایمان مجمل اور ایمان مفصل کا مدار قرآن و ایمان کی نصوص آیات اور احادیث ہیں، جن میں سے ایک حدیث ترمذی ج ۲ ص ۸۵ (طبع مکتبہ فاروقی) میں موجود ہے: فی ان یؤمن باللہ وملائکته وکتبه ورسله والیوم الآخر والقدر خیره وشره الحدیث وکذا فی حدیث عمرؓ فی الترمذی۔ اور چھ کلموں کا ثبوت اور حوالہ جات درج ذیل ہیں۔ ۱۔ کلمۂ طیبہ: کنز العمال، فصل فی الشهادتین رقم الحدیث [illegible] ج [illegible] ص ۵۵ طبع مؤسسة الرسالة بیروت) ومشکوٰة المصابیح کتاب الایمان، الفصل الأول ج [illegible] ص [illegible] حدیث [illegible] (طبع قدیمی کتب خانہ)۔ کلمۂ طیبہ سے متعلق قرآن کریم میں کئی آیات ہیں، تفصیل کے لئے فتاویٰ محمودیہ ج ۶ ص ۴۳ دیکھئے۔ ۲۔ کلمۂ شہادت: الصحیح للبخاری، باب ما یتخیر من الدعاء بعد التشهد ج ۱ ص ۱۱۵ (طبع قدیمی کتب خانہ)۔ ۳۔ کلمۂ تمجید: الصحیح لمسلم، باب فضل التهلیل والتسبیح والدعاء ج ۲ ص ۳۴۵۔ ۴۔ کلمۂ توحید: جامع الترمذی ج ۲ ص ۱۸۰ (طبع میر محمد کتب خانہ)۔ ۵۔ سید الاستغفار: الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات فی باب أفضل الاستغفار ج ۲ ص ۹۳۳ (طبع قدیمی کتب خانہ)۔ ۶۔ ردِّ کفر: مسند احمد ج ۵ ص ۴۵۱ (طبع المکتب الاسلامی بیروت)۔ اس کے علاوہ ان کلمات کے الفاظ متفرق طور پر بے شمار احادیث میں وارد ہوئے ہیں، ان کی ترتیب، نام، تعداد اور نمبر آسانی کے لئے ہیں، درحقیقت ان کلموں کے معانی پر ایمان لانا ضروری اور مطلوب ہے۔ (محمد زبیر)

کا اسم گرامی جب بھی لیا جائے تو اس پر درود شریف پڑھنا احادیث سے ثابت ہے، اس لئے اگر کلمہ کے بعد ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھ دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ اس میں یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہتے وقت لہجہ کچھ بدل لیا جائے تاکہ کلمہ پر اضافے کا شبہ نہ ہو۔

واللہ اعلم

۱۳/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۸۰ الف)

شعراء کا اپنے کلام میں غیر اللہ کو خطاب کرنا

سوال:- ایک جگہ دو شخص آپس میں گفتگو تھے، شخص مذکورہ میں سے ایک شخص کا کہنا تھا کہ شاعری خواہ مجازی ہو یا حقیقی، ان دونوں کا اثر شاعر کے عقائد پر ہوتا ہے، جس طرح سے آج کل عام شاعر جن کی شاعری بالکل غیر سنجیدہ اور اخلاق سے گری ہوئی ہوتی ہے یہاں تک کہ شاعر کا اپنے فرضی محبوب کو خدا کے ہم پلہ قرار دینے، یا موسم یا دوسرے موضوعات پر مبالغہ آمیز انداز میں اپنے تخیل کو پیش کرنے سے شاعر کے عقائد اس کی زد میں آتے ہیں اور اس پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے، یہاں تک کہ شاعر اپنے تخیل کو غلط انداز میں بیان کرنے کی وجہ سے گناہ اور بسا اوقات گناہ عظیم کا مرتکب قرار پاتا ہے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے؟

۲- لیکن اس کے برعکس دوسرے شخص کا کہنا یہ ہے کہ شاعری خواہ مجازی ہو یا حقیقی، محض تخیل ہے، اور تخیل کا حقیقت سے بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی ربط نہیں۔

مہربانی فرما کر اس سوال کا جواب دیں کہ شخص مذکورہ میں سے کون صحیح ہے اور کون غلطی پر ہے؟ سادہ، عام فہم، مدلل، جامع، مفصل اور اگر کہیں عربی کی عبارت ہو تو اس کے بعد ترجمے کے ساتھ اس طرح جلد سے جلد ارقام فرمائیں کہ حجت تام ہو، عین نوازش ہوگی۔

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خط کو موصول ہوئے کئی ماہ گزر گئے، لیکن میں مسلسل سفر اور مصروفیت کی بناء پر جواب نہ دے سکا، اب بمشکل تمام اتنا وقت نکال سکا ہوں کہ جواب لکھوں۔

آپ نے خاص دو صاحبان کی گفتگو نقل کی ہے، ان میں سے کسی کی بات بھی علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے، اور وہ یہ کہ اگر شاعر اپنے کلام میں ایسا مجاز یا استعارہ استعمال کرتا ہے جس کی نظیریں اہل زبان میں معروف و مشہور ہوں اور دوسرے قرائن و شواہد سے یہ بھی معلوم ہو کہ شاعر نے یہ بات مجاز و استعارہ کے طور پر کہی ہے، حقیقت سمجھ کر نہیں کہی، تب تو یہ مجاز و استعارہ

جاتا ہے، اور اس کی بنیاد پر اس کا عقیدہ نہیں بتایا جاسکتا۔ اس کے برخلاف اگر مجاز و استعارہ اس نوعیت کا ہے کہ عام زبان میں اس کی نظیریں معروف نہیں ہیں یا پھر دوسرے قرائن و شواہد سے معلوم ہے کہ شاعر نے یہ بات مجاز کے طور پر نہیں کہی بلکہ حقیقت سمجھ کر کہی ہے تو اس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اس کا عقیدہ یہی ہے۔

مثلاً حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ شعر منسوب ہیں کہ

یا رسول اللہ انظر حالنا — یا حبیب اللہ اسمع قالنا لیکن چونکہ یہ بات حضرت حاجی صاحب کے حالات اور ان کی تحریروں وغیرہ سے معلوم ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرح حاضر و ناظر نہیں سمجھتے تھے، اس لئے یہاں یہ کہا جائے گا کہ ان اشعار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطاب کیا گیا ہے، وہ مجازی خطاب ہے، اور یہ ایک معروف شاعرانہ روایت ہے کہ شاعر بہت سی غیر موجود چیزوں کو تخیل میں موجود فرض کر کے ان سے خطاب کرتے ہیں، بلکہ بعض اوقات دریاؤں، پہاڑوں اور شہروں کو بھی خطاب کرتے ہیں، لہٰذا حضرت حاجی صاحب کا یہ مجاز ایسا ہے کہ عام زبان کے کلام میں اس کی نظیریں موجود ہیں، لہٰذا اس سے فساد عقیدہ لازم نہیں آتا۔ ہاں! اگر کوئی ایسا شخص یہ بات کہے جس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ بطور مجاز یہ بات نہیں کہہ رہا ہے بلکہ اس کے نزدیک حقیقی عقیدہ یہی ہے تو پھر فساد عقیدہ لازم آجائے گا۔(۱)

اس کے برخلاف بعض مرتبہ ایسے مجاز ہوتے ہیں کہ عام زبان میں ان کی معروف نظیریں نہیں ہوتیں، مثلاً کسی مخلوق کو خالق سے تشبیہ دینا یا کسی مخلوق کے اوصاف کو اس طرح بیان کرنا جیسے خالق کے ساتھ مخصوص ہیں، اس قسم کے مبالغے اور استعارے چونکہ متعارف نہیں ہوتے اور دین و مذہب کا پاس رکھنے والے لوگ ان سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں، اس لئے ایسے مبالغوں اور استعاروں سے فساد عقیدہ کا شبہ ہوتا ہے، اور وہ ناجائز ہیں، چونکہ ان میں مجاز و مبالغہ کا احتمال ہوتا ہے اس لئے محض اس کی بناء پر کسی کو فاسد کہنے میں احتیاط کرنی چاہئے تاوقتیکہ وہ اپنے عقیدے کی خود وضاحت نہ کردے۔

ھذا ما عندی واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۵/۴/۱۳۸۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱۹/۲۹ الف)

(۱) مسئلہ مذکورہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۰۴، و امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۳۸۵

کپڑے میں انبیاء علیہم السلام کی تصویر بنانا

سوال:- محترم جناب مفتی جسٹس تقی عثمانی صاحب (دارالعلوم کورنگی کراچی)

جناب عالی!

محمد فاروق ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کورنگی کراچی میں ایک ڈیزائن کپڑے پر چھپائی پرنٹنگ کے لئے سپرز ٹاورلز پرائیویٹ لمیٹڈ کراچی کی جانب سے آیا، اور سپرز ٹاورلز کے ڈیزائن کے عین مطابق چھاپ کر دے دیا گیا۔ عام طور پر ہم ٹیکنیکل اُمور کے علاوہ (مثلاً کلر میچنگ وغیرہ) پارٹیوں سے موصولہ ڈیزائنز کے دیگر اُمور سے واسطہ نہیں رکھتے، اور کسی غور وخوض کے بغیر آرڈر تکمیل کر دیتے ہیں۔

نادانستہ طور پر اس ڈیزائن کے چھپ جانے کے بعد شکوک وشبہات پیدا ہوئے ہیں، اس ڈیزائن میں چرند پرند، آبی جانور اور کارٹون انسانوں کے انداز میں دو انسانی شکلیں بھی ہیں، اور اس ڈیزائن پر Noahs ark بھی لکھا ہوا ہے۔

یہ ڈیزائن آپ کے سامنے پیش کرنے کے بعد آپ اس بارے میں فتویٰ صادر فرمائیں کہ اگر ہم سے کوئی گستاخی سرزد ہوئی ہو تو جو بھی کفارہ ہے، اور کیا کرنا چاہئے۔ ہم تمام عملہ بصدق دل سے اپنی نادانستہ غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں، اور عہد کرتے ہیں کہ آئندہ ہر ممکن احتیاط سے کام لیں گے۔

محمد احمد علی خان

جواب:- کسی جاندار کی تصویر بنانا بذاتِ خود ایک ناجائز کام ہے، بالخصوص کسی پیغمبر کی خیالی تصویر بنانا تو انتہا درجے کی بے ادبی ہے، جس سے ہر مسلمان کو بچنا واجب ہے، اور ایسی بے ادبی پر مشتمل تصویر کو شائع کرکے لوگوں میں پھیلانا مزید وبال کا موجب ہے، لیکن اگر آپ نے واقعۃً نادانستگی میں یہ تصویریں اس طرح چھاپ دیں کہ آپ کو اندازہ نہیں ہوسکا کہ ان میں کیا ہے؟ تو آپ پر مندرجہ ذیل اُمور فوری طور پر واجب ہیں:-

۱- سب سے پہلے صدقِ دل سے اپنے اس عمل پر توبہ واستغفار کریں، اور آئندہ کے لئے اس قسم کے معاملات میں تیقظ اور بیدار مغزی سے کام کرنے کا عہد واہتمام کریں۔

۲- اس کپڑے کا جتنا سٹاک موجود ہو، اس کی پوری رنگائی کرکے ان تصاویر کو مٹا دیں، اور اگر مٹ نہ سکیں تو ان کو جلا دیں۔

۳- اگر بچہ اس عمل سے پرہیز چاہتا ہے جس کے آپ سے پوچھا ہے تو اس کے والدین پر لازم ہے
کہ بچی کو اس سے روکنے کے لئے اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کریں، اور اگر وہ بچی کی سرپرستی سے باز نہ
آئیں تو آپ ان سے براءت کا اظہار و اعلان کریں۔

۴- اس بچے کی چیزوں کی جو اجرت آپ نے وصول کی ہے، وہ مکمل طور پر صدقہ کریں۔

واللہ اعلم
۶/۹/۱۴۱۰ھ

شعر میں غیر اللہ کو خطاب کرنا

سوال:-

لے جلد خبر کہ ہیں بھی تم
سینے میں لگی آگ کی ابلی ہے
کشتی یہ بھنور میں آ پھنسی ہے
لے جلد خبر مریض غم کی
اب اس کا یہ سانس آخری ہے

زید کہتا ہے ایسے کلمات غیر اللہ کے لئے استعمال نہ کرنے چاہئیں جن سے عقائد میں خلل پیدا
ہونے کا اندیشہ ہو، مذکورہ اشعار ایسے ہی ہیں، لیکن عمر اپنے عقائد کی بنا پر ان اشعار کو درست سمجھتا ہے،
کیونکہ عمر نے اپنے مرشد کی وفات کے بعد یہ اشعار کہے۔ اب ان دونوں میں سے کون حق پر ہے،
باطل کے لئے شرعی کیا حکم ہے؟ برائے مہربانی جواب عنایت فرمائیں۔

جواب:- شعر میں بکثرت مجاز و استعارہ کا استعمال ہوتا ہے، اور شاعر بسا اوقات ان اشیاء کو
بھی مخاطب کرتا ہے جو سننے اور جواب دینے کی اہلیت نہیں رکھتیں، مثلاً دریا، پہاڑ وغیرہ، یہ خطاب ذہنی
ہوتا ہے، حقیقی نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اس انداز سے شعر میں غیر اللہ کو خطاب کرے اور مقصد حقیقۃً اس
کے مشکل کشا یا فریاد رس ہونے کا عقیدہ نہ ہو، بلکہ تخیلی طور پر مجاز و استعارۃً خطاب کرنا ہو تو ایسے
اشعار میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر مشرکانہ عقیدے کے ساتھ ایسے اشعار ان کے حقیقی معنی پر اعتقاد
رکھتے ہوئے کہے اور پڑھے جائیں تو حرام ہیں۔ پس مندرجہ بالا اشعار اگر کسی صحیح العقیدہ شخص نے کہے
ہیں تو ان میں کچھ حرج نہیں، البتہ اگر فاسد عقیدے کے ساتھ کہے ہیں تو حرام ہیں، اور عوام میں ایسے

اشعار کی تشہیر بہرصورت منع ہے کہ فسادِ عقیدہ کا اندیشہ ہے۔(۲)

سوال نمبر۲:-

اے رسولِ کبریا فریاد ہے
یا محمد مصطفیٰ فریاد ہے
سخت مشکل میں پھنسا ہوں آج کل
اے میرے مشکل کشا فریاد ہے

زید ان اشعار کو درست مانتا ہے، اور عمر اسے شرک قرار دیتا ہے، قول کس کا درست ہے؟ اور شعر کہنے والے کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب – ان اشعار میں بھی وہی تفصیل ہے جو اوپر بیان کی گئی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲۴؍رمضان ۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۸۶ ۰۳)

قادیانیوں کی عبادت گاہ کو مسجد کہنے کی ممانعت

سوال – قادیانی جماعت کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور کیا قادیانی اپنی مسجد بنا سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ قانوناً وشرعاً کیا حکم ہے؟ اور کیا ایسے فیصلوں کا قانون بنانا درست ہے کہ جس میں قادیانیوں کو اپنی عبادت گاہ مسجد کے نام سے بنانے کی اجازت دی گئی ہو؟

سائل: امام مسجد سبیل، نیوٹاؤن

جواب – مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار، خواہ قادیانی ہوں یا لاہوری بہرحال ملتِ اسلامیہ سے خارج ہیں، اور ان کا دینِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں، اس حقیقتِ واقعی کو ستمبر ۱۹۷۴ء میں آئینی طور پر بھی تسلیم کرلیا گیا ہے، اور اسی غرض کے لئے پاکستان کے دستور میں ایک ترمیم کردی گئی ہے جس پر ملک کے تمام مسلمان متفق ہیں۔

اس ترمیم کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مرزائیوں کو شعائرِ اسلام و مسلمین کے اختیار کرنے

---

(۲) حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں [illegible] محض اظہار شوق واشتیاق ہوتا ہے [illegible] (دیکھئے [illegible] ص ۳۸۵) [illegible] خلوت میں پڑھے [illegible] (محمد تقی [illegible])

سے روکا جائے، خاص طور سے کسی بھی مذہب کی عبادت گاہ اس مذہب کا ایک امتیازی نشان ہوتی ہے، جس سے اس مذہب اور اہل مذہب کی شناخت میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ ''مسجد'' مسلمانوں کی اس عبادت گاہ کا نام ہے جو صرف اور صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے، دوسرے مذہب کے پیروؤں کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ اپنی عبادت گاہ کو ''مسجد'' کا نام دے کر لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنے اور ان کی گمراہی کا باعث ہوں، بالخصوص مرزائیوں کا معاملہ یہ ہے کہ مدت دراز تک اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرکے ناواقف لوگوں کو فریب دیتے رہے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر انہیں ''مسجد'' کے نام سے اپنی عبادت گاہ تعمیر کرنے یا اسے اس نام پر برقرار رکھنے کی اجازت دی جائے تو اس کا صریح نتیجہ عام مسلمانوں کے سخت فریب میں مبتلا ہونے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا، اور پاکستان جیسی اسلامی مملکت میں یہ فریب گوارا نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا احقر کی رائے میں وہ تمام فیصلے جن میں قادیانیوں یا لاہوریوں کو ''مسجد'' کے نام سے عبادت گاہ بنانے کی اجازت دی گئی ہے، قرآن و سنت، شریعت اسلامی اور مصالح مسلمین کے یکسر خلاف ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۸/۱۰/۱۳۹۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۳۳/۳۰ و)

احقر اس تحریر کی تصدیق و تائید کرتا ہے

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۸/۹/۱۳۹۹ھ

حیات انبیاء علیہم السلام، حیات عیسیٰ علیہ السلام اور سماع موتیٰ سے متعلق مختلف سوالات

سوال ۱:- حیات انبیاء کے بارے میں احادیث صحیحہ کیا فرماتی ہیں؟ کیا انبیاء قبر میں کسی دنیوی حیات سے زندہ ہیں اور روح مقام رفیق اعلیٰ میں ہے؟ کیا جسد کے ساتھ انبیاء قبروں میں نماز پڑھتے ہیں؟ کیا اسی جسد کے ساتھ پڑھتے ہیں یا جسد مثالی کے ساتھ؟ نیز حیات انبیاء کا منکر شریعت میں کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب:- آپ کے سوالات کے مختلف جوابات اہل علم نے دیے ہیں، لیکن ان مسائل پر تدقیقات میں پڑنا درست نہیں، ان سوالوں کے جواب پر دین کا کوئی عملی حکم موقوف نہیں ہے، نہ ان کی تحقیق کا ہمیں مکلف کیا گیا ہے، لہٰذا اپنے وقت کو ان مسائل کو معلوم کرنے میں صرف کرنا چاہئے جن کا براہ راست تعلق عملی زندگی سے ہے، حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من حسن اسلام

[illegible]

المرء ترکہ ما لا یعنیہ"[1] اس تمہید کے بعد مختصر جوابات لکھے جاتے ہیں، مگر ان پر بحث، تعمق کا دروازہ نہ کھولا جائے۔

ا:- انبیاء علیہم السلام کی حیات، حیاتِ برزخی ہے، لیکن یہ حیاتِ برزخی عام مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے، اس میں روح کا رشتہ جسد کے ساتھ اتنا زیادہ قوی رہتا ہے کہ اسے حیاتِ دنیویہ کے ساتھ بہت قرب ہے، اور اسی بنیاد پر ان پر حقیقتاً احیاء کا اطلاق کیا جاتا ہے، اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، نہ ان کی ازواجِ مطہرات سے بعد میں کوئی نکاح کر سکتا ہے، اب یہ تعلق کس درجے کا ہے؟[2] اس کا ٹھیک علم اللہ ہی کو ہے، اور ہمیں اس کو جاننے کی کوشش اور فضول تحقیق کی ضرورت نہیں، اور انبیاء کا قبر میں نماز پڑھنا بظاہر اجساد کے ساتھ ہی ہے۔[3]

س۲:- معراج کی رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور تخفیفِ نماز کے بارے میں گفتگو صرف رُوح سے ہوئی تھی یا رُوح مع الجسد سے؟

ج۲:- احادیث میں اس کی تصریح نہیں ہے، لیکن الفاظ سے ظاہر یہی ہے کہ جسد کے ساتھ ہوئی تھی۔

س۳:- شبِ معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا معاملہ تمام انبیاء کے ساتھ مسجدِ اقصیٰ میں صرف رُوحوں کے لئے ہوا تھا یا کہ رُوح مع الاجساد تھے؟

ج۳:- اس کی بھی روایات میں تصریح نہیں ہے، بظاہر اجساد کے ساتھ ہی ہے، واللہ اعلم۔

س۴:- حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بقیدِ حیات ہیں، کیا اس نماز میں مع الجسد شریک ہوئے تھے یا صرف رُوح نے شرکت فرمائی تھی؟

---

(۱) جامع الترمذی ابواب الزہد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ج ۲ ص ۵۵ (طبع فاروقی کتب خانہ)

(۲،۳) وفی شفاء السقام للسبکیؒ ص ۱۸۰ (طبع مکتبہ نوریہ رضویہ). ولحیاۃ الأنبیاء بعد موتہم شواہد من الحدیث لتصحیحہ وفی الصحیح بالامام مسلم ج ۲ ص ۲۶۸ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اتیت -وفی روایۃ ھداب- مررت علی موسی لیلۃ أسری بی عند الکثیب الأحمر وھو قائم یصلی فی قبرہ [illegible] الوجود کلہ من واحد یسلم علیہ فی لیل ونھار ونحن نؤمن ونصدق بانہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یرزق فی قبرہ وان [illegible] صلاۃ فی قبورھم. واستدل بذلک ما تقدم وبحدیث انس رضی اللہ عنہ الأنبیاء أحیاء فی قبورھم یصلون ... الخ. وقال العلامۃ السبکیؒ فی شفاء السقام ص ۱۹۰ (طبع مکتبہ نوریہ رضویہ) وھی ثابتۃ للروح بلا اشکال والجسد ... فان الصورۃ [illegible] حیاۃ حقیقیۃ ان تکون الأبدان معہا کما کانت فی الدنیا من الاحتیاج الی الطعام والشراب ... وغیر ذلک من صفات [illegible] احکام القرآن للعلامۃ التھانوی رحمہ اللہ تعالی (ج ۳ ص ۱۴۰) ورد المحتار ج ۳ ص ۱۵۱۔

ج۴:- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسد و روح دونوں کے ساتھ زندہ ہونا قرآن کریم میں مصرح ہے،(۱) اس لئے ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مع الجسد واقع ہوئی۔

س۵:- عام مسلمانوں کو جب قبر میں دفنایا جاتا ہے اس کے بعد ان کی قبر پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے، کیا وہ سنتے ہیں؟ نفی کی صورت میں ان احادیث کا کیا جواب ہوگا جن میں ثبوت ہے؟

ج۵:- اصل یہ ہے کہ مردوں میں موت کے بعد سننے کی طاقت نہیں ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں تصریح ہے،(۲) لیکن جس وقت اللہ تعالیٰ کسی مصلحت سے انہیں کوئی آواز سنانا چاہے تو سنا دیتا ہے، حدیث میں جو جوتیوں کی آواز سننے کا ذکر ہے وہ اسی پر محمول ہے کہ اللہ تعالیٰ عبرت کے لئے اس کو آواز سنا دیتا ہے۔(۳)

س۶:- قبر سے کیا مراد ہے؟ کیا وہی گڑھا جس میں میت کو دفنایا جاتا ہے یا کوئی اور؟ عذاب قبر کہاں ہوتا ہے؟ منکرین کا سوال و جواب کہاں ہوتا ہے؟

ج۶:- قبر سے وہی قبر مراد ہے جس میں مردے کو دفن کیا گیا ہو، منکرین کے سوال کے وقت روح کو دوبارہ جسد میں داخل کیا جاتا ہے،(۵) اور پوری حقیقت حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔

س۷:- سماع موتیٰ میں صحابہ کرام کا اختلاف ہے، جمہور صحابہ کی رائے اثبات میں ہے یا نفی میں؟ امام ابوحنیفہ کی رائے کیا ہے؟

---

(۱) قال الله تعالى: يا عيسى إني متوفيك ورافعك إلي [illegible] وما قتلوه وما صلبوه ولكن شبه لهم [illegible]

(۲) قال الله تعالى: فإنك لا تسمع الموتى [illegible] (سورة الروم: ۵۲)

(۳، ۴) "إن الله يسمع من يشاء وما أنت بمسمع من في القبور" (سورة فاطر: ۲۲) وفي أحكام القرآن ج: ۳ ص: ۲۳ [illegible] وفي الصحيح للبخاري باب الميت يسمع خفق النعال ج: ۱ ص: ۱۷۸ (طبع قديمي كتب خانه) عن أنس رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: العبد إذا وضع في قبره وتولى وذهب أصحابه حتى إنه ليسمع قرع نعالهم أتاه ملكان الحديث. وفيه أيضًا ج: ۱ ص: ۱۸۳ (طبع مذكور) عن نافع أن ابن عمر أخبره قال: اطلع النبي صلى الله عليه وسلم على أهل القليب فقال: وجدتم ما وعد ربكم حقًا؟ فقيل له: تدعو أمواتًا؟ فقال: ما أنتم بأسمع منهم ولكن لا يجيبون. وعن عائشة رضي الله عنها قالت: إنما قال النبي صلى الله عليه وسلم: إنهم ليعلمون الآن أن ما كنت أقول لهم حق، وقد قال الله تعالى: "إنك لا تسمع الموتى". وفي أحكام القرآن للعلامة التهانوي رحمة الله عليه (ج: ۳ ص: ۲۳) قوله [illegible] وفيه أيضًا ج: ۳ ص: ۲۵ [illegible] على ذلك يعني سماعهم في الحكمة هو الحق الحقيق بالقبول، وإليه يرشد صيغة القرآن وشأن النزول [illegible]

(۵) وفيه أيضًا ج: ۳ ص: ۱۸ مذهب أهل السنة والجماعة أن أرواح الموتى ترد في بعض الأوقات من العليين أو من سجين إلى أجسادهم في قبورهم عند إرادة الله تعالى وخصوصًا ليلة الجمعة ويجلسون ويتحدثون ويتنعم أهل النعيم ويعذب أهل العذاب [illegible]

ج۷ - امام ابوحنیفہؒ کی رائے صحیح قول کے مطابق وہی ہے جو نمبر ۵ میں لکھی گئی۔

س۸ - عام مسلمانوں کی قبر پر قرآن خوانی بامعاوضہ جائز ہے یا نہیں؟ جائز ہونے کی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ کا کوئی عمل، جس کا ذکر حدیث میں ہو۔

ج۸ - ایصالِ ثواب کے لئے قبر پر قرآن خوانی جائز ہے بشرطیکہ کسی دن کی تخصیص نہ ہو اور اس پر کوئی معاوضہ طے نہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

جواب حق

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۴۹ الف)

"اسلامی سوشلزم" سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی شرعی حیثیت

سوال :- اسلامی سوشلزم کیا ہے؟ اور کیا موجودہ حالات میں اس کو قبول کرنا ہمارے لئے درست ہے؟

قاضی نذیر احمد سونڈ ضلع ٹھٹھہ

جواب :- کچھ عرصے سے ہمارے معاشرے میں یہ وبا چل نکلی ہے کہ مغرب سے آئے ہوئے ہر غلط یا صحیح نظریے کے ساتھ صرف "اسلامی" کا نام لگا کر اسے بزعم خود "مشرف بہ اسلام" کر لیا جاتا ہے، پھر اس کی تبلیغ شروع کردی جاتی ہے، اسلامی سوشلزم کا نعرہ بھی یہی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور سوشلزم زندگی کے دو بالکل مختلف نظام ہیں، جن میں مطابقت ممکن نہیں، سوشلزم درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام کی ہلاکت آفرینیوں کا ایک جذباتی ردعمل ہے، جو بجائے خود اتنا ہی مضر اور خطرناک ہے جتنا سرمایہ دارانہ نظام، سوشلزم کی بنیاد انفرادی ملکیت کے انکار پر ہے، سرمایہ دارانہ نظام میں غریبوں کے خون چوسنے کا جو طوفانِ عظیم بپا کیا، اس سے متاثر ہوکر سوشلزم کے علمبرداروں نے انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کردیا، حالانکہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوا کہ چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہوگئے، اور ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آگیا جو پوری مستبد طاقت کے ساتھ دولت کے ایک بڑے ذخیرے سے کھیلتا ہے، رہا بیچارہ مزدور، سو وہ سوشلزم میں بھی اتنا ہی بے بس ہے جتنا سرمایہ داری میں تھا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے سرمایہ داری کی خرابیوں کا علاج انفرادی ملکیت کا خاتمہ نہیں ہے، بلکہ انفرادی ملکیت کی خودغرضی اور بے لگامی کو ختم کرنا ہے، چنانچہ اسلام میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن سود کی حرمت اور زکوٰۃ، صدقات، نفقات، کفارات، عشر و خراج اور وراثت وغیرہ کے احکام کے ذریعہ اس نے اس ملکیت کو حدود کا پابند بنادیا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ سیکولرزم کی بنیاد جس نظریے پر قائم ہے، اسلام اس بنیاد ہی کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے دونوں میں کسی قسم کی مصالحت کا کوئی امکان نہیں۔ اسلام سیکولرزم نہیں بن سکتا، اور سیکولرزم اسلام نہیں کہلا سکتا، لہٰذا ”اسلامی سیکولرزم“ کا نعرہ ایک مہمل نعرہ ہے، جو دونوں معاشی نظاموں یا اسلام اور سیکولرزم کی بنیادی حقیقت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ پاکستان میں ہماری ضرورت ”اسلام“ ہے، ”سیکولرزم“ نہیں۔

واللہ اعلم
۲۰ رشوال ۱۴۱۷ھ (۱)

کیا جنت میں کفار داخل ہوسکتے ہیں؟

سوال:- آج کل بعض لوگوں کا ذہن اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ صرف مسلمان ہی جنت میں جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اگر اچھے کام کرتا ہے تو جنت کا مستحق ہے۔ واضح رہے کہ یہ خیالات میرے عقیدے میں شامل نہیں ہیں، میں صرف اسلام کو سچا مذہب مانتا ہوں، لیکن بہتر ہو کہ ایسے لوگوں کے شبہات کا ازالہ ”البلاغ“ کے ذریعہ کردیا جائے۔

جواب:- ان لوگوں کا یہ شبہ درحقیقت ایک بنیادی بات کو ذہن میں نہ رکھنے کا نتیجہ ہے، اور وہ یہ کہ اس کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے؟ اور جنت وجہنم کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ یہ دنیا ایک ”دارالامتحان“ ہے، جنت اس امتحان کی کامیابی کا صلہ ہے، دوزخ ناکامی کی سزا ہے، اور ”ایمان“ اس امتحان میں کامیابی کی بنیادی شرط اور وہ ”لازمی سوال“ ہے، جسے حل کئے بغیر کوئی شخص کامیاب نہیں ہوسکتا، اس لئے جنت کا حصول ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔

دنیا میں روزمرہ کے امتحانات سے ہمارا سابقہ رہتا ہے، ان پر ہی اگر آپ غور فرمائیں تو واضح طور سے نظر آئے گا کہ ہر امتحان میں کچھ سوالات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اور ممتحن ان سوالات کو کامیابی کا مدار سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے سوالات ہوتے ہیں جنہیں حل نہ کرنے سے کامیابی کے درجے میں تو کمی ہو جاتی ہے، مگر وہ کامیابی اور ناکامی کے لئے فیصلہ کن نہیں ہوتے۔ اب اگر کوئی شخص پہلی قسم کے لازمی سوالات کو بالکل چھوڑ دے یا انہیں بالکل غلط طریقے سے حل کرے، اور دوسری قسم کے ضمنی سوالات کو ٹھیک طریقے سے حل کرے تو آپ خود ہی سوچئے کہ وہ شخص کامیاب ہوگا یا ناکام رہے گا؟ کوئی معقولیت پسند انسان ایسے شخص کو کامیاب قرار نہیں دے سکتا، اس لئے کہ اس نے سب سے بنیادی سوالات کو بالکل حل نہیں کیا۔ جو شخص اسلام کے بنیادی عقائد، توحید، رسالت، آخرت

---

(۱) [illegible]

وغیرہ پر ایمان نہیں رکھتا، اور ساتھ ہی کچھ اچھے کام بھی کرتا ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے۔

اسی بات کو ایک دُوسرے طریقے سے بھی سمجھ لیجئے، دنیا میں بہت سی چیزیں اپنی ذات کے اعتبار سے مفید ہوتی ہیں، لیکن کوئی دُوسری خراب چیز ان کے ساتھ مل کر ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ دُودھ، گھی، مکھن اپنی ذات کے اعتبار سے کتنی مقوی غذائیں ہیں، لیکن اگر ان کے ساتھ سنکھیا ملادیا جائے تو یہی چیزیں مہلک بن جاتی ہیں۔ انسان کے اعمال و افعال کا بھی یہی حال ہے، کسی غریب کی روپے پیسے کے ذریعہ امداد کرنا کتنا مستحسن کام ہے، لیکن اگر اس سے مقصد محض دکھاوا اور نام ونمود ہو تو یہ نیکی دُنیوی نقطۂ نظر سے بھی اکارت ہوجاتی ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد یہی ہے کہ ”کفر“ وہ زہر ہے جو انسان کے تمام نیک اعمال کو اکارت کردیتا ہے، یہ اعمالِ خیر اگر ایمان کے ساتھ ہوں تو انسان کے درجات میں ترقی کا سبب بنتے ہیں، اور ان سے اس کی آخرت سنورتی ہے، لیکن اگر ان کے ساتھ کفر مل جائے تو وہ ان کو اسی طرح بیکار کردیتا ہے جیسے سنکھیا، دُودھ اور گھی کو، جو شخص خدا کا یا اس کی وحدانیت کا منکر ہو، اس کے رسولوں کو (معاذ اللہ) جھوٹا کہتا ہو اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کو من گھڑت بتاتا ہو، اور اس کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی کا سرے سے انکار کرتا ہو، اور اس قدر سنگین جرائم کے بعد وہ کوئی اچھا کام بھی کرے تو اسے مستحق انعام قرار دینے میں آخر کیا معقولیت ہے؟ فرض کیجئے کہ ایک نہایت خوش اخلاق، مخلص اور ذہین شخص ہے جو اپنی مبنی برانصاف حکومت کے خلاف بغاوت کی سازش کرتا ہے، اس کے دُشمنوں سے مل کر ان کی مدد کرتا ہے، اس کے قانون کی کھلم کھلا توہین کرتا ہے، تو کیا محض اس کی خوش اخلاقی اس کو ان سنگین جرائم سے بری کرسکے گی؟ اور اگر حکومت اس کو موت کی سزا دے تو کیا کوئی انصاف پسند انسان حکومت کے اس فیصلے کو ظلم قرار دے سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں! اس کا جرم اتنا سنگین ہے کہ اس کی موجودگی میں اس کی خوش اخلاقی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

اب آپ خود سوچ لیجئے کہ جو شخص خدا کا، اس کے رسولوں کا، اس کی کتابوں کا اور اس کے قوانین کا باغی ہو، اسے محض اس کی خوش اخلاقی کی بناء پر جنت کا مستحق کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے؟[۱]

واللہ سبحانہ اعلم

۲۲؍شوال ۱۳۸۷ھ[۲]

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج ۴ ص ۳۴۷

(۲) یہ فتویٰ ماہنامہ البلاغ شمارہ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

وحدت الوجود کا مطلب

سوال:- وحدت الوجود کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ عقیدہ کہاں تک درست ہے؟

جواب:- وحدۃ الوجود کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں حقیقی اور مکمل وجود صرف ذات باری تعالیٰ کا ہے، اس کے سوا ہر وجود بے ثبات، فانی اور نامکمل ہے۔ ایک تو اس لئے کہ وہ ایک نہ ایک دن فنا ہوجائے گا، دوسرے اس لئے کہ ہر شے اپنے وجود میں ذات باری تعالیٰ کی محتاج ہے، لہٰذا جتنی اشیاء ہمیں اس کائنات میں نظر آتی ہیں، انہیں اگرچہ وجود حاصل ہے، لیکن اللہ کے وجود کے سامنے اس وجود کی کوئی حقیقت نہیں، اس لئے وہ کالعدم ہے۔

اس کی نظیر یوں سمجھئے جیسے دن کے وقت آسمان پر سورج کے موجود ہونے کی وجہ سے ستارے نظر نہیں آتے، وہ اگرچہ موجود ہیں، لیکن سورج کا وجود ان پر اس طرح غالب ہوجاتا ہے کہ ان کا وجود نظر نہیں آتا۔

اسی طرح جس شخص کو اللہ نے حقیقت شناس نگاہ دی ہو وہ جب اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے وجود کی معرفت حاصل کرلے تو تمام وجود اسے ہیچ، ماند، بلکہ معدوم نظر آتے ہیں، بقول حضرت مجذوب:

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

"وحدت الوجود" کا یہ مطلب صاف، واضح اور درست ہے، اس سے آگے اس کی جو فلسفیانہ تعبیرات کی گئی ہیں، وہ بڑی نازک ہیں، اور اگر ان میں غلو ہوجائے تو ان کی سرحدیں کفر تک سے جاملتی ہیں۔ اس لئے ایک مسلمان کو بس سیدھا سادا یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ کائنات میں حقیقی اور مکمل وجود اللہ تعالیٰ کا ہے، باقی ہر وجود نامکمل اور فانی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ

مسئلہ عصمت انبیاء علیہم السلام

سوال ۱:- عصمت انبیاء علیہم السلام ضروریات دین سے ہے یا نہیں؟

۲:- کیا انبیاء علیہم السلام کو نبوت سے قبل ہی عصمت حاصل ہوتی ہے یا نبوت ملنے کے بعد ہوا کرتی ہے؟

جواب ۱:- عصمت انبیاء علیہم السلام ضروریات دین سے ہے، اور ان سے کسی وقت بھی یہ صفت

[illegible]
[illegible]

جد نہیں ہوتی، ان کی جن لغزشوں کا ذکر قرآن کریم وغیرہ میں آیا ہے، وہ سب خلافِ اولیٰ باتیں تھیں[1] جو شرعاً معصیت نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کی جلالتِ قدر کی وجہ سے ان پر بھی تنبیہ کی گئی۔[2]

۳- صحیح یہ ہے کہ نبوت سے قبل بھی انبیاء سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔[3]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۲/۲/۱۳۸۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۰/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

بلا تحقیق مسئلہ بیان کرنا

سوال — کوئی شخص بدون تحقیق کے مسئلہ بیان کرے اور مسائل شرعیہ کو غلط [illegible] اور [illegible] تعالیٰ نے جو حصہ وارثوں کے لئے قرآن مجید میں مقرر فرمایا ہے [illegible] دادی کا [illegible] اور کسی عالم کو کافر کہے اور اس عالم کی ہر طرح آبرو ریزی کرے، غیبت [illegible] مسلمانوں میں تفرقہ [illegible] مسجد میں فساد [illegible] فتنہ [illegible] ایسے شخص کے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟ اور مسجد میں داخل ہونا [illegible] اور جو کوئی [illegible] تائید کرے ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟

جواب — ایسا شخص فاسق ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اسے نرمی سے سمجھائیں اور اگر نہ مانے تو اس سے بیزاری کا اظہار کریں، فرائض کے بارے میں وہ جو یہ کہتا ہے کہ: "دادی کا مسئلہ ہے" تو اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، اور اس کے مسجد میں داخل ہونے پر پابندی کا معاملہ [illegible] پر موقوف ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

[illegible] ۱۳[illegible]ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱ تا ۳) قال فی شرح الفقه الاکبر ص [illegible]: والمختار عند جمهور اهل السنة لعصمة عن ای عن الصغائر والکبائر [illegible] [illegible] قبل الوحی وبعده بالاجماع وکذا عن تعمد الکبائر عند الجمهور [illegible]

کسی انجمن کے رُکنیت فارم میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانے کا حکم

سوال:- ایک انجمن کے رکنیت فارم کی عبارت مندرجہ ذیل ہے، کیا اس میں سے کوئی شق پورا نہ ہونے پر ممبر گناہگار ہوگا یا نہیں؟ اور گناہ کیسا ہوگا؟ بینوا توجروا۔

میں اللہ رب العزت اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ کر کے اقرار کرتا ہوں کہ مجھے بزم ہذا کے اغراض و مقاصد سے پورا پورا اتفاق ہے، اور میں بزم کی فیس مستقل ادا کرتا رہوں گا، اور میں دوسرے کو رکنیت کی رغبت دوں گا اور بزم ہذا کو مستحکم بنانا اپنا فرض عین سمجھوں گا، تبدیلیٔ رہائش سے آگاہ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس عہد کو وفا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جواب:- پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کوئی عہد کرنا تو صحیح ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کر عہد کرنا درست نہیں، کیونکہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے،[1] اور کوئی نبی یا ولی اس کا شریک نہیں، لہٰذا معاہدے کے مذکورہ بالا الفاظ میں ترمیم کرنی ضروری ہے۔ اس کے بعد جو شخص یہ معاہدہ کر کے فارم بھر دے گا اس پر اس عہد کی پابندی اس وقت تک لازم ہوگی جب تک وہ اس عہد سے دستبردار ہونے کا واضح اعلان نہ کر دے، اس دوران دونوں میں سے کسی بات کی خلاف ورزی کرے گا تو گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، کیونکہ عہد کر کے اس کو پورا نہ کرنا گناہِ کبیرہ ہے، لقوله تعالى "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ"[2]۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۵۴/۲۷ د)

کیا قیامت کے دن جانوروں کا بھی محاسبہ ہوگا؟ کیا جنت میں عورتوں کو رؤیت باری ہوگی؟

سوال ۱:- قیامت کے دن جب انسانوں کو حساب و کتاب کے لئے کھڑا کیا جائے گا تو کیا جن و انس کے علاوہ جانوروں کو بھی اٹھایا جائے گا یا نہیں؟ حدیث میں سینگ والی بکری سے گنجی بکری کا بدلہ لینے کا ذکر آتا ہے۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ قیامت کے دن تمام جانوروں کو حساب وغیرہ کے

---

(1) "وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ" (الحديد ۴) "مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَىٰ مِن ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا" (المجادلة ۷)

(2) سورة المائدة ۱

لئے اٹھایا جائے گا، ایک صاحب جو عالم اور فاضل ہیں کہتے ہیں کہ "قرآن وسنت سے صرف انسان کا مکلف ہونا معلوم ہوتا ہے، اس لئے ان کے علاوہ کسی اور مخلوق کا حساب وکتاب کے لئے اٹھائے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ حدیث قابلِ تاویل ہے۔"

جواب ۱- جانوروں کا ایک دوسرے سے بدلہ لینا بعض احادیث سے ثابت ہے اور یہ غیر مکلف ہونے کے منافی نہیں ہے،(۱) صرف مظالم کا حساب لے لیا جائے تو یہ بھی مستبعد نہیں، لیکن حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، اور چونکہ اس مسئلے کا تعلق انسان کے عمل سے نہیں ہے اس لئے اس کی بحث وتدقیق میں پڑنا فضول ہے۔

س۲- جنت میں جیسے مردوں کو رؤیت باری ہوگی، کیا اسی طرح عورتوں کو بھی ہوگی؟ اس ضمن میں ایک صاحب کی رائے یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کو اکٹھے رؤیت نصیب ہوگی اور پردہ کا وہاں حکم نہ ہوگا، کیونکہ پردہ صرف دُنیا کے لئے ہے۔ دوسرے صاحب کی رائے یہ ہے کہ جنت میں بھی پردہ ہوگا، اور عورتوں کو رؤیت باری تعالیٰ نصیب نہ ہوگی، اور اگر ہوگی تو مردوں کے ساتھ نہ ہوگی۔

ج۲- اکثر حضرات علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ رؤیت عورتوں کو بھی ہوگی، جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے تصریح فرمائی ہے۔ باقی اس کی تفصیلات اللہ ہی جانتا ہے، اس قسم کی بحثوں میں پڑنے کے بجائے عملی مسائل معلوم کرنے میں وقت صَرف کیجئے۔

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۸/۵/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۹۳۱ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی تفسیر رُوح المعانی (ج ۳۰ ص ۵۱) تحت الآیة "وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ" ولا یحشر للقیامة غیر الثقلین وقیل بعثت للقصاص فتحشر کل شیء حتی الذباب، وروی ذلک عن ابن عباس ایضاً وعن قتادة وجماعة وفی روایة عن الحبر تحشر الوحوش حتی یقتص من بعضها لبعض فیقتص للجماء من القرناء ثم یقال لها موتی فتموت، وقیل [illegible] وفیه ایضاً بعد سطر ج ۳۰ ص ۵۱، ۵۲ فقد اخرج مسلم والترمذی عن ابی هریرة فی هذه الآیة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لتؤدن الحقوق الی اهلها یوم القیامة حتی یقاد للشاة الجلحاء من الشاة القرناء. اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ [illegible] آیت کے تحت معارف القرآن ج ۸ ص ۶۵۹ میں تحریر فرماتے ہیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کذا فی روح المعانی ج ۳۰ ص ۲۲

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے [illegible] اعتقاد اهل السنة والجماعة للامام [illegible] اللالکائی ج ۳ ص ۵۰۳ تا ۵۰۸۔

عقیدۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سوال: [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] قرآن [illegible]

[illegible] وفات [illegible] حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]

جواب: [illegible]

[illegible]

[illegible] برزخی زندگی [illegible] کہ انسان کی روح کا [illegible] تعلق [illegible] یہ تعلق عام انسانوں میں بھی ہوتا ہے، مگر اتنا کم کہ اس کے [illegible] انبیاء [illegible] میراث تقسیم نہیں ہوتی اور ان کے ازواج کا نکاح بھی دوسرا نہیں ہو سکتا [illegible] قرآن کریم میں ہے [illegible] ان کی ارواح کا تعلق سب سے زیادہ ہوتا ہے، اس لئے شہداء کی طرح انہیں بھی [illegible] جیسی انہیں موت سے پہلے حاصل تھی [illegible] قرآن و سنت [illegible]

[illegible]

لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون (البقرۃ ۱۵۴)

۲ ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا (الاحزاب ۵۳)

شیخ احمد کے مروّجہ وصیت نامہ کا حکم

سوال:- جو اشتہار بھی بعض لوگ شائع کرتے ہیں، یعنی وہ معروف وصیت نامہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کے خادم کی طرف منسوب ہوتا ہے، اس میں جو کچھ تحریر ہے وہ درست ہے یا نہیں؟ مثلاً جو اس کو پڑھے گا وہ اس کو شائع کرے، اگر ایسا نہیں کرے گا تو نقصان اُٹھائے گا، انکار کرنے والا سخت عذاب میں مبتلا ہوگا، جو پڑھ کر شائع نہ کرے مسلمان نہ رہے گا۔

جواب:- منسلکہ وصیت نامہ میں بنیادی طور سے جو بات کہی گئی ہے کہ مسلمان اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور شریعت کے احکام کے مطابق زندگی گزاریں، وہ بالکل صحیح اور دُرست ہے۔ اس کی جتنی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے بہتر ہے، لیکن پڑھنے والے کے ذمہ خاص تعداد میں بعینہ اسی وصیت نامہ کو شائع کرنے کو لازمی قرار دینا، اور جو نہ کر سکے اس کو نقصان کی دھمکی دینا شرعاً اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۹۰/۱۸ الف)

یہ وصیت نامہ سالہا سال سے شائع ہوتا رہتا ہے، جس کو تقریباً ۹۰ سال گزر چکے ہیں، کسی شخص نے خود ہی بنالیا ہے، روضۂ اطہر کا کوئی خادم شیخ احمد نامی نہیں ہے، نہ اس وقت تھا جب یہ وصیت نامہ پہلی بار شائع ہوا تھا، اُس وقت علماء نے تحقیق کی تھی، لہٰذا مسلمان اس کی کوئی پرواہ نہ کریں۔

محمد [illegible] عفی عنہ

جب جنت میں شیطان نہیں جا سکتا تو اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا کیسے دیا؟

سوال:- جنت کے اندر تو شیطان نہیں جا سکتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا پھر کیسے دیا؟ اور دھوکا صرف آدم علیہ السلام کو دیا یا آدم و حوا علیہما السلام دونوں کو دیا؟ اور پہلے کس کو دیا؟

جواب:- قرآن کریم میں صراحت ہے کہ شیطان نے وسوسہ ڈالا،(۱) اور اس کام کے لئے جنت میں جانا کیا ضروری تھا؟

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۲۰۳ ب)

---

(۱) "فوسوس لهما الشيطن" الآية (سورة الأعراف: ۲۰)

﴿فصل فی کلمات الکفر وأفعال الکفر وما یکون کفرًا وما لا یکون کفرًا﴾

(کفریہ وغیر کفریہ کلمات اور افعال سے متعلق مسائل کا بیان)

موسیقی سننے والے کو کافر کہنا

سوال ۱:- کیا میراثی، گانا گانے والے کافر ہیں؟

۲- اگر نہیں تو ہمارے ہاں ایک صاحب انہیں کافر کہتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

جواب ۱:- آلاتِ موسیقی میں مشغولیت سخت گناہ ہے، حدیث میں اس پر شدید وعید آئی ہے، لہٰذا ہر مسلمان کو اس سے بچنا لازم ہے، لیکن اس گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہوتا تاوقتیکہ اس کے عقائد کفریہ نہ ہوں۔(۱)

۲- جن صاحب نے میراثیوں کو کافر کہا ہے، انہوں نے سخت غلطی کی، انہیں توبہ و استغفار کرنا چاہئے۔(۲)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

کسی کافر ملک کا ویزا حاصل کرنے کے لئے ویزا فارم میں اپنے آپ کو قادیانی لکھنے کا حکم

سوال:- خدا کرے حضرت بعافیت کام ہوں، ان دنوں یہ مسئلہ زیرِ غور ہے کہ بعض مسلمان کسی کافر ملک کا ویزا سہولت سے حاصل کرنے کے لئے یا کسی اور دنیاوی مصلحت کے لئے پاسپورٹ اور ویزا کے فارم میں اپنے آپ کو قادیانی لکھ دیتے ہیں۔ اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ یہ انتہائی قبیح حرکت اور بڑا گناہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے شخص کی تکفیر کی جائے گی یا نہیں؟ یہاں دار الافتاء میں

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی کتاب "اسلام اور موسیقی"۔

(۲) وفی مشکوٰۃ المصابیح باب حفظ اللسان والغیبۃ والشتم ج ۲ ص [illegible] رقم الحدیث [illegible] طبع قدیمی کتب خانہ، سباب المسلم فسوق وقتاله کفر. وفی جامع الترمذی ج ۲ ص ۸۹ طبع فاروقی کتب خانہ عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال أیما رجل قال لأخیه کافر فقد باء بها أحدهما. هذا حدیث صحیح.

اس سلسلے میں استفتاء بھی آیا ہوا ہے، اس سلسلے میں غور کرنے سے جو نقطۂ نظر سامنے آیا ہے اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔ آخر میں چند متعلقہ عبارات بھی ذکر کردی گئی ہیں، جناب سے درخواست ہے کہ اپنی رائے گرامی سے مطلع فرمائیں۔

۱- کسی کلمے کے موجبِ کفر ہونے، نہ ہونے میں اختلاف ہو تو احتیاط عدمِ تکفیر میں ہوتی ہے۔

۲- جو کلمہ فی نفسہ موجبِ کفر ہو اس کے تلفظ و تکلم کی کئی صورتیں ہیں۔

۱- نسیاناً یا خطأً تکلم ہو، اس صورت میں بالاتفاق تکفیر نہیں کی جائے گی۔

۲- عمداً تکلم ہو، معلوم ہوتا ہے کہ عمد سے مراد یہ ہے کہ تکلم کا قصد بھی ہو، اس کلمے کے موجبِ کفر ہونے کا علم بھی ہو اور کفر کا ارادہ بھی ہو، اس صورت میں بالاتفاق تکفیر کی جائے گی۔

۳- جاہلاً تکلم ہو، یعنی تکلم تو ارادے سے ہو، مگر یہ معلوم نہ ہو کہ اس سے آدمی کافر ہوجاتا ہے، اس صورت میں اختلاف ہے، تکفیر و عدمِ تکفیر دونوں قول ہیں۔

۴- ہازلاً تکلم ہو، یعنی تکلم تو ارادے سے ہو اور اس کے موجبِ کفر ہونے کا علم بھی تھا، مگر ایقاعِ حکم یعنی کفر کا ارادہ نہیں تھا، اس صورت میں تکفیر کی جاتی ہے۔

۵- لاعباً تکلم ہو، یعنی بطورِ استہزاء کے کلمۂ کفر کہا جائے، یہ استخفافِ ایمان ہے اور اس کی بھی تکفیر کی جاتی ہے۔

اس تفصیل کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے آپ کو قادیانی لکھتے ہوئے اگر علم ہو کہ یہ باعثِ کفر ہے، لیکن اعتقادِ کفر نہ ہو تو یہ لاعباً یا ہازلاً تکلم قرار پائے گا اور اس صورت میں تکفیر ہوگی، اور اگر موجبِ کفر ہونے کا علم نہ ہوتے ہوئے لکھا گیا ہے تو اختلاف کی بناء پر احتیاط اس میں ہے کہ تکفیر نہ کی جائے۔

چند عبارات یہ ہیں:-

فی البحر وفی فتح القدیر ومن ھزل بلفظ کفر ارتد وان لم یعتقدہ للاستخفاف، فھو ککفر العناد والألفاظ التی یکفر بھا تعرف فی الفتاوی اھ (ج ۵ ص ۱۲۰ طبع ایچ ایم سعید)

وفی الفتاوی الخیریة وفی الفتاوی اذا أطلق الرجل کلمة الکفر عمدًا لکنه لم یعتقد الکفر قال بعض أصحابنا: لا یکفر لأن الکفر یتعلق بالضمیر ولم یعقد الضمیر علی الکفر وقال بعضھم: یکفر، وھو الصحیح عندی، لأنه استخف بدینه اھ وفی الخلاصة اذا کان فی المسئلة وجوہ توجب التکفیر ووجه واحد یمنع التکفیر، فعلی المفتی أن یمیل الی الوجه الذی یمنع التکفیر تحسینًا للظن بالمسلم، زاد فی البزازیة الا اذا صرح بارادته موجب الکفر فلا ینفعه التأویل حینئذ وفی التاترخانیة لا یکفر بالمحتمل، لأن الکفر نھایة فی

العقوبة، فيستدعي تناهيا في الجناية، ومع الاحتمال لا نهاية اهـ. قال في البحر: والحاصل أن من تكلم بكلمة الكفر هازلا أو لاعبا كفر عند الكل، ولا اعتبار باعتقاده كما صرح به قاضي خان في فتاواه، ومن تكلم بها خطأ أو مكرها لا يكفر عند الكل، ومن تكلم بها عامدا عالما كفر عند الكل، ومن تكلم بها اختيارا جاهلا بأنها كفر ففيه اختلاف. والذي تحرر أنه لا يفتى بتكفير مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن أو كان في كفره اختلاف ولو رواية ضعيفة، فعلى هذا فأكثر ألفاظ التكفير المذكورة لا يفتى بالتكفير بها، ولقد ألزمت نفسي أن لا أفتي بشيء منها، والله أعلم. (تحرير على هامش الفتاوى تنقيح الحامدية ج ١ ص ...)

وفي أحكام القرآن للجصاص: ولأن الفرق بين الجد والهزل أن الجاد قاصد إلى اللفظ وإلى إيقاع حكمه، والهازل قاصد إلى اللفظ غير مريد لإيقاع حكمه.[2] ج ۳ ص ۹۳

وفي الفتاوى الخانية: وكذا غير المكره إذا أجرى على لسانه كلمة الكفر استهزاء أو جهلا يكون كافرا، فيكون لأنه دليلا على أن ركن الإيمان التصديق والإقرار جميعا، ولكن التصديق لا يحتمل السقوط بحال، والإقرار يحتمله في حالة الإكراه.[3] ص ۵۰

تیسری دو باتیں اور قابل غور ہیں، ایک یہ کہ عام لوگوں کی دینی گرفت اس قدر ڈھیلی ہوچکی ہے کہ تکفیر کا فتویٰ معلوم ہونے سے بھی وہ اس بات سے کوئی متاثر نہیں ہوتے اور یہ بات نہیں چھوڑتے، اور تکفیر کے فتویٰ کا علم ہونے کے بعد یہ حرکت بہرحال کفر ہوگی، تو تکفیر کا فتویٰ دینے کی صورت میں ... تجدید کا جو ایک راستہ تھا وہ بھی بند ہوجائے گا..... دوسری بات یہ کہ اگر تکفیر نہ کی جائے تو ظاہر ہے کہ تکفیر نہ کرنا اس حرکت کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوگا۔ ان دونوں باتوں پر غور کرتے ہوئے تقاضائے مصلحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ بتاتے یا لکھتے ہوئے صاف تکفیر تو نہ کی جائے تاکہ پہلا حرج لازم نہ آئے، البتہ مذمت و وعید کے الفاظ سخت بتائے جائیں، لیکن یہ بھی تب درست ہوگا کہ فقہی طور پر اس کی گنجائش ہو۔

جواب:- کسی کافر ملک کا ویزا حاصل کرنے کے لئے یا کسی اور دنیوی مصلحت سے پاسپورٹ اور ویزا فارم پر مذہب کے خانے میں کسی مسلمان کا دیدہ دانستہ اپنے آپ کو قادیانی لکھنا، صراحتاً کافر مذہب کی طرف اپنی نسبت کرنا ہے، جو سراسر موجب کفر ہے، اور جو کوئی ایسا کرے تو ایسے شخص پر واجب ہے کہ فوراً صدق دل سے توبہ کرلے اور تجدید ایمان کرے، اور آئندہ ایسا کرنے سے مکمل پرہیز کرے۔

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible]

آپ نے خط میں جو عبارات فقہیہ تحریر کی ہیں، ان کا مذکورہ مسئلہ سے تعلق نہیں، اور کسی دنیاوی غرض سے اپنے آپ کو غیر مسلم ظاہر کرنے کے بارے میں تلاش بسیار کے باوجود کوئی واضح تصریح بھی نہیں ملی، البتہ درج ذیل جزئیات سے بیان کردہ حکم کی تائید ہوتی ہے۔

في الهندية: مسلم قال: أنا ملحد، يكفر، ولو قال: ما علمت أنه كفر، لا يعذر بهذا.....

وفي التتمة: سألت والدي عن رجل قال: أنا فرعون أو إبليس، فحينئذ يكفر كذا في التاتارخانية[1]

في الهندية: مسلم رأى نصرانية سمينة فتمنى أن يكون هو نصرانيا حتى يتزوجها يكفر، كذا في المحيط. (ج:۲ ص ۲۷۷)۔[2]

واللہ اعلم

بندہ عبدالرؤف سکھروی

۲۱/۶/۱۴۱۶ھ

یہ جواب احقر کی ہدایت پر لکھا گیا ہے، دراصل کوئی کلمۂ کفر کہنا اور بات ہے، اور اپنے آپ کو کسی معروف کافر مذہب کی طرف منسوب کرنا اور بات ہے۔ جو عبارات تحریر کی گئی ہیں وہ اول الذکر صورت سے متعلق ہیں، ثانی الذکر سے نہیں۔ لہٰذا اس صورت میں احقر کا رجحان اسی طرف ہے کہ پاسپورٹ پر مذہب کے خانے میں اپنے آپ کو "مسلمان" کے بجائے قادیانی لکھنا اور مذہب کا یہ عنوان جو ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے، موجب کفر ہے، جس سے توبہ اور تجدید ایمان ضروری ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۱/۶/۱۴۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۳/۴۵)

قادیانیت سے براءت اور کسی مسلمان کو قادیانی کہنے کا حکم

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں مسمی بشیر احمد شاہ ولد سید محمد اسماعیل شاہ ساکن [illegible] شہر ضلع نوابشاہ سندھ مندرجہ ذیل عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے سب فرشتوں اور اس کی سب کتابوں پر اور اس کے سب رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر کی بھلائی اور برائی پر اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان رکھتا ہوں، ایمانِ مجمل اور مفصل پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ میں حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ میں خاتم النبیین

(1) الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۲۷۹ (طبع مكتبه رشيديه)

(2) الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۲۸۰ (طبع مكتبه رشيديه)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر مکمل اور غیر مشروط طور پر ایمان رکھتا ہوں، اور یہ کہ میں کسی ایسے شخص کا پیروکار نہیں ہوں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس لفظ کے کسی بھی مفہوم یا کسی بھی تشریح کے لحاظ سے پیغمبر ہونے کا دعوے دار ہو، اور نہ ہی ایسے دعویدار کو پیغمبر یا مذہبی مصلح مانتا ہوں، نہ قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ سے تعلق رکھتا ہوں یا خود کو احمدی کہتا ہوں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص کسی معنی کے لحاظ یا اعتبار سے نبی یا مذہبی مصلح ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کو اور اس کے ماننے والوں کو مرتد و کافر جانتا ہوں۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے ماننے والے احمدی اور لاہوری گروپ سب کو غیر مسلم اور اسلام سے خارج ہونے پر ایمان رکھتا ہوں۔ میرا یہ بیان حلفیہ ہے اور میں کلمۂ طیبہ لا إله الا الله محمد رسول الله پڑھ کر اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر بالکل صحیح اور درست تحریر کرتا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ میرے مندرجہ بالا عقیدے کو مدنظر رکھتے ہوئے فتویٰ صادر فرمائیں کہ:-

۱-عقیدے کے اعتبار سے میں شریعت محمدیہ کے مطابق مسلمان ہوں یا نہیں؟

۲:- کیا مجھے قادیانی کہا جانا درست ہے؟

۳:- اگر کوئی شخص مجھے قادیانی کہتا ہے تو شریعت محمدیہ میں اس کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- اگر آپ کے وہی عقائد ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، اور ان کے علاوہ کوئی فاسد عقیدہ بھی نہیں رکھتے، تو آپ بلاشبہ مسلمان ہیں۔

۲- مندرجہ سوال عقائد کا حامل شخص قادیانی نہیں ہوسکتا، اس کو قادیانی کہنا ہرگز درست نہیں۔

۳- کسی مسلمان کو بلاوجہ قادیانی کہنا سخت گناہ ہے،(۱) اگر ناواقفیت یا بے احتیاطی سے کہا ہے تو اسے فوراً توبہ کرنی چاہئے، اور اگر کسی غلط فہمی کی بناء پر کہا ہے تو اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۳/۸/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۴۴/۳۴ ج)

علماء کو بُرا بھلا کہنے والے کا حکم

سوال:- ایک شخص علمائے دین کو لوٹی کہتا ہے، اور کہتا ہے کہ دین فروشی ان کا پیشہ ہے، اور علم دین پڑھ کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، علمائے دین بدمعاش ہیں، مدارس عربیہ گمراہی کے اڈے

(۱) وفی مشکوة المصابیح "باب حفظ اللسان والغیبة والشتم" ج ۲ ص ۴۱۰ رقم الحدیث ۴۸۱۴ سباب المسلم فسوق وقتاله کفر. وفی الهندية ج ۲ ص ۵۳۵ (طبع مکتبه شرکت علمیه) وکذا اذا قذف مسلمًا بغیر الزنا، فقال یا فاسق أو یا کافر، فوجب التعزیر

ہیں، اور مسجدوں کو اصطبل خانہ قرار دے اور مزید لغویت و بیہودہ باتوں کا کہنا اس وقت مذکورہ شخص کا پیشہ بن گیا ہے، اور موصوف عاقل، بالغ وذی فہم آدمی ہے۔ اب شرعاً اس شخص کا کیا حکم ہے؟

جواب - مذکورہ کلمات سخت گستاخانہ ہیں، اور تحقیق کے بغیر علماء کی پوری جماعت کو اس قسم کے قبیح و شنیع کلمات کہنا نہ صرف بدترین فسق و گمراہی ہے، بلکہ ان کلمات کے کلماتِ کفریہ ہونے کا اندیشہ ہے۔[1] مذکورہ شخص پر واجب ہے کہ فوراً ان کلمات سے صدقِ دل کے ساتھ اعلانیہ توبہ کرے بلکہ اسے احتیاطاً تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح بھی کرنی چاہئے، اور جب تک وہ اپنے اس عمل سے توبہ نہ کرلے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ رکھیں۔[2]

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۳/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰۵/۳۱ ب)

حدیث کے ناقابلِ اعتبار ہونے اور جہنم کے دائمی نہ ہونے کا عقیدہ رکھنا

سوال: - کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیانِ شرع مندرجہ ذیل مسئلے میں کہ -

۱ - ہمارے علاقے کے بعض حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ موجودہ وقت میں حدیث کا جو ذخیرہ ہے وہ غیر معتبر اور جلانے کے قابل ہے۔ (معاذ اللہ)

۲ - ایک اور عقیدہ یہ رکھتے ہیں کہ جنت دائمی اور غیر فانی ہے، مگر جہنم دائمی و ابدی نہیں ہے، یعنی جہنم ایک مدت کے بعد فانی اور غیر ابدی ہے، اور کہتے ہیں کہ اس کی انتہاء ہونے کے بعد انسان سارے کے سارے یعنی مشرک و کافر رحمت (جنت) میں جائیں گے اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں "ان رحمتی سبقت علی عصبی" اور ساتھ ساتھ مولانا شبلی نعمانی کی کتاب سیرت النبی جہارم میں دوزخ کی انتہاء کے مبحث لوگوں کو دکھا دکھا کر لوگوں کے ذہنوں کو خراب کرتے جا رہے ہیں، اب آپ بتائیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ شریعت محمدی کے مطابق ہے یا نہیں؟

جواب۔ - مذکورہ عقائد سخت گمراہانہ عقائد ہیں۔ پہلا عقیدہ کہ سارا ذخیرۂ حدیث (معاذ اللہ)

---

(۱) وفی خلاصۃ الفتاوی ج:۴ ص ۳۸۸ (مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) (الفاظ الکفر) من أبغض عالمًا بغیر سبب ظاهر خیف علیه الکفر ورجع أیضًا شرح الفقه الأکبر للملا علی القاری ص ۔۔ طبع دار البشائر الاسلامیه بیروت،

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے۔ فتاوی رشیدیه ص ۲۸ و امداد الفتاوی ج ۱ ص ۳۹۳ و امداد الاحکام ج ۱ ص ۲۵

ناقابلِ اعتبار ہے، مگر یہ عقیدہ [illegible] کے بعد انسان دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے، [illegible] ایسے عقیدے پر پختگی کفر کا اندیشہ ہے، ایسے عقائد کے شخص سے جب تک وہ توبہ نہ کرے، [illegible] تعلقات نہ رکھنا چاہئیں۔

واللہ اعلم
۲۲-۹-۱۴۰۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۲/۳۱ د)

مسلمان کو کافر کہنے والے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین [illegible] اللہ سواتی [illegible] کے بارے میں فتویٰ جاری کیا ہے کہ [illegible] کافر ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح ناجائز ہے، اور محمد بن عبدالوہاب نجدی، ابن تیمیہ، ابن قیم [illegible] کو کافر کہتے ہیں، کیا موصوف [illegible] فتویٰ کی رو سے کافر ہے یا نہیں؟

جواب:- کسی مسلمان کو کافر کہنا [illegible] سخت گناہ ہے، [illegible] فاسق ہے، لیکن اس شخص کی بناء پر اسے مطلقاً کافر بھی نہیں کہا جاسکتا، تاوقتیکہ اس کے [illegible] بنیادی عقائد خراب نہ ہوں، [illegible] سے خالی نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۵/۷/۱۴۰۱ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفي البزازية على هامش الهندية ج ۶ ص ۳۲۸ (طبع مكتبه حقانيه پشاور) اذا استخف بسنة أو حديث من [illegible] كفر [illegible] وفي [illegible] ج ۲ ص ۲۲۵ (طبع مكتبه [illegible]) [illegible] من أنكر [illegible] كفر [illegible] ومن أنكر خبر الواحد لا يكفر غير أنه يأثم بترك القبول. وفي شرح الفقه الأكبر ص ۲۷۳ (طبع دار البشائر الاسلامية بيروت، فصل في العلم والعلماء) من قال لفقيه يذكر شيئا من العلم أو يروي حديثا صحيحا أي ثابتا لا موضوعا: هذا ليس بشيء، كفر ..... الخ

(۲) وفي مشكوة المصابيح باب حفظ اللسان والغيبة والشتم ج ۲ ص ۴۱۱، رقم الحديث ۴۸۱۴ (طبع قديمي كتب خانه) سباب المسلم فسوق وقتاله كفر

(۳) عن ابن عمرؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أيما رجل قال لأخيه كافر، فقد باء بها أحدهما. هذا حديث صحيح، جامع الترمذي ج ۲ ص ۸۸ (طبع فاروقي كتب خانه) وفي اللمعات والطيبي [illegible] محمول على المستحل لذلك [illegible] أو لأنه فعل ما فعل الكفر (حواله مذكوره) وفي الدر المختار ج ۴ ص ۲۲۹، ۲۳۰ واعلم أنه لا يفتى بكفر مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن أو كان في كفره خلاف، ولو كان ذلك رواية ضعيفة. وقال الشاميؒ تحت مطلب في حكم من شتم دين مسلم (ج ۴ ص ۲۳۰) ثم ان مقتضى كلامهم أيضا أنه لا يكفر بشتم دين مسلم أي لا يحكم بكفره لإمكان التأويل، ثم رأيته في جامع الفصولين حيث قال بعد كلام أقول: وعلى هذا ينبغي أن يكفر من شتم دين مسلم ولكن يمكن التأويل بأن مراده أخلاقه الردية ومعاملته القبيحة لا حقيقة دين الاسلام فينبغي أن لا يكفر حينئذ. والله تعالى أعلم

''اگر فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں'' کہنے کا حکم

سوال:- اگر بیوی نے کئی مرتبہ کہا: اب بھی نماز نہیں پڑھی تو "من ترک الصلاۃ متعمدًا فقد کفر"، یا اگر بیوی نے کہہ دیا کہ ''فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں'' اور وہ کام کر دیا یا بھول کر کوئی کفریہ فقرہ کہہ دیا (کفر حاصل کرنے کی غرض سے نہیں) تو کیا ان صورتوں میں وہ کافر ہو جائے گی یا طلاق ہو جائے گی؟

جواب:- جان بوجھ کر نماز چھوڑنا انتہائی شدید گناہ ہے، لیکن اس سے انسان کافر نہیں ہوتا، اس طرح اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ ''میں اگر فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں'' تو اتنا کہنے سے بھی کافر نہیں ہوتا، اور اگر وہ کام کرلے تب بھی کافر نہیں ہوتا، الا یہ کہ وہ سمجھتا ہو کہ یہ کام کرنے سے میں واقعی کافر ہو جاؤں گا اور پھر بھی کفر پر راضی ہو کر وہ کام کرلے۔

لما فی الدر المختار: وإن فعل کذا فهو کافر، والأصح أن الحالف لم یکفر عقبه بماض أو آت إن کان عنده فی اعتقاده أنه یمین، وإن کان عنده أنه یکفر فی الحلف یکفر فیهما. (شامی ج:۳ ص:۵۵۰)(۲)۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۶ھ
(فتوی نمبر ۷۰۶ ۲۸ ب)

''میں ہندو ہوں'' کہنے کا حکم

سوال:- اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے کہ جس سے کہا جائے کہ رمضان کا مہینہ ہے، قرآن پاک کی تلاوت کیوں نہیں کرتا؟ تو مسلمان نہیں ہے؟ تو اس کا جواب یہ دے: ''ہاں! میں مسلمان نہیں ہوں بلکہ ہندو یا سکھ ہوں''۔ کیا وہ مسلمان رہتا ہے اور اس کا نکاح باقی رہتا ہے؟

جواب:- یہ کلمہ کہ ''ہاں میں مسلمان نہیں ہوں، ہندو یا سکھ ہوں'' کلمۂ کفر ہے، اور اگر اس کا

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۲۳۵ وتارکها عمدًا مجانة أی تکاسلًا فاسق. اھ وکذا فی شرح المسلم للنووی ج ص ۶۱

(۲) الدر المختار ج:۳ ص:۷۱۸،۷. وفی البزازیة علی هامش الهندیة ج:۶ ص:۳۲۶ (طبع رشیدیه کوئٹه)، إن فعل کذا فهو یهودی ثم أتی بالشرط إن کان عنده من أتی بهذا الشرط لا یکفر کانت علیه کفارة الیمین، وإن حلف بهذه علی معرفة هو یهودی أو نصرانی أو مجوسی إن کان فعل کذا وقد کان فعله هو عالم بفعله لا یلزمه الکفارة لأنه غموس وقد اختلفت الأجوبة فی کفره والمختار ما قال السرخسی وبکر أنه إن کان کفر عنده یحلف بهذا فهو کافر لأنه رضی بکفر نفسه، والرضا بکفر نفسه کفر بلا نزاع ... الخ

وہی مطلب مراد تھا جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے تو انسان ان کلمات کے کہنے سے کافر ہو جاتا ہے،[1] ایسے شخص کو توبہ کے بعد ایمان کی تجدید اور نکاح کی تجدید کرنی لازم ہے، اور اگر مقصد کچھ اور تھا تو وہ لکھ کر دوبارہ سوال کریں۔ تجدید ایمان اور تجدید نکاح ہر صورت میں کر لینی چاہئے، کیونکہ یہ بڑا خطرناک اور سنگین جملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسی بات کہنے سے محفوظ رکھیں، آمین۔ واللہ اعلم

۲۶/۱۰/۱۴۰۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۱۲/۳۲ ج)

اذان کی گستاخی کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مؤذن کے متعلق جو کہ پانچ وقت جامع مسجد میں اذان دیتا ہے، ۵-۶ دفعہ میرے سامنے کہا کہ ''یہ مؤذن صبح کے وقت زیادہ بکواس کرتا ہے، جس سے میری نیند میں خلل آتا ہے، اس کو منع کرو کہ صبح کے وقت اذان نہ دیا کرے۔'' ایک شخص نے اس شخص کو کسی بیمار کو انجکشن لگانے کا کہا تو اس نے کہا کہ ''جب تک موذن سے اذان بند نہیں کرائیں گے، بیمار کو انجکشن نہیں لگاؤں گا۔'' اس شخص کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- جس شخص نے اذان فجر کے بارے میں ایسے گستاخانہ کلمات کہے ہوں وہ انتہائی بدعقیدہ معلوم ہوتا ہے، یہ کلمات کفر کے ہیں،[2] اس شخص کو چاہئے کہ فوراً اپنے ان کلمات سے توبہ کر کے ایمان کی تجدید کرے، اور جب تک وہ ایسا نہ کرے مسلمانوں کو اس سے خصوصی تعلقات نہ رکھنے چاہئیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۸/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۶ /۲۸ ج)

''میں کافر ہو جاؤں گا، پتھروں کی پوجا کروں گا، اللہ تعالیٰ سے لڑائی کروں گا'' وغیرہ الفاظ کہنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے چند آدمیوں کے درمیان یہ الفاظ کہے ہیں کہ ''میں کافر ہو جاؤں

---

(۱) وفی الهندية ج۲ ص:۲۷۹ مسلم قال انا ملحد، يكفر. ولو قال: ما علمت انه كفر، لا يعذر بهذا. وفی ... سمة ... واسمى عن رجل قال انا فرعون او ابليس فحينئذ يكفر. كذا فی التاتارخانية. وفی جامع الفصولين ج ۲ ص:۳۰۱ (طبع اسلامی كتب خانه) قال: هو يهودی او نصرانی ... كفر ... لأنه رضاء بالكفر، وهو كفر، وعليه الفتوى. وفی الهندية ج ۲ ص:۲۵۷، حكم المرتدين ومن يرضى بكفر نفسه فقد كفر، وكذا فی التاتارخانية ج ۵ ص:۴۶۰.

(۲) وفی الهندية ج ۲ ص:۲۶۹ (مكتبه رشيديه كوئٹه) فی تحقير الأذان فقال رجل اين بانگ غوغا است، يكفر ان قال على وجه الانكار. وفی الفصول ولو سمع الاذان فقال هذا صوت الجرس، يكفر كذا فی التاتارخانية. وراجع ايضاً البحر الرائق ج ۵ ص ۲۲ أحكام المرتدين (محمد زبیر عفی عنہ)

گا، پتھروں کی پوجا کروں گا، اور اللہ تعالیٰ سے لڑائی کروں گا، داڑھی کٹوادوں گا'' جب لوگوں نے گرفت کی تو اس نے چند آدمیوں کے سامنے کلمہ پڑھ کر جھوٹ بولا کہ میں نے ایسا نہیں کہا ہے، جبکہ اس کے اس قول کے پورے محلّہ والے گواہ ہیں، اور بغیر تصدیق کئے اس نے الزام تراشی بھی کی ہے، تصدیق کرنے پر محلّہ کے چند آدمیوں کے سامنے یہ اقرار کیا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، اب وہ معافی مانگ رہا ہے۔ اس کا شرعی فتویٰ کیا ہے اور وہ اب اپنے ''کافر ہوجاؤں گا... الخ'' الفاظ سے توبہ کر رہا ہے تو اس توبہ کی کیا صورت اختیار کی جائے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مذکورہ شخص نے یہ الفاظ کہہ کر سنگین گناہ کا ارتکاب کیا، اسے فوراً صدقِ دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرنا چاہئے، توبہ کی صورت یہ ہے کہ صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ سے عرض کرے کہ ''یا اللہ! میں نے مذکورہ کلمات کہہ کر سخت گمراہی کا ارتکاب کیا، میں اس پر بے حد نادم و شرمسار ہوں، آئندہ کے لئے ایسے کلمات سے اور ہر طرح کے کفریہ کلمات و اعمال سے براءت کا اظہار کرتا ہوں، یا اللہ! مجھے اپنے فضل سے معاف فرمادیجئے'' اس کے ساتھ ہی احتیاطاً ایمانِ مفصل کی شہادت اور اسلام کے سوا ہر دین سے اپنی مکمل براءت کا بھی لوگوں کے سامنے اظہار و اعلان کرے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۴/۲۸ الف)

قرآنِ کریم میں لفظی تحریف کا عقیدہ رکھنا اور استدلال میں حضرت کشمیریؒ کی عبارت پیش کرنا

سوال:- باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

حضراتِ علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلۂ ذیل کے بارے میں کیا فرماتے ہیں -

۱- ہمارے علاقے میں ایک مولوی صاحب اپنے بیان میں کہا کرتا ہے کہ قرآن میں لفظی و معنوی دونوں قسم کی تحریفیں موجود ہیں۔ اور وہ مولوی صاحب اپنے قول کی تائید کے لئے درج ذیل عبارت نقل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بات علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی ایک کتاب میں لکھی ہے، کتاب کا نام نہیں بتایا ہے۔ عبارت درج ذیل ہے:-

''واعلم أن فی التحریف ثلاثة مذاهب، ذهب جماعة الی أن التحریف فی الکتب السماویة قد وقع بکل نحو فی اللفظ والمعنی جمیعاً، وهو الذی مال الیه ابن حزم، ...

وذهب جماعة انكر التحريف اللفظي رأسا فالتحريف عندهم كله معنوي. قلت يلزم على هذا المذهب أن يكون القرآن أيضا محرفا، فإن التحريف المعنوي غير قليل فيه أيضًا، والذي تحقق عندي أن التحريف فيه لفظي أيضًا، أما أنه عن عمد منهم أو لمغلطة.''

اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟

۲- بیان کرنے والے مولوی صاحب کا شرعی حکم کیا ہے، کیا قابل امامت ہے یا نہیں؟ اور اس کا یہ عقیدہ، قرآن مجید کی آیت: ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ'' الآية، کا مخالف ہے یا نہیں؟ نیز جس مصنف کی کتاب کا حوالہ پیش کر رہا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ مسلمان ہے یا مرتد؟ مدلل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

نوٹ - شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم ہمارے علاقے کے علماء و عوام آپ ہی کے فتوی پر اعتبار کرتے ہیں، لہٰذا آپ اپنے دست مبارک سے جواب تحریر فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ بینوا توجروا

فضل جاوید حنفی باجوڑی

جواب - قرآن کریم میں تحریف لفظی کا عقیدہ رکھنا کفر ہے، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ عبارت میں یہ فرمایا ہے کہ پچھلی کتب سماویہ کے بارے میں (یعنی تورات، انجیل، زبور کے بارے میں) جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان میں صرف تحریف معنوی ہوئی ہے، وہ غلط کہتے ہیں، کیونکہ کرنے والوں نے تو قرآن کریم میں بھی تحریف معنوی کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک پچھلی کتب سماویہ میں تحریف لفظی بھی ہوئی ہے۔ حضرت کی یہ عبارت[1] پچھلی کتب سماویہ سے متعلق ہے،[2] لہٰذا اس عبارت سے قرآن کریم کی تحریف لفظی کا عقیدہ

---

(۱) [illegible] ۳۹۵ [illegible] ... بعض من ... [illegible] ... على لسخ ذه وعيرها [illegible] ۳۲۹ [illegible]) [illegible] ... عن عبدالله بن عباس قال يا معشر المسلمين! كيف تسألون أهل الكتب وكتابكم الذي أنزل على نبيه أحدث الأخبار بالله تقرؤنه، لم يشب وقد حدثكم الله أن أهل الكتب بدلوا ما كتب الله وغيروا بأيديهم الكتب، فقالوا هو من عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا، ألا ينهاكم ما جاءكم من العلم عن مسائلتهم ولا والله ما رأينا منهم رجلا قط يسألكم عن الذي أنزل عليكم [illegible] ... التحريف في الكتب السماوية [illegible] ... التحريف فيه لفظي [illegible] ... كتب الله [illegible]

(۲) [illegible] ... والذي تحقق عندي [illegible] ... أنه عن عمد منهم [illegible] ... أهل الكتاب [illegible]

بنانا قطعی گمراہی کی بات ہے، اور جو شخص قرآن کریم میں تحریف لفظی کا قائل ہو وہ مسلمان نہیں، کافر ہے۔ ایسے شخص کے پیچھے نماز بھی نہیں ہوگی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۱/۳/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۸/۳)

ایک طنزیہ مضمون میں اللہ تعالیٰ کی شان میں نامناسب الفاظ استعمال کرنے کا حکم

سوال:- فتویٰ حاصل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک مصنف نے اپنے مضمون میں خدا کی شان میں گستاخی کی ہے، اس کے خلاف مقدمہ چلنا ہے۔ مندرجہ ذیل عبارات رسالہ ''نفِ لیلی'' ڈائجسٹ کے صفحات: ۹۰ تا ۹۳ پر لکھی ہوئی ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے ''چند دن ہوئے میں نے خواب میں دیکھا، مجھے ایسا لگا جیسے کوئی سوتے میں جگا رہا ہے، سر اٹھایا تو ایک فرشتہ تھا، کہنے لگا اچھے جرنلسٹ ہو، خدا کے دربار میں ہنگامہ ہے اور تم یہاں پڑے ہو۔ میں نے کہا ''میرا ایڈیٹر تو کہتا ہے کہ صرف وزیروں اور زرائع ذخیرہ کے ہاں جایا کرو، مگر تم کہتے ہو تو آج خدا کو بھی دیکھ لیتے ہیں، پتہ نہیں اس کی استوری اخبار والے قبول کرتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ وہ ہماری پارٹی کا نہیں، ابلیس ہوتا تو دوسری بات تھی۔

بہرحال میں نے اپنی ڈائری اور کیمرہ اٹھایا اور چل پڑا، وہاں پہنچے تو دیکھا کہ واقعی ہنگامہ ہے، اللہ میاں تخت پر بیٹھے ہیں، نور کی روشنی پرنور روشنی ہے، چاروں طرف فرشتے سجدے میں پڑے ہیں، پس منظر میں حمد وثنا کی موسیقی ہے، بھینی بھینی خوشبو کی لہریں اٹھ رہی ہیں، مگر درمیان میں چند مغربی سائنسدان کھڑے گستاخانہ طریقے سے شور کر رہے ہیں۔

اس فرشتے نے کان میں کہا کہ خدا سے بغاوت کرکے اپنی خودمختاری کا اعلان دینے آئے ہیں، میں نے غور سے سنا تو ایک بڈھا سائنسدان چیخ رہا تھا۔

ہم کیوں مانیں تیری خدائی؟ کیا ہے تیرے پاس جو ہمارے پاس نہیں؟ تیری خدائی کی بنیاد صرف دو چیزوں پر ہے، ایک تخریب جو قہر اور عذاب بن کر آتی ہے اور دوسری تخلیق۔ ہمارے پاس بھی یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔

ہمارے ایٹم بم آج تیری دنیا کا ایسے انداز میں خاتمہ کرسکتے ہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر تو نے بھی آج تک تخریب نہ کی ہوگی، تو نے دنیا کو قیامت کے دن حشر برپا کرنے کی دھمکی دے کر ڈرا دیا اور نہیں

مذہب کی زنجیروں میں جکڑا، وہی جسے ہم اپنے بموں سے برپا کر سکتے ہیں" ...(انتخاب ص ۹۳ - از ناقل)

تمام صفحات کی عبارات سے اللہ تعالیٰ کی تحقیر، توہین وتذلیل ہوتی ہے یا نہیں؟ مسلمانوں کے عقیدے میں خلل پڑتا ہے یا نہیں؟

نمبر۲، ۳:- کیا اس عبارت سے کفر لازم آتا ہے یا نہیں جو اُوپر (قوسین) میں نقل کی گئی ہے؟

نمبر۴:- "کیا میں غلط کہہ رہا تھا اے خدا! میں نے جرأت کرکے پوچھ ہی، اللہ میاں نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی تخلیق پر شرم سے سر جھکالیا، تو عرفی میں، مغرب کے سائنسدان اپنی صدیوں کی سائنسی ترقی سے خدا کا سر نہ جھکا سکے اور ہم نے اس ملک کی بیس برس کی زندگی میں خدا کا سر جھکادیا ہے، ہم آگے ہیں یا نہیں؟"

نمبر۵، ۶:- کیا ایسے مسلمانوں کو جو پاکستان میں رعایا کی حیثیت سے مقیم ہیں ان کی، عام مسلمانوں کی دل آزاری اور باری تعالیٰ سے اس درجہ گستاخی کی بناء پر اگر ملک پاکستان کے دستور کی بنیاد پر ضرب کاری لگ رہی ہو تو اس کو دستور اساسی کا منکر تصور کرنا چاہئے یا نہیں؟ اور ملک کا اور خدا کا دُشمن اور ملک کا باغی سمجھنا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- اگرچہ مسئلہ مضمون ایک طنزیہ مضمون ہے، جس میں الفاظ کی حقیقت مراد نہیں ہوتی، لیکن طنزیہ انداز میں بھی اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسی باتیں کرنا، اور اس کی طرف ایسی فرضی باتیں منسوب کرنا سنگین گستاخی ہے، جس پر کفر کا بھی خوف ہے۔ لہٰذا ایسے مضمون لکھنے والے کو فوراً صدقِ دل سے توبہ کرنی چاہئے۔ ایسے مضامین کی نشر واشاعت بالکل ناجائز ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی تخلیق اور اس کے کارخانۂ قدرت کو طنز ومزاح کا موضوع بنانا انتہائی خطرناک گناہ ہے۔ اگر کوئی شخص ایسے الفاظ کو حقیقت سمجھتا ہو تو اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔

لما في العالمگيرية يكفر اذا وصف الله تعالى بما لا يليق به أو سخر باسم من أسمائه أو بأمر من أوامره أو أنكر وعده ووعيده أو جعل له شريكًا أو ولدًا أو زوجة أو نسبه الى الجهل أو العجز أو النقص، ويكفر بقوله يجوز أن يفعل الله تعالى فعلًا لا حكمة فيه.

(عالمگیریۃ ج ۲ ص ۲۵۸)[1]۔ اور اگر الفاظ کی حقیقت مقصود نہ ہو بلکہ صرف موجودہ دور کے انسانوں پر طنز مقصود ہو تو چونکہ تکفیرِ مسلم ایک سنگین معاملہ ہے، اس لئے تکفیر سے تو کف لسان کیا جائے گا،[2] لیکن اس کے سنگین گستاخی اور سخت گناہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس مضمون کے مصنف اور ناشر دونوں کو

---

(۱) الباب التاسع في أحكام المرتدين (طبع مكتبه حقانيه پشاور)

(۲) وفي الدر المختار ج ۴ ص ۲۲۴ (طبع ايچ ايم سعيد) و علم انه لا يفتى بكفر مسلم امكن حمل كلامه على محمل حسن

آخرت کے مواخذے کی فکر کر کے فوراً اس پر توبہ کرنی چاہئے، اور حکومت کو ایسے مضامین کی اشاعت کی اجازت ہرگز نہ دینی چاہئے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۶ھ

قادیانیوں کے ’’لاہوری گروپ‘‘ سے تعلق رکھنے والے شخص کے چند کفریہ عقائد کا حکم

سوال:- ایک شخص کئی سال تک لاہوری، احمدیوں کے ایک تبلیغی رسالے کا ایڈیٹر رہتا ہے، اور اس کے عقائد یہ ہیں:-

الف - ایک غیر عرب مسلمان کو (جو عربی نہیں جانتا) نماز میں اپنی مادری زبان میں قرآن کا ترجمہ جو لفظاً ہو پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے۔

ب - امام ابوحنیفہؒ نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ ایک غیر عرب مسلمان جو عربی زبان نہیں جانتا نماز میں قرآن کا فارسی ترجمہ پڑھ سکتا ہے۔

ج - محنت کش طبقہ (کسان اور مزدور) کے لئے روزہ رکھنا ضروری نہیں، اور یہ کہ رمضان کے روزوں کے لئے وقت اور مہینے کی پابندی بھی لازم نہیں ہے۔ کیا ایسے شخص کو مسلمان شمار کیا جانا چاہئے؟ اور کیا اسے کسی اسلامی ادارے کی نگرانی اور ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے جبکہ وہ اپنے عقائد کا تحریری وتقریری اظہار کرتا ہے؟

جواب:- اگر یہ صاحب اب بھی لاہوری، مرزائیوں کے عقائد سے متفق ہیں تب تو ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور اگر ان عقائد سے تائب ہو چکے ہیں تب بھی ان کا یہ عقیدہ کہ روزوں کے لئے وقت اور مہینے کی پابندی لازم نہیں ہے، کفریہ عقیدہ ہے،[2] اور غیر عرب کے لئے اپنی مادری زبان میں نماز کی اجازت بھی گمراہی ہے، امام ابوحنیفہؒ کی طرف جو بات انہوں نے منسوب کی ہے وہ بھی اس اطلاق کے ساتھ درست نہیں، امام صاحبؒ کا مطلب کچھ اور تھا،[3] اور ایسے شخص کو کسی اسلامی ادارے کی ذمہ داری سونپنا ہرگز درست نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۰۸/۲۸ ج)

---

(۱) نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۳۹۳۔
(۲) "اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ" (البقرۃ ۱۸۴)، "فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْهُ" الآیۃ (البقرۃ ۱۸۵)
(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے رد المحتار مطلب فی حکم القراءۃ بالفارسیۃ ج ۱ ص ۴۸۵ طبع سعید۔

﴿فصل فی الفِرَق والأحزاب الإسلامیة والباطلة والأشخاص المتعلقین بها﴾

(مختلف اسلامی وغیر اسلامی فرقوں اور ان سے متعلق شخصیات کے بیان میں)

"الہدیٰ انٹرنیشنل" کے افکار وعقائد کا حکم

سوال:- حضرت جناب مفتی صاحب، زیدت معالیہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ہم نے اسلام آباد کے ایک ادارے "الہدیٰ انٹرنیشنل" سے ایک سالہ ڈپلومہ کورس ان اسلامک اسٹڈیز (One Year Diploma Course in I.S) کیا ہے۔ ہم اس ادارے میں طلبِ علم کی جستجو میں گئی تھیں اور ان کے خفیہ عقائد سے ناواقف تھیں، ایک سالہ کورس کے بعد ان کے عقائد کچھ صحیح معلوم نہ ہوئے تو سوچا کہ علمائے کرام سے فتویٰ طلب کیا جائے، تاکہ اُمت مسلمہ کی بیٹیوں تک عقائدِ صحیحہ کو پہنچا کر ان کو گمراہی سے بچایا جاسکے۔ ہماری اُستاد اور "الہدیٰ انٹرنیشنل" کی نگران محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ کے نظریات کا نچوڑ پیشِ خدمت ہے۔

۱:- اجماعِ اُمت سے ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کرنا۔

۲:- غیر مسلم اور اسلام بیزار طاقتوں کے نظریات کی ہم نوائی۔

۳:- تلبیسِ حق و باطل۔

۴:- فقہی اختلافات کے ذریعے دین میں شکوک وشبہات پیدا کرنا۔

۵:- آسان دین۔

۶:- آداب ومستحبات کو نظر انداز کرنا۔

اب ان بنیادی نکات کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:-

۱:- اجماعِ اُمت سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کرنا:

۱- قضائے عمری سنت سے ثابت نہیں، صرف توبہ کرلی جائے، قضا ادا کرنے کی ضرورت

نہیں ہے۔

۲:- ۳ طلاقوں کو ایک شمار کرنا۔

۳- نفلی نمازوں، صلوۃ التسبیح، رمضان میں طاق راتوں خصوصاً ۲۷ویں شب میں اجتماعی عبادت کا اہتمام اور خواتین کے جمع ہونے پر زور دینا۔

۲:- غیر مسلم، اسلام بیزار طاقتوں کے خیالات کی ہم نوائی:

۱:- مولوی (عالم)، مدارس اور عربی زبان سے دُور رہیں۔

۲- علماء، دین کو مشکل بناتے ہیں، آپس میں لڑتے ہیں، عوام کو فقہی بحثوں میں اُلجھاتے ہیں۔ بلکہ ایک موقع پر تو فرمایا کہ اگر آپ کو کسی مسئلے میں صحیح حدیث نہ ملے تو ضعیف سے لیں، لیکن علماء کی بات نہ لیں۔

۳- مدارس میں گرامر، زبان سکھانے، فقہی نظریات پڑھانے میں بہت وقت ضائع کیا جاتا ہے، عوام کو عربی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں، بلکہ لوگوں کو قرآن صرف ترجمے سے پڑھایا جائے۔

ایک موقع پر کہا (ان مدارس میں جو ۷، ۷، ۸، ۸ سال کے کورس کرائے جاتے ہیں، یہ دین کی روح کو پیدا نہیں کرتے، اپنی فقہ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں) اشارہ درس نظامی کی طرف ہے۔

۴- وحید الدین خان کی کتابیں طالب علموں کی تربیت کے لئے بہترین ہیں، نصاب میں بھی شامل ہیں اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ کسی نے [illegible] کے بارے میں علماء کی رائے کیا ہے؟ تو کہا کہ: ”حکمت، مؤمن کی گمشدہ میراث ہے“۔

۳:- تلبیسِ حق و باطل:

۱- تقلید شرک ہے، (لیکن کون سی برحق ہے اور کس وقت غلط ہے؟ یہ کبھی نہیں بتایا)۔

۲- ضعیف حدیث پر عمل کرنا تقریباً ایک جرم بنا کر پیش کیا جاتا ہے (جب بخاری میں صحیح ترین احادیث کا مجموعہ ہے تو ضعیف کیوں قبول کی جائے؟)۔

۴:- فقہی اختلافات کے ذریعے دین میں شکوک و شبہات پیدا کرنا:

۱- بنیادی پیغام، مقصد اور متفق علیہ باتوں سے زیادہ زور دوسرے مدارس اور علماء پر طعن و تشنیع۔

۲- ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے بنیادی فرائض، سنتیں، مستحبات، مکروہات سکھانے سے زیادہ اختلافی مسائل میں اُلجھا دیا گیا۔ (پروپیگنڈا ہے کہ ہم کسی مذہب کا شکار نہیں اور صحیح حدیث کو چھپایا

رہے ہیں)۔

۳:- نماز کے اختلافی مسائل رفع یدین، فاتحہ خلف الامام، ایک وتر، عورتوں کو مسجد جانے کی ترغیب، عورتوں کی جماعت، ان سب پر صحیح حدیث کے حوالے سے زور دیا جاتا ہے۔

۴:- زکوٰۃ میں غلط مسائل بیان کئے جاتے ہیں، خواتین کو تملیک کا کچھ علم نہیں۔

۵:- آسان دین:

۱- دین مشکل نہیں، مولویوں نے مشکل بنادیا ہے، دین کا کوئی مسئلہ کسی بھی امام سے لے لیں، اس طرح بھی ہم دین کے دائرے میں ہی رہتے ہیں۔

۲:- حدیث میں آتا ہے کہ آسانی پیدا کرو، تنگی نہ کرو، لہٰذا جس امام کی رائے آسان معلوم ہو وہ لے لیں۔

۳:- روزانہ یٰسین پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت نہیں، نوافل میں اصل صرف چاشت اور تہجد ہے، اِشراق اور اَوّابین کی کوئی حیثیت نہیں۔

۴- دین آسان ہے، بال کٹوانے کی کوئی ممانعت نہیں، اُمہات المؤمنین میں سے ایک کے بال کٹے ہوئے تھے۔

۵- دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ پکنک، پارٹیاں، اچھا لباس، زیورات کا شوق، محبت، مَنْ حرّمَ زینۃ اللہ۔

۶:- خواتین دین کو پھیلانے کے لئے گھر سے ضرور نکلیں۔

۷- محترم کا اپنا عمل طالب علموں کے لئے حجت ہے، محرَم کے بغیر تبلیغی دوروں پر جانا، قیام اللیل کے لئے راتوں کو نکلنا، میڈیا کے ذریعے تبلیغ (ریڈیو، ٹی وی، آڈیو)۔

۸:- آداب و مستحبات کی رعایت نہیں، خواتین ناپاکی کی حالت میں بھی قرآن چھوتی ہیں، آیات پڑھتی ہیں، قرآن کی کلاس میں قرآن کے اُوپر نیچے ہونے کا احساس نہیں۔

۶:- متفرقات:

۱:- قرآن کا ترجمہ پڑھا کر ہر معاملے میں خود اجتہاد کی ترغیب دینا۔

۲- قرآن و حدیث کے فہم کے لئے جو اکابر علمائے کرام نے علوم سیکھنے کی شرائط رکھی ہیں، ان کو بیکار، جاہلانہ باتیں اور سازش قرار دینا۔

۳- کسی فارغ التحصیل طالبہ کے سامنے دین کا کوئی حکم یا مسئلہ رکھا جائے تو اس کا سوال یہ

ہوتا ہے کہ یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ گلی گلی، محلے محلے ''الہدیٰ'' کی برانچز کھلی ہوئی ہیں، اور ہر قسم کی طالبہ خواہ ابھی اس کی تجوید ہی دُرست نہ ہوئی ہو آگے پڑھا رہی ہے، اور لوگوں کو مسائل میں بھی اُلجھایا جارہا ہے۔

گھر کے مردوں کا تعلق عموماً مسجد سے ہے (جہاں نماز کا طریقہ فقہ حنفی کے مطابق ہے)، گھر کی عورتیں مردوں سے اُلجھتی ہیں کہ ہمیں مساجد کے مولویوں پر اعتماد نہیں۔

مطلوبہ سوالات:

۱:- مذکورہ بالا تمام مسائل کی شرعی نقطۂ نظر سے وضاحت فرما کر مشکور فرمائیں۔

۲:- محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی کے اس طریقۂ کار کی شرعی حیثیت، نیز محترمہ کی گلاسگو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۳:- ان کے اس کورس میں شرکت کرنا، لوگوں کو اس کی دعوت دینا، اور ان سے تعاون کرنے کی شرعی نقطۂ نظر سے وضاحت فرمادیجئے، جزاکم اللہ خیر الاحسن الجزاء۔

مستفتیہ مسز سیما افتخار
One Year Diploma Holder from
Al Huda International
Islamabad

جواب:- سوال میں جن نظریات کا ذکر کیا گیا ہے، خواہ وہ کسی کے بھی نظریات ہوں، ان میں سے اکثر غلط ہیں، بعض واضح طور پر گمراہانہ ہیں، مثلاً اجماعِ اُمت کو اہمیت نہ دینا، تقلید کو علی الاطلاق شرک قرار دینا، جس کا مطلب یہ ہے کہ چودہ سو سال کی تاریخ میں اُمتِ مسلمہ کی اکثریت جو ائمۂ مجتہدین میں سے کسی کی تقلید کرتی رہی ہے، وہ مشرک تھی، یا یہ کہنا کہ قضائے عمری فوت شدہ نمازوں کو قضا کرنے کی ضرورت نہیں،( ) صرف توبہ کافی ہے۔ بعض نظریات جمہور اُمت کے خلاف ہیں، مثلاً تین طلاقوں کو ایک قرار دینا۔ بعض بدعت ہیں، مثلاً صلوٰۃ التسبیح کی جماعت یا قیام اللیل کے لئے راتوں کو اہتمام کے ساتھ لوگوں کو نکالنا یا خواتین کو جماعت سے نماز پڑھنے کی ترغیب۔ بعض انتہائی گمراہ کن ہیں، مثلاً قرآنِ کریم کو صرف ترجمے سے پڑھ کر پڑھنے والوں کو اجتہاد کی دعوت، یا اس بات پر لوگوں کو آمادہ کرنا کہ وہ جس مذہب میں آسانی پائیں، اپنی خواہشات کے مطابق اسے اختیار کرلیں، یا کسی کا اپنے عمل کو حجت قرار دینا۔ اور ان میں سے بعض نظریات فتنہ انگیز ہیں، مثلاً علماء وفقہاء سے بدظن کرنا، دینی تعلیم کے جو ادارے اسلامی علوم کی وسیع وعمیق تعلیم کا فریضہ انجام دے رہے ہیں ان کی

( ) قضائے عمری سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے "کتاب الصلوۃ، باب قضاء الفوائت" میں ملاحظہ فرمائیں۔
(محمد زبیر عفی عنہ)

اہمیت ذہنوں سے کم کرکے مختصر دورس کو علم دین کے لئے کافی سمجھنا، نیز جو مسائل کسی امام مجتہد نے قرآن وحدیث سے اپنے گہرے علم کی بنیاد پر مستنبط کئے ہیں، ان کو باطل قرار دے کر اسے قرآن و حدیث کے خلاف قرار دینا اور اس پر اصرار کرنا۔

جو شخصیت یا ادارہ مذکورہ بالا نظریات رکھتا ہو، اور اس کی تعلیم وتبلیغ کرتا ہو، وہ نہ صرف یہ کہ بہت سے گمراہانہ، گمراہ کن یا فتنہ انگیز نظریات کا حامل ہے، بلکہ اس سے مسلمانوں کے درمیان افتراق و انتشار پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے، اور اگر کوئی شخص سہولتوں کی لالچ میں اس قسم کی کوششوں سے دین کے قریب آئے گا بھی، تو مذکورہ بالا فاسد نظریات کے نتیجے میں وہ گمراہی کا شکار ہوگا، لہٰذا جو ادارہ یا شخصیت ان نظریات کی حامل اور مبلغ ہو، اور اپنے اداروں میں اس قسم کی ذہن سازی کرتی ہو، اس کے اداروں میں شرکت کرنا اور اس کی دعوت دینا، ان نظریات کی تائید ہے جو کسی طرح جائز نہیں، خواہ اس کے پاس کسی قسم کی ڈگری ہو، اور گلاسگو یونیورسٹی کی ڈگری بذات خود اسلامی علوم کے لحاظ سے کوئی قیمت نہیں رکھتی، بلکہ غیر مسلم ممالک کی یونیورسٹیوں میں مستشرقین نے اسلامی تحقیق کے نام پر اسلامی احکام میں شکوک وشبہات پیدا کرنے اور دین کی تحریف کا ایک سلسلہ عرصہ دراز سے شروع کیا ہوا ہے۔

ان غیر مسلم مستشرقین نے، جنہیں ایمان تک کی توفیق نہیں ہوئی، اس قسم کے کچھ ادارے درحقیقت اسلام میں تحریف کرنے والے افراد تیار کرنے کے لئے قائم کئے ہیں، اور ان کے نصاب و نظام کو اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ اس کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے۔ الا ماشاء اللہ۔ اکثر و بیشتر دجل وفریب کا شکار ہوکر عالم اسلام میں فتنے برپا کرتے ہیں۔ لہٰذا گلاسگو یونیورسٹی سے اسلامی علوم کی کوئی ڈگری نہ صرف یہ کہ کسی شخص کے مستند عالم ہونے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ اس سے اس کے دینی فہم کے بارے میں شکوک پیدا ہونا بھی بے جا نہیں۔

دوسری طرف بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جنہوں نے ان یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کیں، اور عقائد فاسدہ کے زہر سے محفوظ رہے، اگرچہ ان کی تعداد کم ہے، لہٰذا یہ ڈگری نہ کسی کے مستند عالم ہونے کی علامت ہے، اور نہ محض اس ڈگری کی وجہ سے کسی کو مطعون کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ اس کے عقائد واعمال درست ہوں۔

مذکورہ بالا جواب ان نظریات پر مبنی ہے جو سائل نے اپنے استفتاء میں ذکر کئے ہیں، اب کون شخص ان نظریات کا کس حد تک قائل ہے؟ اس کی ذمہ داری جواب دہندہ پر نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۱/۲/۱۴۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/۳۸۶)

بریلوی فرقے کا تعارف اور حکم

(عربی فتویٰ)

السؤال:-

الحمد لله رب العالمين، والصلوة السلام على رسول الله واله وصحبه أجمعين

شيخي الكريم العلامة محمد تقي العثماني حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

كل عام وأنتم بخير، وتقبل الله منكم الطاعات، واعاد الله هذا العيد عليكم وعلينا وعلى المسلمين باليمن والبركات. ارجو ان تكون وأسرتك وجميع أحبابك في خير وعافية، كما أرجو المعذرة في تأخر المراسلة، فقد انشغلت بالدراسة وأمور الاسرة والله المستعان

أرسلت اليكَ رسالة وبطاقة معايدة في عيد الفطر، فهل وصلاكَ؟

فهمت اشارتك وارجو التوفيق. وهو شرف ان اقوم بترجمة كتاب لك. لكنني مشغول بالاعداد للدكتوراه في حقوق التاليف. ومن اهم مراجعي كتابك (قضايا فقهية معاصرة) وسأقوم ان شاء الله بترجمة بعض كلامك، وأرسل لك ما ترجمته في حينه.

ما يقول الشيخ ايده الله في الطريقة البريلوية، اذ لا توجد هذه الطريقة في بلادنا، ولم أجد كتابا بالعربية يتحدث عنها سوى كتب لأحد علماء نجد، وقد رأيته غير منصف مع غير البريلوية. فلم أثق في حكمه أو نقله، فالرجاء بيان حالهم. فالناس بين محب غال او مبغض قال، والله الهادى للصواب والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

محمد علي محمد احداش

الجواب:-

الى فضيلة الأخ الكريم العلامة محمد علي محمد احداش، حفظه الله تعالى ورعاه

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد.

فقد تسلمت بسرور رسالتك الكريمة، ودعوت لك بالتوفيق والنجاح، وأن يوفقك الله تعالى لاتمام عملك كما يحبه ويرضاه، وقد سألتني عن أمرين -[1]

الأوّل بالنسبة للطريقة البريلوية وان هؤلاء يتميزون عن جمهور المسلمين في

---

(١) والسؤال الثاني يتعلق بعقد الاجارة، وسيجئ في بابه ان شاء الله (محمد زبير)

بعض العقائد والأعمال المبتدعة، فمن عقائدهم أن رسول الله صلى الله عليه وسلم عالم للغيب، ومطلع على جميع ما كان وما يكون، وأن روحه الشريفة متصرفة في الناس بالنفع والضرر، وأن امامهم الشيخ أحمد رضا خان البريلوی نشر فتوى التكفير ضد علماء ديوبند، حتى قال: من لم يكفرهم فهو كافر، وذلك لأنهم نقدوا هذه العقائد، وقالوا: ان علم الغيب صفة الله سبحانه وتعالى لا يشاركه أحد فيها، ولكنه سبحانه وتعالى يطلع رسله على ما يشاء من أنباء الغيب. ومن أعمالهم المبتدعة أنهم يحتفلون بأعياد لم تثبت من القرآن والسنّة، ومع ذلك يعتقدونها مستحبة، بل قد يعاملونها معاملة الواجبات من النكير الشديد على من لا يشاركهم فيها، وكذلك اخترعوا تقاليد عند موت أحد، مثل أن يقوم أهل الميّت بدعوة الناس في اليوم الثالث والعاشر والأربعين بعد وفاة مورثهم، وأن يصنع لهم طعاما ومن لم يفعل ذلك، فانه يلام أشد الملامة، وما الى ذلك من البدعات الكثيرة

والحديث عن هذه الطريقة يطول. ولكن ما ذكرته هو تصور حملى عن عقائدهم وأعمالهم، ويوجد فيهم من يفرط فيها ويغلو ويتعصب، ومن هو معتدل بالنسبة للآخرين.

والله سبحانه أعلم

محمد تقي العثماني عفي عنه

۱۴۲۶/۱/۵ھ

غلام احمد پرویز کے پیروکار کا حکم

سوال:- استفتاء از علمائے شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلے میں کہ مشہور منکرِ حدیث غلام احمد پرویز جس کو جمہور علمائے اُمت نے کافر قرار دیا ہے، اس کا ایک پیروکار، ہم عقیدہ، ہم مسلک بلکہ مسلکِ پرویز کا مبلغ مرگیا ہے، جبکہ جمہور علمائے اُمت نے پرویز کے متبعین کو بھی خارج از اسلام قرار دیا ہے۔ اس پرویزی پر اہلِ سنت والجماعت مسلمانوں کے ایک پیش امام نے نمازِ جنازہ پڑھائی، امامِ مذکور کا کیا حکم ہے؟ غلام احمد پرویز کا کیا حکم ہے؟ اور کس بناء پر اس پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے؟ اور کیا اس امام کی اقتداء دُرست ہے؟

جواب:- غلام احمد پرویز پر کفر کا فتویٰ ان کے عقائد و نظریات کی بنیاد پر لگایا گیا ہے،(۱) لہٰذا جو شخص ان کے عقائد و نظریات سے متفق ہو، وہ بھی انہی کے حکم میں ہے۔ اور کافر ہونے کی بناء پر اس

(۱) تفصیل کے لئے رسالہ ''علمائے اُمت کا متفقہ فتویٰ پرویز کافر ہے'' ملاحظہ فرمائیں۔

پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں، اگر کسی امام صاحب نے غلط فہمی یا ناواقفیت کی وجہ سے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ اِستغفار کریں۔ ایسی صورت میں دُوسرے مسلمان اپنی عام نمازوں میں ان کی اقتداء کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ میّت کو پرویزی تسلیم کرنے کے باوجود اس عمل کی صحت پر اصرار کرتے ہیں تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا دُرست نہیں۔

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۶۳/۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

فکرِ ولی اللّٰہی تحریک کا حکم

بعد از سلام عرض ہے کہ ہم خیریت سے ہیں، اور خداوند کریم سے آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتے ہیں۔

بعد از سلام عرض ہے کہ میں نے ایک عرض نامہ پہلے بھی بھیجا ہے، لیکن اس خط کا جواب ابھی تک نہیں ملا۔ عرض یہ ہے کہ ہم تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس فتویٰ کی حقیقت کیا ہے جو اس خط کے نیچے ہے، اور ہم نے مولانا شیخ الحدیث معز الحق کو عریضہ لکھا، انہوں نے یہ باتیں ہمیں لکھ کر دی ہیں۔ ہم نے یہاں کے مفتی رشید احمد صاحب کو کہا، انہوں نے کہا کہ علمائے کرام مشاورت عظمیٰ اور مفتیان صاحبان کے مشورے کے بعد بتائیں گے۔ یہ پُوچھنا چاہتے ہیں کہ چونکہ اس تنظیم کا گڑھ ہمارے نوشہرہ میں مسجد درزیاں ہے اور اس کا امام بھی یہاں مقرّر ہوگیا ہے، ہمیں بتائیں کہ ان کے پیچھے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ اور یہ کیسے لوگ ہیں؟ اور ان سے کیسا برتاؤ کرنا چاہئے؟

شکریہ

اہلِ مسجد درزیاں

مزاجِ گرامی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض یہ ہے کہ گزشتہ زمانے میں ہمارے مدرسے میں ایک عالم مسمّی مولوی خالد محمود، جو اپنے آپ کو تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کی طرف منسوب کرتا ہے، شاہ ولی اللہؒ کا ترجمان بتلاتا ہے، حسبِ ذیل نوعیت کی باتیں کرتا رہتا ہے:-

۱۔ مقصود اصلی قیام خلافت ہے، جب تک خلافت کا قیام نہ ہو اس وقت تک ایمان، اعمال، عبادات سب کچھ بیکار ہیں۔

۲:۔مقصود اصلی اتباع رسالت میں مقصد بعثت خصوصا "هو الذي ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون" کے بموجب سیاسی پاور کے حاصل کرنے کو سمجھنا ہے۔ باقی انفرادی عبادات و اطوار، وضع قطع نشست و برخاست میں اتباع رسالت بے کار ہے، اس کا چنداں فائدہ نہیں۔

۳۔ اعمال، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سے مقصود ہمہ جہتی تربیت فرد و معاشرہ ہے، لیکن زیادہ زور اجتماعی، سیاسی اور حکومتی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی تربیت پر ہے۔ اگر ان اعمال کا صرف روحانی حلقہ اثر تسلیم کیا جائے تو باقی مذاہب کی عبادات سے اسلامی عبادات کا تفوق کیسے ثابت کیا جائے؟ کیونکہ روحانی اثرات تو یوگ (Mysticism) اور تصوف و احسان و سلوک کے ایک جیسے ہیں۔

۴۔ جزا و سزا کا یہ تصور صرف متوسط اذہان کے لئے قابل قبول ہے، اعلیٰ اذہان کے لئے قابل فہم اور لائق قبول نہیں۔

۵:۔قرآن، مولویوں کے سلوک کے نتیجے میں بازیچہ اطفال بن گیا ہے، ماسوائے تعلیم الفاظ و معانی، آگے کوئی تعلیم و تربیت نہیں، ذہن سازی نہیں۔ جب نظام قرآنی نہ ہو تو صرف الفاظ کے رٹنے کا کیا فائدہ؟ چنانچہ حفظ قرآن ضیاع وقت ہے۔

۶۔ علماء عصر چونکہ عصر حاضر کے تقاضوں سے ناواقف ہیں، لہٰذا بقول امام محمد (من لم يعرف احوال زمانه فهو جاهل) جاہل ہیں۔ مدارس کے اندر تو ان کا حلقہ اثر و ارادت بڑا وسیع ہے، لیکن مدارس سے باہر بحیثیت پیداوار مدارس کے ایک معمولی سے دائرہ پر بھی ان کا بس نہیں چلتا۔ چنانچہ ان علماء کا معاشرے میں کوئی قابل قدر کردار نہیں، یہ علماء معاشرے کا عضو معطل ہیں۔

۷۔ جنت کا عام معروف تصور ذہنی کا نتیجہ ہے، اصل میں جنت دنیا کا مستقبل ہے، دنیا اس کی اساس ہے۔ چنانچہ اس دنیا سے کا حق ضرور ہے وہ پیداوار اقتدار نہیں بن سکتا، جو دنیا میں محدود، تکالیف، مصائب اور غربت و کمپرسی میں مبتلا ہو وہ آخرت میں کامیاب و خوش کیسے رہ سکتا ہے؟

۸۔ جنت سے متعلق عام احادیث محض خوش فہمی ہیں، جب بندہ کچھ نہ کر سکے تو پھر ازواج جنت کا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ "کافر کو ملے حور و قصور اور مومن کو فقط وعدۂ حور"۔

۹۔ امام مہدی کا تصور و عقیدہ بھی محض مردہ قوموں کا تخیل ہے۔

۱۰۔ یاجوج و ماجوج چین اور روس کی قومیں ہیں، ان سے متعلق معروف تصور ٹھیک نہیں۔

۱۱- داڑھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بشری عادت ہی تو تھی، اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟

۱۲- علمائے عصر کی پاکستانی تنظیمیں امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال ہو رہی ہیں۔

۱۳- تبلیغی جماعت کی محنت کے نتیجے میں جو اسلام دنیا میں آئے گا، اس پر چھاپ امریکی اور یورپی ہوگی، اور یوں مغربی دُنیا اس کا سہارا لے کر اپنے معاشی، سیاسی، سامراجی اہداف حاصل کرے گی۔

۱۴- جہادِ افغانستان میں امریکہ نے غریب اور سادہ لوح مولویوں کو جہاد کا پُرفریب اور خوش کن جھانسہ دے کر اسلام کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا ہے۔

۱۵- موجودہ اسلامی تصور امریکی خواہش کے زیرِ اثر پنپ چکا ہے، حالانکہ اگر مسلمان رُوس کا ساتھ دیتے تو رُوس ان کے لئے نسبتاً زیادہ دور رہتا، لیکن مسلمان ہمیشہ جذباتی رہا، مسلم جماعتوں کا جھکاؤ امریکہ کی جانب ہی رہا۔

۱۶- تقدیر کا موجودہ اور معروف تصور بھی غلط ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے پرانی وسابقہ حالت پر رکھے چھوڑا، کیونکہ ابتدائی اسلامیوں (صحابہؓ) میں اسے سمجھنے کی استعداد نہ تھی، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلے کو نہ چھیڑ کر عمل کی طاقت کی بناء پر انقلاب کی راہیں ہموار کیں۔

۱۷- تھانوی لائن کے علماء ہمیشہ حکومتی خواہشات کے لئے استعمال ہوتے رہے، نتیجتاً انہیں سرکار کی جانب سے نوازا جاتا رہا، اور مدنی لائن کے علماء کو اپنے حریت پسند جذبات کی بناء پر ہمیشہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

۱۸- "اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللہُ لَکُمْ قِیٰـمًا" (الآیۃ) اور "مِنَ الذُّنُوْبِ ذُنُوْبٌ لَا یُکَفِّرُھَا اِلَّا الْھَمُّ فِی الْمَعِیْشَۃِ" (الحدیث) جیسے استدلالات سے عموماً یہ باور کرایا جاتا ہے کہ جب تک معاشی مساوات نہ ہو معاشرے کی اصلاح نہیں ہوسکتی، قبض وبسط کی تشریح بھی مختلف انداز سے کرتا ہے۔

۱۹- ذاتی ملکیت کا ایک حد تک جواز ہے، لیکن انقلاب کی راہیں ہموار کرتے وقت ذاتی ملکیت ثابت نہیں ہوسکتی، کیونکہ ابتداء حضرت عثمانؓ اور عبدالرحمن بن عوفؓ کا مال واسباب اپنی ذات سے زیادہ راہِ انقلاب میں خرچ ہوتا رہا۔

۲۰- خمینی انقلاب اُمتِ مسلمہ کے لئے خوش آئند ہے۔

۲۱- طالبانِ افغانستان سادہ لوح لوگ ہیں، یہ حکومتی مزاج سے ناواقف ہیں، حکومت چلانا ان کے بس کی بات نہیں۔ مسائلِ حاضرہ اور موجودہ تعلیم سے یہ ناواقف ہیں۔ فرمایئے ان عقائد کی حامل "تحریک فکرِ ولی اللّٰہی" کا کیا حکم ہے؟

جواب- فکرِ ولی اللّٰہی محض ایک دھوکا ہے، عام طور سے یہ لوگ حضرت شاہ صاحب کے

نام کی آڑ میں اشتراکی نظریات کا پرچار کر رہے ہیں۔

واللہ اعلم
۱۴۱۹/۳/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵ ۳۱۹)

''گروپ آف لبرل مسلمز تحریک'' کے قیام پر
حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دُعائے صحت، درازیٔ عمر اور بلندیٔ ایمان کے ساتھ جناب والا کی خدمتِ عالیہ میں مؤدبانہ عرض ہے کہ قیامِ وطنِ عزیز کے مقاصد کی تکمیل باون سالوں میں بھی نہ ہونے کا اصل سبب ہماری تعلیماتِ قرآنِ کریم سے عدم توجہی، غفلت اور کوتاہی ہے۔ اگرچہ ہر سابق حکومت نے اسلام کے نام پر قوم کو فریب دیا، لیکن قرآنی تعلیمات سے ناآشنائی اور عدم توجہی ہمارے مذہبی راہنماؤں کی کوتاہی اور غفلت بھی ہے، جو بنیادی حقیقت ہے، یہی ہماری باہمی نفرتوں اور اختلافات کا اصل سبب بھی ہے۔ الحمدللہ نوجوان نسل میں پیار و اُنسیت اُجاگر کرنے، نفرتوں کو مٹانے، نیز وحدتِ اسلامی کے نیک مقاصد کی تکمیل کے لئے ''گروپ آف لبرل مسلمز'' کا قیام وجود میں آیا ہے۔

ہمارا مقصد سوائے اصلاح کے کچھ نہیں، ایک معتدل معاشرہ اور اُخوتِ اسلامی کو اُجاگر کرنے اور فہمِ قرآنِ کریم نوجوان نسل خاص کر حفاظ مسلمان بنات اور شبان کو معانیٔ قرآنِ کریم سیکھنے کی دعوت اور اس پر عمل کی ترغیب ہمارا مقصد ہے، کیونکہ ذہنی انقلاب اور اسلامی تعلیمات سے آگاہی کے بغیر نفاذِ اسلام کی عملی صورت نظر نہیں آتی۔ مشن کی کامیابی کے لئے دُعا کی درخواست ہے۔ عقیدت واحترام کے ساتھ! جواب کا انتظار رہے گا۔

جواب:- جس مقصد کے لئے آپ نے یہ تنظیم قائم کی ہے، وہ بڑا مبارک ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی رضا کے مطابق ملک وملت کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

البتہ ایک گزارش یہ ہے کہ آپ نے اپنے نام میں ''لبرل'' (Liberal) کا جو اضافہ کیا ہے، اس کے بارے میں یہ طے کرلینا چاہئے کہ اس کا کیا مقصد ہے؟ اور کن لوگوں کو اس لفظ کے ذریعہ Exclude (خارج) کرنا مقصود ہے، اس سوال کا صحیح جواب متعین کرنے سے پہلے یورپ کے لبرلزم کی تاریخ کا مطالعہ بھی مفید ہوگا کہ اس لبرلزم کی تحریک وجود میں آنے کے کیا اسباب تھے؟ کیا وہ اسباب ہمارے یہاں موجود ہیں؟ دوسرے اس لبرلزم کے کیا نتائج نکلے؟ اور کیا وہ نتائج ہمیں بھی مطلوب ہیں؟

اُمید ہے کہ ان سوالات پر معروضی مطالعے کے ذریعہ غور وفکر فرمائیں گے۔ والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عُفی عنہ
از طیارہ براہ لاہور
۱۴۲۰/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۴۰۰/۲۹)

(یہ جواب طیارے سے لکھ رہا ہوں، اس لئے الگ کاغذ پر نہیں لکھ سکا، معذرت خواہ ہوں)

روافض کو علی الاطلاق کافر نہ قرار دینے کی وجہ

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ ''بینات'' والوں نے دو نمبر روافض کے بارے میں شائع کئے ہیں، ٹائٹل پر لکھا ہے کہ ''علماء کا متفقہ فیصلہ یعنی شیعہ کافر ہے''۔ اس میں ہند و پاک کے بڑے بڑے علماء کے دستخط موجود ہیں۔ آپ کے دستخط نظر سے نہیں گزرے، اور ہمارے ایک دوست کا کہنا یہ ہے کہ مولانا محمد رفیع صاحب کو شیعہ روافض کی تکفیر کے بارے میں تردّد ہے۔ برائے مہربانی آپ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں کہ کیا واقع ایسا ہے کہ آپ شیعوں کو کافر نہیں سمجھتے؟

فقط والسلام
آپ کا مخلص
احقر حافظ مشتاق احمد

جواب:- جو شیعہ کفریہ عقائد رکھتے ہوں، مثلاً قرآن کریم میں تحریف کے قائل ہوں یا یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ حضرت جبریل علیہ السلام سے وحی لانے میں غلطی ہوئی، یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگاتے ہوں، ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن یہ بات کہ تمام شیعہ یہ یا اس قسم کے کافرانہ عقائد رکھتے ہیں، تحقیق سے ثابت نہیں ہوئی۔ اور کئی شیعہ یہ کہتے ہیں کہ الکافی یا اُصول الکافی وغیرہ میں جتنی باتیں لکھی ہیں، ہم ان سب کو دُرست نہیں سمجھتے۔ دوسری طرف کسی کو کافر قرار دینا چونکہ نہایت سنگین معاملہ ہے، اس لئے اس میں بے حد احتیاط ضروری ہے۔ اگر بالفرض کوئی تقیہ بھی کرے تو وہ اپنے باطنی عقائد کی وجہ سے عنداللہ کافر ہوگا، لیکن فتویٰ اس کے ظاہری اقوال پر ہی دیا جائے گا۔ اسی لئے چودہ سو سال میں علمائے اہل سنت کی اکثریت شیعوں کو علی الاطلاق کافر کہنے کے بجائے یہ کہتی آئی ہے کہ جو شیعہ ایسے کافرانہ عقائد رکھے، کافر ہے۔ اور یہی طریقہ بیشتر اکابر علمائے دیوبند کا رہا ہے، اور چونکہ جمہور علماء کے اس طریقے میں کوئی تبدیلی لانے کے لئے کافی دلائل محقق نہیں ہوئے، اس لئے دارالعلوم کراچی، حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے وقت سے اکابر کے اسی طریقے کے مطابق فتویٰ دیتا آیا ہے کہ جو شیعہ ان کافرانہ عقائد کا قائل ہو، وہ کافر ہے، مگر علی الاطلاق ہر شیعہ کو خواہ اس کے عقائد کیسے بھی ہوں، کافر قرار دینے سے جمہور علمائے امت کے مسلک کے مطابق

تقیہ کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شیعوں کی گمراہی میں کوئی شبہ ہے، جن شیعوں کو کافر قرار دینے سے احتیاط کی گئی ہے، بلاشبہ وہ بھی سخت ضلالت اور گمراہی میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان گمراہیوں سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائیں، آمین۔

واللہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۱۴ھ

سرسیّد احمد خان کے نظریات اور تبلیغی جماعت کے بارے میں حکم

سوال:- زید اکثر دوستوں یا عام مجالس میں سرسیّد کی تعریف کرتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ سرسیّد نے قوم کو بیدار کیا، مسلمانوں کو آزادی ان کی تعلیمات ہی کی بناء پر ہوئی۔ بکر کہتا ہے کہ شعور اور بیداری مسلمانوں کو قرآن و سنتِ نبوی ہی سے ہوسکتی ہے، اور آزادی کی خاص وجہ علمائے حق کی قربانیاں ہیں۔ نیز بکر یہ بھی کہتا ہے کہ سرسیّد نے فرشتوں اور جنات کے وجود کا انکار کیا ہے، اور یہ فعل صریح کفر ہے، سرسیّد کے بجائے علمائے حق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

مسلمانوں کا زوال و پستی انگریزی تعلیم سے محروم رہنا ہے، وہ یہ بھی کہتا ہے۔ مگر بکر اس کا قائل نہیں، زوال کی وجہ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل نہ کرنا ہے۔

نیز زید تبلیغی جماعت کو نہایت سست کہتا ہے، اور کہتا ہے کہ ان کا طریقہ سنت کے خلاف ہے، جبکہ بکر کہتا ہے کہ تبلیغی جماعت صحیح راستے پر گامزن ہے، ان کا ہر قول و فعل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کے مطابق ہے، یہی وجہ ہے کہ کثرت سے غیر مسلم مشرف باسلام ہوئے ہیں۔ نیز زید ظاہری شکل و صورت کا بھی بالکل قائل نہیں، مسلم داڑھی اور لباس وغیرہ فرائض سے لازمی نہیں۔ آپ ہم کثیر پاکستانیوں کی رہنمائی فرمائیں۔ 　　　　طالب الحق، ریاض، سعودی عرب

جواب:- بکر کی باتیں دُرست ہیں، سرسیّد احمد خان صاحب کے دینی نظریات جو انہوں نے اپنی تفسیر میں بیان کئے ہیں، انتہائی گمراہانہ ہیں[1]، اور تبلیغی جماعت ماشاء اللہ اچھی دینی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس کے افراد کے کسی عمل یا کام پر تنقید کی جاسکتی ہے، لیکن بحیثیت مجموعی جماعت کو برا بھلا کہنا بہت بُرا کام ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۴ / ۳۲ ج)

---

(۱) سرسیّد اور ان کے نظریات سے متعلق تفصیلی حکم کے لئے امداد الفتاویٰ ج ۶ ص ۱۶۶ تا ۱۸۵ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) تبلیغی جماعت سے متعلق عبارت ... ت بہ نامہ ... کتاب فتاویٰ کی جلد کی "فصل فی الدعوة والتبلیغ" میں ملاحظہ فرمائیں۔
(محمد ... عفی عنہ)

کتاب السُّنَّۃ والبدعۃ

(سنت اور بدعت سے متعلق مسائل کا بیان)

فرض نماز کے بعد "اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ" پڑھنا

سوال:- اگر فرض نماز کے بعد "انّ اللہ وملٰئکتہٗ ... الخ" والی آیت پڑھے تو شریعت میں کیا حکم ہے؟ اور کیا بدعت، حسنہ بھی ہوسکتی ہے؟

جواب:- آج کل جس طرح اس آیت کو پڑھنے کا التزام کیا جاتا ہے کہ اس کے تارک پر ایسی نکیر کی جاتی ہے جیسے فرائض کے تارک پر کی جاتی ہے، تو یہ بدعت سیئہ ہے، اور "بدعت" اصطلاحی معنوں میں صرف سیئہ ہی ہوتی ہے، حسنہ نہیں ہوتی، بقولہ علیہ السلام "کل بدعة ضلالة"۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۴/۲۸ ب)

نیاز فاتحہ کا حکم

سوال:- اگر کسی نے کچھ پکا کر نیاز فاتحہ دیا تو کیا جب تک نیاز فاتحہ نہ دیا جائے، تقسیم کرنا ممکن نہیں؟

جواب:- نیاز فاتحہ کا مروّجہ طریقہ ہی شریعت کی رُو سے دُرست نہیں ہے۔ ہاں! اگر کسی بزرگ کی رُوح کو ایصالِ ثواب کرنا ہے تو کھانا پکا کر کسی کو صدقہ کردیا جائے، اور یہ دُعا کرلی جائے کہ اللہ تعالیٰ اس صدقے کا ثواب فلاں کو پہنچادے، یہ جائز ہے، اور اس نیت سے کرنے کے لئے نیاز فاتحہ کی ضرورت نہیں ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۵/۲ھ

---

(۱) رواه أحمد وأبوداؤد والترمذي وابن ماجة، راجع إلى مشكوة المصابيح باب الاعتصام بالكتاب والسنة ج ۱ ص ۳۰ (طبع قديمي كتب خانه)، وفي مرقاة المفاتيح لأبي الحسن المباركفوري الهندي ج ۱ ص ۲۶۴ (طبع بنارس هند). والمراد بالبدعة ما أحدث في الدين مما لا أصل له في الشريعة يدل عليه وما كان له أصل من الشرع يدل عليه فليس ببدعة شرعا وإن كان بدعة لغة وأما ما وقع في كلام السلف من استحسان بعض البدع فإنما ذلك في البدع اللغوية لا الشرعية ... فالبدع الشرعية كلها مذمومة لأنها موجبة للضلال والغواية. وفي التعليق الصبيح على مشكوة المصابيح للشيخ محمد ادريس الكاندهلوي ج ۱ ص ۸۸ (طبع دار احياء التراث العربي بيروت) فالبدعة في عرف الشرع مذمومة بخلاف اللغة فإن كل شئ أحدث على غير مثال يسمى بدعة سواء كان محمودا أو مذموما ... الخ. نیز دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۳۷ (طبع ادارہ اسلامیات)۔ (محمد زبیر حق نواز)

کسی بزرگ کے مزار پر اجتماعی قرآن خوانی کرنا

سوال:- کسی بزرگ کے مزار شریف پر اجتماعی حیثیت سے بہ نیت ایصالِ ثواب قرآن خوانی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- ایصالِ ثواب جائز ہے اور وہ ہر جگہ، ہر وقت ہوسکتا ہے، مگر کسی کی قبر پر اجتماعی طور سے قرآن خوانی کرکے ایصالِ ثواب کرنے کا صحابہ کرامؓ سے کوئی ثبوت نہیں ہے، لہٰذا اس طریقے سے اجتناب بہتر ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح — احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ — ۱۳۸۸/۲/۲ھ

ختمِ قرآن کے موقع پر مسجد میں چراغاں کرنا اور مٹھائی تقسیم کرنا

سوال:- ماہِ رمضان میں ختمِ قرآن پر مسجد کو سجانا، روشنی کرنا اور قراءت کا مقابلہ وغیرہ کرنے کے بعد مٹھائی تقسیم کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- مسجد میں چراغاں کرنا اسراف ہے، اور کسی حال جائز نہیں[1]، قراءت کا مقابلہ اگر بچوں میں قرآنِ کریم کی ترغیب کی غرض سے ہو تو اس کی گنجائش ہے، لیکن آج کل اس طرح نام ونمود اور تفاخر کی غرض سے جو مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں، ان سے احتراز لازم ہے۔ جہاں تک مٹھائی تقسیم کرنے کا تعلق ہے، اس کا مسئلہ یہ ہے کہ مسجد کی رقم سے مٹھائی تقسیم کرنا جائز نہیں، ہاں! اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے مٹھائی تقسیم کرے اور اسے مسنون اور لازم بھی نہ سمجھے تو اس کی گنجائش ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۰۰ / ۳۲ ج)

سفر کرکے بزرگ کے مزار کی زیارت کرنا

سوال:- زید کبھی کبھار اسّی نوّے میل سفر کرکے کسی بزرگ کی قبر پر چلا جاتا ہے، خیال یہ ہوتا ہے کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتے ہیں، اس مقبرے پر بعض مشرکانہ افعال بھی کئے جاتے

---

(۱) وقال العلامة الشاطبي في الاعتصام ج ۲ ص ۲۷۳ (طبع دار المعرفة بيروت): إن الزين ليس يقصد في المساجد من شأن السلف الصالح ولا كان مما تزين به المساجد البتة، ثم أحدث التزيين بها حتى صارت من جملة ما يعظم به رمضان واعتقد العامة هذا... وبعد أسطر.... ومثله إيقاد الشمع بعرفة ليلة الثامن ذكر النووي أنها من البدع القبيحة وأنها ضلالة فاحشة جمع فيها أنواع من القبائح، منها إضاعة المال في غير وجهه، ومنها إظهار شعائر المجوس وقد ذكر الطرطوشي في إيقاد المساجد في رمضان بعض هذه الأمور، وذكر أيضا في قبائح سواها (مرتب عفی عنہ)

ہیں، کیا اس طرح جانا جائز ہے؟

جواب:- اگر زید شرک وبدعت کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہو، اور اسے اعتماد ہو کہ وہاں شرک وبدعت میں مبتلا نہیں ہوگا، تو اس کے لئے جانا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

قال ابن حجر فی فتاویہ: ولا تترک (أی الزیارۃ) لما یحصل عندھا من منکرات ومفاسد ... لأن القربات لا تترک لمثل ذلک بل علی الانسان فعلھا وانکار البدع بل وازالتھا ان أمکن. اھ. (شامی ج:۱ ص:۸۴۳)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۲۰/۱۰/۱۳۸۷ھ[2]

فرض نماز اور عیدین کے بعد مصافحہ ومعانقہ کا حکم

سوال:- عموماً عیدین (عیدالفطر وعیدالاضحیٰ) کی نماز کے بعد نمازی مسجد کے اندر ہی خطبے اور دعا کے بعد ایک دوسرے کو عید مبارکباد کہتے ہوئے مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کو ضروری سمجھتے ہیں، کچھ رسم پوری کرنے کی غرض سے، اور کچھ سنت کی غرض سے مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں۔ نمازیوں میں کچھ حضرات بزرگ ہوتے ہیں، ان کے متعلق اللہ والا ہونے کا حسنِ ظن لوگ رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ایسا کرنے سے فیض حاصل ہوگا اور نیکیوں پر مدد ملے گی، وہ نہ اس کو رسم سمجھ کر کرتے ہیں اور نہ ضروری سمجھ کر بلکہ نیک لوگوں کی عقیدت سے معانقہ کرتے ہیں، آیا یہ فعل سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، آثارِ صحابہؓ یا فتاویٰ ائمہ اربعہ سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب:- دو مسلمانوں کی ملاقات کے وقت مصافحہ مسنون ہے، نیز کوئی شخص سفر سے آئے تو اس سے معانقہ کرنا بھی سنت سے ثابت ہے، ان دونوں مواقع کے علاوہ سنت نہیں، لیکن اگر سنت سمجھے بغیر، اتفاقاً کبھی کرلے تو گناہ بھی نہیں، اور سنت سمجھ کر کرے تو بدعت ہے۔ ہمارے زمانے میں چونکہ فرض نمازوں کے بعد مصافحہ اور عیدین کے بعد معانقہ کو سنت سمجھا جانے لگا ہے حالانکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، اس لئے علماء نے اس کو بدعت قرار دیا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، لیکن کہیں اعتقادِ سنت کی یہ علت نہ ہو تو مباح ہے۔

فی ردّ المحتار: قد نقل ان المواظبۃ علیھا بعد الصلوات خاصۃ قد یؤدی الجھلۃ الی اعتقاد سنیتھا فی خصوص ھذہ المواضع، وان لھا خصوصیۃ زائدۃ علی غیرھا مع ان ظاھر کلامھم انہ لم یفعلھا أحد من السلف فی ھذہ المواضع ... ونقل فی تبیین المحارم عن

---

(۱) شامی ج:۲ ص:۲۴۲ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) یہ فتویٰ "البلاغ" کے شمارہ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

الملتقط أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلوة ولأنها من سنن الروافض اهـ ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية أنها بدعة مكروهة، لا أصل لها في الشرع، وأنه ينبه فاعلها أوّلًا ويعزر ثانيًا الخ (رد المحتار، باب الاستبراء وغيره من كتاب الحظر والاباحة، ومثله في عزيز الفتاوى)۔[1][2]

واللہ اعلم
۲/۱/۱۳۹۹ھ
(فتوی نمبر ۷۰/۲۸ الف)

نماز کے بعد یا مہمان سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا

سوال ۱:- فرض نماز کے بعد خصوصاً اور عصر کی نماز کے بعد دعا سے فارغ ہو کر مصافحہ کرنا، آپس میں ہاتھ ملانا اور امام صاحب کا مصلے پر کھڑے ہو کر ہاتھ ملانا لازمی ہے یا نہیں؟

۲- اگر کوئی مہمان مسجد میں نماز کے بعد مصافحہ کرنا چاہے تو اس سے مصافحہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- ہرگز لازم نہیں، بلکہ لازم یا ثواب وسنت سمجھ کر مصافحہ کرنا بدعت ہے، اور اس کا ترک واجب ہے۔[3]

۲- مہمان سے پہلی ملاقات میں مصافحہ مسنون ہے،[4] اس نیت سے مصافحہ درست ہے۔

واللہ اعلم
۲۹/۸/۱۳۹۷ھ
(فتوی نمبر ۸۸۴/۲۸ ج)

میت کے سرہانے بیٹھ کر یا قبرستان لے جاتے وقت کلمہ پڑھنا

سوال:- میت کی چارپائی کے پاس بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر کلمۂ طیبہ بلند آواز سے پڑھنا یا میت کو قبرستان کی طرف لے جاتے وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا کیسا ہے؟

جواب:- دونوں حالتوں میں کلمۂ طیبہ پڑھنا درست ہے، مگر اس کو لازم اور ضروری نہ سمجھا

(۱) فتاوی شامیة ج ۶ ص: ۳۸۱، نیز دیکھئے امداد الفتاوی ج ۵ ص ۲۴۰، امداد الاحکام ج ۱ ص ۱۹۵۔

(۲) عزیز الفتاوی ص ۲۸۔

(۳) وفي الشامية ج ۶ ص ۳۸۱ طبع سعيد، ونقل في تبيين المحارم عن الملتقط أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلوة بكل حال لأن الصحابة رضي الله عنهم ما صافحوا بعد أداء الصلوة ولأنها من سنن الروافض إلى أن قال ابن حجر فاعله لما أتى به من خلاف السنة. نیز دیکھئے امداد الفتاوی ج ۵ ص ۲۴۰، عزیز الفتاوی ص ۱۲۸، امداد الاحکام ج ۱ ص ۱۹۵۔

(۴) وفي الشامية أيضا وموضع المصافحة في الشرع إنما هو عند لقاء المسلم لأخيه لا في أدبار الصلوات

جائے، اور بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۸ /۱۸ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کفن پر کلمۂ طیبہ لکھنا

سوال:- کفن پر کلمۂ طیبہ لکھنا آپ کے خیال میں کیسا ہے؟

جواب:- جائز تو ہے، لیکن چونکہ صحابہ کرامؓ، سلف صالحین سے منقول نہیں اس لئے نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔ (۲)

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۸ /۱۸ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

جشنِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی حیثیت

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ ایک جمعہ مسجد میں یہ اعلان کردیا جائے کہ فلاں تاریخ کو جلسہ جشن عید میلاد ہوگا، اور بعد میں ایک آدمی کے کہنے پر فلاں مولوی اس مسجد میں تقریر کرنے نہ آئے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ناراض ہے، کچھ چند آدمی اس کا ساتھ دے کر جلسہ ملتوی کردینے کا اعلان کردیں، باقی عوام کا خیال نہ رکھیں۔ شریعت کی رو سے مسئلہ حل کرکے ممنون کریں۔ والسلام

جواب:- جشن عید میلاد کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، (۳) البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) في البحر الرائق ج ۲ ص ۲۳۳ كره فيها رفع صوت بذكر أو قراءة فتح وفي السراجية [illegible] كره [illegible] وقيل [illegible] في الجنازة [illegible] وينبغي لمن تبع الجنازة أن يطيل الصمت، وفيه عن الظهيرية فإن أراد أن يذكر الله تعالى يذكره في نفسه لقوله تعالى إنه لا يحب المعتدين أي الجاهرين بالدعاء، وعن إبراهيم أنه كان يكره أن يقول الرجل وهو يمشي معها استغفروا له غفر الله لكم [illegible] وذكر [illegible] بدعة، أحدث في هذا الزمان وفي الفتاوى الهندية على هامش الهندية ج [illegible] ص [illegible] طبع مكتبة رشيدية كوئٹہ ويكره رفع الصوت بالذكر فإن أراد أن يذكر الله يذكره في نفسه وعن إبراهيم كانوا يكرهون أن يقول الرجل وهو يمشي معها استغفروا له غفر الله لكم ..... الخ

(۲) تفصیل کے لئے [illegible] ص ۹۹۔

(۳) وفي الإبداع في مضار الابتداع ص [illegible] طبع مكتبة علمية مدينة المنورة قيل إن أول من أحدثها بالقاهرة الخلفاء الفاطميون في القرن الرابع فابتدعوا ستة موالد [illegible] ثم عدت في خلافة الحاكم بأمر الله في سنة أربع وعشرين وخمسمائة بعد ما كاد الناس ينسونها وأول من أحدث المولد النبوي بمدينة إربل الملك المظفر أبو سعيد في القرن السابع وقد استمر العمل بالمولد إلى يومنا هذا وتوسع الناس فيها وابتدعوا بكل ما تهواه أنفسهم وتوحيه إليهم الشياطين

جشن عید میلاد کی تاریخی و شرعی حیثیت سے متعلق [illegible] تفصیلات [illegible]

کے ذکر مبارک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو سننے اور سنانے کے لئے کوئی مجلس کسی خاص دن یا تاریخ کی قید کے بغیر منعقد کی جائے تو درست ہے، بشرطیکہ اس کا مقصد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک سے برکت حاصل کرنا اور سیرت طیبہ پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا ہو، نام و نمود مقصود نہ ہو۔

صورت مسئولہ میں اگر محفل اسی غرض کے لئے منعقد کی گئی تھی تو ٹھیک تھی، لیکن اگر کسی مصلحت سے اسے ملتوی کر دیا گیا تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں، مثلاً یہ کہ کوئی عالم سیرت بیان کرنے کے لئے موجود نہ ہو یا کسی فتنے فساد کا اندیشہ ہو۔ ہاں! اگر کسی عذر کے بغیر جلسہ ملتوی کر دیا گیا تو اس میں حاضرین کو خواہ مخواہ تکلیف پہنچانے کا گناہ ہوگا۔

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۶/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۶ / ۳۱ ج)

شادی کے موقع پر لوگوں کو سفید پگڑیاں دینا
ختنہ کے موقع پر لوگوں کو جمع کرنا

سوال ۱:- ہمارے ہاں شادی کے طریقے جب دولہن کو رخصت کیا جاتا ہے تو سفید پگڑیاں عطا کی جاتی ہیں، یہ لوگ یہ پگڑیاں باندھ کر یا ہاتھ میں لے کر اپنے گھروں کو جاتے ہیں اور یہ ایک بڑی عزت کی بات سمجھی جاتی ہے، آیا یہ طریقہ جائز ہے یا رسم ہے؟

۲:- اور ختنے کے موقع پر لوگوں کو جمع کرنا سنت ہے یا بدعت؟

جواب ۱:- یہ رسم اگر سنت سمجھ کر کی جاتی ہے تو بدعت اور واجب الترک ہے، اور اگر سنت نہیں سمجھا جاتا لیکن اس کی ایسی پابندی کی جاتی ہے جیسے فرض و وجوب کی کی جاتی ہے، اور نہ کرنے کو برا سمجھا جاتا ہے تب بھی یہ ناجائز ہے، اور اگر ان باتوں سے پرہیز کرتے ہوئے محض خوش دلی سے کسی دباؤ کے بغیر دیا جاتا ہے اور بدلے کی توقع بھی نہیں ہوتی تو جائز ہے۔

۲ - سنت سمجھ کر جمع کرنا یا اس کی سنتوں کی طرح پابندی کرنا اور نہ کرنے والے کو برا سمجھنا

([illegible])

۱ - فتاویٰ میلاد شریف — مجموعہ فتاویٰ حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی، حضرت گنگوہی، حضرت تھانوی رحمہم اللہ

۲ - فیصلہ ہفت مسئلہ — حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ

۳ - تذکرۃ [illegible] — [illegible] رحمہ اللہ

۴ - انصاف فیما قیل فی المولد — [illegible]

۵ - [illegible] (ج [illegible] ص ۲۰۵) — مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ

۶ - راہ سنت (ص ۲۵) — حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر دامت برکاتہم

۷ - تاریخ میلاد — [illegible] عبدالشکور صاحب مرزاپوری

(محمد زبیر حق نواز)

بدعت اور واجب الترک ہے۔[1]

والله سبحانہ اعلم
۱۸/۱/۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸/۷۲)

نماز کے بعد مصافحہ کرنے کا حکم

سوال:- نماز کے بعد لوگ جو مصافحہ کرتے ہیں، یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نماز کے بعد مصافحہ کو جس طرح لازم اور نماز کا جزء سمجھ لیا گیا ہے، وہ بدعت اور واجب الترک ہے۔[2] ہاں! کسی آدمی سے اسی وقت ملاقات ہوئی تو ملاقات کے مصافحہ کی نیت سے مصافحہ کرلیں،[3] نماز کے بعد کی نیت سے نہیں۔

والله سبحانہ اعلم
۱/۱۰/۱۳۹۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۰/۳۰)

بزرگ یا پیر کی نیاز اور میّت کی مختلف رُسومات کا حکم

سوال ۱:- اکثر لوگ کہتے ہیں کہ آج فلاں پیر یا بزرگ کی نیاز ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ جائز ہے یا نہیں؟

۲:- میّت اور اس سے متعلق مختلف رُسومات ہمارے یہاں رائج ہیں، اس سلسلے میں شرعی اَحکام کیا ہیں؟

جواب ۱:- آج کل نیاز کے نام سے جو رسمیں رائج ہیں، قرآن وسنت اور شریعتِ مطہرہ میں ان کا کوئی ثبوت نہیں، ان بدعات کو ترک کرنا واجب ہے۔[4] البتہ کسی بزرگ کے ایصالِ ثواب کا طریقہ یہ ہے کہ جتنی توفیق ہو نقد روپیہ یا کھانا، کپڑا صدقہ کرکے اس کا ثواب خاموشی سے ان بزرگ کو پہنچا دیا جائے، اس غرض کے لئے یہ دعوتیں اور اجتماعات کرنا شرعاً ناجائز اور بدعت ہے۔

---

(۱) وفي مسند أحمد ج:۴ ص ۲۱۷ (طبع مؤسسة قرطبة مصر) عن الحسن قال: دعي عثمان بن ابي العاص الى ختان فأبى أن يجيب فقيل له فقال: انا كنا لا نأتي الختان على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا ندعى له، وكذا في المعجم الكبير للطبراني رحمه الله، رقم الحديث ۸۳۸۲ ج ۹ ص ۵۷ (طبع مكتبة العلوم موصل) نیز دیکھئے مدد المفتین ص ۲۰۱

(۲) وفي الشامية ج:۶ ص: ۳۸۱ (طبع سعيد) ونقل في تبيين المحارم عن الملتقط أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلوة بكل حال، لأن الصحابة رضي الله عنهم ما صافحوا بعد أداء الصلوة ولأنها من سنن الروافض الى ان قال) ويزجر فاعله لما أتى به من خلاف السنة. تفصیل کے لئے امداد الفتاوی ص ۲۶۰ ج ۶، نیز منتخبات فتاویٰ ص ۱۲۸، امداد الاحکام ج ۱ ص ۱۹۵ دیکھئے۔

(۳) وفي الشامية ج:۶ ص:۳۸۱ (طبع سعيد) وموضع المصافحة في الشرع انما هو عند لقاء المسلم لأخيه لا في ادبار الصلوات

(۴) وفي الدر المختار ج ۲ ص:۴۳۹ (طبع سعيد) واعلم أن النذر الذي يقع للاموات من اكثر العوام وما يؤخذ من الدراهم والشمع والزيت ونحوها الى ضرائح الاولياء الكرام تقربا اليهم فهو بالاجماع باطل وحرام ما لم يقصدوا صرفها للفقراء الأنام وقد ابتلى الناس بذلك وكذا في البحر الرائق ج ۲ ص ۲۹۸ (طبع سعيد) (محمد زبیر حق نواز)

۲- بہشتی زیور اور بہشتی گوہر میں جنازے اور میّت کے اَحکام تفصیل سے موجود ہیں، اس کا مطالعہ فرمائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۷/۱۲/۱۴۰۰ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۶/۳۸ و)

عرس اور برسی کی شرعی حیثیت

سوال:- عرس و برسی کی شریعت میں کیا حیثیت ہے؟

جواب:- عرس اور برسی کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، یہ سب انسانوں کی ایجاد کردہ بدعات ہیں جن سے پرہیز لازم ہے۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۵/۱۱/۱۴۰۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲/۱۷۱۲ ج)

نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا

سوال:- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی صحابی کی نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی یا نہیں؟ نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا کیسا ہے؟

جواب:- نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، نہ دُوسرے صحابہ کرامؓ سے۔ لہٰذا آج کل جو رواج چل پڑا ہے اور اس طرح ضروری سمجھتے اور اس کے ترک پر نکیر کرتے ہیں، وہ بدعت اور واجب الترک ہے۔ (۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۷/۲۸ ج)

---

(۱) فی التفسیر المظہری سورۃ آل عمران ج ۲ ص ۶۵ (طبع بلوچستان بک ڈپو) لا یجوز ما یفعله الجہال بقبور الأولیاء والشہداء من السجود والطواف حولہا، واتخاذ السرج والمساجد علیہا، ومن الاجتماع بعد الحول کالأعیاد، ویسمونه "عرسا"۔ نیز دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۲۵، ۲۸۔

(۲) وفی مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ ج ۴ ص ۶۳ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان) ولا یدعو للمیّت بعد صلوۃ الجنازۃ، لأنه یشبه الزیادۃ فی صلوۃ الجنازۃ۔ وفی البزازیۃ علی الہندیۃ ج ۴ ص ۸۰) لا یقوم بالدعاء بعد صلوۃ الجنازۃ، لأنه دعا مرۃ لأن أکثرہا دعاء۔ وفی خلاصۃ الفتاوی ج ص ۲۲۵ (طبع امجد اکیڈمی لاہور) ولا یقوم بالدعاء فی قراءۃ القرآن لأجل المیّت بعد صلوۃ الجنازۃ وقبلہا۔ وفی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۸۳ (طبع سعید) لا یدعو بعد التسلیم۔ وفی فتاوی السراجیۃ علی قاضی خان ج ۱ ص ۱۳۵۔ اذا فرغ من الصلوۃ لا یقوم داعیا له۔ وفی جامع الرموز فصل فی الجنائز ج ۱ ص ۲۸۳ (طبع ایچ ایم سعید) لا یقوم داعیا له۔ وفی نفع المفتی والسائل ص ۴۳۰ (طبع کتب خانہ رحیمیہ دیوبند یوپی)۔ الدعاء بعد الجنازۃ مکروہ۔ نیز مزید دیکھئے امداد الاحکام ج ۱ ص ۹۴۳، و امداد المفتیین ص ۱۷۶۔ (محمد زبیر)

نکاح کے وقت دُولہا کا سہرا باندھنا

سوال:- نکاح سے پہلے دُولہا کے سر پر سہرا باندھنا کسی روایت سے ثابت ہے؟

جواب:- سہرا باندھنا ہندوانہ رسم ہے، مسلمانوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۷/۲۸ ج)

کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ پڑھنا

سوال:- کھانا سامنے رکھ کر ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ پڑھنا کسی حدیث یا روایت سے ثابت ہے یا نہیں؟ اور فاتحہ کو لازمی سمجھنا کیسا ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب کس طرح کیا کرتے تھے؟

جواب:- کسی روایت یا حدیث سے ثابت نہیں، اور اس کو لازمی سمجھنا بدعت شنیعہ ہے۔ ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کوئی بھی نیک عمل صدق و اخلاص کے ساتھ نام و نمود سے بچتے ہوئے یہ دُعا کرنی چاہئے کہ یا اللہ! اس کا ثواب فلاں کو عطا فرما۔ اور اس غرض کے لئے لوگوں کو جمع کرنا یا خاص خاص دنوں میں جمع ہوکر اجتماعی طور پر تلاوت کرنا، کھانا پکانا وغیرہ یہ سب امور بدعت ہیں اور ان سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۷/۲۸ ج)

عہدنامہ قبر میں رکھنے کا حکم

سوال:- عہدنامہ کا قبر میں رکھنا کیسا ہے؟

جواب:- میت کے ساتھ قبر میں کسی قسم کا عہدنامہ رکھنے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔( )

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/[illegible]ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۶/۱۹ الف)

( ) دیکھئے فتاویٰ دار العلوم دیوبند ([illegible]) ص ۹۹۔

قبر پر تلقین کا حکم

سوال:- قبر پر تلقین کی کیا کیفیت ہے؟

جواب:- قبر پر تلقین کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۱ھ

مسجد میں بلند آواز سے دُرود وسلام، نعت اور میلاد منعقد کرنا

سوال:- مسجد میں بلند آواز سے درود وسلام اور نعت پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ مسجد میں میلاد شریف ہونی چاہئے یا نہیں؟

جواب:- نماز کے اوقات میں جب لوگ فرض یا سنن ونوافل پڑھ رہے ہوں، مسجد میں بلند آواز سے ذکر یا وعظ وخطبہ دینا درست نہیں، (۲) البتہ جب نماز میں مشغول نہ ہوں تو ذکر جہر یا وعظ کہنا جائز ہے، لیکن دُرود شریف کو جس شکل میں جس طرح کھڑے ہوکر اجتماعی شکل میں بلند آواز سے پڑھنا لازم سمجھ لیا گیا ہے وہ بدعت ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا بیان انتہائی سعادت اور موجب خیر وبرکت ہے، لیکن اس کو کسی خاص دن کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں، نیز اس میں حاضری کا مقصد اتباعِ سنت کا جذبہ ہونا چاہئے، نمود ونمائش نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۹ ۲۹ ب)

قبر پر اذان دینے کا حکم

سوال:- ایک شخص مرگیا، اس کی میت کو دفنانے کے لئے قبرستان لے جاتے ہیں اور دفنانے کے بعد اس کی قبر پر ایک شخص اذان دیتا ہے، قبر پر اذان دینا درست ہے؟

جواب:- قبر پر مذکورہ طریقے سے اذان دینا بالکل بے اصل ہے۔ قرآن وحدیث میں اس

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے ... ص ۲۱، وفتاویٰ رشیدیہ ص ۲۳۳۔

(۲) وفی الفتاوی البزازیۃ علی الھندیۃ ج ۶ ص ۳۷۸ وقد صح عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ أنہ سمع قوما اجتمعوا فی مسجد یھللون ویصلون علیہ علیہ السلام جھرا فراح الیھم فقال ما عھدنا ذلک علی عھدہ علیہ السلام وما أراکم الا مبتدعین، فما زال یذکر ذلک حتی أخرجھم عن المسجد کذا فی ردّ المحتار ج ۲ ص ۳۹۸ وفی الشامیۃ ج ۶ ص ۳۴۹ (طبع سعید) وفی الملتقی وعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنہ کرہ رفع الصوت عند قراءۃ القرآن والجنازۃ والزحف والتذکیر، فما ظنک بہ عند الغناء الذی یسمّونہ وجدا ومحبۃ فانہ مکروہ لا أصل لہ فی الدین وفیہ ص ۳۹۸ ... فصل ... ۔

کا کوئی ثبوت نہیں، اس عمل سے اجتناب لازم ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۲-۶-۱۳۹۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۷۶/۲۷ و)

اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جن مسجدوں میں عرصہ تیس سال سے اذان سے قبل صلوٰۃ وسلام نہیں پڑھا جاتا تھا وہاں اب پڑھتے، نہ پڑھنے پر نمازیوں میں شدید اختلاف پیدا ہو رہا ہے۔ حدیث وفقہ کی روشنی میں دلائل کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

جواب:- دُرود شریف پڑھنا بے حد فضیلت کا عمل ہے، جس مسلمان کو اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے، دُرود شریف پڑھ کر اپنے نامۂ اعمال کو نیکیوں سے بھرنا چاہئے، اس کا کوئی خاص وقت شریعت کی طرف سے مقرر نہیں، انسان جس وقت چاہے اخلاص کے ساتھ، نمود ونمائش کے بغیر دُرود شریف پڑھ سکتا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے میں بعض مقامات پر اذان سے پہلے جس طرح اجتماعی ہیئت میں بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا رواج ہوگیا ہے، اور جس طرح اس کو فرض واجب یا اذان کا لازمی جزء سمجھا جانے لگا ہے، یہ دُرود شریف نہیں، بلکہ اس کی نمائش ہے، جس کا کوئی ثبوت قرآن وسنت یا صحابہؓ و تابعینؒ کے عہد مبارک میں نہیں ملتا، اس بناء پر یہ بدعت ہے۔[۲] مسلمانوں کو چاہئے کہ اس طریقے سے

---

(۱) وفي رد المحتار ج:۲ ص ۲۳۵ تنبيه في الاقتصار على ما ذكر من الوارد اشارة الى أنه لا يسن الأذان عند إدخال الميت في قبره كما هو المعتاد الآن وقد صرح ابن حجر في فتاويه بأنه بدعة وقال ومن ظن أنه سنة قياسا على ندبهما للمولود الحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم يصب وفي حاشية البحر الرائق باب الأذان ج ۱ ص ۲۵۶ (طبع مكتبه ماجديه كوئته) قيل وعند إنزال الميت القبر قياسا على أول خروجه للدنيا لكن رده ابن حجر في شرح العباب الخ وفي در البحار: من البدع التي شاعت في بلاد الهند الأذان على القبر بعد الدفن. بحوالہ فتاویٰ رشیدیہ ص ۳۶، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۳۰ وعزیز الفتاویٰ ص ۵۵، ۱۰۲۔

(۲) وفي الفتاوى الكبرى لابن حجر الهيتميؒ ج ۱ ص ۲۹، ۱۳۰ (طبع مكتبه اسلاميه) (وسئل) هل الصلوٰة على النبي صلى الله عليه وسلم مسنونة قبل الأذان كما هي بعده؟ وهل نهي عنه، وعن الصلوة على النبي صلى الله عليه وسلم قبل الأذان أو لا؟ (فأجاب) بعد سطر أما الصلوة والسلام على النبي صلى الله عليه وسلم بعد الأذان والاقامة، فإنهما مندوبان كما صرح به أصحابنا وما جاء به ذلك خبر مسلم والأربعة إلا ابن ماجه وفيه أيضا ج ۱ ص ۳۱ فمن أتى بها معتقدا سنيته في ذلك المحل المخصوص نهي عنه ومنع منه لأنه تشريع بغير دليل ومن شرع بلا دليل يزجر عن ذلك وينهى عنه قد أحدث المؤذنون الصلوة والسلام على رسول الله صلى الله عليه وسلم عقب الأذان، وكان ابتداء حدوث ذلك في أيام السلطان الناصر صلاح الدين ابن أيوب، وبأمره في مصر وأعمالها وقد استفتى مشايخنا وغيرهم في الصلوة والسلام عليه صلى الله عليه وسلم بعد الأذان على الكيفية التي يفعلها المؤذنون، فأفتوا بأن الأصل سنة والكيفية بدعة. (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بجائے مسنون طریقے پر اذان دیں اور اس کے ساتھ درود شریف پڑھنے کا طریقہ اختیار کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۲/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۸۵۸ ب)

نماز کے بعد بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- نمازوں کے بعد الصلوٰۃ والسلام بلند آواز سے بہ ہیئتِ اجتماعی پڑھنا فرض، واجب یا سنت یا مستحب یا بدعت ہے؟

جواب:- درود پڑھنا بہت ثواب ہے، لیکن اس کا جو طریقہ آج کل چل پڑا ہے کہ کھڑے ہو کر اجتماعی طور سے پڑھنے کو ضروری سمجھا جاتا ہے، اور جو ایسا نہ کرے اسے بُرا سمجھا جاتا ہے، یہ بدعت ہے۔[1]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۲۳ الف)

نماز اور درس کے بعد مصافحہ کرنا

سوال:- ہماری مسجد میں روزانہ بعد نماز فجر درس قرآن ہوتا ہے، درس قرآن کے بعد جب مولوی صاحب کھڑے ہوجاتے ہیں تو مصافحہ کے لئے لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں، اس میں بھی ناغہ نہیں ہوتا، کیا اس طرح پابندی بدعت نہیں ہے؟

جواب:- نماز خواہ فجر کی ہو یا ظہر کی، اس کے بعد یا درس قرآن کے بعد ثواب سمجھ کر مصافحہ کرنا بدعت ہے، اور اس پر اس طرح پابندی کی جائے کہ جو مصافحہ نہ کرے اسے برا سمجھا

---

(١) ... وفی الابداع فی مضار الابتداع ص ۷۷، ۷۸ (طبع مکتبۃ علمیۃ مدینۃ المنورۃ) لا کلام فی ان الصلوٰۃ والسلام علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عقب الاذان مطلوبان شرعا لورود الاحادیث الصحیحۃ ... الخلاف فی الجہر بہما علی الکیفیۃ المعروفۃ، والصواب انہا بدعۃ مذمومۃ بہذہ الکیفیۃ التی جرت بہا عادۃ المؤذنین من رفع الصوت بہما کالاذان والتمطیط والتغنی، فان ذلک احداث شعار دینی علی خلاف ما عہد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ والسلف الصالح من ائمۃ المسلمین، ولیس لاحد بعدہم ذلک.
ومن ثم قال العلامۃ ابن حجر فی فتاواہ الکبریٰ: من صلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبل الاذان او قال محمد رسول اللہ بعدہ معتقدا سنیتہ فی ذلک المحل ینہی ویمنع منہ، لانہ تشریع بغیر دلیل ومن شرع بغیر دلیل یزجر وینہی. وہذا للعلامۃ ابن حجر حکمہ علی من صلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبل الاذان او قال محمد رسول اللہ بعدہ بانہ شرع فی دین اللہ تعالیٰ ما لم یشرع من ذلک ویزجر ومع ذلک لا تنفع ما فعل ... الخ
(١) [illegible]

جائے تو بھی بدعت ہے،[1] لیکن اگر اسے ثواب سمجھے بغیر، اور جو مصافحہ نہ کرے اسے بُرا سمجھے بغیر مصافحہ کرلیا جائے تو مضائقہ نہیں۔

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۹۰ الف)

امام صاحب کا نمازِ جنازہ کے بعد دُعا نہ مانگنا

سوال:- نمازِ جنازہ میں چار تکبیروں کے بعد سلام پھیر کر امام بطریق مروجہ دُعا نہ مانگتے ہوئے چلا گیا، کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ بدون دعا مانگے نماز مکمل نہیں ہوئی، کچھ لوگوں نے کہا کہ نمازِ جنازہ خود میت کے حق میں دُعا ہے، نماز مکمل ہوگئی۔ کون سا عمل دُرست ہے؟

جواب:- نمازِ جنازہ خود دُعا ہے، اور اس کے بعد الگ سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا سنت سے ثابت نہیں،[2] لہٰذا امام صاحب کا عمل دُرست ہے۔ جو لوگ ان کے اس عمل پر اعتراض کررہے ہیں ان کا اعتراض صحیح نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۴۲۲ د)

دفن کے بعد قبر پر اذان دینے کا حکم

سوال:- دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہوکر جو اذان دی جاتی ہے، شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟

جواب:- دفن کے بعد اذان دینے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں، اس سے احتراز کرنا لازم ہے، کیونکہ یہ بدعت ہے۔[3]

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۹/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۳۰ الف)

---

(۱) وفی الشامیة ج ۶ ص ۳۸۱ (طبع سعید) ونقل فی تبیین المحارم عن الملتقط أنه تکرہ المصافحة بعد أداء الصلوۃ بکل حال لأن الصحابة ما صافحوا بعد أداء الصلوۃ ولأنها من سنن الروافض ... وقال ابن الحاج من المالکیة فی المدخل انها من البدع وموضع المصافحة فی الشرع انما هو عند لقاء المسلم لأخیه لا فی أدبار الصلوات، فحیث وضعها الشارع یضعها، فینهی عن ذلک ویزجر فاعله لما اتی به من خلاف السنة. وکذا فی فتاوی رشیدیه ص ۲۶۳، نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۲۶۰، عزیز الفتاویٰ ص ۱۲۸، امداد الاحکام ج ۱ ص ۱۹۵۔
(۲) دیکھئے ص ۱۰۸ کا حاشیہ نمبر ۲۔
(۳) دیکھئے ص ۱۱۱ کا حاشیہ نمبر ۱۔

دُعا کے آخر میں "صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا" پڑھ کر بلند آواز سے دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- آج کل بعض مساجد میں دعا کے آخر میں "صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا" پڑھ کر امام اور مقتدی زور سے دُرود شریف پڑھتے ہیں، اگر امام منع کرے تو فساد ہوتا ہے، کیا حکم ہے؟

جواب:- مذکورہ عمل جس التزام و اہتمام کے ساتھ کیا جا رہا ہے، اور جس طرح اس کے تارک پر نکیر کی جاتی ہے، وہ بدعت ہے،(۱) اس سے پرہیز لازم ہے۔ جو لوگ اس پر عمل پیرا ہوں ان کو اہل علم کے فتاویٰ دکھا کر نرمی سے سمجھانا چاہئے، لیکن اس کی وجہ سے فتنہ و فساد برپا کرنا واقعۃً دُرست نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۱/۱۰/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۶۱ ج)

ما حكم قراءة الصلوة والسلام جهرًا بعد صلوة الجمعة؟

(جمعہ کے بعد بلند آواز سے صلوۃ وسلام پڑھنے پر عربی میں مفصل فتویٰ)

الاستفتاء:-

هل يجوز بكلام الله وسنة الرسول صلى الله عليه وسلم أن تؤدى الصلوة والسلام جهرا بعد صلوة الجمعة امام المسجد والمحراب للجامع اهتماما والتزاما؟ تشرّفونا بالجواب الصائب، مأجورين عند الله، مشكورين عند الناس.

الجواب:-

ليعلم اولا ان الصحابة رضوان الله عليهم فمن بعدهم من التابعين واتباعهم كانوا سابقين الى الخير حريصين في كل ما هو خير في نظر الشريعة الغراء اذ عملوا بكلما رأوه سنة نبيهم الكريم صلى الله عليه وسلم وبكلما كان حسنا شرعا فدل على انه لم يبق بعدهم شي

---

(۱) وفي البزازية على هامش الهندية ج ٦ ص ٣٧٨ ، طبع رشيدية كوئته، وقد صح عن ابن مسعود رضي الله عنه انه سمع قوما اجتمعوا في مسجد يهللون ويصلون عليه الصلوة والسلام جهرا فراح اليهم فقال ما عهدنا ذلك على عهده عليه الصلوة والسلام وما اراكم الا مبتدعين فما زال يذكر ذلك حتى اخرجهم عن المسجد. كذا في رد المحتار ج ٦ ص ٣٩٨) وفي الشامية ج ٦ ص ٣٣٩ وفي الملتقى وعن النبي صلى الله عليه وسلم انه كره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة والزحف والتذكير، فما ظنك به عند الغناء الذي يسمونه وجدا ومحبة فانه مكروه لا اصل له في الدين [illegible] وفيها ج ٦ ص ٣٩٨ فالاسرار افضل حيث خيف الرياء او تأذي المصلين [illegible] الخ وفي [illegible] شرح مشكوة ج ٣ ص [illegible] تحت قوله تعالى "ولا تجهر بصلاتك [illegible] الخ" وحسن الاسرار في سائر الاذكار [illegible] ج [illegible] ص ٥٢٣

واجب ولا مندوب الا ما أوجبه القرآن الكريم وأحاديث رسول الله صلى الله عليه أحسن الصلوة والتسليم، وان اخترع بعدهم فكر أحد شيئا، يمكن أن يكون مباحا ولكنه لا يجوز أن يهتم به اهتماما بليغا ويدعى اليه الناس، ويلام على من يتركه.

فاذا بحثنا عن فعل الصحابة و تابعيهم في مسئلتنا هذه، رأينا أنهم كانوا يباشرون الصلوة على النبي صلى الله عليه وسلم ويعتبرونه عملا مهمّا مثابا عليه، غير أن طريق مباشرتها عندهم غير الطريق المذكور في السؤال، اذ كانوا يصلون منفردين خاشعين ولم يكونوا يؤدونها زرافات مجتمعين عند المساجد والمحاريب، ولم يثبت في شئ من الروايات اجتماعهم لهذا المقصد واعلامهم به كما يُعلمون الأذان

فظهر أن الصلوة على النبي صلى الله عليه وسلم حسن مثاب عليه، والطريق المذكور غير مستحسن، اذ لو كان ذلك حسنا لفعله الصحابة بوجه أحسن واهتمام بليغ

ثم في هٰذا الفعل مفاسد أخرىٰ عديدة:

١ - ان الصلوة دعاء في حضرة الحق جل وعلا مجده، وقد تقرر في موضعه أن الدعاء بالسر أولى، قال الله تبارك و تعالى "اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً"[١]

٢ - انه يشبه الرياء، ولا ينبغي دخول مواضع التهم.[٢]

٣ - غاية ما في الباب أنه مباح، وسفهاء زماننا يلتزمون التزاما ولا كالتزامهم الجماعة، ويهتمون به ويلومون على تاركيه، حتّى أن بعضهم يزعمه فرضا، وقد تقرر في الفقه أن التزام ما لا يلزم لا يجوز، فانه خلاف للآية الشريفة "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ" الآية.[٣]

٤ - بعضهم يباشره قائما ويعتقد ان الرسول صلى الله عليه وسلم "حاضر في كل مكان، ناظر الى كل شئ". وهذه العقيدة يخشى عليها الكفر كما لا يخفى على مسلم، فان احاطة الأشياء كلها بالعلم ووجوده في كل مكان من أخص صفات الله سبحانه واشراك أحد فيه شرك بالله تعالى، نعوذ بالله منه.

---

(١) سورة الاعراف ٥٥

(٢) وفي كشف الخفاء للعجلوني ج١ ص٣٥ رقم ٨٨ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت) قول عمر من سلك مسالك الظن اتهم، ورواه الخرائطي في مكارم الأخلاق مرفوعا بلفظ من أقام نفسه مقام التهم فلا يلومن من أساء الظن به. وراجع أيضا سنن الكبرى للبيهقي ج٤ ص٣٢٤ (طبع مكتبة دار الباز مكة المكرمة) وفتح الباري اجتناب مواضع التهم وكراهة ... الخ ج٢ ص٣٣٦ (طبع دار المعرفة بيروت)

(٣) سورة المائدة ٣

وبالجملة فهذا الطريق لم يثبت في القرون المشهود لها بالخير، لا سيما إذا ضمت معها مفاسد ذكرناها كان فعلا قبيحا، وحق على كل مسلم أن لا يفعله ويمنع فاعله مهما استطاع.[۱] والله سبحانه وتعالى أعلم

الجواب صحيح
العبد محمد شفیع عفا الله عنه

الأحقر محمد تقی العثمانی
۱۳۷۹/۶/۱۳ھ[۲]

نماز کے بعد دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- نماز کے بعد درود شریف اونچی آواز سے پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ یا آہستہ پڑھنا چاہئے؟

جواب:- آہستہ ہی پڑھنا چاہئے۔ ہمارے زمانے میں بلند آواز سے دُرود شریف پڑھنے کا جو رواج ہوگیا ہے، اور اس کی جس طرح فرائض کی سی پابندی کی جاتی ہے اور جس طرح اس کے خلاف پر ملامت و نکیر کی جاتی ہے، وہ بدعت ہے۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۴۶/۲۷ د)

نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا

سوال:- نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نمازِ جنازہ خود دُعا ہے، اور اس کے بعد دُعا کے لئے اجتماعی اہتمام جیسا کہ آج کل بعض حلقوں میں مروّج ہے، اس کا قرآن وسنت اور بزرگانِ سلف کے تعامل سے کوئی ثبوت نہیں ہے، اور اس طرح کا اہتمام واصرار بدعت ہے، لہٰذا واجب الترک ہے۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم
۲۰/ /۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۵/۲۸ الف)

حیلۂ اسقاط کا حکم

سوال:- حیلۂ اسقاط کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب:- حیلۂ اسقاط کا مروّجہ طریقہ شرعاً بے اصل ہے، اس بارے میں اصل حکم شرعی یہ

---

(۱) مزید حوالہ جات سابقہ ص ۱۱۴ کے حاشیہ نمبر میں ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرین فتاویٰ کی کاپی سے لیا گیا ہے۔
(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص ۹۰ حاشیہ نمبر ۱۔
(۴) دیکھئے حوالہ سابقہ ص ۹۰ حاشیہ نمبر ۲۔

ہے کہ نماز، روزے جو میت کے ذمے رہ گئے ہوں، ان کا فدیہ ادا کیا جائے اگر میت نے وصیت کی ہو، اور اس کے لئے مال بھی چھوڑا ہو تو ورثاء کے لئے ایسا کرنا واجب ہے، ورنہ واجب نہیں بہتر ہے، کذا فی عزیز الفتاویٰ (ج:۱ ص:۳۷۰)۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۵/۲۸ الف)

میّت کے ساتھ قبرستان تک قرآن مجید لے جانا

سوال:- میت کے ساتھ قبرستان تک قرآن مجید لے جانا کیسا ہے؟

جواب:- اس کی کوئی اصل نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۵/۲۸ الف)

نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مانگنا

سوال:- نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نمازِ جنازہ خود دُعا ہے، اور اس کے بعد دُعا کا اہتمام کسی حدیث یا صحابہ و تابعین کے عمل سے ثابت نہیں، لہٰذا آج کل بعض حلقوں میں جس اہتمام اور اصرار کے ساتھ یہ عمل کیا جاتا ہے وہ بدعت ہے۔ (کذا فی عزیز الفتاویٰ ج:۱ ص ۳۸۹)۔[۲]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۶/۲۸ الف)

میّت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا

سوال:- اذانِ قبر، میت کو دفن کرنے کے بعد اس کے سر کی جانب کھڑے ہو کر اذان دینا جائز ہے یا نہیں؟

---

(۱) عزیز الفتاویٰ ص ۲۲۰ وفی الشامیة ج ۲ ص ۷۳ وبه ظهر حال وصایا اهل زماننا، فان الواحد منهم یکون فی ذمته صلوات کثیرة وغیرها من زکاة واضاحی وایمان ویوصی لذلک بدراهم یسیرة ویجعل معظم وصیته لقراءة الختمات والتهالیل التی نص علماؤنا علی عدم صحة الوصیة بها، وراجع تفصیل الرسالة لتتمة لتحیین ص ۲۲۵ من رسائل ابن عابدین رحمه الله، وامداد الاحکام ج:۱ ص ۸۳

(۲) فتاوی دار العلوم دیوبند ج ۱ ص ۲۹۹، مرقاة المفاتیح ج ۴ ص ۶۶ مکتبه امدادیه ملتان، البزازیة مع الهندیة ج ۴ ص ۸۰ رشیدیه کوئٹه، خلاصة الفتاوی ج ۱ ص ۲۲۵ امجد اکیڈمی لاهور، البحر الرائق ج ۲ ص ۱۸۳، جامع الرموز ج ۱ ص ۲۸۳ طبع سعید، نفع المفتی والسائل ص ۴۳ طبع کتب خانه رحیمیه دیوبند یوپی، امداد الاحکام ج ۱ ص ۹۶، امداد المفتیین ص ۴۰۱، ... ص ۱۰۹ ... (محمد زبیر)

جواب:- اس کا صحابہ و تابعین سے کوئی ثبوت نہیں ہے، لہٰذا یہ بدعت ہے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۴/۱۹ الف)

مروجہ حیلۂ اسقاط کا حکم

سوال:- حیلۂ اسقاط جو آج کل مشہور ہے اور لوگ کیا کرتے ہیں، شریعت میں کیا اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

جواب:- اسقاط مروجہ کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے،(۲) میت کے گناہ معاف کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے مغفرت کی دعا کی جائے اور جو نماز، روزے رہ گئے ہیں اس کا فدیہ ادا کیا جائے اور میت کو ایصال ثواب کیا جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد عاشق الٰہی بلندشہری

رمضان کی ۲۳ تاریخ کو بعد از تراویح سورۂ عنکبوت اور سورۂ روم پڑھنا

سوال:- رمضان کی ۲۳ تاریخ کو امام مسجد بعد از تراویح سورۂ عنکبوت وسورۂ روم پڑھتے ہیں، لوگ سنتے ہیں اور نذرانے پیش کرتے ہیں، یہ طریقہ کیسا ہے؟ فضائل قرآن کی روایت کا حوالہ دیتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

سائل: (مولانا) محمد افضل خان

شاہ پور کانا، سوات، صوبہ سرحد

جواب:- قرآن کریم کی تلاوت باعث اجر وثواب ہے، لیکن اس التزام کے ساتھ پڑھنا ہمارے علم میں بے اصل ہے، جس روایت کا وہ صاحب ذکر کرتے ہیں، اس کا مفصل حوالہ لکھ کر بھیجیں تو

---

(۱) ... تنبیه في الاقتصار على ما ذكر من الوارد إشارة إلى أنه لا يسن الأذان عند إدخال الميت في قبره كما هو المعتاد الآن، وقد صرح ابن حجر في فتاويه بأنه بدعة، وقال من ظن أنه سنة قياسا على ندبهما للمولود إلحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم يصب، رد المحتار ج ۲ ص ۲۳۵، كتاب الجنائز. وفي رد المحتار من البدع التي شاعت في بلاد الهند الأذان على القبر بعد الدفن. بحوالہ فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۳۶، وامداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۳۰۱، عزیز الفتاویٰ ص ۱۰۰ ...۔

(۲) وفي الشامية ج ۲ ص ۷۳ وبه ظهر حال وصايا أهل زماننا، فإن الواحد منهم يكون في ذمته صلوات كثيرة وغيرها من زكاة وأضاح وأيمان ويوصي لذلك بدراهم يسيرة ويجعل معظم وصيته لقراءة الختمات والتهاليل التي نص علماؤنا على عدم صحة الوصية بها.

اس کے بارے میں کچھ کہا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۷/۲۸ الف)

حیلۂ اسقاط اور میّت کے لئے تین دن خیرات کرنے کا حکم

سوال ۱:- مردے کے فدیہ میں پیسے اور قرآن کا دور اسقاط پھراتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

۲- مردے کے لئے اول تین رات خیرات کرتے ہیں اور تین صبح تلاوتِ قرآن قبر پر جاکر کرتے ہیں، اس کو پیسے اور روٹی دیتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

سائل مولانا افضل خان
شاہ پور کانا، ضلع سوات، صوبہ سرحد

جواب ۱:- حیلۂ اسقاط کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، اس کے بجائے مشروع طریقہ یہ ہے کہ جتنی نمازیں یا روزے مردے کے قضا ہیں، اتنی نمازوں اور روزوں کا فدیہ غرباء کو دے دیا جائے، اور جتنا ہوسکے مشروع طریقے سے اس کو ایصالِ ثواب کیا جائے۔[1]

۲- اس قسم کی پابندیاں بدعت ہیں اور ان سے اجتناب لازم ہے۔ ہاں! ان پابندیوں سے بچ کر مردے کو جتنا ایصالِ ثواب اخلاص کے ساتھ کیا جائے باعثِ خیر و برکت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۷/۲۸ الف)

قبرستان میں قرآن مجید لے جاکر پڑھنا

سوال:- قبرستان میں قرآن مجید لے جاکر پڑھنا جائز ہے؟ اور کیا جواز پر اس حدیث سے استدلال کرنا "نوروا قبور موتاکم بالقرآن" درست ہے یا نہیں؟

عبد السلام چاٹگامی
جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن

جواب:- قبرستان میں قرآن مجید لے کر پڑھنا جائز ہے، لیکن "نوروا قبور موتاکم بالقرآن" کے الفاظ کی کوئی روایت ہمیں نہیں ملی، موضوعات کے مجموعے میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملا۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۵۶/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص ۱۱۷ کا حاشیہ نمبر ۔

اہلِ قبور سے توسل پکڑنا

سوال:- کیا اہلِ قبور سے توسل پکڑنا جائز ہے؟ اور اس کے جواز کے لئے یہ حدیث "اذا تحيرتم في الأمور فاستعينوا بأهل القبور" استدلال میں پیش کرنا کیسا ہے؟ والسلام

(مفتی) عبدالسلام چاٹگامی
سابق مفتی جامعۃ العلوم
الاسلامیہ بنوری ٹاؤن

جواب:- توسل کیا جا سکتا ہے، لیکن خود ان سے حاجت طلب کرنا حرام ہے، "استعينوا بأهل القبور" کے الفاظ کی کوئی حدیث نہیں ملی۔[1] واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۵۶ الف)

جماعت کے بعد امام سے مصافحہ کرنا

سوال:- جماعت کے بعد دعا مانگ کر امام سے مصافحہ کرنا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- نماز کے بعد امام سے مصافحہ کرنے کو جو بعض لوگ مسنون سمجھتے ہیں، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، خاص طور سے نماز کے بعد مصافحے کو سنت سمجھنا درست نہیں، ہاں! واقعۃً امام صاحب سے ملاقات مقصود ہو تو مصافحے میں مضائقہ نہیں۔[2] واللہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۴۸/۳۰ د)

---

(۱) سوال میں سائل موصوف مفتی عبدالسلام چاٹگامی صاحب زید مجدہ نے "فاستعينوا بأهل القبور" کے الفاظ لکھے ہیں جبکہ مجموعۃ فتاویٰ علامہ لکھنوی کے ایک سوال میں "فاستغيثوا بأهل القبور" کے الفاظ لکھے ہیں، جس کے جواب میں علامہ عبدالحی لکھنوی نے فرمایا [illegible] یہ حدیث کسی کا مقولہ ہے۔ [illegible] "فاستغيثوا" کے الفاظ کے ساتھ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ "جب تمہیں کسی چیز کے حدوث یا عدم ہونے میں شبہ ہو تو [illegible] وقت قبروں میں سوئے ہوئے [illegible] یہ معنی ہے کہ "جب تم دنیوی امور میں پریشان ہو تو [illegible] قبور [illegible] اور وہ تمہیں بھی [illegible] ہے۔" اور "استعينوا" کے [illegible] تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ "اہلِ قبور سے [illegible] مانگو" [illegible] مستقل ہو [illegible] حل مشکلات [illegible] دیکھئے علامہ [illegible] لکھنوی کی کتاب مجموعۃ الفتاویٰ اردو، کتاب العلم والعلماء ج ۱ ص ۱۵۹ (طبع میر محمد کتب خانہ)۔ (محمد زبیر حق نواز)

(۲) دیکھئے سابقہ ص ۱۰۷ کا حاشیہ نمبر ۲۔

درسِ قرآن کے شروع میں دُرود شریف پڑھوانا

سوال:- درسِ قرآن یا حدیث شروع کرنے سے قبل دُرود شریف پڑھوانا کیا بدعت ہے؟

جواب:- اگر اس کو لازم وضروری نہ سمجھا جائے اور واجبات کی طرح التزام نہ کیا جائے تو بدعت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۹۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

مسجد میں چراغاں کا حکم

سوال:- ہماری مسجد عزّت الاسلام میں رمضان کے شروع ہونے سے دو روز پہلے محلے کے دو تین آدمی آئے اور کہا کہ ہمارا ارادہ ہے کہ رمضان میں ہم اپنے خرچ سے ایک مہینے تک اپنی جیب سے مسجد کو بجلی کے قمقموں سے سجائیں گے، تقریباً پورے مہینے میں دو ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ زید کہتا ہے کہ یہ فضول خرچی ہے جو اللہ کو ناپسند ہے، اس کا شرعی حکم بتائیں کہ کیا ہے؟

جواب:- مسجد کے چندے سے زائد از ضرورت روشنی کرنا بالکل ناجائز ہے ہی، لیکن اگر کوئی ایک شخص اپنے پاس سے خرچ کرکے روشنی کرے تب بھی اس میں ایک تو اسراف کا گناہ ہے، دُوسرے تشبہ بالکفار ہے، تیسرے اس کو زیادہ ثواب کا کام سمجھ کر کرنا بدعت ہے۔ اس لئے جو لوگ چراغاں کر رہے ہیں انہیں اس سے اجتناب لازم ہے۔[1]

واللہ تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۹۵/۲۸ ج)

شہدائے کربلا کے مزارات کی شبیہ بنانا

سوال:- ذکرِ شہادت کے دوران ایک مولانا نے فرمایا کہ: رائج الوقت تمام تعزیئے ناجائز ہیں، البتہ اگر سید الشہداء کے روضۂ مبارک کی شکل اور نقل بنائی جائے تو جائز ہے، کیا یہ کہنا دُرست ہے یا نہیں؟

(۱) دیکھئے ص:۱۰۲ کا حاشیہ نمبر۱۔

جواب:- تعزیہ داری کی ہر صورت جو رائج ہے، بدعت ہے، اور اس کا بنانا جائز نہیں[1]، شہدائے کربلا کے مزارات کی شبیہ کو ثواب سمجھ کر بنائی جائے گی تو بدعت ہوگی۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۰/۱۹ الف)

تعزیہ سازی، سبیل لگانا، تعزیہ کو جلانا وغیرہ کا حکم

سوال:- کیا تعزیہ بنانا جائز ہے؟ اس کی کیا وعیدیں ہیں؟

جواب:- تعزیہ بنانا بدعت ہے، اور اس میں کئی قسم کے گناہ ہیں۔[2]

سوال:- سبیل کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب:- لوگوں کے لئے پانی کا انتظام کرنے کے واسطے راستوں پر سبیل لگانا بڑے ثواب کا کام ہے، لیکن اس ثواب کے کام کو صرف محرم کے مہینے کے ساتھ خاص کرنا اور اس مہینے کے اندر سبیل لگانے کو زیادہ اُجر وثواب کا موجب سمجھنا بدعت اور ناجائز ہے۔

سوال:- لوگ عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ امام حسینؓ کو سات محرم کے بعد پانی نہیں ملا تھا، کیا یہ صحیح ہے، یا انہیں آخر تک پانی میسر تھا؟

جواب:- سات تاریخ کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دریائے فرات سے پانی لانے سے روک دیا گیا تھا، یہ بات تاریخی روایات سے ثابت ہے۔[3]

سوال:- ایک صاحب نے زیرِ تعمیر تعزیہ کو موقع پاکر جلادیا، اس فعل پر آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:- کسی شخص کو برائی سے روکنے کا یہ طریقہ دُرست نہیں، نرمی سے سمجھانا چاہئے، اگر وہ نہ مانیں تو ان کے حق میں دُعا کریں۔ واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹ے ۱۱۹ الف)

(۲،۱) تعزیہ سازی وغیرہ بدعات محرم سے متعلق مزید تفصیل کے لئے دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص:۵ے، امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۲۸۶، ۲۸۷، امداد الاحکام ج... ص ۱۸۱، ۸۶، فتاویٰ... رسومات... ص ۱۵۴۔

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا رسالہ "شہید کربلا" ص:۶۸۔ (محمد زبیر)

بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اور مسجد میں چراغاں کرنے کا حکم

سوال۱:- کچھ لوگ مسجد میں بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھتے ہیں، اور جمعرات کو شیرینی بھی تقسیم کرتے ہیں، مجوّزین کا اصرار ہے کہ حلقہ بنا کر دُرود شریف بآوازِ بلند پڑھنے کی اجازت ہونی چاہئے، اور وہ لوگ یہ بھی چاہتے ہیں کہ تہواروں کے ایام میں مسجد میں چراغاں بھی کرنا چاہئے۔ کیا یہ مذکورہ بالا مسائل ایسے ہیں جیسے مجوّزین کا خیال ہے؟

جواب۱:- سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر دُرود و سلام بھیجنا بہت اجر و فضیلت کی چیز ہے، لیکن دُرود و سلام کو کسی ہیئت کے ساتھ مخصوص کر دینا یا کسی ایسی ہیئت کو زیادہ ثواب کا موجب سمجھنا جو صحابہ کرامؓ سے منقول نہیں، اور جو شخص اس ہیئت کو اختیار نہ کرے اسے بُرا سمجھنا بدعت ہے، جس سے احتراز کرنا چاہئے، کبھی کبھی اجتماعی طور سے حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اصلاً مباح ہے، لیکن چونکہ صحابہ کرامؓ سے یہ طریقہ منقول نہیں اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں ثواب زیادہ ہے، اور جو شخص اس طریقے سے دُرود شریف نہ پڑھے وہ قابلِ نکیر نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اس اجتماعی صورت کو زیادہ ثواب سمجھ کر اختیار کیا جائے اور جو شخص اس ہیئت کو اختیار نہ کرے اسے بُرا سمجھا جائے تو یہ بدعت ہوگا، اور چونکہ آج کل اس اجتماعی ہیئت کو اسی نیت سے اختیار کیا جاتا ہے، اور سوال میں بھی اسی کی تصریح ہے، اس لئے اس طریقے کو ترک کرنا چاہئے۔[1]

شیرینی تقسیم کرنے کا بھی یہی حال ہے کہ اصلاً مباح ہے، لیکن اس کو کسی دن کے ساتھ مخصوص کرکے ثواب سمجھنا اور تارک پر نکیر کرنا بدعت ہے۔

سوال۲:- بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اور مسجد میں چراغاں کرنا کیسا ہے؟

جواب۲:- مسجد میں چراغاں کرنا بلاشبہ اِسراف ہے، فقہاء نے صراحۃً اس سے منع فرمایا ہے۔[2]

فقط واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۱/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) دیکھئے سابقہ ص:۱۱۴ کا حاشیہ نمبرا۔　(۲) دیکھئے ص ۶۳ کا حاشیہ نمبرا۔

۱:- تعزیہ کے بوسے کو حجرِ اسود کے بوسے پر قیاس کرنا

۲:- مختلف مقامات میں قمری تقویم مختلف ہونے کی بناء پر لیلۃ القدر ہر مقام پر اپنے مطلع کے لحاظ سے ہوتی ہے

سوال:- ابھی ابھی لکھنؤ سے آئے ہوئے ایک شیعہ عالم جناب ڈاکٹر کلب صادق صاحب کا خطاب سننے کا اتفاق ہوا، دوران خطاب انہوں نے تعزیہ، علم، مزار اور اسی طرح دیگر مراسم کے جواز کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ:-

> نماز اگر چہار دیواری والے کعبہ کی سمت منہ کر کے پڑھی جائے تو یہ بھی غیر خدا کی تعظیم ہوگئی؟ حجر اسود کو اگر بوسہ دیا جائے، قرآن مجید کی تعظیم وتوقیر ہو تو یہ بھی عین خدا نہیں ہیں، مگر ان کا ادب و احترام، بوسہ وتعظیم عین عبادت اور دین کا حصہ ہے، صرف اس لئے کہ ان کی نسبت خدا کے ساتھ ہے۔ اسی طرح اگر تعزیہ، علم، ضریح اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں کا ادب واحترام کیا جاتا ہے تو یہ بھی اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اور ان کے تعلق سے کیا جاتا ہے، تو پھر یہ شرک اور گناہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ یہ بھی عینِ دین ہے اور عبادت ہے۔

ان کی اس توجیہ نے دین میں ایک اشکال پیدا کر دیا ہے، اس سلسلے میں آپ رہنمائی فرمائیں۔

دوسری گزارش لیلۃ القدر کے حوالے سے ہے۔ پاکستان میں قمری تقویم کی رُو سے لیلۃ القدر کی رات دوسری ہوگی، سعودی عرب میں دوسری ہوگی اور یورپ وامریکہ میں یہ رات مختلف ہوگی، تو کیا سال میں مختلف لیلۃ القدر ہوسکتی ہیں؟ اس حوالے سے بھی اپنا نقطۂ نظر بیان فرمائیں۔

جواب:-

محترمی ومکرمی! 　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، لفافے پر میرا پتہ اور نام تھا، لیکن اندر خط جاوید الغامدی صاحب کے نام تھا، شاید آپ نے سوال دونوں کو بھیجا اور خطوط بدل گئے۔

بہرصورت! جواب درج ذیل ہے:-

تعزیہ، عَلَم اور ضریح کو بیت اللہ اور حجر اسود پر قیاس کرنا اس لئے بداہۃً غلط ہے کہ بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے اور حجر اسود کی تقبیل کا حکم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً عطا فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ کعبہ کے کسی اور پتھر کو چومنا جائز نہیں۔ تعزیہ، عَلَم اور ضریح کے بارے میں

کون سی نص ہے؟

بالفاظِ دیگر نماز میں رُخ کرنا یا بوسہ دینا، اور کوئی تعظیمی عمل جو عبادت کے مشابہ ہو، انجام دینا اصلاً غیر اللہ کے لئے حرام ہے، البتہ جہاں نصوص سے کسی غیر اللہ کے لئے ثابت ہو، صرف اسی حد تک اجازت ہوگی۔ جہاں نص نہیں وہاں اصل حرمت کا حکم ثابت رہے گا۔

لیلۃ القدر کی فضیلت ہر مقام پر اس کے اپنے مطلع کے لحاظ سے حاصل ہوتی ہے، لہٰذا الگ الگ راتوں میں اس فضیلت کا حصول ممکن ہے۔[1]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲۰ر رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۴۶/۳۱)

غیر اللہ کے نام کی نذر و نیاز کا حکم

سوال:- قرآن میں اس بات کی صراحت ہے کہ اگر کسی چیز پر اللہ کے علاوہ کسی کا نام لیا جائے تو وہ حرام ہو جائے گی، لیکن مسلمان نذر و نیاز کی مٹھائیاں اور کھانے متبرک سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، کیا یہ خلافِ قرآن نہیں؟

جواب:- وہ نذر و نیاز جو غیر اللہ کے نام پر ہو، واقعۃً قرآن کریم کے خلاف ہے۔[2]

واللہ اعلم
۱۴۲۲/۸/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۵۰۵/۱۰)

پندرہ شعبان یا معراج کے موقع پر مسجد میں چراغاں کا حکم

سوال ۱:- پندرہ شعبان کے دوران یا معراج کے موقع پر مسجد پر چراغاں کرنے کا کیا حکم ہے؟

۲- بعض مساجد میں پندرہ شعبان یا معراج کے موقع پر کمیٹی چراغاں نہیں کرتی ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اگر انفرادی طور پر چراغاں کردے تو ہمیں اعتراض نہیں ہے، کیا ایسا چراغاں کرنا جائز ہے؟

جواب ۱:- جتنی روشنی کی مسجد میں فی الواقع ضرورت ہے، اس سے زائد چراغاں کرنا درست نہیں۔

۲- کوئی شخص اگر اپنے مال سے چراغاں کرادے تو اس سے مسجد کا مال غیر مصرف میں خرچ

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۱۲۹ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی) تفسیر معارف القرآن ج ۸ ص ۹۴ (سورۃ قدر)۔
(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۰۷ حاشیہ نمبر۴۔

کرنے کا گناہ تو نہ ہوگا، لیکن اسراف اور تشبہ بالکفار کا گناہ پھر بھی ہوگا، لہٰذا یہ ناجائز ہے۔ (۱)

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۸۸۲ ج)

ختمِ گیارھویں اور کونڈے کا حکم

سوال:- ختمِ گیارھویں اور کونڈے کا کیا حکم ہے؟ اور مُردوں کو ایصالِ ثواب کے لئے کیا کیا جائے؟

جواب:- گیارھویں اور کونڈے وغیرہ کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں، یہ بدعتیں ہیں جن کا اصل شرع میں وجود نہیں، ان میں شرکت نہیں کرنی چاہئے۔ مُردوں کو ایصالِ ثواب کی نیت سے صدقہ، خیرات ہر وقت کیا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۹۳ الف)

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ

***

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص ۱۰۲ حاشیہ نمبر

کتاب العلم والتاریخ والطب

(علم، تاریخ اور طب کے متفرق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی المتفرقات﴾
(علم، تاریخ اور طب کے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

کیا کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا حقیقی بیٹا تھا؟

سوال:- کنعان نام فرزند حقیقی حضرت نوح بود یا غیر حقیقی؟

جواب:- پسر حضرت نوح کہ در طوفان غرق شدہ بود اسم او بعض مؤرخین کنعان گفتہ اند۔ حافظ ابن کثیرؒ در تاریخ خود می نویسد "وهذا الابن هو يام أخو سام وحام ويافث، وقيل اسمه كنعان، وكان كافرا عمل عملا غير صالح" (البداية والنهاية جلد اوّل ص ۱۳)[1]۔ و ایں پسر چنانکہ ظاہر آیت دلالت می کند "ونادى نوح ابنه"[2] بود۔ کنعان دیگر پسر حام پسر نوح علیہ السلام بود، و مسکن او در شام بود باسم کنعان مشہور گشت۔ (کما فی الکامل لابن اثیر، ج۱ ص ۲۸)[3]۔

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۶/۱۹ الف)

"اجماع اور بابِ اجتہاد" نامی کتاب کا حکم، نیز اجماع کی حقیقت کیا ہے؟

سوال:- اسلام میں اجتہاد کا "دستوری ضابطہ" اور ائمہ اربعہ کے اجتہاد کی "دستوری پوزیشن" محترم مفتی محمد شفیع صاحبؒ قرآنی آیت النساء (۴: ۱۱۵) اور حدیث "لا تجتمع" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اجماع کا حق بحیثیت مجموعی ساری امت مسلمہ کو حاصل ہے نہ کہ امت کے کسی خاص طبقے یا گروہ کو۔

---

(۱) البداية والنهاية قصة نوح عليه السلام ج ۱ ص ۱۲۰ (طبع دار الفكر بيروت)

(۲) سورہ ہود ۴۲

(۳) وفي التاريخ الكامل لابن اثيرؒ ج ۱ ص ۲۸ (طبع قديم) وما الحام فولد له كوش ومصرايم وقوط وكنعان، وامام الكنعانيون فلحق بعضهم بالشام ... الخ

استدلال کے طور پر اس امر کو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خواہ مسئلہ زیرِ بحث کوئی بھی ہو، اگر اُمت کا سوادِ اعظم فقہاء کے اجماع کا مخالف ہو تو کوئی اجماع اصطلاحی معنوں میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا، لیکن یہ امکان ساری اسلامی تاریخ میں کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا، بلکہ عملاً اس کا وقوع ناممکن بھی ہے، کیونکہ اجماع ایک اسلامی فنی اور فقہی عمل ہے جس کے لئے اُمتِ مسلمہ کو ہمیشہ ان اہلِ علم پر اعتماد کرنا ہوگا جو اس شعبے میں ضروری قابلیت اور اختصاصی مہارت رکھتے ہیں۔

''اجماع اور بابِ اجتہاد'' (مصنف کمال فاروقی، ترجمہ مظہرالدین صدیقی صفحہ۵۰) اس تفسیر کے تجزیے سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

۱- اُصولی طور پر اجماع کا حق تمام اُمتِ مسلمہ کو حاصل ہے، نہ کسی خاص طبقہ یا گروہ کو۔

۲- لیکن چونکہ اجماع ایک فنی (Technical) اور فقہی عمل ہے، لہٰذا اس عمل کو مسلم معاشرے کا صرف فقہی اور عالم طبقہ ہی انجام دے سکتا ہے جو قرآن و سنت اور دیگر مآخذ سے فقہی اور قانونی تعبیرات اخذ کرنے کا ماہر ہے۔

۳- چونکہ مسلم معاشرہ بحیثیت مجموعی نہ اس فن کا ماہر ہے، نہ یہ عمل انجام دے سکتا ہے، لہٰذا اُمتِ مسلمہ نے قانون سازی کا یہ حق و فرض طبقۂ علماء و فقہاء کو ''تفویض'' کر دیا ہے۔

اس ''طبقۂ ماہرین'' کے انتخاب یا نامزدگی کا کوئی خصوصی طریقہ مسلم معاشرے میں متعین اور مروّج نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ خلافتِ راشدہ کے دور کے نظائر ایک مثال ضرور بن سکتے ہیں، لیکن حجت نہیں۔

۴- لہٰذا طبقۂ علماء و فقہاء کی تعبیرات اور اجماع پر مسلم معاشرے کا اجماع ناگزیر (منطقی طور پر) اور واجب ہے۔

۵- لیکن اس کے باوجود بھی اگر بالفرض اُمت کا سوادِ اعظم، فقہاء کے اجماع کا مخالف ہو تو کوئی اجماع اصطلاحی معنوں میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

۶- اسی طرح بالفرض اُمت کا سوادِ اعظم طبقۂ علماء و فقہاء کے برخلاف (یعنی علماء کے اجماع کے برخلاف) کسی تعبیر یا فیصلے پر متفق ہو جاتا ہے جسے علماء و فقہاء کی تائید حاصل نہ ہو تو یہ اجماع بھی منعقد اور مکمل نہیں ہوگا، اور دونوں صورتوں میں نمبر۵ اور ۶ میں چونکہ اجماع منعقد یا مکمل نہیں ہوگا، لہٰذا حجت نہیں ہوگا۔

۷- لہٰذا نمبر۵ اور ۶ کے تجزیے سے یہ ظاہر ہوا کہ طبقۂ علماء و فقہاء اور اُمتِ مسلمہ دونوں کو ''قوتِ تنفیذ'' حاصل ہے، یعنی انہیں اپنے فیصلے کے نفاذ کا حق بھی حاصل ہونا ضروری ہے۔

(اگرچہ یہ حق صرف اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جبکہ دونوں طبقے علماء اور سوادِ اعظم متفق ہوں)۔

اور دونوں طبقوں کی حیثیت مشاورتی کونسل کی ہرگز نہیں ہے جس کے فیصلے کو قبول یا مسترد کرنے کا اختیار ایک تیسرے اور حکمران طبقے کو حاصل ہو، جسے نہ اُمت نے منتخب کیا ہو، اور نہ نامزد کیا ہو، بلکہ صرف اس کے سیاسی غلبے کی وجہ سے مجبوراً قبول کیا ہو۔

۸- لہذا قرآن وسنت کی دستوری تعبیر اور دستوری اجماع وہ ہوا جو اس وقت منعقد ہو جبکہ -

۱- اُمت مسلمہ کا منتخب یا نامزد طبقۂ علماء وفقہاء موجود ہو جس کی تعبیر اور رائے کو اُمت کی تائید سے قوت نافذہ بھی حاصل ہو (جیسی کہ موجودہ لیجسلیچر کو حاصل ہوتی ہے)۔

۲- اُمت مسلمہ کو طبقۂ علماء وفقہاء کے اجماع کو قبول یا مسترد کرنے اور قبول کرنے کی صورت میں اس قبول شدہ اجماع کو نافذ کرنے کی قوت بھی حاصل ہو۔

۳- کسی بھی حکمران کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی یا کسی فردِ واحد کی (خواہ وہ امام ہی کیوں نہ ہو) یا کسی گروہ فقہا کی رائے اور تعبیر کو اُمت کی مرضی کے خلاف اس پر نافذ کردے۔

۴- لہذا دستوری اجماع وہی ہوگا جس میں مندرجہ بالا دونوں شرائط (نمبر۱، ۲) پائی جائیں، جس کی بہترین مثال خلافتِ راشدہ کے دور کے فیصلوں اور تعبیرات کی ہیں جن میں مندرجہ بالا دونوں شرائط پائی جاتی ہیں، اب ایک ایسے دور میں (مثلاً بنی اُمیہ اور بنی عباس کا دور اور پاکستان کا موجودہ دور بھی اس سے مختلف نہیں) جبکہ:-

الف ۱- اُمت کی مرضی کے خلاف اور اسلام کے سیاسی نظام کے قطعی طور پر خلاف، محض غلبہ اور طاقت کی بناء پر ایک فرد، خاندان یا جماعت، ملک کے سیاسی نظام پر مکمل طور پر مسلط ہو چکی ہو۔ (یہاں مستفتی نے ایک حاشیہ بھی تحریر کیا ہے جو نیچے ملاحظہ فرمائیں۔ محمد زبیر عفی عنہ)۔[1]

---

(۱) جیسے [illegible] نے خلیفہ منصور [illegible] ... حنفی اکثریت میں ہیں اور مالکی، شافعی، حنبلی اقلیت میں۔

(۲) واضح رہے کہ یہاں سوال غلط یا صحیح اجتہاد کا نہیں ہے، دستوری و غیر دستوری کا ہے۔ [illegible] ... لیکن کسی چیز کا صحیح یا غلط ہونا اور چیز ہے، اور دستوری و غیر دستوری ہونا دوسری چیز۔ یہاں بھی سوال دستوری و غیر دستوری کا ہے۔

۲:- طبقۂ فقہاء وعلماء موجود ہی نہ ہو یا اگر موجود ہو بھی تو:-

ا:- امامت کا منتخب شدہ یا نامزد شدہ نہ ہو۔

۲:- اگر اپنی علمی حیثیت اور سیرت و کردار کی بناء پر اُمت میں ایک مقام بھی رکھتا ہو تب بھی اس کے فیصلوں اور تعبیرات کو نفاذ کی قوت حاصل نہ ہو۔

۳:- یا حکمران جماعت و خاندان کی حیثیت زیادہ ہو اور اس کی حیثیت صرف مشاورتی کونسل کی ہو، جس کے فیصلوں اور تعبیرات کو قبول اور مسترد کرنے کا اختیار حکمران، فرد یا خاندان کو حاصل ہو۔

۴ - اور اُمتِ مسلمہ کو کسی فیصلے یا اجماع کے قبول و مسترد کرنے اور نافذ کرنے کی قوت حاصل نہ ہو۔

ب:- مندرجہ بالا صورت میں علماء وفقہاء کی ایک جماعت (جس کی علمی حیثیت اور سیرت و کردار کی بلندی مسلّم ہونے کے باوجود اُمت کے، غیر منتخب شدہ یا غیر نامزد شدہ ہے) یا فرد واحد، ذاتی طور پر اجتہاد کرتا ہے اور اس کے اجتہاد پر سوادِ اعظم یا سوادِ اعظم کا مختصر گروہ جمع ہو جاتا ہے۔

ج - تو کیا یہ اجماع، اسلام کے سیاسی نظام کے دستوری ضابطے کے لحاظ سے (جس کی مثال خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یعنی خلافت راشدہ ہے) دستوری ہے؟ (یعنی اس میں نکتہ نمبر ۸ کی دونوں شرائط نمبر ا و ۲ پائی جاتی ہیں؟)

د - اگر یہ دستوری نہیں تو اس کی حیثیت عبوری ہے، اور جب اسلام کا سیاسی نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی بنیاد پر قائم ہوگا (جس میں وہ دونوں شرائط پائی جاتی ہیں جو نکتہ نمبر ۸ میں بیان ہوئے ہیں) تو اس تعبیر اور اجتہاد کو امت مسلمہ اور طبقۂ علماء وفقہاء باضابطہ طور پر اختیار کرے گا تو ان کی حیثیت دستوری حیثیت سے مسلّم ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ

ر - لیکن اگر نکات الف، ب، ج، د، اور نکتہ نمبر ۸ کے تمام نکات غلط ہیں یا اسلام کے سیاسی نظام کے لئے ضروری نہیں ہیں تو -

ا - گویا اسلام میں اجماع اور اجتہاد کا کوئی دستوری ضابطہ متعین نہیں ہے، اور

۲ - ہر وہ اجتہاد، اجماع حاصل کر لیتا ہے جس پر امت کا کوئی گروہ جمع ہو جائے۔

۳ - اجماع اور اجتہاد کے لئے علماء فقہاء اور امت کی قوت تنفیذ ضروری نہیں ہے۔

۴ - مسلم معاشرے میں اجماع اور اجتہاد کی تاریخ اور قرآن وسنت کی فقہی تعبیرات کی تاریخ یہ ہے کہ ہر اجتہاد اور تعبیر علماء وفقہاء کا ذاتی اجتہاد ہے، جس پر بعد میں امت کا ایک گروہ یا طبقہ جمع

ہوجاتا ہے۔ کیا مندرجہ بالا تجزیہ دُرست ہے؟

جواب:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سب سے پہلے تو میں اس مکتوب کے جواب پر تأخیر کے لئے آپ سے تہ دل سے معذرت خواہ ہوں، لیکن میں جن مصروفیات میں ہمہ وقت گرفتار رہتا ہوں اگر آپ انہیں بچشم خود دیکھتے تو یقیناً معذور قرار دیتے۔

آپ نے جو سوالات اُٹھائے ہیں وہ تشریح کے لئے کافی تفصیل چاہتے ہیں، تاہم چند نکات عرض کرتا ہوں، خدا کرے کہ وہ آپ کے کسی کام آسکیں۔

۱- ''اجماع اور بابِ اجتہاد'' نامی کتاب جو کمال فاروقی صاحب کی تصنیف ہے، کوئی معتبر کتاب نہیں ہے، اور اس کتاب میں احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر بیان کرنے میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا، لہٰذا حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی بات نقل کرنے کے لئے اس کا حوالہ مستند نہیں ہے۔

۲- ''اجماع'' کے بارے میں اکثر مستند فقہاء کا موقف یہ ہے کہ وہ صرف ''کسی زمانے کے تمام اہل اجتہاد علماء کے کسی شرعی مسئلے پر متفق ہوجانے'' کو کہتے ہیں، یعنی اجماع دراصل صرف اہل اجتہاد علماء کے اتفاق کا نام ہے، عوام کا اختلاف واتفاق اس میں معتبر نہیں، چنانچہ صدرالشریعۃ اور علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں:-

وفی الاصطلاح اتفاق المجتهدین من أمة محمد علیه الصلوٰة والسلام فی عصر علی حکم شرعی وقید بالمجتهدین، اذ لا عبرة باتفاق العوام۔ (ملخصہ التلویح مع التوضیح ج ۲ ص ۴۱ طبع مصر)[1] ''اجماع اصطلاحی طور پر اُمت محمدیہ علی صاحبہا السلام کے مجتہدین کے کسی ایک زمانے میں کسی شرعی حکم پر متفق ہوجانے کا نام ہے۔ اور اس تعریف میں مجتہدین کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ عوام کے متفق ہوجانے کا کوئی اعتبار نہیں۔''

البتہ جن حضرات نے اجماع کی تعریف میں ''اہل اجتہاد'' کی قید نہیں لگائی جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کی رائے بھی اجماع میں مؤثر ہے، سو درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کا فریضہ بھی یہ ہے کہ وہ مجتہدین امت کی پیروی کریں، اور عملاً ہوتا بھی یہ ہے کہ جب مجتہدین کا کسی مسئلے پر اتفاق ہوجاتا ہے تو وہ انہی کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اسلام میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ عام مسلمانوں نے مجتہدین اُمت کے کسی فیصلے سے اختلاف کیا ہو، لہٰذا جب مجتہدین کسی مسئلے پر

---

(۱) توضیح تلویح ص:۴۹۴ (طبع نور محمد کتب خانہ کراچی)

اتفاق کرتے ہیں تو اُمت کے تمام افراد کا اتفاق خود بخود ہی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عملی اعتبار سے اسے "تمام مسلمانوں کا اجماع" بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر اہلِ اجتہاد کو مجتہدین کے اجماع کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔

۳- "مجتہدینِ امت" کی تعیین تاریخِ اسلام میں کبھی بھی یہاں تک کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی "انتخاب" اور "نامزدگی" کے مروجہ طریقوں سے نہیں ہوئی، بلکہ قبولیتِ عام سے اس کا فیصلہ ہوا ہے، جس طرح قدیم زمانے میں طبیب کے طبیب ہونے کے لئے کسی انتخاب یا نامزدگی کی ضرورت نہ تھی بلکہ قبولِ عام کی بنیاد پر اس کا فیصلہ ہوتا تھا، اسی طرح کسی کے مجتہد ہونے کا فیصلہ بھی اسی بنیاد پر کیا جاتا تھا اور اس میں کوئی عملی دُشواری نہ تھی۔ چنانچہ اگر کسی مسئلے میں کسی بھی عالم کا کوئی اختلاف نہیں تب تو اجماع کا تحقق ثابت ہوگیا، اور اگر کسی کا اختلاف ہے تو صرف اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ یہ شخص اہلِ اجتہاد ہے یا نہیں؟ اور دُوسرے مجتہدین کی اکثریت کا فیصلہ اس بارے میں کافی تھا۔

مندرجہ بالا نکات ذہن میں آجائیں تو اس سے آپ کے بیشتر سوالات کا جواب خود بخود نکل آتا ہے، کیونکہ وہ اس تصور پر مبنی ہیں کہ اہلِ اجتہاد کے اجماع کے خلاف عام مسلمانوں کی رائے بھی مؤثر اور معتبر ہے، جس کی تردید نمبر۲ میں اختصار کرچکا ہے۔ ان تین نکات کی بنیاد پر اگر کوئی خلش باقی ہو تو وہ دوبارہ لکھ کر معلوم فرمالیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۵/۲۸ ب)

کیا روزے کی حکمت وہی ہے جو نماز کی ہے؟

سوال:- مندرجہ ذیل الفاظ ایک مضمون کے ہیں جو "سیرت و کردار کے سانچے" کے عنوان سے روزنامہ حریت مؤرخہ ۲؍دسمبر ۱۹۶۷ء کے صفحہ نمبر۳ پر شائع ہوا ہے:-

"زکوٰۃ اور حج کی طرح روزہ ایک مستقل جداگانہ نوعیت رکھنے والا "رُکن" نہیں ہے بلکہ دراصل اس کا مزاج قریب قریب وہی ہے جو رُکنِ صلوٰۃ کا ہے، اور اسے رُکنِ صلوٰۃ کے مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگایا گیا ہے، اس کا کام اُن ہی اثرات کو زیادہ تیز اور زیادہ مستحکم کرنا ہے جو نماز سے انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ نماز، روزہ کا معمول "نظامِ تربیت" ہے، نماز کا معمول تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا ہے اور تعلیم و تربیت کی ہلکی خوراکیں دے کر چھوڑ دیتا ہے،

اور روزہ سال بھر میں ایک مہینے کا غیر معمولی نظام تربیت ہے جو آدمی کو تقریباً ۷۲۰ گھنٹے تک اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجے میں کس ہوا رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی معمولی تربیت میں جو اثرات تھے وہ شدید ہو جائیں۔"

اس کے بعد "روزے کے اثرات" کے عنوان سے نیا پیراگراف شروع ہوتا ہے۔

اپنی طرف سے کچھ مفہوم کے متعلق تحریر کرنا بددیانتی سمجھتا ہوں، لیکن چونکہ جواب میں تحریر فرمایا گیا ہے کہ عبارت کا مفہوم مجمل ہے، لہٰذا کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عبارت کا ابتدائی جملہ "نہیں ہے" کے ساتھ ختم ہو کر روزہ کے مستقل جداگانہ نوعیت کے رُکن کی نفی مطلق کرتا ہے۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی اس غلط فہمی کا سبب بیان کیا جا رہا ہے کہ مستقل رُکن روزہ کو اس لئے سمجھا گیا ہے کہ اس کا مزاج ایک مستقل رُکن کا سا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسے رُکن صلوٰۃ کے مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگادیا گیا ہے۔ لفظ "ہی" روزہ کی حیثیت کو محدود و معین کرتا ہے۔ عبارت کا باقی حصہ اس "محدود حیثیت" کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ بہرحال ابتداء میں نفی قطعی اور اس کے بعد وضاحت میں "ہی" کا لفظ کم از کم یہی ظاہر کرتا ہے۔

جواب:- مذکورہ عبارت میں نماز اور روزے کی حکمت بیان کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ روزے کی حکمت قریب قریب وہی ہے جو نماز کی تھی، اس کے ذریعہ بھی انسان کو تربیت دینا مقصود ہے، یہ بات اگرچہ فی نفسہ محلِ نظر ہے کہ روزے کو حکمت کے لحاظ سے نماز کا تتمہ قرار دیا جائے، حقیقت یہی ہے کہ روزہ بالکل مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اس کی حکمتیں بھی مستقل ہیں۔[۱] اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ نماز اور روزہ دونوں بندگی کے مظاہر ہیں، سو اس اعتبار سے تمام عبادات ایک جیسی ہیں، اس لئے اس عبارت میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی، لیکن چونکہ اس میں تشریعی طور پر روزے کے مستقل رُکن ہونے کا انکار نہیں کیا گیا اس لئے اس پر وہ احکام جاری نہ ہوں گے جو مستقل رُکن کے انکار سے جاری ہو سکتے ہیں۔

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۲/۱۱۸ الف)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی کی کتاب "احکام اسلام عقل کی نظر میں" ص ۱۴۳ (طبع کتب خانہ جمیل لاہور)۔

بعض شرعی احکام کی مصلحتیں

(غیرمسلموں کی جانب سے چند اعتراضات کا جواب درکار ہے، اُمید ہے کہ آپ جواب ارسال فرماکر عنداللہ ماجور ہوں گے)

سوال ۱:- اسلام میں کثیر الازدواجی (Poly Gamy) کی اجازت کیوں ہے؟ اور Poly Andry کیوں ممنوع ہے؟ اگر والدین کی شناخت کا مسئلہ ہے تو یہ خون کے ایک سادہ سے ٹیسٹ سے حل ہوجاتا ہے۔ عورتیں چار شادی کا مطالبہ کریں تو کیا دلائل ہیں؟

۲:- اسلام میں خنزیر کیوں حرام ہے؟ اس کی اخلاقی وطبی وجوہ ارشاد فرمائیں، اور یہ ثابت فرمایئے کہ اس کا گوشت کیوں مضر ہے؟

۳:- اسلام سے پہلے شراب پی جاتی تھی، یہ کیوں ممنوع نہ تھی؟

۴:- اگر کوئی اپنی بیوی کو غصے، غلط فہمی یا شدید مجبوری کی حالت میں طلاق دے دے اور دوبارہ اس سے شادی کرنا چاہے تو مرد کی اس غلطی کی سزا اس بیچاری بے گناہ مظلومہ عورت کو حلالہ کی صورت میں کیوں دی جاتی ہے؟ کرے کوئی، بھرے کوئی!

۵:- اسلام میں (معاذ اللہ) عورت کو کمتر مخلوق کیوں تصور کیا جاتا ہے؟ مثلاً جائیداد میں آدھا حصہ، آدھی گواہی، عقیقے میں آدھی قربانی، طلاق کا حق نہ ہونا، اگر خلع لینا ہو تو اپنے حق مہر سے دستبردار ہونا پڑے، وغیرہ وغیرہ۔

جواب:- آپ کے سوالات کے جواب سے پہلے دو اُصولی باتیں عرض کرتا ہوں۔

غیرمسلموں سے گفتگو

۱- غیرمسلموں سے جب کبھی اسلام کے بارے میں گفتگو کی نوبت آئے تو گفتگو ہمیشہ اُصولِ اسلام پر ہونی چاہئے، جزوی اَحکام پر نہیں، کیونکہ تمام جزوی اَحکام دراصل اُصولوں پر مبنی ہیں۔ جب تک انسان ان اُصولوں کا قائل نہ ہو، جزوی اَحکام کی حکمتیں ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہیں آسکتیں، اور ایک کے بعد دُوسرے حکم پر اعتراض کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

ہر حکم کی مصلحت سمجھ میں آنا ضروری نہیں

۲- اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم حکمتوں سے خالی نہیں ہے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر حکم کی مصلحت کلی طور انسان کی سمجھ میں آجائے۔ اگر ہر حکم کی مصلحت انسان کی سمجھ میں آجاتی تو اللہ تعالیٰ کو وحی کے

ذریعے احکام معلوم فرمانے کی ضرورت نہ تھی، صرف اتنا کہہ دیا جاتا کہ مصلحت و حکمت کے مطابق عقل سے کام لے کر عمل کرو۔ شریعت کے احکام تو آتے ہی عموماً اس جگہ پر ہیں جہاں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر اس معاملے کو صرف انسانی عقل کے حوالے کیا گیا تو وہاں ٹھوکر کھائے گا۔ لہٰذا اگر کسی حکم کی پوری مصلحت سمجھ میں نہ آئے تو اس حکم سے انکار نہیں کیا جاسکتا، جیسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کردو، بظاہر اس حکم میں کوئی مصلحت نہ تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مصلحت نہیں پوچھی، فوراً عمل کرنے پر تیار ہوگئے۔ جب اللہ تعالیٰ کو حکیم مطلق اور اپنا پروردگار مان لیا تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے ہر حکم کو بجالائے اور حکمت و مصلحت کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

اگر آپ ایک ملازم رکھیں اور جب آپ اسے کسی کام کا حکم دیں تو وہ پہلے آپ سے اس کی مصلحت بتانے کا مطالبہ کرے، تو کیا وہ ملازم وفادار سمجھا جائے گا یا برطرف کرنے کا مستحق ہوگا؟ جب ایک ملازم کا یہ حال ہے تو بندے کا معاملہ اپنے مالک کے ساتھ خود سوچ لیجئے۔

لہٰذا اصل تو یہ ہے کہ شرعی احکام کی مصلحتوں کے زیادہ درپے ہونا نہیں چاہئے، تاہم بہت سے شرعی احکام کی کچھ مصلحتیں انسان کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ حضرت مولانا تھانوی کی کتاب ''احکام اسلام عقل کی نظر میں'' انہی مصلحتوں کو بیان کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، کبھی اس کا مطالعہ فرمالیں۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا مختصر جواب حاضر ہے۔

۱:- مردوں کو چار شادیوں کی اجازت کیوں؟

یہ ایک حیاتیاتی حقیقت ہے کہ اگر ایک مرد چار عورتوں کے پاس جائے تو چاروں کو حاملہ کرسکتا ہے، لیکن ایک عورت چار مردوں کے پاس جائے تو وہ ایک ہی سے حاملہ ہوگی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فطرت کے لحاظ سے عورت ایک زوجی کے لئے پیدا کی گئی ہے نہ کہ مرد، اس کے علاوہ مرد پر ایسا کوئی زمانہ معمولاً نہیں آتا جب وہ جنسی تعلق کے قابل نہ ہو، لیکن عورت پر حیض و نفاس اور حمل کے ایام میں ایسے دور باقاعدہ آتے ہیں جب وہ جنسی تعلق کے قابل نہیں ہوتی، لہٰذا مرد کو جنسی تسکین کے لئے زیادہ کی ضرورت ہوسکتی ہے، عورت کو اس کی ضرورت نہیں۔

۲:- خنزیر کیوں حرام ہے؟

خنزیر کے طبی نقصانات سینکڑوں اطباء اور ڈاکٹروں نے بیان کئے ہیں، اور اخلاقی نقصان یہ ہے کہ اس سے قوت بہیمیہ میں اضافہ ہوتا ہے، جس کا مشاہدہ آپ دن رات مغرب میں کرتے ہیں۔

۳:- شراب ایک دم سے کیوں حرام نہیں ہوئی؟

اسلام کے احکام بتدریج آئے ہیں، ایک دم سارے احکام آجاتے تو عمل مشکل ہوتا، اس لئے رفتہ رفتہ کر کے بُری عادتیں چھڑائی گئیں۔

۴:- حلالہ کیوں؟

یہ خیال غلط ہے کہ "حلالہ" کوئی تدبیر ہے جس پر عورت کو مجبور کیا جارہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس شخص نے اللہ کی مقرر کی ہوئی تمام حدود کو پامال کر کے تینوں طلاقیں دے دیں، وہ اب اس لائق نہیں کہ ایک شریف عورت اس کے پاس رہے۔ لہٰذا حکم یہ ہے کہ اب اس سے نکاح نہ کرو، کوئی اور شوہر تلاش کرو۔ ہاں! اگر اس شوہر سے بھی نبھاؤ نہ ہوا، وہ از خود طلاق دیدے تو اس صورت میں اُمید ہے کہ پہلا شوہر کچھ سبق حاصل کر چکا ہوگا۔ اس لئے اگر اب اس سے نکاح کرنے پر بیوی رضامند ہو تو اس کی اجازت دے دی گئی ہے۔ ورنہ یہ جو محض حیلے کے طور پر حلالہ کیا جاتا ہے، وہ شریعت کے منشاء کے خلاف ہے۔

۵:- کیا عورت کم تر مخلوق ہے؟

عورت ہرگز کم تر مخلوق نہیں، البتہ مرد کے مقابلے میں کمزور ضرور ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے، اس لئے کسب معاش کی ذمہ داری اس پر نہیں ڈالی گئی۔ اس کی کمزوری اور بعض دوسری نفسیات کے پیش نظر مرد کو اس کے کسب معاش کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے، اور جب وہ کسب معاش کی ذمہ دار نہیں تو جائیداد میں بھی اس کا حصہ آدھا اور کسب معاش کے ذمہ دار کا حصہ پورا ہے، (اسلام کے سوا کسی مذہب میں تو آدھا حصہ بھی نہیں ہے)۔

یہ تمام موضوعات تفصیل طلب ہیں اور ایک خط میں ساری بات کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے، اس لئے آپ "مسلمان عورت" از مولانا ابو الکلام آزاد کا مطالعہ فرمائیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

(۱)
۱۴۱۲/۵/۵ھ

اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ "شخص" استعمال کرنے کا حکم اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات طاہر تھے؟

سوال ۱:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ خد

(۱) یہ فتویٰ "البلاغ" کے شمارہ جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ سے لیا گیا ہے۔ (از مرتب)

تعالیٰ کی ذات کو لفظ ''شخص'' سے پکارا جاسکتا ہے؟ کیونکہ پندرہ پارے کی ابتدائی آیت کا ترجمہ چند مترجم حضرات نے اس طرح کیا ہے کہ ''پاک ہے اس شخص کو جو لے گیا اپنے بندے کو'' اس جگہ خدا کی پاک ذات کو ''شخص'' کہہ کر مخاطب فرمایا گیا ہے۔ برائے کرم صرفی ونحوی قاعدے کی رو سے اور شرعی اعتبار سے اُجاگر فرمائیں کہ لفظ ''شخص'' صرف بنی آدم کے لئے ہی ہے یا خدا کی ذات اور ملائکہ وغیرہ کو بھی کہا جاسکتا ہے؟ نیز ''شخص'' کا لغوی اور اصطلاحی معنی بھی تحریر فرماکر ہماری رہنمائی فرمائیں۔ ایسی تحریر کا قرآنِ پاک ہمارے پاس موجود ہے، اگر لفظ ''شخص'' حضرت جبریلؑ کی طرف منسوب کیا جائے تو پھر اس میں قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جبریلؑ کے بندے تو نہیں ہیں؟

۲ - زید، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات مبارکہ کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ پاک نہیں ہیں، نیز یہ بھی کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیشاب مبارک آپ کی کسی خادمہ یا خادم نے نہیں پیا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ سچ ہے تو صحاحِ ستہ کی حدیث پیش کی جائے۔ برائے مہربانی تحریر کریں کہ زید کا قول صحیح ہے یا غلط ہے اور زید کے لئے کیا حکم ہے؟ کیا صحاحِ ستہ کے علاوہ باقی احادیث مبارکہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں؟

جواب ۱:- لفظ ''شخص'' کے لغوی معنی خواہ کچھ ہوں، لیکن عرفاً اس کا اطلاق انسانوں پر ہی ہوتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لئے اس لفظ کا استعمال درست نہیں، اس کے بجائے لفظ ''ذات'' استعمال کرنا چاہئے۔

۲ - اس مسئلے میں فقہاء ومحدثین میں اختلاف رہا ہے۔ ایک بڑی جماعت کے نزدیک راجح یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات طاہر تھے، جس کے دلائل ان کے پاس موجود ہیں[1]، لیکن اس مسئلے کی تحقیق پر نہ ایمان کا کوئی حصہ موقوف ہے اور نہ عملِ صالح کا، اس قسم کی بحثوں میں فضول پڑنا نہیں چاہئے، اس کے بجائے ایسے مسائل معلوم کیجئے جن کا تعلق عمل اور آخرت کی بھلائی سے ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸ ۔ ۳۰ و)

---

(۱) اس بارے میں تفصیلی بحث کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں

- الشفاء فی حقوق المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ج:۱ ص ۱۶۱ (علامہ قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ)

۲ - شرح الشفاء مُلّا علی قاری رحمہ اللہ ج:۱ ص ۱۵۹، ۳ - الدر المختار ج:۱ ص ۳۱۸ مطلب فی طہارۃ بولہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟

سوال:- گزارش یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟ اور یہ جو آثار قدیمہ والے بحث کرتے ہیں اور اس کے ثبوت کے طور پر وہ معلوم شدہ ڈھانچے سامنے لاتے ہیں، اس بارے میں آپ کی کیا تحقیق ہے؟ نیز جنات کب سے دنیا میں قیام پذیر ہیں؟ احادیث مبارکہ میں ان کا کوئی ذکر ہے؟

جواب:- محترمی و مکرمی!　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قرآن کریم یا کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے اب تک کتنی مدت گزر چکی ہے؟ لہٰذا اس کی تحقیق میں پڑنا دینی اعتبار سے نہ ضروری ہے، نہ مفید۔ سائنسی نظریات جو مختلف جمادات و نباتات کی عمر کے بارے میں سامنے آتے رہتے ہیں، ان کی حیثیت محض اندازے کی ہے، یقینی کی نہیں، اور جو ڈھانچے پرانے ملے ہیں ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اتنی بات بہرحال قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اس زمین پر انسان سے پہلے جنات آباد تھے۔ بہرحال ان تحقیقات پر کوئی دینی مسئلہ موقوف نہیں ہے، لہٰذا زیادہ فکر عملی مسائل کی کرنی چاہئے۔

واللہ اعلم
۵/۲۳/ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۹۳/۴۰ ج)

اُحد اور حراء سے متعلق دو واقعات کے زمانے کی تعیین

اور کیا علامہ ابن تیمیہ حافظ مزیؒ کے شاگرد تھے؟

سوال:- اس سے پہلے میری آپ سے اگرچہ تحریری یا بالمشافہ ملاقات نہیں، لیکن آپ کی علمی تصانیف اور خصوصاً تکملہ فتح الملہم اور درس ترمذی سے جو استفادہ کرنے کی بنا پر پہلے ہی سے ذہنی اور فکری طور پر آپ سے بہت قریب رہا ہوں، اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ انہی چند کتابوں کا مطالعہ کر کے میرے اندر حدیث شریف کا وہ ذوق پیدا ہوا جو آج میری امنگوں کا [illegible]

---

(۱) یہاں فتاویٰ دارالعلوم دیوبند [illegible]

سوال (۳۲) - حضرت آدم [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) [illegible]

مجھے ابنِ ماجہ پر تحقیقی کام کرنے کا حوصلہ دے چکا ہے۔ اگر مولائے کریم کی توفیق شامل رہی تو ابنِ ماجہ کی یہ شرح وقت کی اہم ضرورت پوری کرے گی۔

۱:- اس وقت جس مقصد کے لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں، وہ ایک حدیث کے سلسلے میں استفسار کرنا ہے جس میں، میں بُری طرح اُلجھ گیا ہوں۔ بخاری و مسلم، ترمذی، ابنِ ماجہ، مسند احمد اور تقریباً تمام ہی کتبِ حدیث میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم احد پر چڑھے تو وہ ہلنے لگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے احد! ٹھہر جا، "لیس علیک الا نبی أو صدیق أو شهید" آگے راوی تصریح کرتے ہیں کہ فلاں فلاں صحابہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ یہاں دو گتھیاں حل طلب ہیں۔ (الف) پہلی تو یہ کہ بخاری و مسلم میں احد کے الفاظ ہیں، جبکہ دوسری کسی حدیث میں غارِ حراء کی تصریح ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے یا الگ الگ دو واقعے ہیں؟ اس سلسلے میں اپنے موقف سے آگاہ فرمائیں۔ (ب) دوسرے یہ کہ ابنِ ماجہ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفینہ بن زید اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا بھی تذکرہ ہے، حالانکہ وہ بالاتفاق شہید نہیں، تو اب اس کی کیا تاویل کی جائے؟ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اس ذیل میں تمام محدثین کی تصریحات میری نظر سے گزر چکی ہیں، اور اب میری رائے یہ ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہے جو احد سے متعلق ہے، کیونکہ مکہ میں نبوت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حراء جانے کا تذکرہ غالباً نہیں ملتا، یہ محض رائے ہے جس کی میرے پاس کوئی دلیل نہیں، صرف ذوق و وجدان کی بناء پر ایسا کہہ رہا ہوں، یقینی فیصلہ تو آپ ہی فرمائیں گے۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ ابھی ایک ماہ قبل میں نے "جہانِ دیدہ" پڑھا، اس میں آپ نے علامہ مزیؒ مصنف تہذیب الکمال کے تعارف میں لکھا ہے کہ علامہ ابن تیمیہؒ ان کے شاگرد ہیں۔

تہذیب الکمال ایک سال پہلے میری نظر سے گزری تھی، اس میں مزی کے ترجمے میں، میں نے پڑھا تھا کہ وہ ابنِ تیمیہؒ سے اگرچہ چھ سال بڑے ہیں اور ان کے بعد بھی چودہ سال تک زندہ رہے ہیں، لیکن وہ شیخ الاسلام کے شاگرد ہیں، استاذ نہیں۔

یہ ایک سال قبل کا اجمالی خاکہ ہے، اس وقت نہ میرے پاس تہذیب الکمال ہے اور نہ ہی دوسری اُمہات الکتب موجود ہیں جن کی طرف مراجعت کرکے میں یقینی طور سے کچھ کہہ سکوں۔ ہوسکتا ہے کہ میرا حافظہ خطا کر رہا ہو، اس لئے آپ تحقیق کرلیجئے۔ مجھے بہرحال یہی یاد پڑتا ہے کہ شیخ الاسلام، علامہ مزی کے استاذ ہیں، شاگرد نہیں۔

آپ کے پاس اگرچہ مشاغل کا ہجوم ہے، لیکن مجھے آپ کی شفقت و عنایت سے امید ہے کہ

آپ اس حدیث کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی بتانے کی زحمت فرمائیں گے کہ کن کتابوں کے ذریعہ میں اپنے ذوقِ حدیث کو ترقی دوں۔ خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے۔

جواب ا:- (الف) - شراحِ حدیث کی تصریحات وترجیحات کی بناء پر درست موقف یہی ہے کہ اُحد اور حراء سے متعلق یہ دونوں الگ الگ واقعے ہیں، جو مختلف اوقات میں پیش آئے ہیں، اور وہ تصریحات درج ذیل ہیں:-

فی فتح الباری ج ۷ ص ۳۲[1] وأخرج مسلم من حديث أبي هريرة ما يؤيد تعدد القصة، فذكر أنه كان على حراء ومعه المذكورون، وزاد معهم غيرهم ... الخ

وفي عمدة القاري ج ۱۶ ص ۱۹۰[2] ولكن لا شك في تعدد القصة، فإن أحمد رواه من طريق بريدة بلفظ "حراء" وإسناده صحيح، وأبا يعلى رواه من حديث سهل بن سعد بلفظ "أحد" وإسناده صحيح، وأخرجه مسلم من حديث أبي هريرة، فذكر أنه كان على حراء ومعه أبوبكر وعمر وعثمان وغيرهم، فهذا كله يدل على تعدد القصة ... الخ

وفي المرقاة ج ۱۱ ص ۳۳۲ (طبع مكتبة امداديه ملتان) فاختلاف الروايات محمول على تعدد القصية في الأوقات اهـ

ب:- اس بارے میں دو قسم کی تأویل کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی تغلیب پر محمول ہے، چنانچہ ان حضرات میں سے اکثر شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوگئے ہیں، اور دُوسری یہ کہ شہادت عام ہے، یعنی شہادتِ حقیقیہ اور حکمیہ دونوں کو شامل ہے۔ لہٰذا بعض حضرات تو حقیقی شہادت پاگئے اور بعض کو حکمی شہادت ملی، بایں طور کہ انتقال ایسی بیماری سے ہوا جو شہادت کے حکم میں ہے۔

فی حاشية ابن ماجة ص ۳[3] قال القاري رحمه الله وفي سعد بن أبي وقاص مشكل، لأن سعدا مات في قصره بالعقيق، فتوجيه هذا أن يكون بالتغليب، أو يقال كان موته بمرض يكون في حكم الشهادة اهـ وأقول ومثله في سعيد بن زيد فإنه مات بالعقيق أيضا فحمل إلى المدينة سنة احدى وخمسين. (اكمال في أسماء الرجال)

وفي المرقاة في هذه القصة ج: ۱۱ ص ۳۳۲[4] واثبات الشهادة لبعضهم حقيقة وللباقين حكمًا، والله أعلم

(۱) فتح الباري كتاب فضائل الصحابة ج ۷ ص ۳۸ (طبع دار نشر الكتب الاسلاميه لاهور)
(۲) عمدة القاري ج ۱۶ ص ۱۹۱ (طبع دار الفكر بيروت)
(۳) (طبع ايچ ايم سعيد). (۴) (طبع مكتبه امداديه ملتان)

۲:- صحیح بات وہی ہے جو "جہانِ دیدہ" میں ہے، یعنی علامہ ابنِ تیمیہؒ، حافظ مزیؒ صاحبِ تہذیب الکمال کے شاگرد ہیں، اُستاذ نہیں۔ چنانچہ خود کتاب "تہذیب الکمال" کی فصلِ اوّل میں تصریح ہے:

وقرأ الثلاثة (أی ابن تیمیة وغیره) علی المزی، واعترفوا بأستاذیته وافتخروا بها (ج:۱ ص:۱۸)[1]۔

واللہ اعلم

عصمت اللہ عصمہ اللہ

۱۴۱۵/۲/۱۳ھ

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ موصول ہوا تھا، احقر نے اسفار واشغال کی وجہ سے اپنے ایک عزیز دوست کو مامور کیا تھا کہ وہ ان اُمور کی تحقیق کریں۔ انہوں نے اُوپر جو جواب لکھا ہے، احقر کی رائے میں درست ہے۔ اگر اُحد اور حراء کی احادیث ایک ہی صحابی سے مروی ہوتیں تو تعدّدِ قصہ بعید ہوتا، لیکن یہ مختلف اصحاب سے مروی ہیں، کما حققه الحافظ فی الفتح ۔ لہٰذا متعدّد واقعات پر محمول کرنے کے سوا چارہ نظر نہیں آتا۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۵/۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۴۲ /۱۴۵)

خواتین کے لئے میڈیکل اور ہوم اکنامکس کی تعلیم حاصل کرنا کیسا ہے؟

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ لڑکیوں کو قرآن اور معمولی خط وکتابت کی تعلیم دینے کے سوا مزید تعلیم دلانا حرام ہے یا جائز؟ اور اگر حرام ہے تو میڈیکل، حکمت اور ہوم اکنامکس کی تعلیم مسلمان خواتین کے لئے کس زُمرے میں آئے گی؟

جواب:- خواتین اگر میڈیکل سائنس، حکمت یا ہوم اکنامکس کی تعلیم اس غرض سے حاصل کریں کہ ان علوم کو مشروع طریقے پر عورتوں کی خدمت کے لئے استعمال کریں گی تو ان علوم کی تحصیل میں بذاتہ کوئی حرمت وکراہت نہیں، بشرطیکہ ان علوم کی تحصیل میں اور تحصیل کے بعد ان کے استعمال میں پردے اور دیگر اَحکامِ شریعت کی پوری رعایت رکھی جائے۔ اگر کوئی خاتون ان تمام اَحکام کی

(۱) (طبع مؤسسة الرسالة بیروت)

رعایت رکھتے ہوئے یہ علوم حاصل کرے تو کوئی کراہت نہیں،(۱) لیکن چونکہ آج کل ان میں سے بیشتر علوم کی تحصیل اور استعمال میں احکامِ شریعت کی پابندی عنقاء جیسی ہے، اس لئے اس کا عام مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۰ر رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳ / ۱۳۰۳ د)

خطوط میں بسم اللہ، ابجد اور ہندسوں میں لکھنے کی شرعی حیثیت اور اس طریقے کی ایجاد کی تاریخ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین درج ذیل مسئلے میں کہ خطوط میں جو ابجد سے بسم اللہ لکھی ہوتی ہے، یہ کس کی ایجاد ہے؟ اور یہ کب ہوا؟ اور عدد سے پورے بسم اللہ کا ثواب و برکت حاصل ہوگی یا نہیں؟

جواب:- خطوط کی ابتداء میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھنا مسنون ہے،(۲) اور یہ بات قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط بسم اللہ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بات کسی مستند کتاب میں نظر نہیں آئی کہ بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ کا عدد کب سے لکھا جانا شروع ہوا، لیکن اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بسم اللہ لکھا ہوا کاغذ کی بے حرمتی کی جگہ استعمال ہوگا تو اس سے بے ادبی ہوگی، لہٰذا اگر کوئی شخص اس خیال سے زبان سے بسم اللہ پڑھ کر یہ عدد لکھ دے تو سنت تو ادا ہو جائے گی لیکن افضل یہی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ صراحۃً لکھی جائے، اس لئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط بھی کافر کے پاس گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر بادشاہوں کو جو خطوط روانہ فرمائے، ان میں بھی بسم اللہ درج تھی۔ ظاہر ہے کہ کافر کے پاس بے حرمتی کا احتمال مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ تھا، مگر اس کی وجہ سے بسم اللہ کو ترک نہیں کیا گیا۔

واللہ اعلم بالصواب
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۵/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۰۳ ب)

---

(۱) فی البحر ج ۸ ص ۱۹۲: وللطبیب انما یجوز له ذلک اذا لم یوجد امرأة طبیبة، فلو وجدت فلا یجوز له ان ینظر، لأن نظر الجنس الی الجنس أخف، وینبغی للطبیب ان یعلم امرأة ان امکن. وفی الشامیة ج ۶ ص ۳۷۱ (قوله وینبغی) کذا اطلقه فی الهدایة والخانیة وقال فی الجوهرة: اذا کان المرض فی سائر بدنها غیر الفرج یجوز النظر الیه عند الدواء، لانه موضع ضرورة، وان کان فی موضع الفرج فینبغی أن یعلم امرأة تداویها، فان لم توجد وخافوا علیها أن تهلک ... والظاهر ان ینبغی هنا للوجوب وکذا فی الهندیة ج ۵ ص ۳۳۰، وفی البدائع ج ۵ ص ۱۲۴.
(۲) دیکھئے معارف القرآن ج ۱ ص ۱۵ تا ۱۷۔

جواب صحیح ہے، مگر اس کی شرط یہ ہے کہ ظن غالب اس کا ہو کہ اس خط کی بے ادبی نہ کی جائے گی، جہاں یہ شرط نہ ہو جیسے عموماً خطوط میں یہی حال ہے، وہاں بسم اللہ لکھنے سے پرہیز کرنا بہتر ہے، صرف زبان سے کہنے پر اکتفا کرے یا ۷۸۶ کو ایک علامت بسم اللہ کی ہونے کی حیثیت سے لکھ دے۔ مکاتیب نبوی اور مکتوب سلیمانی میں یہ شرط موجود تھی، کیونکہ عام دُنیا میں سلاطین اور بڑوں کے خطوط احتیاط سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ جن خطوط کے متعلق آج بھی یہ گمان غالب ہو ان میں بسم اللہ لکھنا چاہئے۔

بندہ محمد شفیع

حدیث "کنت کنزًا مخفیًا" کی تحقیق اور تخلیقِ عالَم کے سلسلے میں کئی وساوس اور شبہات کے جوابات

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ بندہ آپ کے تبحر علمی، ذکاوت فہم اور اعلیٰ استعداد فقہ کا قدردان اور دل سے معترف ہے، اور آپ کے لئے دست بدعا رہتا ہے، اسلام کو آپ جیسے علماء کی سخت ضرورت ہے، آپ کی بہت سی کتابوں سے بندہ نے استفادہ کیا ہے، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ، اللہ کرے نورِ فہم اور زیادہ۔

بندہ آج کل چند وسوسوں کی وجہ سے سخت پریشان ہے، ان میں سے تین اشکال ہر وقت ذہن میں گھومتے ہیں، اور میرے اور خدا کے درمیان ایک قسم کا حجاب بنتے ہیں، کیونکہ نماز و اذکار وغیرہ کے درمیان یہ وسوسے آکر بدمزگی کا سبب بنتے ہیں۔ براہِ کرم فی سبیل اللہ میری مدد فرمائیں، میں سمجھتا ہوں حضرت تھانویؒ کے فہم و فراست سے جناب کو کافی حصہ ملا ہے، ایسے سوالات کے جوابات مولانا تھانویؒ کی خصوصیات میں شامل ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ خدمتِ دین کے سلسلے میں آپ کی مصروفیات ملک و بیرونِ ملک، تصنیف و تألیف، دارالعلوم کے انتظامی اُمور اور دیگر شعبہ جات میں آپ کا انہماک اتنا زیادہ ہے کہ شاید اپنی ذات کے لئے بھی آپ کو وقت کم ملتا ہوگا، مگر آپ جیسے عالم سے پوشیدہ نہیں ہوگا کہ تزکیۂ نفس کا کام بھی کتنا عظیم الشان کام ہے کہ پیغمبر اس کے لئے مبعوث کئے گئے، اور وسوسوں کا ازالہ اور شبہات و اشکال کا مدلل جواب بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

آپ کی مصروفیت کی بناء پر آپ اس میں آزاد ہیں کہ جواب ایک دن میں، یا ایک مہینے میں دیں، یا ہر اشکال کا ایک ساتھ دیں، یا الگ الگ دیں، جس طرح آپ کو سہولت ہو، مگر براہِ کرم جواب ضرور دیں، حق تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

سوال ۱:- الف:- "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" مفسرین حضرات نے "لِيَعْبُدُوْنِ" کی تفسیر "لِيَعْرِفُوْنِ" سے کی ہے، یعنی مقصد تخلیق یہ ہے کہ خدا کو پہچانا جائے، اور ایک حدیث بھی ہے "كنت كنزًا مخفيًا" یعنی میں چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں "فخلقت الخلق" چنانچہ میں نے خلق کو پیدا کردیا۔

وسوسہ یہ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کی صفات الرحمن الرحیم بھی ہے، نے محض اپنی شناخت اور تعارف کے لئے کروڑوں، اربوں انسانوں کو پیدا کرکے ایک بلائے عظیم میں مبتلا کردیا۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک کروڑوں، اربوں ذی روح انسان جن کے جسم ایسے بنائے گئے کہ اگر ایک سوئی بھی بدن میں لگ جائے تو تکلیف ہوتی ہے۔ سسک سسک کر ظالموں کے جبر و بربریت اور اذیت ناک تشدد کے سبب مرگئے۔ ہزاروں، لاکھوں جنگلی جانوروں، شیر، سانپ، بچھو کی غذا کے لئے، لاکھوں افراد سمندری طوفان، برف باری اور موسم کی خنکی کی نذر ہوگئے۔ لاکھوں لوگ آفات سماوی ارضی، طاعون، چیچک اور دُوسری اذیت ناک بیماریوں کے لقمہ بن گئے۔ لاکھوں بے کس انسان قحط میں بھوک سے مرگئے، آج بھی لاکھوں انسان قلت غذائیت کے شکار ہیں۔ ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے۔ دو وقت کی روٹی نہ ملے تو کیسی اذیت ہوتی ہے، کوئی زخم لگ جائے، کوئی بیماری ہوجائے، کسی کی عزتِ نفس مجروح ہو، کسی بے گناہ کو قید کردیا جائے، کسی کو بے عزت کردیا جائے، کسی کا گھر لوٹ لیا جائے، کسی کو اغوا کرلیا جائے، یہ اذیتیں برابر جاری ہیں اور زیادہ تر ان کے شکار غریب اور بے وسیلہ لوگ ہوتے ہیں، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

بنی نوعِ انسان پر ایسی ایسی مصیبتوں اور تکالیف کے پہاڑ ٹوٹے ہیں جن کو سن کر پتھر دل بھی موم ہوجائیں۔ نوعِ انسانی کا ابتدائی دور دیکھئے، سردی کی شدت، گرمی کا عذاب، ہواؤں کی تیزی ایسی ہی تھی جیسی آج ہے، مگر انسان کے پاس نہ لحاف، نہ گدے تھے، بدن پیڑ کی چھالوں اور جانوروں کی کھالوں سے چھپایا جاتا تھا۔ پتھر کا دور، لوہے کا دور، زندہ رہنے کے لئے کیسی جدوجہد کرنی پڑتی ہوگی؟

ب:- پھر جس پہچان اور شناخت کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ" کی حالت میں پیدا کیا۔ اس شناخت کو بھی ستر ہزار پردوں میں ایسا چھپایا کہ پوری زندگی ریاضت اور مجاہدات کرو، تب بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا، (ماشاء اللہ) سلوک کی کتابیں اور صالحین کے حالات اس پر شاہد ہیں۔

ج:- پھر چلو اگر دنیا کی زندگی جیسے تیسے گزرگئی، فاقوں میں، بیماری میں، موسم کی سختی میں، مظلومی کی حالت میں تو اب آخرت کی زندگی کا خوف اس سے بڑھ کر، وہاں کا عذاب دُنیا کے عذاب

سے ہزاروں گنا بڑا ہے، تو گویا ایک روح کو جسم دے کر ابدالآباد اور ہمیشہ کی تکلیف میں مبتلا کر دیا اور شناخت کو اتنا مشکل بنا دیا کہ کوئی کہتا ہے اللہ کا وجود ہی نہیں، کوئی کہتا ہے سب اللہ ہی اللہ ہے، کوئی کہتا ہے کہ اس کے اولاد ہے، کوئی کہتا ہے وہ فلاں جسم میں حلول کر گیا۔

۳- تو پھر ایک ایسی چیز یعنی شناخت (عرفانِ الٰہی) جو اتنی مشکل اور نایاب ہو اس کے لئے اربوں گوشت پوست کے انسانوں کو ایسی بلائے عظیم میں مبتلا کرنا بظاہر خدا کی صفت الرحمن الرحیم سے متضاد معلوم ہوتی ہے۔

د:- اگر جواب میں کوئی کہے کہ اسلام نے اللہ کی شناخت کا طریقہ بتا دیا ہے تو بے شک یہ صحیح ہے، مگر اس سے شناخت کہاں ہوتی ہے؟ اس سے تو صرف علم حاصل ہوتا ہے، یعنی جاننا اور پہچاننا اور چیز ہے۔

یا کوئی کہے کہ ہم سب اللہ کی مملوک ہیں اور مالک کو اپنی مملوک میں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے، اس سے کوئی سوال نہیں کر سکتا، تو بے شک یہ بھی صحیح ہے مگر خدا نے انسانوں کو منع کیا ہے کہ اپنی مملوک میں بے جا تصرف نہ کرو، اولاد کو بھوکا مارنا، اپنے جانوروں کو بھوکا رکھنا، اپنی دولت کا بیجا اسراف، یہ سب باتیں خدا نے منع کی ہیں۔ تو جس امر کو خدا اپنے بندوں سے پسند نہیں کرتا وہ خود کیونکر کر گیا؟

محترم! یہ سوال میں پوری انسانیت کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے کر رہا ہوں جس میں ابتدائے خلق سے آج تک کے سارے انسان، کافر، مؤمن سب شامل ہیں۔ لہذا جواب میں اس حیثیت کو مدنظر رکھئے گا۔ بندے کا علم بہت محدود ہے اور یہ معاملات تکوینی امور سے تعلق رکھتے ہیں جن کی حکمت کا احاطہ محال ہے اور آخرت میں بھی پورا پورا ہوگا۔ پس جناب سے استدعا ہے کہ ایسا معقول جواب عنایت فرمائیں کہ کسی طرح یہ کانٹا نکل جائے جو آج کل مجھے بہت پریشان کئے ہوئے ہے۔ عقیدہ تو الحمدللہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی شئی باطل پیدا نہیں کی مگر بعض امور میں قلب ساتھ نہیں دیتا، خدا مجھے اس منافقت سے محفوظ رکھے۔

اشکال نمبر۲:- ساری دنیا میں کروڑوں لوگ انتہائی افلاس اور غربت کا شکار ہیں، افریقہ میں تو ہزاروں لوگ بھوک سے مرجاتے ہیں۔ ہم اپنے صوبہ سرحد کو دیکھیں، چھوٹے چھوٹے بچے کچرا چنتے ہوئے نظر آتے ہیں جن کو مشکل سے دس بیس روپے روز مزدوری ملتی ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ جن کے یہاں رزق کی اتنی وسعت ہے کہ ان کے کتے بھی وہ غذا کھاتے ہیں جو غریبوں کو میسر نہیں، اگر اس تفاوت کو امر خدا سمجھا جائے تو یہ قرآن اور خدا کے قول "وما انا بظلام للعبید" کے خلاف جاتا ہے۔ غور وفکر کے بعد یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ "وما من دابة فی الارض الا علی اللہ رزقھا" مشروط ہے اپنے زمانے کے اسباب معیشت اختیار کرنے پر۔ مشاہدہ ہے کہ ایک بھائی نے اس زمانے

کے اسباب معیشت اختیار کئے، پڑھ لکھ گیا، اعلیٰ عہدے کا مالک ہو گیا، خوب رزق میں وسعت ہوئی، دوسرا بھائی جاہل رہ کر ہر طرح محتاج رہا۔ اس کے خلاف بھی ہے، مگر حکم اکثریت پر لگایا جاتا ہے۔ خدا کو کسی سے دشمنی نہیں کہ اس کو محتاج رکھے، قرآن کی آیت "إِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ ....." بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ آپ فرمائیں کہ یہ بات صحیح ہے اور یہ عقیدہ حق ہے یا نہیں؟

اشکال نمبر۳:- ہمارا عقیدہ ہے کسب بندے کی طرف سے ہے اور خلق اللہ کی طرف سے۔

بندے نے کسی نیک کام کا ارادہ کیا، اللہ نے اس عمل کی تخلیق کر دی، یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن بندے نے کسی برائی مثلاً ڈاکہ یا قتل کا ارادہ کیا تو اللہ کی طرف سے اس عمل کی تخلیق سے دو اشکال پیدا ہوتے ہیں، پہلا تو یہ کہ اللہ کی تخلیق کا عمل بندے کے ارادے کے تابع ہے، گو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تخلیق عمل نہیں ہوتا مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے اور حکم اکثریت پر لگتا ہے۔

دوسرا اشکال یہ کہ بد عمل کی تخلیق بظاہر "وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ بندوں کو حکم ہے "لا تعاونوا" کسی نے کسی بے گناہ کو قتل کر کے اس پر ظلم کیا، اللہ تعالیٰ نے اس عمل کی تخلیق کر کے ظالم سے تعاون کیا (نعوذ باللہ)۔ دنیا کی عدالتیں اعانت جرم کو بھی جرم سمجھتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے اس بد عمل کی تخلیق کی کیا توجیہ کریں گے؟ دوسرے یہ کہ ایمان مفصل میں "والقدر خيره وشره من الله تعالىٰ" سے مراد یہی تخلیق فعل ہے یا کچھ اور؟ کیونکہ شر محض کا صدور تو حق تعالیٰ سے محال ہے۔

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مفصل خط ملا، آپ نے احقر کو جو دعائیں دی ہیں، ان پر تہ دل سے شکر گزار ہوں (جزاکم اللہ تعالیٰ)۔ آپ کے اصل سوال کے بارے میں پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ "كنت كنزا مخفيا الخ" کا جو فقرہ حدیث قدسی کے عنوان سے مشہور ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بھی سند سے ثابت نہیں ہے، علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

"كنت كنزا لا أعرف فأحببت أن أعرف ... قال ابن تيمية إنه ليس من كلام النبي صلى الله عليه وسلم، ولا يعرف له سند صحيح ولا ضعيف، وتبعه الزركشي وشيخنا"

(المقاصد الحسنة للسخاوي ص:۳۲۷)

نیز علامہ عجلونی نے بتایا ہے کہ صرف علامہ ابن تیمیہ ہی نہیں، حافظ ابن حجرؒ، علامہ زرکشیؒ اور علامہ سیوطیؒ نے بھی یہی کہا ہے کہ اس روایت کی کوئی بھی سند نہیں ہے، نہ صحیح، نہ ضعیف۔

(کشف الخفاء للعجلونی ج ۲ ص ۱۷۳)

اور اسنی المطالب میں لکھا ہے کہ اس حدیث کو بعض صوفیاء نے بلا حدیث قدسی کے طور پر ذکر کرتے ہیں (ص:۲۴۳) اور بس۔

البتہ آیت کریمہ میں ضرور وارد ہوا ہے کہ "وما خلقتُ الجنّ والانس الا لیعبُدُون"[1] یعنی جن وانس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اس سے آگے آپ نے تخلیق عالم کے سلسلے میں جن وساوس وشبہات کا ذکر فرمایا ہے، ان کا اجمالی جواب یہ ہے کہ یہ وساوس وشبہات درحقیقت اس دائرے میں قدم رکھنے سے پیدا ہوتے ہیں جو عقل انسانی سے ماوراء ہے۔ تخلیق کائنات کی کیا حکمتیں ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا کیسا نظام بنایا ہے؟ اور یہاں ہر چیز اور ہر واقعے کے پیچھے کیا کیا مقاصد کارفرما ہیں؟ اگر یہ سب باتیں انسان کی عقل اور علم میں آجائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان انسان نہ رہا، عالم الغیب ہوگیا۔ یہ بات طے شدہ ہے جس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ انسان کی عقل محدود ہے، اور وہ کائنات کی تخلیق تو کیا، خود اپنے وجود کے ہر حصے کی حکمت تخلیق معلوم کرنے پر بھی قادر نہیں، یہاں تک کہ وہ دماغ جس سے انسان سوچتا ہے، اس کا بھی بڑا حصہ ابھی تک انسان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا عمل کیا ہے؟ جو واقعات انسان کو کسی تکلیف یا صدمے کے دکھتے ہیں، وہ صرف ان کا ظاہری رخ ہے، ان واقعات کے پیچھے کے حقائق اس کے علم میں نہیں ہوتے۔ ہماری زندگی ہی میں بہت سے حالات و واقعات ایسے پیش آتے ہیں کہ ایک عرصے تک ہم ان پر افسوس کرتے رہتے ہیں، لیکن کسی وقت ان کی حقیقت کھلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ افسوسناک واقعات عین حکمت کے مطابق تھے۔ اگر یہ حقیقت نہ کھلتی تو ہم اسے ظلم ہی سمجھتے۔ اب کسی کسی موقع پر یہ حکمت ظاہر ہوجاتی ہے، لیکن اکثر مواقع پر ظاہر نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان معاملات کی کھوج میں پڑنا جو انسان کے دائرۂ ادراک سے باہر ہیں، خواہ مخواہ اپنے آپ کو پریشانی میں ڈالنا ہے۔

دوسری طرف اگر اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان ہے تو اس کے رحمن ورحیم ہونے پر بھی ایمان ہونا لازمی ہے۔ اگر کسی مخلوق کی کوئی تکلیف دیکھ کر آپ کو ترس آرہا ہے تو کیا رحمن ورحیم کو نہیں آئے گا؟ اگر اس نے آپ سے کہیں زیادہ رحیم ہونے کے باوجود اسے اس حالت میں چھوڑا ہے تو یقیناً اس کی کوئی وجہ ہے جو آپ کے دائرۂ علم وادراک سے باہر ہے۔ آپ ایک شخص کو پھانسی پر لٹکا تو دیکھ رہے ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ اس نے کتنے انسانوں کی جان لی ہے؟ آپ ایک ڈاکٹر کو کوئی عضو کاٹتے ہوئے دیکھ کر ترس کھا رہے ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ آپریشن نہ ہوتا تو سب اعضاء کا کیا بنتا؟ یہ تو معمولی مثالیں ہیں، پوری کائنات کے نظام میں کسی شخص کے حق میں کیا بہتر

---

(۱) سورة الذّریٰت:۵۶

ہے؟ اس کا علم سوائے خالق کائنات کے کسی کو نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس کھوج میں پڑنا ہی خلافِ عقل ہے۔ اگر یہ اجمالی حقیقت ذہن نشین ہوجائے تو ان شاء اللہ اس قسم کے وساوس وشبہات زیادہ پریشان نہیں کریں گے، اور اگر بھی غیر اختیاری طور پر آئیں تو اپنے آپ کو کسی کام میں لگالیں، اور ان کی طرف التفات نہ کریں۔

والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۰/۱۲/۲۷ھ

(فتویٰ کے حوالوں کی تخریج از مولانا محمد عبداللہ میمن زید مجدہٗ)

۱- کنت کنزا لا اعرف فاحببت ان اعرف، فخلقت خلقا فعرفتهم بی، فعرفونی. قال ابن تیمیة: انه لیس من کلام النبی صلی الله علیه وسلم ولا یعرف له سند صحیح ولا ضعیف، وتبعه الزرکشی وشیخنا. (المقاصد الحسنة للسخاوی ص:۳۲۷)

۲- وفی کشف الخفاء بعد هذه العبارة:-

وتبعه الزرکشی والحافظ ابن حجر فی اللآلی والسیوطی وغیرهم، وقال القاری ولکن معناه صحیح مستفاد من قوله تعالی "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" ای لیعرفونی کما فسره ابن عباس. والمشهور علی الألسنة کنت کنزا مخفیا، فأحببت ان اعرف، فخلقت خلقا فبی عرفونی، وهو واقع کثیر فی کلام الصوفیة، واعتمدوه، وبنوا علیه اصولا لهم. کشف الخفاء للعجلونی ج:۲ ص:۱۷۳.

۳- وفی الموضوعات الکبیر مثل ذلک الی کما فسره ابن عباس رضی الله عنهما. (ص:۹۳)

۴- وفی اسنی المطالب" وتبعه الزرکشی، وابن حجر، وهذا یذکره المتصوفة فی الأحادیث القدسیة تساهلًا منهم. (ص:۲۴۳)

قومِ لوطؑ کی جس بستی کو اُلٹا گیا تھا اس کی تعیین میں رائے کا اختلاف

سوال:- معارف القرآن جلد سوم سورۂ انعام ص۳۲۰ پر مرقوم ہے:

قومِ لوط کی پوری بستی کو الٹ دیا گیا جو آج تک اردن کے علاقے میں ایک عجیب قسم کے پانی کی صورت میں موجود ہے، جس میں کوئی جانور، مینڈک، مچھلی وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتی، اسی لئے اس کو بحرِ میّت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور بحرِ لوط کے نام سے بھی۔

پوری بستی کو الٹ جانے کا واقعہ جس جگہ پیش آیا ہے وہ بالکل صاف میدان ہے، عذاب والی جگہ کو پانی سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ کوئی جانور زندہ نہیں رہ سکتا، تاریخ کے خلاف ہے۔ آج کل لوگ اس جگہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، عذاب الٰہی کی جگہ کو بحر میت کہنا جھوٹ ہے۔

جواب:- حضرت لوط علیہ السلام کی جن بستیوں کو الٹ دیا گیا تھا، ان کی تعیین میں رائیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اردن تشریف لے گئے تو وہاں کے اہل علم نے بحر میت کی جگہ کے بارے میں یہی بتایا کہ یہ لوط علیہ السلام کی بستیوں کی جگہ ہے، اور والد صاحبؒ کو وہاں لے بھی گئے، اس کی بنیاد پر انہوں نے یہ بات لکھی ہے۔ اگر کسی صاحب علم کی تحقیق اس کے خلاف ہو، تو ہوسکتی ہے، یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر شریعت کا دار و مدار ہو، ایک تاریخی یا جغرافیائی مسئلہ ہے، اور بہت سے تاریخی جغرافیائی مسائل میں اہل علم کی رائے یا مشاہدات مختلف ہوتے ہیں، ان میں سے کسی کو راجح، کسی کو مرجوح تو کہہ سکتے ہیں، مگر کسی کو جھوٹ کہنا بڑی زیادتی کی بات ہے، والسلام

واللہ سبحانہ اعلم
۵/۶/۱۳۹۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۰۴۴ ج)

نبوّت اور وحی کی کیا حقیقت ہے؟

سوال:- برائے کرم تفصیلی اعتبار سے یہ سمجھا دیجئے کہ نبوت اور وحی کیا چیز ہیں؟ اور نبی اور خدا کے مابین جو رشتہ ہوتا ہے اس کا ہم کس طرح ادراک کرسکتے ہیں؟

جواب:- یہ ایک مفصل اور طویل بحث ہے جو مختصر طور سے سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ اس موضوع پر احقر کی کتاب ''علوم القرآن'' میں مفصل بحث موجود ہے۔ یہ کتاب مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴ نے شائع کی ہے، اس کا مطالعہ فرمائیں، پھر بھی کوئی شبہ رہ جائے تو پوچھ لیں۔ واللہ اعلم

۳/[illegible]/۱۳۹۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۵۰۹ ہ)

کیا موجودہ سائنسی تحقیقات قرآن وحدیث سے متعارض ہیں؟

سوال:- چاند، سورج اور ستاروں کے بارے میں موجودہ سائنس کی جو تحقیق ہے، کیا وہ قرآن کریم کی رو سے درست ہے؟ یہاں بعض حضرات کہتے ہیں کہ سائنس اور قرآن وحدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، لہٰذا اس کی ہر بات درست ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ سائنس کے نظریات قرآن سے ٹکراتے ہیں، براہ کرم اس معاملے میں اپنی جامع و مانع رائے سے مطلع فرمائیے۔

جواب:- آپ کا سوال اچھے جواب کے لئے درحقیقت ایک مبسوط مقالے کی وسعت چاہتا ہے، تاہم اصولی طور پر چند ضروری باتیں پیش خدمت ہیں۔ امید ہے کہ وہ آپ کی اُلجھن دُور کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

۱- سب سے پہلے یہ بات سمجھ لیجئے کہ سائنس کا بنیادی مقصد ان قوتوں کا دریافت کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ودیعت فرمائی ہیں۔ اگر ان قوتوں کو انسانیت کی فلاح و بہبود میں استعمال کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اسلام کی نظر میں نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ اسلام ان کوششوں کے راستے میں کوئی رُکاوٹ کھڑی کرنے کے بجائے ان کی ہمت افزائی کرتا ہے، اس سلسلے میں اسلام کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ ان قوتوں کو ان مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے جو اسلام کی نظر میں جائز اور مفید ہیں۔ دُوسرے الفاظ میں سائنس کا کام یہ ہے کہ وہ کائنات کی پوشیدہ قوتوں کو دریافت کرے، لیکن ان قوتوں کا صحیح مصرف مذہب بتاتا ہے، وہی ان اکتشافی کوششوں کے لئے صحیح رُخ اور بہتر فضا مہیا کرتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اسی وقت انسانیت کے لئے مفید ہوسکتی ہے جب اسے اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے، ورنہ شاید اس سے کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ سائنس جس طرح انسانیت کے لئے مادّی فلاح و بہبود کا باعث بن سکتی ہے، اسی طرح اگر اس کا غلط استعمال کیا جائے تو وہ ہمارے لئے تباہ کن بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ مثلاً ہمارے سامنے ہے کہ ماضی میں سائنس نے جہاں انسانیت کو راحت وآسائش کے اسباب مہیا کئے ہیں، وہاں اس کے غلط استعمال نے پوری دُنیا کو بدامنی اور بے چینی کا جہنم بھی بنادیا ہے۔ سائنس ہی نے سفر کے تیز رفتار ذرائع بھی ایجاد کئے اور اسی نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بھی بنائے، لہٰذا سائنس کا صحیح فائدہ اسی وقت حاصل کیا جاسکتا ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اُصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے۔

۲- دُوسری بات یہ سمجھنے کی ہے کہ سائنس کی تحقیقات دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو صریح مشاہدے پر مبنی ہیں، ایسی تحقیقات نہ کبھی قرآن وسنت سے متصادم ہوئی ہیں اور نہ ہوسکتی ہیں، بلکہ مشاہدہ تو یہ ہے کہ ایسی تحقیقات نے ہمیشہ قرآن وسنت کی تصدیق ہی کی ہے، اور قرآن وسنت کی بہت سی وہ باتیں جو کچھ عرصہ پہلے لوگوں کی سمجھ میں ذرا مشکل سے آتی تھیں، سائنس کی ان تحقیقات نے ان کا سمجھنا آسان بنادیا ہے، مثلاً معراج کے موقع پر براق کی جس تیز رفتاری کا ذکر صحیح احادیث میں آیا ہے، قدیم زمانے کے نام نہاد عقل پرست سے بعید از قیاس سمجھتے تھے، لیکن آج سائنس نے یہ ثابت نہیں کردیا کہ تیز رفتاری ایک ایسی صفت ہے جس کو کسی حد میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔

دُوسری قسم کے سائنسی نظریات وہ ہیں جو مشاہدہ اور یقین کے بجائے ظن وتخمین پر یا کم علمی

پر مبنی ہیں، اور اس سلسلے میں سائنس داں کسی یقینی نتیجے پر ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں، ان کی تحقیقات بعض اوقات قرآن وسنت کی تصریحات سے ٹکراتی ہیں، ایسے مواقع پر سیدھا اور صاف راستہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کی تصریحات میں کوئی تاویل کئے بغیر ان پر ایمان رکھا جائے، اور سائنس کی جو تحقیقات ان سے ٹکراتی ہیں ان کے بارے میں یہ یقین رکھا جائے کہ سائنس ابھی اپنی کم مائیگی کی بناء پر اصل حقیقت تک نہیں پہنچی، جوں جوں انسان کی سائنسی معلومات میں اضافہ ہوگا قرآن وسنت کے بیان کئے ہوئے حقائق واضح ہوتے جائیں گے۔

مثلاً بعض سائنسدانوں کا یہ خیال ہے کہ آسمان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ خیال اس بناء پر قائم نہیں ہوا کہ انہیں آسمان کے موجود نہ ہونے پر کوئی دلیل قطعی مل گئی ہے، بلکہ ان کے استدلال کا حاصل صرف یہ ہے کہ ہمیں آسمان کے وجود کا علم نہیں ہوسکا، اس لئے ہم اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ دوسرے الفاظ میں یہ خیال ''علم عدم'' کے بجائے ''عدم علم'' پر مبنی ہے ... لہٰذا ہم جو قرآن وسنت کی قطعیت پر ایمان رکھتے ہیں، پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ان سائنسدانوں کی یہ رائے قطعی غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن وسنت کی تصریح کے مطابق آسمان موجود ہے، مگر سائنس اپنی کم علمی کی بناء پر اسے دریافت نہیں کرسکی، اور اگر انسان کی سائنسی معلومات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا تو عین ممکن ہے کہ سائنسدانوں کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوجائے اور وہ اسی طرح آسمان کے وجود کو تسلیم کرلیں جس طرح بہت سی ان چیزوں کو تسلیم کیا ہے جن کا پہلے انکار کیا جاتا تھا۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھنے کی ذہنیت ختم ہوتی جارہی ہے، جب کسی چیز کی اہمیت ذہن پر سوار ہوتی ہے تو بسا اوقات اس میں حد سے تجاوز ہونے لگتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نہایت مفید اور ضروری فنون ہیں، اور دور حاضر میں تو مسلمانوں کے لئے ازحد ضروری ہے کہ ان فنون کی طرف بطور خاص توجہ دے کر ان میں ترقی کی انتھک کوشش کریں، اس کے بغیر موجودہ دنیا میں ان کے لئے اپنا جائز مقام حاصل کرنا ممکن نہیں رہا، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ کوئی سائنسدان اپنے ظن وتخمین سے جس کسی نظریئے کا اعلان کردے اسے وحی کی طرح درست تسلیم کرلیا جائے، اور اس کی بناء پر قرآن وسنت میں تاویل وترمیم کا دروازہ کھول دیا جائے، یا اس کی بناء پر قرآن وسنت میں شکوک وشبہات پیدا ہونے لگیں، خاص طور پر جب یہ شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ سائنس کے اس قسم کے نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔

۳- یاد رکھئے کہ اسلام کا معاملہ عیسائیت سے بہت مختلف ہے۔ عیسائی مذہب میں اتنی جان نہیں تھی کہ وہ زمانے کی نت نئی ضروریات اور انسان کی بڑھتی ہوئی سائنسی معلومات کا مقابلہ کرسکتی،

لہٰذا سائنس اس کے لئے ایک عظیم خطرہ بن کر سامنے آئی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ عیسائیت کے وقار کو سلامت رکھنے کے لئے یا تو سائنس کی مخالفت کرے یا اپنے مذہب میں ردّ و بدل کرے۔ شروع میں رومن کیتھولک چرچ نے پہلے راستے کو اختیار کیا، اور چونکہ عوام پر اس کا اقتدار قائم تھا، اس لئے گلیلیو جیسے سائنسدانوں کو بے شمار رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن جب کلیسا کا اقتدار ڈھیلا پڑا تو اب اس کے لئے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اپنے مذہب میں ترمیم کر کے اس کی نئی تشریح و تعبیر کریں۔ چنانچہ اہل تجدّد (Modernism) کے مکتب فکر نے یہ راستہ اختیار کر لیا۔

لیکن یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ عیسائی مذہب کو انتہائی غیر فطری اور غیر معقول بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اسلام کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، وہ دین فطرت ہے، اور عقل و خرد کی کوئی دلیل اسے چیلنج نہیں کر سکتی۔ اس میں زمانے کی ہر ضرورت کو پورا کرنے اور ہر دور کی تحقیقات کے ساتھ ان کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے۔ لہٰذا ہمیں اسلام کے وقار کو سلامت رکھنے کے لئے سائنس کی مخالفت کی ضرورت ہے، نہ اسلام کو بدلنے کی، اس لئے کہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ سائنس جس قدر ترقی کرے گی اور انسان کی سائنسی معلومات میں جتنا اضافہ ہوگا اسلام کی حقانیت اور واضح ہوتی چلی جائے گی، بشرطیکہ انسان کا نقطۂ نظر صحیح معنوں میں سائنٹفک رہے، اور وہ محض قیاس و تخمین کو یقین اور مشاہدے کا درجہ نہ دے بیٹھے۔

بس یہ ہے وہ بات جو علمائے دین کہتے ہیں، اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا چاہئے۔ جذباتی نعروں کی رو میں آ کر حدود سے تجاوز کرنا دانشمندی کا تقاضا نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ اس معتدل اور سو فیصد معقول بات کی وجہ سے بعض حضرات مسلسل یہ تشہیر کر رہے ہیں کہ علماء، سائنس اور نئی ایجادات کے مخالف ہیں، اور اس میدان میں ترقی کرنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس الزام کے جواب میں ہم یہ دعا کرنے کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو فکر سلیم عطا کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
(۱)
آخر جمادی الاولیٰ ۱۳۸۷ھ

اہرام کے فوائد اور اثرات کی شرعی حیثیت

سوال:- اہرام کے اندر کھانے پینے کی اشیاء رکھنے سے وہ سڑتی نہیں بلکہ خشک اور سکڑ جاتی ہیں، مثلاً -

---

(۱) یہ فتویٰ "البلاغ" کے شمارہ جمادی الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

دودھ رکھا جائے تو وہ دہی یا پنیر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

گوشت رکھا جائے تو وہ سڑتا نہیں بلکہ خشک ہو جاتا ہے۔

چائے یا تمباکو رکھنے سے ان کی تلخی یا کڑواہٹ ختم ہو جاتی ہے۔

اہرام کے اندر اگر پانی رکھا جائے تو بعد میں وہ اہرامی پانی اگر -

پودوں میں ڈالا جائے تو ان کی نشوونما اور جسامت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

سر کے بالوں میں لگایا جائے تو بال گرنے بند ہو جاتے ہیں اور پیدائش میں اضافہ ہوتا ہے۔

سردیوں میں جلد پر لگایا جائے تو پھٹی ہوئی جلد ٹھیک ہو جاتی ہے، اور چہرے پر لگایا جائے تو جھرّیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

عادی شرابی کو پلایا جائے تو شراب کی طلب ختم ہو جاتی ہے۔

مچھلی گھر میں ڈالا جائے تو مچھلیوں کی افزائش میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

جانوروں کے آگے اگر اہرامی پانی اور عام پانی رکھا جائے تو وہ اہرامی پانی پیتے ہیں۔

اہرام کے اندر اگر دوا رکھی جائے تو اس کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔

اہرام کے اندر اگر پھلوں اور ترکاریوں کے بیج رکھے جائیں تو ان بیجوں سے طاقت ور پھل زیادہ پھل پھول والے درخت اور سبزیاں پیدا ہوں گی۔

اگر گلاب اور دوسرے درختوں کی قلمیں پانی میں ڈبو کر اہرام کے اندر رکھی جائیں تو ان قلموں سے جڑیں بہت جلد نکلتی ہیں۔

اگر استعمال شدہ بلیڈ اہرام کے اندر رکھا جائے تو اس کی دھار دوبارہ تیز ہو جاتی ہے۔

زخموں اور چوٹوں کے اوپر جب اہرام رکھا گیا تو وہ بہت جلد اچھے ہو گئے۔

سائنس دانوں نے بیماریوں کے جراثیم اہرام میں رکھے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جراثیم یا تو مکمل طور پر ختم ہو گئے یا ان کی پیدائش وافزائش میں حیرت انگیز کمی ہوئی۔

مختلف بیماروں کو اہرام کے اندر بٹھانے سے پہلے اور بٹھانے کے بعد ان کے خون کا تجزیہ کیا گیا، ڈاکٹر حیران رہ گئے کہ اہرامی قوت نے آدھے گھنٹے کے اندر خون کے اجزاء میں کافی تبدیلیاں کر دیں۔ اب آپ فرمائیے کہ:-

۱- اہرام جسے انگریزی میں پیرامڈ (Pyramid) کہتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲- دنیا کے مختلف علاقوں میں بنے ہوئے اہرام خصوصاً مصر جن میں سے ایک کے اندر فرعون کی لاش موجود ہے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بھی پہلے کے ہیں، اس لئے کیا

اہرام کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ملتی ہیں یا نہیں؟ نیز یہ کہ قرآن کے اندر بھی اہرام کے متعلق کچھ مضمون بیان کیا گیا ہے یا نہیں؟

۳:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں کیا اہرام استعمال کرنے یا اہرامی شکل کے مکانات بنانے کا رواج موجود تھا یا نہیں؟

۴:- ''اہرام کے فوائد'' جو پچھلے صفحے پر بیان کئے گئے ہیں، ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے تو پھر اہرام کی پُراسرار قوت کا راز کیا ہے؟ کیا ان فوائد کا حاصل ہونا کسی جادو وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے یا یہ کسی دُنیاوی علوم کا نتیجہ ہیں؟

۵:- کیا یہ فوائد حاصل کرنے کے لئے اہرام سے استفادہ کرنا شرعاً جائز ہے؟

۶:- چونکہ اہرام سے دو چیزوں کا خاص تعلق ہے، جن میں سے شمال اور جنوب کا تعین کرنا، کیا ان کی بھی کوئی شرعی حیثیت ہے یا ان کا تعلق کسی دُنیاوی علوم سے ہے؟

۷:- کہا جاتا ہے کہ اکثر اہرام خیالات وخواہشات کو مادّی شکل دیتا ہے، کچھ لوگوں نے قابلِ عمل خواہشات کو لکھ کر اہرام کے اندر رکھا، کچھ عرصے کے بعد ان کی خواہشات خود بخود پوری ہوگئیں، کیا ایسا ہونا شرعاً ممکن ہے؟

۸:- تجربات اور مشاہدات سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ شمس چاند اور بعض اوقات سیاروں اور زمین کی گردش کی وجہ سے اہرام کے بعض اثرات میں زیادتی اور بعض میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔ موجودہ مغربی طب نے بڑی حد تک سیاروں کے اثرات کے بارے میں واضح ثبوت فراہم کئے ہیں، مثلاً پورے چاند پر، جنون، پاگل پن، مرگی کیفیت، خودکشی، قتل اور جرائم کی وارداتوں میں اضافہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ عورتوں کے ایامِ حیض بھی چاند کی گردش سے متأثر ہوتے ہیں، اور اس بات کا بھی لوگوں کو عملی تجربہ ہے کہ پورے چاند پر سمندر چڑھا ہوا ہوتا ہے۔

کیا چاند اور سیاروں کے اثرات کی کوئی شرعی حیثیت ہے یا نہیں؟ اگر ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے تو پھر ان تمام باتوں کے ظہور ہونے کی کیا وجوہات ہیں؟ اور ان پر یقین رکھنا شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب:- ''اہرام'' کی حقیقت اور خواص وآثار کے بارے میں قرآن وسنت نے کوئی بات ارشاد نہیں فرمائی، اس کا تعلق خالصۃً تجربے اور مشاہدے سے ہے۔ تجربے اور مشاہدے سے اگر ''اہرام'' کی شکل کے کچھ خواص یا فوائد ثابت ہوجائیں تو ان کو شریعت کے خلاف نہیں کہا جاسکتا، نہ ان خواص کو ظاہری اسباب کے درجے میں تسلیم کرنے سے کسی اسلامی عقیدے میں نقص واقع ہوتا ہے،

بشرطیکہ ان کو ظاہری سبب ہی کے درجے میں رکھا جائے، موثر حقیقی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کو سمجھا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۱۸ھ
(فتوی نمبر ۹۱/۵۷)

اجتہاد کی شرائط اور موجودہ دور میں کسی کو مجتہد قرار دینا

سوال:- پندرہ روزہ ''قافلہ'' میں ایک مضمون ''دیوبندی بریلوی اختلاف کا پس منظر، اصلاحی تحریک (از صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی)'' نظر سے گزرا۔ کچھ امور جو حضرت سید احمد بریلویؒ اور ان کے رفقاء کی طرف منسوب کئے گئے ہیں وہ صحیح اور غلط کا ملغوبہ محسوس ہوتے ہیں، اور ذہنی پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ چونکہ یہ ناچیز دیوبند مسلک، تھانوی مشرب کا حامل ہے، اس لئے ان میں سے چند تحریروں کی نشاندہی کر کے حقیقت حال سے کتاب کشائی کا طالب ہے۔ اس مضمون کی یہ پہلی قسط رسالے میں شائع ہوئی ہے، لہٰذا مضمون ابھی جاری ہے، اس لئے مجھے اجازت دی جائے اس سوال اور آپ کے جواب کو بھی پندرہ روزہ ''قافلہ'' میں برائے اشاعت پیش کردوں تاکہ عامۃ المسلمین غلط فہمی سے غلط عقائد کو علمائے حق کی طرف منسوب سمجھ کر اہل حق سے مستفید ہونے سے محروم نہ رہیں بفضلہ تعالیٰ ان میں سے ایک بات یہ لکھی ہے کہ:-

''اجتہاد'' یہ ایک ایسا حق ہے جو ہر صاحب علم و بصیرت مسلمان کو حاصل ہے۔ یہ اجتہاد کسی خاص شخصیت اور خاص زمانے تک محدود نہیں بلکہ تاقیامت جاری رہے گا۔ وہابی تحریک کے ہم نوا اندھی تقلید کے حامیوں پر نکتہ چینی کرتے تھے، اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ وہ ائمہ اربعہ امام اعظمؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ کا احترام نہیں کرتے تھے، اور ان کے اجتہاد پر انہیں اعتماد نہیں تھا، کیونکہ اصل وہابی تحریک کے مؤسس اول شیخ محمد بن عبدالوہاب خود حنبلی مسلک رکھتے تھے اور مقلد تھے۔

جواب:-''اجتہاد'' کی حقیقت یہ ہے کہ وہ بے شک اس لحاظ سے کسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ اس کے بعد کسی زمانے میں پایا جانا عقلاً ناممکن ہو بلکہ وہ ایک ملکہ ہے جس کے پائے جانے کے لئے علم کی کچھ خاص شرائط ہیں، جو اصول فقہ کی کتابوں میں مفصل مذکور ہیں۔ یہ شرائط پہلے زمانوں میں بکثرت پائی جاتی تھیں، اب عام طور سے ان شرائط کا آدمی نہیں ملتا، اس لئے اس دور میں کسی کو مجتہد مطلق قرار نہیں دیا گیا، البتہ اجتہاد کی کچھ خاص اقسام مثلاً اجتہاد فی المسائل کے لئے شرائط نسبۃً نرم ہیں اور آخری زمانوں میں اس کے حامل علماء ہوتے ہیں۔ مسئلہ تفصیل طلب ہے، ضرورت ہو تو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا رسالہ ''الاقتصاد فی التقلید و الاجتہاد'' اور احقر کا

رسالہ ’’تقلید کی شرعی حیثیت‘‘ ملاحظہ فرمائیں۔

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۶۸۱ د)

جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے واقعہ کا انکار کرنا

سوال:- مسئلہ مشاجرات میں جو حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان ہوا، جنگ صفین و جمل میں آپس میں صحابہ کرامؓ مقتول ہوئے۔ زید اس واقعے کی سخت تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ’’رُحماءُ بینھم‘‘ صحابہؓ کی صفت ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ آپس میں قتل و قتال کریں؟ (نعوذ باللہ) یہ صحابہ کرامؓ پر بہتانِ عظیم ہے۔ زید کا یہ انکار درست ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر جنگِ جمل اور جنگِ صفین کا وقوع صرف کسی ایک تاریخی روایت سے ثابت ہوتا تو زید کا استدلال صحیح ہوتا، لیکن ان جنگوں کا وقوع تواتر سے ثابت ہے۔[1] اس لئے اس کا انکار درست نہیں۔ ’’رُحماءُ بینھم‘‘[2] کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کبھی ایک دوسرے سے کوئی اختلاف یا رنجش پیدا نہیں ہوتی تھی، لہٰذا اگر اجتہادی اختلافِ رائے کی بناء پر کوئی مشاجرہ پیدا ہو تو اس کے منافی نہیں ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۲۳ ج)

بقدرِ ضرورت علمِ دین سیکھنے کے لئے ایک مطالعاتی نصاب کا خاکہ

سوال:- گزارش ہے کہ حضرات علمائے کرام سے سنتے رہتے ہیں کہ دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے ’’طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة‘‘ لیکن دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کی تعیین ہم جیسے عامی مسلمانوں کو معلوم نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح آپ نے دینی مدارس میں پڑھنے والے علمائے کرام کے لئے ایک نصاب مقرر کر رکھا ہے، اس طرح عام مسلمانوں کے لئے بقدرِ ضرورت دین کا علم سیکھنے کے لئے کوئی نصاب مقرر نہیں۔ اگرچہ حضرات علمائے کرام نے دین اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے اُردو زبان میں بہت سی کتابیں اور رسالے تحریر فرمائے ہیں۔

---

(۱) دیکھئے تاریخ الطبری ج۳ ص:۵۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)، الاستیعاب ج:۳ ص:۱۳۷۵ (طبع دار جیل بیروت)، الإصابة ج۲ ص ۲۸

(۲) سورۃ الفتح ۲۹

آپ سے درخواست یہ ہے کہ آپ اُردو زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کا ایسا مجموعہ تجویز فرمادیں جو عام مسلمانوں کے لئے علم دین سیکھنے کے لئے نصاب کا درجہ رکھتا ہو، اس نصاب کو پڑھ لینے کے بعد آدمی کو دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کا علم حاصل ہوجائے، اور حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محولہ بالا حدیث پاک کا منشا بھی پورا ہوجائے۔ بینوا توجروا۔

جواب:- گرامی نامہ ملا، آپ نے بہت اہم سوال پوچھا ہے۔ بقدرِ ضرورت دین کا علم حاصل کرنا واقعۃً ہر مسلمان پر فرض ہے۔ احقر کی رائے میں اس مطالعے کے دو حصے کرنے چاہئیں۔ پہلا حصہ ابتدائی ضروری معلومات پر مشتمل ہو جن کے بغیر ایک سچے مسلمان کی طرح زندگی گزارنا ممکن نہیں، اور دُوسرا حصہ پہلے حصے کی تکمیل کے بعد ایسے مطالعے پر مشتمل ہو جس سے دینی معلومات میں اتنی وسعت اور استحکام پیدا ہوجائے کہ انسان گمراہ کرنے والوں سے گمراہ نہ ہو۔ پہلے حصے میں احقر کی نظر میں مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ ضروری ہے:-

۱:- حیاۃ المسلمین از حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۲:- فروع الایمان از حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۳:- تعلیم الدین از حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۴:- مردوں کے لئے ''بہشتی گوہر'' اور عورتوں کے لئے ''بہشتی زیور'' از حکیم الاُمتؒ
۵:- جزاء الاعمال از حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۶:- سیرتِ خاتم الانبیاء از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
۷:- حکایاتِ صحابہؓ از شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری مدظلہم
۸:- تاریخ اسلام کامل از حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ
۹:- اُسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم از حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ

دُوسرے حصے میں مندرجہ ذیل کتب شامل ہونی چاہئیں:-

۱:- معارف القرآن از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
یا تفسیرِ عثمانی از شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
۲:- معارف الحدیث کامل از حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم
۳:- بہشتی زیور کے مسائل از حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
یا علم الفقہ از حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ
۴:- عقائد اسلام از حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ
۵:- شریعت وطریقت از حکیم الاُمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ان شاء اللہ ان کتابوں کے مطالعے سے دین کی اتنی ضروری معلومات حاصل ہو جائیں گی کہ ان کے بعد اپنی زندگی بھی سنور جائے اور انسان کسی باطل نظریئے سے گمراہ بھی نہ ہو۔ والسلام

آخر جمادی الثانیہ ۱۴۰۲ھ[۱]

کلمۂ طیبہ میں لفظ ''محمد'' پر رفع، اور اذان میں اس پر نصب کی وجہ

سوال:- کلمۂ طیبہ میں لفظ ''محمد'' میں لفظ ''د'' ضمہ کے ساتھ اور اذان میں فتحہ کے ساتھ کیوں ہے؟ دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب:- یہ عربی زبان کے قواعد کی وجہ سے ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۸ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲۳ ۱۹ الف)

میڈیکل کالج میں ڈاکٹری کی مخلوط تعلیم اور پوشیدہ انسانی اعضاء کے معائنے سے متعلق متعدد مسائل

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسائل کی بابت -

(برائے مہربانی جواب لکھنے سے پہلے ایک بار تمام مسائل پڑھ لیے جائیں تاکہ تمام نکات سامنے آجائیں، اس کے بعد فرداً فرداً جواب تحریر فرمائیں، خصوصاً مندرجہ ذیل پیرا پڑھ لیں)

ہم میڈیکل کالج میں پڑھتے ہیں، ہماری تعلیم مکمل ہونے میں تقریباً ایک سال باقی ہے، مندرجہ ذیل تمام مسائل پڑھ لیں اور بعد از مکمل تحقیق، مفصل و مدلل جواب تحریر فرمائیں، ہر ایک کے لئے لکھیں کہ ۱- جواز کی آخری حد کیا ہے؟ ۲- جواز کی آخری حد کن شرائط پر ہے؟ ۳- افضل کیا ہے؟ جزاک اللہ- پہلے یہ پڑھ لیں: یہاں میڈیکل کالج میں جتنے بھی داڑھی والے طلباء ہیں ان کو مولوی کہا جاتا ہے، تمام ''مولویوں'' کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ انتہائی درجے کے نالائق ہوتے ہیں، اور ہمیں طعنے سننے پڑتے ہیں، اگر کبھی کوئی ''مولوی'' کسی سوال کا جواب دیدے تو استاد صاحب فرماتے ہیں ''آج تو کمال ہی ہوگیا، کوئی معجزہ ہوگیا کہ مولوی صاحب نے جواب دے دیا''، اساتذہ اور دوست وغیرہ اکثر ہمیں ان الفاظ سے سمجھاتے ہیں ''مولویوں کو زیادہ پڑھنا چاہئے کیونکہ اسی میں دین

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ [illegible] سے لیا گیا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

کی عزت ہے، نہ پڑھ کر مولوی دین کو بدنام کرتے ہیں، ورنہ عام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جو دین پر چلتا ہے وہ کسی کام کا نہیں رہتا، لہٰذا تمہاری وجہ سے دین بدنام ہو رہا ہے۔'' ہم مولوی قطعاً نالائق نہیں ہیں بلکہ شرعی مجبوریوں کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ کی طرف کم سے کم توجہ دیتے ہیں، لوگ اور اساتذہ ہمیں طعنے دیتے ہیں کہ ''نہ تم کسی پارٹی وغیرہ میں آتے ہو، نہ تم پڑھتے ہو، آخر تم کیا کرتے ہو؟'' ایک طرف دین کا حکم بھی ہے کہ اپنے آپ سے لوگوں کو غلط فہمی نہ ہونے دو، نیز دین کی اور اپنی عزت کا خیال رکھو، بعض اوقات تو اساتذہ ایسی بات بھی کہہ دیتے ہیں جو صریح کفر ہوتی ہے۔

اب تک چار سال گزر چکے ہیں اور ہمیں کچھ بھی نہیں آتا، جس طرح ہم یہاں آنے سے پہلے کورے تھے، ویسے ہی اب بھی کورے ہیں، یقیناً کچھ نہیں آتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ شرعی مجبوریوں وغیرہ کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ پر توجہ نہیں دیتے۔

یہ بات بھی ہمارے سامنے کی ہے کہ ہم سے بڑے مولوی یعنی وہ مولوی صاحبان جو ہم سے پہلے یہاں سے تعلیم مکمل کرکے فارغ ہوئے ہیں، کوئی ان کے پاس جانا پسند نہیں کرتا، نہ ان کا کلینک چلتا ہے، وجہ یہی کہ انہوں نے معائنہ وغیرہ میں تجربہ حاصل نہیں کیا، لہٰذا ان کی تشخیص صحیح نہیں ہوتی، مریض کا حق ادا نہ کرنے کا گناہ علیحدہ ہے، اور یہ حدیث علیحدہ ہے کہ نااہل قاضی اور نااہل طبیب کا ٹھکانا جہنم کے سوا کچھ نہیں۔

وجہ یہی ہے کہ انہوں نے مریضوں پر پڑھا نہیں، اپنے ہاتھ سے کرکے نہیں دیکھا، معائنہ کرکے نہیں دیکھا، ان تمام باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

میڈیکل کالج میں مخلوط نظامِ تعلیم ہے، لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں، پڑھانے والے اکثر مرد ہیں، بعض اوقات خواتین اساتذہ بھی پڑھانے آجاتی ہیں اور بے پردہ ہوتی ہیں، ہماری معلومات کے مطابق پورے پاکستان میں مردوں کے لئے علیحدہ کوئی میڈیکل کالج نہیں ہے، لاہور میں لڑکیوں کے لئے فاطمہ جناح کالج ہے، جہاں مخلوط نظامِ تعلیم نہیں ہے، مگر وہاں اساتذہ میں خواتین کے ساتھ مرد بھی شامل ہوتے ہیں، بہرحال ہمارے میڈیکل کالج میں مکمل بے پردگی ہے، بعض لڑکیاں ایسے کپڑے پہنتی ہیں کہ حدیث کے مطابق کپڑے پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں، اور کپڑوں کے اندر جلد کا رنگ صاف نظر آتا ہے، اگر کپڑا باریک نہ ہو تو بھی بعض لڑکیاں تنگ لباس پہنتی ہیں جس سے جسم کے اعضاء واضح ہو جاتے ہیں، تمام لڑکیاں ایسی نہیں ہیں، بعض لڑکیاں چادر سے چہرہ ڈھانپے رکھتی ہیں مگر آنکھیں اور آس پاس کی جلد نظر آتی ہے، لڑکے اکثر تنگ پتلون پہنتے ہیں، جس سے ان کے اعضاء واضح رہتے ہیں، جو لڑکے شلوار قمیص استعمال کرتے ہیں ان میں سے بھی بعض کالر وغیرہ استعمال کرتے ہیں، ۹۹ فیصد لڑکوں کے ٹخنے

ڈھکے ہوتے ہیں، جبکہ لڑکیوں میں سے اکثر کے ٹخنے ننگے ہوتے ہیں، لڑکیوں کی آواز بھی سنائی دیتی ہے، بعض لڑکے لڑکیاں آپس میں کھلم کھلا باتیں کرتے ہیں، ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ اساتذہ، خواتین ہوں یا مرد، وہ بھی ہنسی مذاق کرتے ہیں، یہاں مردوں کی کوئی تمیز نہیں، خصوصاً بعض اساتذہ تو یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لئے کوئی لڑکا یا لڑکی نہیں ہے، ہمارے لئے سب طالب علم ہیں اور بس۔

خواتین اساتذہ کی آواز بھی سننی پڑتی ہے، مکمل طور پر احتیاط کے باوجود بھی غیر محرم کے چہرے پر نظر پڑ جاتی ہے، ورنہ کم از کم ان کی آواز تو مکمل طور پر سنائی دیتی ہے۔ یہ تمام تفصیل بتانے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں مکمل بے دینی اور برائی کا ماحول ہے، آپ جانتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی جگہ جانے سے پہلے معلوم ہو کہ وہاں گناہ کا کام ہوگا تو وہاں جانا حرام ہے، اور اگر وہاں جا کر پتہ چلے تو اُٹھ آنا واجب ہے، نیز گناہ کی طرف چل کر جانا بھی گناہ ہے، جو کام حرام میں ابتداء کا سبب بنے وہ بھی حرام ہے اور اوپر کی تفصیل میں تقریباً سب کے سب کبیرہ گناہ ہیں، اس تمام تفصیل کو ملحوظ رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

مسئلہ نمبر ا

ا/ا:- اس نظامِ تعلیم میں علم حاصل کرنا عورتوں کے لئے کیسا ہے؟

ا/۲:- اس نظامِ تعلیم میں علم حاصل کرنا مردوں کے لئے کیسا ہے؟

۳:- لاہور کے فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں عورتوں کا علم حاصل کرنا کیسا ہے؟ (وہاں اساتذہ مرد و خواتین دونوں ہوتے ہیں، مگر پڑھنے والی صرف لڑکیاں ہوتی ہیں)۔

ا/۴:- اگر یہ نظامِ تعلیم صحیح نہیں تو کیا مرد و عورت کسی کے لئے علم حاصل کرنا جائز نہیں ہے؟

ا/۵:- حکومت کا کام ہے کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ کالج بنائے اور وہ اس کے تمام اختیارات اور سہولیات رکھتی ہے، مگر جب تک حکومت یہ کام نہ کرے تو کیا اس وقت تک کوئی جواز نہیں کہ ہم لوگ علم حاصل کر سکیں؟ آپ جانتے ہیں کہ باقی علوم دنیا کے مقابلے میں علم طب افضل ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں، اگر ہم علم حاصل نہیں کرتے تو مردوں اور عورتوں کا علاج کون کرے گا؟ آخر اس صورت میں کوئی نہ کوئی متبادل صورت تو ہوگی؟

ا/۶:- خواتین اساتذہ پڑھانے کے لئے آئیں تو مردوں کے لئے کیا حکم ہے؟

ا/۷:- مرد اساتذہ پڑھانے کے لئے آئیں تو عورتوں کے لئے کیا حکم ہے؟

مسئلہ نمبر ۲

ہمارے ہاں جتنی کتب پڑھنے کا کہا جاتا ہے تمام کی تمام دوسرے ممالک کی ہوتی ہیں، ان

کتب میں انسانی تصاویر کثرت سے ہوتی ہیں اور اکثر تصاویر عریاں ہوتی ہیں، عریاں صرف وہ حصہ نہیں ہوتا جو دکھانا مقصود ہے بلکہ پورے پورے انسان کی ننگی تصویر ہوتی ہیں اور اس میں مردوں کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا، ان کے بارے میں قاعدہ تو یہ ہوا کہ ''بوقت بقدرِ ضرورت'' دیکھنا جائز ہے، یعنی جب تصویر کے بغیر سمجھنے کی کوئی صورت نہ ہو تو صرف وہی تصویر دیکھ لے اور صرف اتنی ہی دیکھے جتنا ضروری ہے، مگر اس بات کا فیصلہ کون کرے کہ بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت دیکھ رہا ہے یا نہیں؟ ہم یہاں پر جوان ہیں بلکہ جوانی کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں، اس صورت میں بوقتِ ضرورت کا تعین اور بھی زیادہ مشکل ہے، اگر تصویر دیکھنے کی بجائے صرف پڑھنے کی غرض سے کتاب کھولی تو بھی تصاویر پر نظر پڑتی ہی ہے، ننگی تصاویر دیکھ کر شہوت آمیز خیالات بھی آتے ہیں، بعض مضامین کتاب میں ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو پڑھنے سے شہوت آتی ہے، اگرچہ یہ علم حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے لیکن پوچھنا یہ ہے کہ ایسے مضامین یا ایسی کتاب کا پڑھنا، پڑھانا، سیکھنا، دیکھنا اور دُوسرے دوستوں کی غرض سے دکھانا وغیرہ جائز ہے یا نہیں؟ اس میں بھی لکھ دیں کہ فضل کیا ہے؟ جواز کی آخری حد کیا ہے؟ اور جواز کی آخری حد کن شرائط پر ہے؟

میڈیکل کالج میں پڑھائی کے پانچ سال ہوتے ہیں، سال اول و دوم میں مردہ انسانی جسم کی چیر پھاڑ کروائی جاتی ہے، اس کا متبادل تو موجود ہے کہ پلاسٹک کے بنے اعضاء سے سیکھا جائے، سال سوم سے سال پنجم تک ہمیں ہسپتال اور وارڈوں میں بھیجا جاتا ہے، خصوصاً سال پنجم میں تو رات کو بھی جانا پڑتا ہے، وہاں پر ہمیں مریضوں پر پڑھایا جاتا ہے، پڑھنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اُستاد ایک مریض کے بارے میں کہہ دیتا ہے کہ اس سے پوچھو کہ اسے کیا تکلیف ہے؟ اور اس کے بعد اس کا معائنہ کرو، نظامِ تعلیم مخلوط ہے، لہٰذا لڑکے، لڑکیاں اکٹھے ہوتے ہیں، جب طالب علم اپنا کام پورا کر لیتے ہیں تو اُستاد صاحب تشریف لاتے ہیں طلباء و طالبات میں سے کوئی ایک تفصیل کے ساتھ مریض کی تکلیف اور معائنے کے بارے میں بتا دیتا ہے، اُستاد صاحب اس میں سے غلطیاں نکالتے ہیں، سمجھاتے ہیں، وغیرہ۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ ہر بیماری مرد و عورت دونوں میں نہیں ہوتی، بعض بیماریاں صرف مردوں، اور بعض بیماریاں صرف عورتوں میں پائی جاتی ہیں، نیز کوئی جانور ایسا نہیں جو مکمل طور پر انسان کے مشابہ ہو، نیز معائنے کے دوران مختلف پٹھوں کی حرکت، دل کی دھڑکن کی مختلف آوازیں، مختلف بیماریوں میں سانس کی مختلف آوازیں وغیرہ صرف انسان کے جسم میں دیکھی جاسکتی ہیں نہ کہ پلاسٹک کے اعضاء میں، اگرچہ بعض چیزیں کمپیوٹر پر ایسی آگئی ہیں کہ ان پر آوازیں سنی جاسکتی ہے، مگر ہر چیز پاکستان میں نہیں ملتی اور ہر طالب علم کمپیوٹر بھی نہیں خرید سکتا، نیز میڈیکل کالج میں بھی یہ سہولت نہیں

جب سب سے پہلے مریض سے اجازت لی جاتی ہے، اگر مریض (مرد و عورت) اجازت نہ دے تو اس کا معائنہ وغیرہ صاحب علم کو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

معائنہ کرنے کے چار طریقے ہوتے ہیں، ۱- دیکھنا، ۲- ہاتھوں سے دبا کر ٹٹول کر چیک کرنا، ۳- انگلی سے ٹھونک کر دیکھنا، ۴- کانوں کے آلے (Stethoscope) سے اس حصے کی آواز سننا۔

۱:- دیکھنا

اس کے لئے ضروری ہے کہ جو حصہ دیکھنا ہو وہ حصہ اور اس کے آس پاس کا کافی حصہ ننگا کیا جائے، مشہور قاعدہ یہ ہے کہ اگر سینہ دیکھنا ہو تو کم از کم ناف تک قمیص اتروائی جائے، اور اگر پیٹ دیکھنا ہو تو سینے سے لے کر گھٹنوں تک بشمول شرم گاہ ننگا کیا جائے، اگرچہ کتب کے مطابق صحیح طریقہ یہی ہے، مگر پاکستان میں شرم گاہ سب کے سامنے نہیں کھولی جاتی بلکہ علیحدہ کمرے میں پردے کے ساتھ کھولی جاتی ہے، اس میں مرد کی شرم گاہ کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا، البتہ عورت کی شرم گاہ کو عورت ہی کھولتی اور دیکھتی ہے، مرد اس کو اجازت نہیں، بہرحال مریض مرد ہو یا عورت یہ کرنا پڑتا ہے، مرد میں تو ناف سے شرم گاہ کے حصے کے علاوہ باقی حصہ ننگا کرنا مثلاً رانیں گھٹنوں وغیرہ کے ننگا کرنے کو برا نہیں سمجھا جاتا، عورت مریض کی صورت میں دوپٹہ اتروالیا جاتا ہے اور پیٹ کمر وغیرہ سے قمیص بھی ہٹائی جاتی ہے، عام طور پر اس سے زیادہ نہیں کیا جاتا۔

۲:- دبا کر، ہاتھ لگا کر دیکھنا

اس میں مریض کو جس جگہ کی تکلیف ہو اس کو ہاتھ لگا کر اور دبا کر دیکھا جاتا ہے، تاکہ معلوم ہو کہ اس کی جلد اور جلد کے نیچے والے حصے اور پٹھے عام صحت مند آدمی کی طرح ہیں یا سخت ہیں یا نرم ہیں یا یہ کہ ہاتھ لگانے سے مریض کو درد ہوتا ہے یا نہیں، وغیرہ۔ یہاں بھی مرد و عورت (مریض ہو یا صاحب علم) کی کوئی تخصیص نہیں۔

۳:- ٹھونک کر دیکھنا

اس میں ہاتھ اور انگلی کی مدد سے مریض کے جسم کے مختلف حصوں خصوصاً سینہ اور پیٹ کو ٹھونک کر دیکھتے ہیں، اور آواز کا موازنہ صحت مند انسان سے کیا جاتا ہے۔

۴:- کانوں والے آلے سے سننا

اس میں اگرچہ عموماً مریض کو ہاتھ نہیں لگتا، مگر جس جگہ آلہ لگایا جاتا ہے وہاں سے اکثر کپڑا ہٹایا جاتا ہے۔

آپریشن تھیٹر

شعبۂ جراحت کی پڑھائی کے دوران طلباء کو بہت سے عمل جراحی (آپریشن) دکھایا جاتا ہے، اس میں طالب علم کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی مگر صرف دکھایا جاتا ہے، یہاں پر بھی استاد، شاگرد اور مریض میں مرد و عورت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔

آؤٹ ڈور O.P.D

اس میں مریضوں کا معائنہ استاد کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس میں فلاں بیماری کی فلاں فلاں علامتیں ظاہر ہیں، چنانچہ طلباء اس بیماری کی وہ علامتیں اس میں فوراً فوراً دیکھتے ہیں اور معائنہ کرتے ہیں۔

تمام میڈیکل کالجوں میں یہی طریقہ تعلیم ہے اور اسی کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اس تمام تفصیل کے بعد جواب طلب اُمور مندرجہ ذیل ہیں، اس میں لکھ دیں کہ افضل کیا ہے؟ جواز کی آخری حد کیا ہے؟ اور جواز کی حد کن شرائط کے ساتھ ہے؟ یاد رہے کہ سب سے پہلے مریض سے اجازت لی جاتی ہے، اگر مریض (مرد و عورت) اجازت نہ دے تو اس کا معائنہ وغیرہ طالب علم کو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر ۳

۳/۱- مرد طالب علم کو مریض (مرد و عورت) سے بات کرنے کا کیا حکم ہے؟

۳/۲- عورت طالب علم کو مریض (مرد و عورت) سے بات کرنے کا حکم کیا ہے؟

۳/۳- مرد طالب علم کو مریض (مرد و عورت) کا معائنہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

۳/۴- عورت طالب علم کو مریض (مرد و عورت) کا معائنہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

۳/۵- اگر جواز نہیں تو استاد کے کہنے یا حکم کرنے کے بعد جواز کا کیا حکم ہے؟ جبکہ یہ فتنے کا دور ہے، اور طالب علم کے انکار پر اسے سالانہ امتحان میں فیل بھی کیا جا سکتا ہے۔

۳/۶:- آپ جانتے ہیں کہ عملِ جراحی مہارت کا کام ہے، اور مہارت ہاتھ سے کام کرنے سے آتی ہے، کالج میں عموماً ہاتھ سے کام تو نہیں کرنے دیا جاتا مگر عمل جراحی دکھایا جاتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

۳/۷- اگر ہر طرف سے بچ جائے تو دورانِ امتحان تو ہر طالب علم کا علیحدہ علیحدہ امتحان لیا جاتا ہے، پس دورانِ امتحان کیا حکم ہے؟ (افضل اور جواز مع شرائط)۔

۴۔ ۸۔ دوران تعلیم مرد وعورت طلباء وطالبات کو کہا جاتا ہے کہ مریض یا مریضہ کے مقعد یا اندام نہانی وغیرہ میں ہاتھ اور انگلیاں وغیرہ ڈال کر دیکھیں، اس کا حجم وغیرہ دیکھیں، اندر سے دبا کر دیکھیں، وغیرہ، ایسا کرنا کیسا ہے؟ (مریض اور طالب علم مرد یا عورت میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے) اگر جواز نہیں تو اُستاد کے کہنے یا حکم کرنے کے بعد جواز کا کیا حکم ہے؟ جبکہ یہ فتنے کا دور ہے، اور طالب علم کے انکار پر اسے سالانہ امتحان میں فیل بھی کیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ نمبر۴

شعبۂ حادثات یعنی ایمرجنسی وارڈ میں عموماً مریض آتے ہیں جن کی حالت نازک ہوتی ہے، لہٰذا وہاں بعض اوقات ایک ایک مریض پر دو دو، تین تین ڈاکٹر لگے ہوتے ہیں، بعض اوقات ڈاکٹر کم ہوں یا مریض زیادہ ہوں تو طالب علم کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ مریضوں کی جان بچانے کی کوشش کی جاسکے، اس حالت میں بوتل بھی لگائی جاتی ہے، بوتل لگانے کے لئے عام طور پر مریض کے بازو کی خون کی ورید پر سوئی لگائی جاتی ہے، اگر وہاں نہ ملے تو جسم کے دُوسرے حصوں پر ورید تلاش کی جاتی ہے، بعض وقت سارے جسم میں کہیں نہیں ملتی اور جاکر شرمگاہ کے ساتھ ران پر ملتی ہے، مریض، ڈاکٹر اور طالب علم، مرد وعورت میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے، یہاں پر اگر مریض کی حالت زیادہ نازک ہو تو پردہ کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ اس کی جان بچانے کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے، ایسی حالت میں ڈاکٹر اور طالب علم (مرد وعورت) کے لئے کیا حکم ہے؟ بعد جواز مع شرائط اور افضل کیا ہے؟ لکھ دیں۔

مسئلہ نمبر۵

کالج میں تعلیم کے دوران تمام طلباء وطالبات کے لئے ضروری ہے کہ کالج وہسپتال میں کل حاضری میں سے ۷۵ فیصد حاضری کا ہونا اور ۷۵ فیصد اسباق اُستاد سے پڑھنا ضروری ہے، ورنہ اسے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی، بعض وقت سال ضائع ہونے کا احتمال بھی ہوتا ہے، لہٰذا ۷۵ فیصد حاضری کے لئے کالج اور ہسپتال میں جانا مجبوراً ضروری ہے، اس سے زیادہ جانا یا نہ جانا اپنے اختیار میں ہے، اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بتائیں کہ:-

۵۔ ۱۔ ایسی حالت میں کیا یہ ضروری ہے کہ ۷۵ فیصد کے بعد طالب علم کالج نہ جائیں، اس سلسلے میں لکھا نہیں کہ افضل کیا ہے؟ اگر جواز ہے تو کیا ہے؟ اور کن شرائط پر ہے؟

۵۔ ۲۔ کالج میں زیادہ تر لوگ صرف اس لئے جاتے ہیں کہ ۷۵ فیصد حاضری ضروری ہے،

اگر یہ ضروری نہ ہو تو اکثر لوگ نہ جائیں، بعض اوقات اگر پڑھنے کا دل نہ کرے یا سبق سمجھ میں نہ آئے یا خاتون اُستاد آجائے تو بعض طالب علم دینی کتب، مواعظ اور بعض ناول وغیرہ دوران سبق پڑھتے رہتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ صحیح ہے؟

۳۵:- یہاں کالج میں ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت بھی ہے، جن کے نزدیک داڑھی اتنی رکھنا کافی ہے کہ دُور سے نظر آئے، کچھ لڑکے ان کے اثر سے، اور کچھ فیشن کے طور پر چھوٹی سی داڑھی رکھ لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں واجب پورا ہوگیا، جب ہم انہیں کہتے ہیں کہ داڑھی پوری رکھو تو وہ کہتے ہیں کہ کیا وہ داڑھی نہیں ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح نہیں تو کیا ہم نے داڑھی جتنی رکھی ہے کٹوادیں؟ ہم انہیں کیا جواب دیں؟ ایک مولانا صاحب نے فرمایا تھا کہ انہیں بے شک کہہ دو کہ اس داڑھی کا کوئی فائدہ نہیں لہٰذا بے شک کٹوادیں۔ بتائیں کہ ہم انہیں کیا جواب دیں؟ (ان کا پوری داڑھی رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں اور وہ اسی کو سنت، واجب سمجھتے ہیں)۔

۴۵:- طلباء کا کالج جانے کو دل نہیں کرتا، نیز اس کے لئے صبح صبح اُٹھنا پڑتا ہے، لہٰذا بعض طلباء دُوسروں کو کہہ دیتے ہیں کہ ہم نہیں جاتے مگر ہماری حاضری لگوادینا، کیا یہ جائز ہے کہ طالب علم نہ جائے اور کوئی دُوسرا اس کی حاضری لگادے؟ بعض اساتذہ اجازت دیتے ہیں، مگر اکثر ناراض ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر۶

یہاں میڈیکل کالج میں جتنے بھی داڑھی والے طلباء ہیں ان کو ''مولوی'' کہا جاتا ہے، تمام ''مولویوں'' کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ انتہائی درجے کے نالائق ہوتے ہیں، اور ہمیں طعنے سننے پڑتے ہیں، اگر کبھی کوئی ''مولوی'' کسی سوال کا جواب دیدے تو اُستاد صاحب فرماتے ہیں ''آج تو کمال ہی ہوگیا، کوئی معجزہ ہوگیا کہ مولوی صاحب نے جواب دے دیا۔'' اساتذہ اور دوست وغیرہ اکثر ہمیں ان الفاظ سے سمجھاتے ہیں: ''مولویوں کو زیادہ پڑھنا چاہئے کیونکہ اسی میں دین کی عزّت ہے، نہ پڑھ کر مولوی دین کو بدنام کرواتے ہیں، اور تمام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جو دین پر چلتا ہے وہ کسی کام کا نہیں رہتا، لہٰذا تمہاری وجہ سے دین بدنام ہو رہا ہے۔'' ہم مولوی قطعاً نالائق نہیں ہیں بلکہ شرعی مجبوریوں کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ کی طرف کم سے کم توجہ دیتے ہیں، لوگ اور اساتذہ ہمیں طعنے دیتے ہیں ''نہ تم کسی پارٹی وغیرہ میں آتے ہو، نہ تم پڑھتے ہو، آخر تم لوگ کرتے کیا ہو؟'' ایک طرف دین کا حکم بھی ہے کہ اپنے آپ سے لوگوں کو غلط فہمی نہ ہونے دو، نیز دین کی اور اپنی عزّت کا خیال رکھو، بعض اوقات تو اساتذہ ایسی بات بھی کہہ دیتے ہیں جو صریح کفر ہوتی ہے۔

اب تک چار سال گزر چکے ہیں اور ہمیں کچھ بھی نہیں آتا، جس طرح ہم یہاں آنے سے پہلے کورے تھے، ویسے ہی اب بھی کورے ہیں، یقیناً کچھ نہیں آتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دوسرے شرعی مجبوریوں وغیرہ کی وجہ سے پریکٹیکل اور معائنہ وغیرہ پر توجہ نہیں دیتے۔

یہ بات بھی ہمارے مشاہدے میں ہے کہ ہم سے بڑے مولوی ٹائپ جو مولوی صاحبان جو ہم سے پہلے یہاں سے تعلیم مکمل کر کے فارغ ہوئے ہیں، کوئی ان کے پاس جانا پسند نہیں کرتا، نہ ان کا کلینک چلتا ہے، وجہ وہی کہ انہوں نے معائنہ وغیرہ میں تجربہ حاصل نہیں کیا، لہٰذا ان کی تشخیص صحیح نہیں ہوتی، مریض کا حق ادا کرنے کا شعور نہیں ہوتا، اور یہ حدیث مشہور ہے کہ جاہل ڈاکٹر اور جاہل طبیب کا ٹھکانا جہنم ہے۔ پتہ نہیں۔ وجہ یہی ہے کہ انہوں نے مریضوں پر پڑھا نہیں، اپنے ہاتھ سے کر کے نہیں دیکھا، معائنہ کر کے نہیں دیکھا، ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

۶-۱- اس پیرے کی روشنی میں دین دار طلباء وطالبات کے لئے جواز کی آخری حد کیا ہے؟ اور شرعاً کیا ہے؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ افضل کیا ہے؟ کیا ہمارے لئے کوئی جواز نہیں کہ ہم علم حاصل کر سکیں؟ کیا ہم پڑھائی چھوڑ دیں؟ اگر ہم پڑھائیں چھوڑ دیں گے تو ہمارے ماں باپ، دوست، رشتہ دار سخت باتیں کریں گے، آپ جانتے ہیں کہ آج کل لوگوں کے ایمان کتنے کمزور ہیں، ہمیں یقین ہے کہ ہمارے کالج چھوڑنے پر بہت سے اپنے پرائے ایسی باتیں کریں گے کہ کافر ہو جائیں گے۔

۶-۲- کیا ہم سب جو یہاں پڑھ رہے ہیں، ہم سب گناہ کبیرہ کے مرتکب اور فاسق ہیں یا نہیں؟

مسئلہ نمبر ۷

ہمارے کالج، ہسپتال اور ہاسٹل کے قریب کم و بیش چھ مساجد ہیں، ہمارے کالج میں ایک قاری صاحب پڑھتے ہیں، قاری صاحب شکل وصورت، ہر لحاظ سے ماشاء اللہ دین دار ہیں، ماشاء اللہ قاری حافظ قرآن بھی ہیں، آواز بھی اچھی ہے، مخلوط تعلیم میں پڑھتے ہیں، حافظ قرآن ہیں، اپنا کلینک بھی چلا سکتے ہیں، یہ صاحب ہسپتال کی لیبارٹری میں کام بھی کرتے ہیں، نیز اپنی ذاتی لیبارٹری بھی ہے، ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمائیں کہ:

۷-۱- کیا مخلوط تعلیم میں پڑھانے کی وجہ سے یہ صاحب فاسق ہیں یا نہیں؟

۷-۲- ان کی امامت میں فرض نماز کا کیا حکم ہے؟

۷-۳- ان کی امامت میں تراویح کی نماز کا کیا حکم ہے جبکہ قریب میں اور مساجد بھی ہیں؟

۷-۴- اگر قریب اور مسجد نہ ہو تو ان کی امامت میں فرض وتراویح کا کیا حکم ہے؟ افضل اور

حد جواز اگر ہو تو مع شرائط بیان فرمادیں۔

برائے مہربانی مکمل تحقیق کے بعد جواب عنایت فرمائیں۔ جزاک اللہ

واللہ تعالیٰ هو الموفق وهو المستعان ولا حول ولا قوة الا به

سیّد فاتح عظمت اللہ، فرحان شہزاد،
محمد عمران، محمد ہارون محمود،
کمرہ نمبر ۲۹ جوہر ہال
(طلبہ قائد اعظم میڈیکل کالج بہاولپور
۲۳ رصفر ۱۴۲۳ ہجری)

جواب:-

مسئلہ نمبر ۱

شریعت کا اصل حکم تو یہ ہے کہ نامحرم مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے پرہیز کیا جائے، خاص طور پر ایسا مستقل مشغلہ اختیار کرنا، جس میں نامحرم خواتین کے ساتھ مستقل میل جول ہو، بغیر ضرورت کے جائز نہیں، لہذا حکومت اور مسلم معاشرے کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ مخلوط تعلیم کی بجائے لڑکوں کے لئے الگ اور لڑکیوں کے لئے الگ تعلیمی ادارے قائم کریں، لیکن جب تک ایسا انتظام نہ ہو تو چونکہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنا ایک ضرورت ہے اور اس میدان میں متدین افراد کی جو کمی ہے اسے دور کرنے کا یہی راستہ ہے کہ متدین افراد میڈیکل کی تعلیم حاصل کریں، اس لئے اگر اس تعلیم کے حصول کا وہ راستہ نہ ہو جو اوپر بیان کیا گیا تو اس شرط کے ساتھ تعلیم کے حصول کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ حتی الامکان اپنے آپ کو بے پردہ نامحرم خواتین سے دور رکھیں اور جہاں کہیں ایسی خواتین کا سامنا ہو وہاں نگاہ نیچی رکھیں، اور اپنی نگاہ اور دل کی حفاظت کریں۔

خواتین کے لئے بھی میڈیکل تعلیم کا حصول اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ وہ پردہ کا مکمل اہتمام کریں اور مردوں کے قریب نہ بیٹھیں، عورتوں کے لئے تعلیم کی غرض سے مردوں کو دیکھنے کی گنجائش ہے، مگر یہ گنجائش ضرورت کی حد تک ہی محدود رہنی چاہئے۔ (۳)

مسئلہ نمبر ۲

جب کتاب کا اصل مقصود تعلیم ہے اور اس میں تصویریں ضمنی طور پر آگئی ہیں تو ایسی کتاب کو اس شرط کے ساتھ رکھنا اور پڑھنا جائز ہے کہ تصویروں کے جن حصوں کی، تعلیم کے لئے ضرورت نہ ہو ان کو

(۱تا۳) وفی مقدمة ردّ المحتار ج: ۱ ص ۴۲ (طبع سعید) قال فی تبیین المحارم واما فرض الکفایة من العلم فهو کل علم لا یستغنی عنه فی قوام امور الدنیا کالطب والحساب ... الخ نیز دیکھئے ص ۱۴۳ کا فتویٰ اور ص ۱۴۲ پر اس کا حاشیہ نمبر ۱۔

یا تو مٹا دیا جائے یا کسی کاغذ وغیرہ سے چھپا دیا جائے، خاص طور پر ایسی تصویر جو شہوت کو برانگیختہ کرے اس کو اس طرح تبدیل کر دیا جائے کہ صرف وہ حصہ باقی رہے جو تعلیم کی غرض سے ضروری ہے، ضرورت کا تعین اس موضوع سے کیا جا سکتا ہے جس موضوع کی اس تصویر کے ذریعے تعلیم دی جا رہی ہے۔

مسئلہ نمبر۳

۱، ۲، ۵، ۶، ۷ - ان تمام کاموں میں جو کام طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں، ان کو بقدرِ ضرورت انجام دینے کی گنجائش ہے، لیکن ہر کام میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ مریض کے ستر کا اتنا ہی حصہ کھلے جتنا معائنے کے لئے ضروری ہے، اگر عملے کا کوئی فرد اس میں بے احتیاطی کرے تو اسے تاکید کی جائے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ کھولے۔[1]

مسئلہ نمبر۴

جب جان بچانے کے لئے بوتل یا انجکشن لگانا ضروری ہو اور جسم کے ظاہری حصوں پر رگ نہ ملے تو ستر والے حصے میں رگ تلاش کرنے کی گنجائش ہے، اس میں ڈاکٹر اور طالب علم کے درمیان کوئی فرق نہیں، تاہم اس میں یہ بھی ضروری ہے کہ حتی الامکان مرد مریضوں کے ساتھ یہ عمل مرد ڈاکٹر یا طلباء کریں، اور خواتین کے ساتھ یہ عمل لیڈی ڈاکٹر یا طالبات کریں۔[2]

مسئلہ نمبر۵

۱، ۲ - ۷۵ فیصد حاضری کی کم سے کم مقدار ہے، ورنہ تعلیم کی تکمیل کے لئے سو فیصد حاضری ضروری ہے، لہٰذا ۷۵ فیصد کے بعد بھی حاضری کا اہتمام کرنا چاہئے اور حاضر ہو کر تعلیم ہی پر متوجہ رہنا چاہئے، تاہم حتی الامکان ان احتیاطوں کو ملحوظ رکھا جائے جو اوپر بیان کی گئیں۔

۳ - داڑھی کی شرعی مقدار ایک قبضہ ہے، داڑھی کا ایک قبضہ سے نیچے کٹوانا جائز نہیں،[3] جن لوگوں نے داڑھی ایک قبضہ سے کم رکھی ہوئی ہے، وہ اگر یہ کہیں کہ جتنی رکھی ہوئی ہے کیا وہ کم کروا دیں؟

---

(۱) وفي الدر المختار ج ٦ ص ٣٧٠ طبع سعيد: ينظر الطبيب إلى موضع مرضها بقدر الضرورة إذ الضرورات تتقدر بقدرها وكذا نظر قابلة وختان وينبغي أن يعلم امرأة تداويها لأن نظر الجنس إلى الجنس أخف. وفي الشامية تحته: في الجوهرة إذا كان المرض في سائر بدنها غير الفرج يجوز النظر إليه عند الدواء، لأنه موضع ضرورة وإن كان في موضع الفرج فينبغي أن يعلم امرأة تداويها فإن لم توجد وخافوا عليها أن تهلك أو يصيبها وجع لا تحتمله يستروا منها كل شيء إلا موضع العلة ثم يداويها الرجل ويغض بصره ما استطاع إلا عن موضع الجرح

(۲) وفي الدر المختار كتاب الحظر والإباحة فصل في البيع ج ٦ ص ٤٠٧ (طبع سعيد) والسنة فيها القبضة ولذا يحرم على الرجل قطع لحيته ... الخ وفي البحر الرائق ج ٢ ص ٢٨٠ (طبع رشيدية كوئٹہ) وأما الأخذ منها وهي دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه أحد ... الخ

تو جواب یہ نہیں ہے کہ "ہاں کٹوا دیں!" بلکہ جواب یہ ہے کہ داڑھی پوری رکھیں، اور یہ بات دُرست ہے کہ داڑھی کم رکھنا بالکل منڈوانے سے بہتر ہے۔

۴:- دُوسرے طالب علم کی حاضری لگوانا دھوکا ہے اور بالکل ناجائز ہے۔

مسئلہ نمبر ۶

اس سوال میں آپ نے جو باتیں لکھی ہیں، اکثر و بیشتر مبالغہ پر مبنی ہیں، اگر واقعۃً آپ تعلیم میں کورے ہیں تو اس کی وجہ دین دار ہونا نہیں، بلکہ تعلیم کی طرف توجہ نہ دینا ہے، اور یہ بھی غلط ہے کہ جو دین دار لوگ میڈیکل تعلیم حاصل کرکے فارغ ہوچکے ہیں ان کا کلینک نہیں چلتا، ملک کے ہر خطے میں ایسے متدین ڈاکٹروں کی کمی نہیں ہے جو اپنی فنی مہارت میں مشہور ہیں، لہٰذا اس احساسِ کمتری سے نکلئے، اور اپنی بے عملی کو اپنے تدین کے ساتھ وابستہ نہ کیجئے، اگر واقعی آپ ایسا کریں گے تو یقیناً متدین لوگ بدنام ہوں گے۔

جواز کی حدود پیچھے بیان کی جاچکی ہیں، ان حدود میں رہ کر اگر محنت سے تعلیم حاصل کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مہارت حاصل نہ ہو۔

مسئلہ نمبر ۷

محض مخلوط تعلیم میں پڑھانے کی وجہ سے ان صاحب کو فاسق نہیں کہا جاسکتا، عین ممکن ہے کہ وہ نگاہ و دل کی حفاظت کرتے ہوئے پڑھاتے ہوں، لہٰذا ان کی امامت میں نماز بھی جائز ہے، اگر قریب کوئی دُوسری مسجد موجود ہو تو شبہ سے بچنے کے لئے اس مسجد میں چلے جائیں، ورنہ ان کے پیچھے نماز پڑھیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۲/۴/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۵/۱۶)

(بنو ہاشم، بنو اُمیہ، جنگِ جمل، جنگِ صفین، حضرت حسینؓ، حضرت معاویہؓ اور یزید سے متعلق متعدّد سوالات اور جوابات)

کیا بنو ہاشم اپنے کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے؟

سوال ۱:- کیا بنو ہاشم اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے؟ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب "شہادتِ حسینؓ" میں تحریر کیا ہے؟

قبولِ اسلام کے بعد بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی خاندانی رنجشوں کی کیفیت

سوال ۲:- کیا اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی بنو ہاشم اور بنو امیہ نے قبل اسلام کی خاندانی رنجشوں کو ختم نہیں کیا تھا؟ جیسا کہ واقعہ کربلا کے پس منظر میں بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ قرآنِ پاک نے مسلمان ہونے کے بعد خصوصاً صحابہ میں مودّت قلبی کا ذکر کیا ہے، اثبات کی صورت میں اس تأثر سے حامل کا کامل الایمان ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

کیا حضرت علیؓ نے خلافت کے لئے خلفائے سابقہ کے اتباع کی شرط سے انکار کر دیا تھا؟

سوال ۳:- کچھ تواریخ میں ذکر آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد انتخابی شوریٰ نے حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کے سامنے اطاعت خدا و رسولؐ کے ساتھ اتباعِ خلفائے اوّل و ثانی کی شرط بھی رکھی تھی، جسے حضرت عثمانؓ نے قبول کر لیا، لیکن حضرت علیؓ نے خلفائے سابقہ کے اتباع کی شرط کو قبول نہیں کیا، چنانچہ حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں لایا گیا، کیا یہ صحیح ہے؟ اور کیا اطاعتِ خدا و رسولؐ کے بعد خلفائے سابقین کا اتباع منتخب خلیفہ کے لئے ایک لازمی امر تھا؟

قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ کرنے والوں کا حقیقی مقصد قصاصِ عثمانؓ تھا یا حضرت علیؓ کو خلافت سے روکنا؟

سوال ۴:- عام تاریخوں سے یہ تأثر ملتا ہے کہ قصاصِ عثمانؓ ایک بہانہ تھا، ورنہ اصل مقصد خلافتِ علیؓ کو مرتب نہ ہونے دینا تھا، اگر یہ تأثر قبول کر لیا جائے تو اس میں حضرت عائشہؓ سے لے کر حضرت معاویہؓ تک اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ سے لے کر عمرو بن العاصؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ تک سب ملوّث ہیں، اور ان کے علاوہ بہت سارے ایسے صحابہؓ بھی ملوّث ہیں جن کو اکابر میں شمار کیا جاتا ہے اور جن کے ذریعہ دین کا ایک بڑا حصہ ہم تک پہنچا ہے، مذہب اہل سنت اس چیز سے انکار کرتا ہے؟ فسادِ ایمان سے بچنے کے لئے سکوت اختیار کرنے کا حکم ضرور دیا گیا ہے، لیکن اس سکوت کو فرار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کے کردار کا تاریخی و شرعی جائزہ

سوال ۵:- تاریخوں سے حضرت معاویہؓ کے کردار کا مطالعہ کرنے کے بعد دو باتیں لازمی طور پر پیدا ہوتی ہیں، یا تاریخیں غلط ہیں یا حضرت معاویہؓ کا ایمان مصلحت وقت کا تقاضا تھا، تیسری صورت میں جیسا کہ اہل سنت انہیں اکابر صحابہ میں شمار کرتے ہیں، نبی کی تربیت اور ذات محلِ نظر ہو جاتی ہے۔

کیا حضرت معاویہؓ نے اپنی زندگی میں بزور ولی عہدی کی بیعت لی تھی؟

سوال ۶:- حضرت معاویہؓ کا اپنی زندگی میں بزور ولی عہدی کی بیعت لینا ایک سیاسی مسئلہ ہے یا مذہبی؟ اگر سیاسی مسئلہ ہے اور حضرت معاویہؓ کو خلفائے راشدین میں شمار نہیں کیا جاتا تو اعتراض کس چیز کا رہ جاتا ہے؟ اس سلسلے میں دو ضمنی سوال بھی پیش ہیں

الف:- کیا نفس ولی عہدی کی بیعت لینا صحیح نہیں ہے؟

ب - لوگوں کو اپنے بعد کسی کو ولی عہد بنانے کی وصیت کرنے کے بعد جواب حاصل کرنے اور بیعت لینے میں کیا فرق ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے آخری وقت میں نہ صرف حضرت عمرؓ کو ولی عہد نامزد کیا تھا، بلکہ لوگوں سے ان کی اطاعت کا اقرار بھی کرایا تھا، اور حضرت علیؓ نے بھی اپنے آخری وقت میں حضرت حسنؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔

یزید کے لئے ولایتِ عہد کی بیعت لینے کا شرعی حکم

سوال ۷:- یزید فاسق وفاجر تھا، اور اپنے بیٹے کے لئے ولایت عہد کی بیعت لینا جائز تھا یا ناجائز؟ ناجائز کام کرنا معصیتِ خداوندی ہے یا نہیں؟

حضرت معاویہؓ کے عہد میں یزید پر شرعی حد کیوں جاری نہیں کی گئی؟

سوال ۸:- تاریخوں میں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کے زمانے میں شرعی عدالتیں موجود تھیں، جو خدا کی نافرمانیوں اور قابل تعزیر جرائم کا ارتکاب کرنے والوں پر حدود جاری کیا کرتی تھیں، کیوں یزید پر حد جاری نہیں کی گئی؟ جبکہ اس کا شرابی، زانی ہونا اس قدر مشہور تھا کہ بیعت ولی عہدی کے دوران اس کا بزور اظہار کیا گیا، اس مسئلے کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے لئے یہ ریمارکس قائم نہیں کیا جا سکتا " تأمرون الناس بالبر وتنسون انفسکم"؟

یزید کا حکم؟ اور کیا حضرت معاویہؓ کے عہد میں مجالسِ غناء عام تھیں؟

سوال ۹:- تاریخوں میں اجمالی حیثیت سے یزید کے فسق وفجور کا ذکر تو آیا ہے، لیکن کسی خاص واقعے کا ذکر کم از کم اردو ترجموں میں سامنے نہیں آیا، کیا کسی عربی تاریخ نے حضرت معاویہؓ کے عہد میں اس قسم کے واقعات کا ذکر کیا ہے؟ شاید ابن خلدون نے مجالس غناء کا ذکر کیا ہے، کیا اس قسم کی مجالس غناء جو خلاف شرع ہوں حضرت معاویہؓ کے دور میں عام ہوا کرتی تھیں؟

حضرت حسینؓ کے نام کوفیوں کے خطوط میں کیا بات درج تھی؟

سوال ۱۰:- تاریخوں میں حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ کے ساتھ کوفیوں کی خط وکتابت کا جو تذکرہ اردو میں منتقل ہو چکا ہے، اس کے مطابق حضرت معاویہؓ کی وفات پر حضرت حسینؓ کو مبارک باد اور اپنا حق لینے کی ترغیب ہے، اس خط وکتابت میں ایک فاسق وفاجر خلیفہ کو ہٹانے کی جدوجہد کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا، براہِ کرم اگر عربی تاریخوں میں ایسا کوئی واقعہ ہو تو مطلع کریں، مختلف روایتوں کے مطابق تین سو خطوط یا بروایت دیگر ۳ بوریوں کی مقدار میں خطوط آنے کے بعد اور وفود آنے کے بعد حضرت حسینؓ نے مکہ مکرمہ چھوڑا۔

فاسق حکمران کے خلاف حضرت حسینؓ کے خروج وجہاد کی شرعی حیثیت

سوال ۱۱:- واقعہ کربلا کا پس منظر بتاتے ہوئے ہر تحریر وتقریر میں یہ بات وضاحت کے ساتھ آتی ہے کہ ایک فاسق وفاجر حکمران سے جہاد کی خاطر حضرت حسینؓ مکہ مکرمہ سے نکلے تھے، یہ مقصد واجب تھا یا مستحب؟ اگر واجب تھا تو دوسروں کو ترغیب دلانا ضروری تھا، کیا حضرت حسینؓ نے اس سلسلے میں دوسروں کو ترغیب دلائی؟ اور اگر مستحب تھا تو نتائج کا اندازہ کر کے حضرت حسینؓ کو ترک کردینا چاہئے تھا، ہر صورت میں بہتر تھا کہ حضرت حسینؓ اپنے ہم نوا پیدا کرتے، پھر نظریاتی یا عملی دباؤ ڈال کر حالات کو بہتر بناتے، اور اگر یہ خیال تھا کہ تیس ہزار کوفی تیار ہیں جیسا کہ تاریخیں لکھتی ہیں اور مسلم نے اطلاع دی تھی اور بغیر کسی مشورے کے حضرت حسینؓ ان تک پہنچنا چاہتے تھے تو بھی پورے خاندان واسباب کو لے کر روانہ ہونا مناسب نہ تھا، اکیلے یا ایک دو ساتھی کو لے کر کسی غیر معروف راستے سے جا کر کوفہ والوں سے ملتے، بلکہ تاریخوں میں جیسے آتا ہے کہ کوفہ والوں نے کھلم کھلا یزید کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور مسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اور حکومت کو ان کے رجحانات کا علم تھا، لہٰذا حکومت کی طرف سے مزاحمت متوقع تھی، چنانچہ حضرت حسینؓ کا ایسے حالات میں خاندان والوں کو لے کر نکلنا اپنے آپ کو اور مشن کو نقصان پہنچانے کے مترادف تھا، اس لحاظ سے حضرت حسینؓ کو اپنے اس مشن میں مخلص ماننے میں تأمل پیدا ہوتا ہے یا پھر یہ مقصد ہی نہ تھا؟

کیا یزید نے اپنی مملکت میں غیر اسلامی دستور جاری کیا تھا؟

سوال ۱۲:- بتایا جاتا ہے کہ یزید قانونِ شریعت کو بدلنا چاہتا تھا، حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنا چاہتا تھا، کیا تاریخ وسوانح کے ذریعہ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ یزید کے خلاف ہونے والی جدوجہد کو چنے

کے بعد اس نے اپنی مملکت میں غیر اسلامی دستور رائج کیا تھا؟ حالانکہ اس کے بعد اسے کسی قسم کی مزاحمت کی توقع نہ تھی۔

یزید کے خلاف جدوجہد میں دیگر صحابہ کرامؓ کیوں شریک نہیں ہوئے؟

سوال ۱۳:- یزید کے خلاف جدوجہد میں اس دور کے بقیہ صحابہؓ کی عدمِ شرکت کو کس بات پر محمول کیا جائے؟ حالانکہ حضرت حسینؓ کے مقابلے میں کوئی آدمی، درجہ کا صحابی بھی نہیں بلکہ ایک فاسق و فاجر حکمران تھا، کیا آلِ علیؓ کے سوا کسی پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا تھا؟ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ اور دیگر صحابہؓ نے انہیں روکنے کی کوشش بھی کی تھی۔

حضرت حسینؓ کی طرف سے جہاد اور مقابلے کے فیصلے کی وجہ

سوال ۱۴:- مرثیہ خواں ذاکروں کی طرح سنی واعظ بھی لہک لہک کر اشعار پڑھتے ہیں کہ سر داد و نداد دست در دست یزید۔ اور بتاتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کسی صورت میں یزید جیسے فاسق و فاجر کی خلافت کو اپنی زندگی میں برداشت کرنے کو تیار نہ تھے، جان دے دی لیکن یزید کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا، حالانکہ واقعات کے اعتبار سے نہ تو حضرت حسینؓ مکہ مکرمہ سے یزید کی بیعت کے خوف سے نکلے تھے، نہ ان پر مکہ مکرمہ میں کسی نے جبر کیا تھا، بلکہ کوفیوں کی خط وکتابت پر نکلے اور راستے میں جب معلوم ہوا کہ کوفی بدعہد ہوگئے ہیں تو لوٹنے کا ارادہ فرمایا، لیکن مسلم کی شہادت پر مشتمل اعزہ واقارب کی ضد کی وجہ سے ارادے کا ساتھ دیا اور آخر میں تین شرطیں تک پیش کردیں، پھر مقصد کیا تھا؟ سمجھ میں نہیں آتا۔

تاریخِ اسلام کو روایات کی تحقیق کے ساتھ ازسرِنو مرتب کرنے کی ضرورت

سوال ۱۵:- آخر میں ایک اہم سوال پیش خدمت ہے، اسلامی تاریخ قدیم کا ذخیرہ ایک عجوبہ سے کم نہیں، کہیں ایک فرشتہ ہے اور دُوسری جگہ شیطان بن جاتا ہے، بدقسمتی سے تراجم کے سلسلے میں بھی کوئی احتیاط نہیں کی گئی، علمائے کرام نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ قرآن وسنت اور آثارِ سلف کے ماہرین کا ایک بورڈ مقرر کر کے اختلافِ روایت پر تحقیق کرتے اور کم از کم اہلِ سنت کو ابتدائی تاریخ ایسی ملتی جس میں اکابر صحابہؓ اور قرونِ خیر کی ایک اچھی اور متفق علیہ تصویر ہوتی، اب بھی وقت گیا نہیں، کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کرسکتے ہیں؟ ورنہ ہوسکتا ہے کہ آئندہ آنے والی نسلیں، دُوسرے مذاہب کی نہیں بلکہ سیاسی وملکی رہنماؤں کی تاریخوں کو بے عیب اور متفق علیہ پاکر، اور اسلامی تاریخ کے پورے ذخیرے کو اختلافات اور کشت وخون سے بھرا ہوا پاکر، خلافِ اسلام مشنریز کے پروپیگنڈے میں آکر محمد

عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور ان کے خلاف نعوذ باللہ زبان درازی پر اتر آتے ہیں، اعوذ باللہ من شر ذلک۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شرمندہ ہوں کہ اب تک آپ کے سوالات کا جواب لکھنے کا موقع نہیں مل سکا، دراصل میں اس انتظار میں تھا کہ کوئی اطمینان کا وقت ملے تو مفصل جواب تحریر کروں، لیکن اندازہ یہ ہوا کہ اطمینان کا وقت ملنا بہت مشکل ہے، اب جو تھوڑی بہت فرصت ملی ہے اس میں اختصار کے ساتھ آپ کے سوالات کا جواب عرض کر دینا زیادہ مناسب ہے، اگر کسی جواب میں پھر کوئی اِشکال رہ جائے تو براہِ کرم آپ دوبارہ رجوع فرمائیں، اپنے ناقص علم کی حد تک میں ان شاء اللہ جواب عرض کروں گا۔

سب سے پہلے ایک اُصولی بات عرض کردوں، اور وہ یہ کہ ہمارے پاس علمِ تاریخ پر کتابوں کا جو ذخیرہ موجود ہے اس میں ہر ایک واقعے سے متعلق کئی کئی روایتیں ملتی ہیں، اور تاریخ میں روایت کی چھان پھٹک اور جرح وتنقید کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو حدیث میں حضرات محدثین نے اختیار کیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کتبِ تاریخ میں ہر طرح کی روایتیں درج ہوئی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔ کسی معاملے کی حقیقت پسندانہ تحقیق کرنی ہو تو یہ ضروری ہے کہ رطب ویابس کے اس مجموعے میں سے صرف ان روایات پر اعتماد کیا جائے جو روایت اور درایت کے اصولوں پر پوری اترتی ہوں، اگر کوئی ایسا عالم جسے جرح وتعدیل کے اصولوں سے واقفیت ہو، ان روایتوں کو ان ہی اُصولوں کے مطابق چھانٹتا ہے تو شکوک وشبہات کا ایک بہت بڑا حصہ وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے میں عبداللہ بن سبا کی سازش نے جو تحریک شروع کی تھی اس کے دو بڑے مقاصد تھے، ایک صحابہؓ کی عظمت کو مجروح کرنا، اور دوسرے جھوٹی روایتیں پھیلانا، چنانچہ انہوں نے بے شمار غلط سلط روایتیں معاشرے میں پھیلانے کی کوشش کی۔ حضرات محدثینؒ نے پوری تندہی اور جانفشانی کے بعد احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اس سبائی تحریک کے اثرات سے جدوجہد کرکے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا، لیکن علم تاریخ میں اتنا اہتمام نہ ہو سکا اور وہ روایتیں کتابوں میں درج ہوتی رہیں جو خالص سبائی پروپیگنڈے کی پیداوار تھیں۔

ہاں! محتاط مؤرخین نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر روایت کی سند لکھ دی ہے، اور اب تحقیق حق کرنے والوں کے لئے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ علم اسماء الرجال کی مدد سے ان روایتوں کی تحقیق کریں اور جن روایتوں کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اسی سبائی تحریک کے افراد کی بیان کی ہوئی ہیں ان پر صحابہ کرامؓ کے بارے میں اعتماد نہ کریں، کیونکہ صحابہؓ کے فضائل ومناقب اور ان کا اللہ کے نزدیک انبیاء

کے بعد محبوب ترین اُمت ہونا، قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقابل انکار دلائل سے ثابت ہے، لہٰذا اس سبائی پروپیگنڈے پر کان دھر کر قرآن وسنت کے واضح ارشادات کو دریابُرد نہیں کیا جا سکتا، اہل سنت کا جو عقیدہ ہے کہ مشاجرات صحابہؓ کی تحقیق میں پڑنا درست نہیں بلکہ اس معاملے میں سکوت اختیار کیا جائے، یہ کوئی تلخ حقائق سے فرار نہیں بلکہ اس کی وجہ یہی ہے کہ تاریخی روایات میں سے صحیح اور غلط، اور سچی اور جھوٹی کا امتیاز ہر انسان کا کام نہیں ہے، اس لئے جو شخص جرح وتعدیل کے اُصولوں سے ناواقف رہ کر ان روایات کو پڑھے گا وہ ہرگز کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا، صحیح روایت میں مشاجرات صحابہؓ سے متعلق جو مواد آیا ہے اسے سامنے رکھ کر اہل سنت کے تمام مرکزی علماء نے متفقہ طور پر یہ عقیدہ اختیار کیا ہے کہ اگرچہ صفین وجمل کی جنگوں میں حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، لیکن ان کے مقابل حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت معاویہؓ وغیرہم کا موقف بھی سراسر بے بنیاد نہیں تھا، یہ حضرات بھی اپنے ساتھ شرعی دلائل رکھتے تھے اور ان سے جو غلطی بھی صادر ہوئی وہ خاص اجتہادی نوعیت کی تھی۔ اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا جواب درج ذیل ہے۔

۱- مولانا ابوالکلام مرحوم کی کتاب میں نے نہیں پڑھی، اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن یہ خیال غلط ہے کہ بنو ہاشم اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت تک بنو ہاشم کے کسی فرد نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا، صرف حضرت علیؓ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے ابتداءً حضرت صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی، لیکن خود انہوں نے بعد میں یہ وجہ بیان فرمائی کہ میری رنجیدگی کا اصل سبب یہ تھا کہ ہمیں مشورۂ خلافت میں شریک نہیں کیا گیا، چنانچہ بعد میں انہوں نے برسرِ عام حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ صرف حضرات شیخینؓ بلکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ساتھ بھرپور تعاون فرمایا۔

۲- اسلام کے بعد بلاشبہ بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی خاندانی رنجشیں ختم ہوگئی تھیں، اس کے بعد جو تھوڑی بہت رنجشیں ظاہر ہوئی ہیں، ان کا سبب خاندانی رقابت نہ تھی بلکہ کچھ دوسرے اُمور تھے، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ ان رنجشوں کے باوجود دونوں خاندانوں میں برابر رشتے ناطے ہوتے رہے۔

۳- یہ غلط ہے کہ حضرت علیؓ نے انتخابی شوریٰ کی اس شرط کو ٹھکرادیا تھا کہ وہ خلفائے سابقین کی اتباع کریں گے۔ علامہ طبریؒ نے حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد شوریٰ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ نقل فرمایا اور اس میں صحیح وغلط ہر طرح کی روایت جمع کی ہیں، لیکن اس میں یہ بھی موجود ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے، جو شوریٰ کے متفقہ نمائندہ تھے، حضرت علیؓ سے پوچھا ”علیک عهد الله وميثاقه لتعلمن بكتاب الله وسنة رسوله وسيرة الخليفتين من بعده“، تم پر اللہ کی طرف سے عہد ہوگا کہ تم

کتاب وسنت اور آپؐ کے بعد آنے والے دو خلفاء کی سیرت پر عمل کروگے، اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا "أرجو ان أفعل وأعمل بمبلغ علمي وطاقتي"، مجھے اُمید ہے کہ میں اپنے علم اور اپنی طاقت کی حد تک اس پر عمل کروں گا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج:۳ ص:۲۹۷، مطبعۃ الاستقامہ قاہرہ ۱۳۵۷ھ) اسی طرح کے الفاظ ایک اور روایت میں بھی ہیں جو مذکورہ تاریخ کے صفحہ ۳۰۱ پر منقول ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی طاقت کی حد تک اتباع کا وعدہ کیا تھا۔

۴- عام تاریخوں میں یہ تأثر پیدا کرنے والے وہی عبداللہ بن سبا کے افراد ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ کرنے والے صحابہؓ پوری دیانت داری کے ساتھ یہی سمجھتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کا قصاص اگر اس مرحلے پر نہ لیا گیا تو ایک طرف دین کا ایک اہم حکم جس پر قرآن کریم کی کئی آیات اُتری ہیں مجروح ہوگا۔ دُوسری طرف فتنہ پردازوں کی جراتیں بڑھ جائیں گی اور وہ جس خلیفہ کے ساتھ چاہیں گے یہی معاملہ کریں گے، جنگِ جمل میں تو یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ فریقین کے درمیان لڑائی صرف سبائی فتنہ پردازوں نے کرائی، حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ صلح پر متفق ہو چکے تھے، رات کے وقت سبائی فتنہ پردازوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہنے لگے "رأي الناس فينا والله واحد وان يصطلحوا وعليّ فعلى دمائنا"[1] (ہمارے بارے میں ان سب لوگوں کی رائے ایک ہے، اب اگر ہم میں اور ان میں صلح ہوگئی تو وہ ہمارے خون پر ہوگی)، عبداللہ بن سبا نے یہ تجویز پیش کی کہ "اذا التقى الناس غدا فانشبوا القتال ولا تفرغوهم للنظر"[2] (جب کل یہ لوگ ملیں تو لڑائی شروع کردینا اور انہیں سوچنے کی مہلت نہ دینا)، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انہوں نے لڑائی چھیڑ دی اس کے نتیجے میں جنگِ جمل پیش آئی۔[3] (ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج:۳ ص:۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۴، ۵۰۵، ۵۰۷، اور کامل ابن اثیر ج:۳ ص:۲۳۳، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۲،[4] اور البدایۃ والنہایۃ ج:۷ ص:۲۳۴ تا ۲۳۷)[5]

رہا حضرت معاویہؓ کا معاملہ جس وقت حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت ابوامامہؓ حضرت معاویہؓ سے گفتگو کرنے کے لئے تشریف لے گئے ہیں اسی وقت حضرت معاویہؓ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ حضرت علیؓ مجھ سے بہتر اور افضل ہیں، میرا ان سے اختلاف صرف قصاصِ عثمانؓ کے معاملے میں ہے، وہ اگر حضرت عثمانؓ کا قصاص لے لیں تو اہلِ شام میں سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا

---

(۱) تاریخ طبری ج ۳ ص:۵۰۷ (مطبعۃ الاستقامۃ، قاهرۃ)
(۲) تاریخ طبری ج ۳ ص:۵۰۸ (مطبعۃ الاستقامۃ، قاهرۃ)
(۳) تاریخ طبری ج:۳ ص:۵۰۷ (مطبعۃ الاستقامۃ، قاهرۃ)
(۴) التاریخ الکامل لابن اثیر تحت ذکر مسیر علی الی البصرۃ والوقعۃ ج:۳ ص:۹۲، ۹۳۔
(۵) ذکر مسیر امیر المؤمنین علی بن ابی طالب من المدینۃ الی البصرۃ (طبع مطبعۃ السعادۃ بجوار محافظۃ، مصر نیز دیکھئے البدایۃ والنہایۃ (طبع دار الفکر بیروت) ج:۵ ص:۲۳۴ (محمد زبیر)

میں ہوں گا، (البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۲۵۸، ۲۵۹، و ج ۸ ص ۱۲۹) اس کے بعد اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ محض بہانہ بنایا تھا تو اس کے اطمینان کے لئے شاید کوئی اور بات کافی نہ ہوگی۔

۵ - آپ کا خیال بڑی حد تک صحیح ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ تاریخ میں حضرت معاویہؓ پر جو الزامات عائد کئے گئے ہیں، وہ غلط سلط اور موضوع روایت پر مبنی ہیں، اگر صرف صحیح روایات پر بھروسہ کر کے حضرت معاویہؓ کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو صورتِ حال بالکل مختلف ہو جاتی ہے، میں نے اپنے مضمون ''حضرت معاویہؓ'' میں اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے، یہ مضمون ''سیرتِ معاویہؓ'' کے اضافے کے ساتھ عنقریب کتابی صورت میں آجائے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۶:- یزید کی ولی عہدی کے مسئلے پر میں اپنے مقالے میں مفصل گفتگو کر چکا ہوں، اگر آپ نے اس کا مطالعہ فرمالیا ہوگا تو اُمید ہے کہ اس میں آپ کو تمام سوالات کا جواب مل گیا ہوگا۔

۷:- اس مسئلے پر بھی میں اپنے مضمون میں روشنی ڈال چکا ہوں۔

۸ - یزید کا شراب پینا یا زنا کرنا کسی بھی قابلِ اعتماد روایت سے ثابت نہیں ہے، زنا کی روایت تو میں نے کسی بھی تاریخ میں نہیں دیکھی، کسی نے جو شیعہ راوی ہے یزید کا شراب پینا وغیرہ بیان کیا ہے، لیکن کسی مستند روایت میں اس کا ذکر نہیں، اگر یزید کھلم کھلا شرابی ہوتا تو حضراتِ صحابہؓ کی اتنی بڑی جماعت اس کے ساتھ قسطنطنیہ کے جہاد میں نہ جاتی، اس دور کے حالات کو دیکھ کر ظنِ غالب یہی ہے کہ یزید کم از کم حضرت معاویہؓ کے عہد میں شراب نہیں پیتا تھا اور حدِ شرعی اس وقت قائم ہو سکتی ہے جبکہ دو گواہوں نے پیتے وقت دیکھا ہو، ایسا کوئی واقعہ کسی شیعہ روایت میں بھی موجود نہیں ہے۔

۹:- ابن خلدون نے صرف اتنا لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید کا فسق ظاہر ہو گیا تھا، اس میں غالباً مجلسِ غناء کا تذکرہ بھی ہے۔

۱۰ - اس زمانے میں مکتوب نگاری کا اُسلوب نہایت مختصر ہوتا تھا، آپ اس دور کے کسی بھی ایسے مکتوب کی مثال نہیں پائیں گے جس میں تفصیل و اطناب سے کام لیا گیا ہو، مختصر خطوط میں سب باتوں کی رعایت ممکن نہیں، پھر کوفہ کے باشندے حضرت حسینؓ کو خواہ کسی سے بلا رہے ہوں، حضرت حسینؓ کا اپنا موقف یہ تھا کہ ایک سلطان متغلب جو ان کی نظر میں نا اہل تھا، ابھی پورے عالمِ اسلام پر غالب نہیں پا سکا، اس کے غلبے کو روکنا ان کے پیشِ نظر تھا، اور اسی مقصد کے لئے وہ روانہ ہوئے تھے۔ اس پہلو کو بھی میں اپنے مضمون میں واضح کر چکا ہوں۔

۱۱- حضرت حسینؓ کے خروج کی شرعی حیثیت میرے مضمون میں موجود ہے، اُمید ہے کہ آپ نے دیکھ لی ہوگی، یہ کہنا مشکل ہے کہ آپ نے پورے خاندان کو لے کر جانا کس وجہ سے مناسب سمجھا

تھا؟ لیکن اگر بالفرض حضرت حسینؓ کو معاذ اللہ غیر مخلص قرار دیا جاتا تب بھی تو یہ سوال باقی رہتا ہے، درحقیقت حضرت حسینؓ کا خلوص شک وشبہ سے بالاتر ہے، انہوں نے جو کچھ کیا وہ اللہ کے لئے کیا، اب چودہ سو سال کے بعد ان کے ایک ایک جزوی اقدام کی ٹھیک ٹھیک حکمت ومصلحت معلوم کرنا ہمارے لئے نہ ممکن ہے، نہ ضروری۔

۱۲ - یزید کے بارے میں صحیح بات وہی ہے جو میں لکھ چکا ہوں، قانونِ الٰہی کو بدلنے کا کوئی ثبوت کم از کم مجھے نہیں ملا۔

۱۳ - جیسا کہ میں اپنے مضمون میں عرض کر چکا ہوں، یزید ایک سلطان متغلب تھا، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ پورا کنٹرول حاصل کر چکا ہو تو اس کے خلاف خروج نہ کیا جائے گا، اور اگر اس کا غلبہ روکنا ممکن ہو تو روکنے کی کوشش کی جائے، حضرت حسینؓ سمجھتے تھے کہ اس کا غلبہ روکنا ممکن ہے اس لئے وہ روانہ ہوگئے اور دوسرے حضرات صحابہؓ کا خیال تھا کہ اب اس کے غلبہ کو روکنا استطاعت میں نہیں اور اس کو روکنے کی کوشش میں زیادہ خون ریزی کا اندیشہ ہے، اس لئے وہ خود بھی خاموش رہے اور حضرت حسینؓ کو بھی اپنے ارادے سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔

۱۴ - ''سر داد ونداد دست در دست یزید'' کوئی نقطۂ نظر نہیں ہے، حضرت حسینؓ شروع میں یہ سمجھتے تھے کہ سلطان متغلب کا غلبہ روکنا ممکن ہے اس لئے روانہ ہوئے اور اہل کوفہ پر اعتماد کیا، لیکن جب عبداللہ بن زیاد کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو کوفیوں کی بدعہدی کا اندازہ ہوا، اس وقت آپ کو یقین ہوگیا کہ اہل کوفہ نے بالکل غلط تصویر پیش کی تھی، حقیقت میں یزید کا غلبہ روکنا اب استطاعت میں نہیں ہے، اس لئے انہوں نے یزید کے پاس جاکر بیعت تک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر عبداللہ بن زیاد نے نہیں غیر مشروط طور پر گرفتار کرنا چاہا، اس میں نہیں مسلم بن عقیلؓ کی طرح اپنے بے بس ہوکر شہید ہونے کا اندیشہ تھا، اس لئے ان کے پاس مقابلہ کے سوا چارہ نہ رہا۔

۱۵ - کوئی شک نہیں کہ تاریخ کو اس طرح چھان پھٹک کر مرتب کرنا بہت ضروری ہے، لیکن آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں کام بے شمار ہیں، آدمی کم، کوئی شخص کیا کیا کام انجام دے؟ آج کل ایک مفصل کتاب میرے زیر قلم ہے، کسی اور کام میں لگنا مشکل ہے، تاہم کوشش کروں گا کہ جب کو اس طرف متوجہ کروں۔ میں دوبارہ معذرت خواہ ہوں کہ آپ کے جواب میں بہت تاخیر ہوئی لیکن ہجوم مشاغل کا یہ عالم ہے کہ یہ خط بھی کئی روز میں مختلف نشستوں کے اندر پورا کیا ہے، خدا کرے کہ یہ باعث اطمینان ہوسکے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے اصل عربی تواریخ میں مشاجرات صحابہؓ کے زمانے کے واقعات پڑھنے کا موقع ملا ہے، اور شاید تاریخ کی کوئی کتاب جو آج کل

ملتی ہے چھوٹی نہیں، لیکن بحمداللہ میرا دل و دماغ صحابہؓ کی طرف سے بالکل مطمئن ہے، پہلے میں اہلِ سنت کے عقائد کا تقلیداً اگر اتباع کرتا تھا، اب بحمداللہ تحقیقاً ان کا متبع ہوں، اور تمام صحیح و سقیم روایات دیکھنے کے بعد بفضلہ تعالیٰ اس عقیدے پر اور زیادہ شرح صدر ہوا ہے، اس موضوع پر والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے ایک مقالہ ''مقام صحابہؓ'' کے نام سے لکھا ہے جو ان شاء اللہ ایک دو ماہ میں منظرِ عام پر آجائے گا، موقع ہو تو اس کا بھی مطالعہ فرمائیں۔

والسلام

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۹؍ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰۴/۲۲ الف)

کس قسم کی غلطی کو ''اجتہادی غلطی'' قرار دیا جائے گا؟

سوال:- مکرمی ومحترمی مولانا محمد تقی عثمانی ایڈیٹر ''البلاغ'' کراچی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ کے بعد عرض یہ ہے کہ ذوالحجہ کا خصوصی ایڈیشن ماہنامہ ''البلاغ'' نظر سے گزرا، پڑھ کر دل مطمئن ہوا لیکن ایک عبارت پر چند شکوک ذہن میں پیدا ہوئے۔ ان شکوک کو رفع کرنے کے لئے آپ کو خط لکھ رہا ہوں تاکہ آپ کا منشاء اس عبارت سے معلوم کرسکوں، عبارت درج ذیل ہے:-

''لیکن چونکہ حضرت عائشہؓ ہوں یا حضرت معاویہؓ دونوں سے یہ عمل حضرت علیؓ کی عداوت یا بغض کی وجہ سے نہیں بلکہ شبہ اور تاویل کی بنا پر صادر ہوا تھا، اور بہرحال وہ بھی اپنے پاس دلائل رکھتے تھے جو غلط فہمی پر مبنی سہی لیکن دیانت دارانہ تھے، اس لئے اُخروی احکام کے اعتبار سے ان کا یہ عمل اجتہادی غلطی کے ذیل میں آتا ہے، اس لئے ان پر طعن کرنا جائز نہیں، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ذبیحہ پر جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑ کر اسے ذبح کردینا اور پھر اسے کھانا دلائل قطعیہ کی بناء پر گناہ کبیرہ ہے، لیکن امام شافعیؒ نے اپنے اجتہاد سے اسے جائز سمجھا، اس لئے اگر کوئی شافعی المسلک انسان اسے کھالے تو اس کا یہ عمل دلائل شرعیہ کی رُو سے گناہ کبیرہ اور فسق ہے لیکن چونکہ وہ دیانت دارانہ اجتہاد کی بناء پر صادر ہوا اس لئے اس شخص کو فاسق نہیں کہا جائے گا۔'' (''البلاغ'' ۱۳۹۰ ص ۷۲)

میرا اس عبارت پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن کی آیتوں کا انکار کرتا چلا جائے تو آپ اس کو دیانت دارانہ اجتہاد کہیں گے؟ اور اس کی نیت کو دیکھیں گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی دلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے تو آپ کیسے دعوے کررہے ہیں؟ اگر مرزائی قرآن مجید کی آیتوں کی تلاوت کرتے جائیں اور یہ کہیں کہ ہماری نیت ٹھیک ہے اور ہم دیانت داری سے کرتے ہیں، تو کیا وہ آپ کے نزدیک ٹھیک ہوگا؟ اگر کوئی یہ کہے کہ مولانا مودودی نے یہ اجتہادی غلطی کی تو آپ اس کا کیا

جواب دیں گے؟

یہ شکوک میرے ذہن میں پیدا ہوئے اس لئے ان شکوک کو دور کرنے کے لئے آپ کی طرف متوجہ ہو رہا ہوں، مہربانی فرما کر آپ میرے شبہات دُور کرکے خدا کے ہاں اجرِ عظیم کے مستحق ٹھہریں۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ موصول ہوا، کسی شخص کی غلطی کو اجتہادی غلطی قرار دینے کے لئے میں نے جو دو شرطیں عرض کیں، وہ غالباً آپ کی نگاہ سے اوجھل رہ گئیں، جس کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہوا، میں نے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی شخص اجتہاد کا اہل ہے، یعنی اس میں وہ علمی وعملی صلاحیت پائی جاتی ہے جو تمام اُمت نے مجتہد کے لئے ضروری قرار دی ہے، اور اپنے مسلک کی بنیاد کسی شرعی دلیل پر رکھتا ہے خواہ وہ دلیل ہمیں کمزور معلوم ہوتی ہے تو اس کا یہ عمل ''اجتہاد'' کہلائے گا، اور اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو وہ ''اجتہادی غلطی'' ہوگی۔ امام شافعیؒ نے حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث کی بناء پر یہ مسلک اختیار کیا کہ بغیر بسم اللہ پڑھے بھی ذبیحہ دُرست ہے۔(۱) اور قرآنِ کریم کی آیت کو ''ما اُھلّ لغیر اللہ'' پر محمول کیا، ساری اُمت نے اسے اجتہادی غلطی اس لئے قرار دیا کہ ان میں اجتہاد کی شرائط پوری طرح پائی جاتی تھیں، اور یہ مسلک بہرحال ایک شرعی دلیل پر مبنی ہے جو کمزور سہی لیکن اجتہاد کی حدود میں داخل ہے۔

آپ نے یہ سوال بڑا اچھا کیا ہے کہ ''کچھ آج کل دوسرے لوگ اگر اسی اجتہاد کو بہانہ بنا کر قرآن وسنت میں غلطیاں کرنے لگیں تو ان کو کیا کہا جائے گا؟'' لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شرائطِ اجتہاد کا حامل ہو تو اس کی غلطی کو اجتہادی غلطی کہیں گے، لیکن جن لوگوں کی آپ نے مثال دی ہے ان میں شرائطِ اجتہاد مفقود ہیں، اس لئے ان کی غلطی کو اجتہادی غلطی نہیں کہہ سکتے۔ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ایک غلطی کوئی مجتہد کرے تو باعثِ ثواب اور اگر غیر مجتہد کرے تو باعثِ مذمت، یہ بے انصافی کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ اگر ایک سند یافتہ ڈاکٹر کسی مریض کو کسی غلط فہمی کی بناء پر غلط دوا دیدے اور اس سے مریض کا کام تمام ہو جائے تو اگر یہ ثابت ہو کہ اس نے اپنے پیشے کی بجا آوری میں دیانت داری سے وہ دوا دی تھی، تو دنیا کا کوئی قانون اسے مجرم قرار نہیں دیتا، اس کے برخلاف اگر وہی دوا کوئی غیر سند یافتہ عطائی کسی مریض کو دے اور اس سے اس کی موت واقع ہو جائے تو دُنیا کا ہر قانون اس پر گرفت کرتا ہے۔

(۱) وفي المجموع شرح المهذب، باب الصيد والذبائح ج ۹ ص ۴۵۲ (طبع جديد، دار الكتب العلمية بيروت) فرع في مذاهب العلماء في التسمية على ذبح الصيد وغيره من الذبائح، مذهبنا أنها سنة في جميع ذلك فإن تركها سهوا أو عمدا حلت الذبيحة ولا إثم عليه. نيز ديكهئے روضة الطالبين ج ۳ ص ۲۰۵ (طبع المكتب الإسلامي)

یہ فرق اس لئے ہے کہ غلطی سے دُنیا کا کوئی انسان محفوظ نہیں ہے، البتہ اس کے ذمہ یہ ضروری تھا کہ غلطی سے بچنے کے جتنے اسباب و وسائل ہوسکتے ہیں ان کو پوری طرح اختیار کرے، جو شخص ڈاکٹر بننا چاہتا ہے اس کے لئے اسباب یہ ہیں کہ وہ فن طب کو ماہر اساتذہ سے حاصل کرکے ان سے سند لے، اس کے بعد اس سے کوئی غلطی ہوجاتی ہے تو یہ ایک غلطی ہے جس سے کوئی انسان محفوظ رہنے کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اسی طرح ایک عالم کے لئے ظاہری وسائل یہ ہیں کہ وہ قرآن وسنت کا پورا علم باضابطہ حاصل کرے، ماہر اساتذہ سے اس کی تربیت لے، اس کے بعد وہ غلطی کرے گا تو یہ ایک ماہر ڈاکٹر کی غلطی کی طرح قابلِ ملامت نہ ہوگی، اس کے برخلاف جس شخص میں اجتہاد کی اہلیت نہیں ہے اس کی مثال عطائی کی سی ہے کہ اس کی غلطی قابلِ ملامت اور موجب گرفت ہے۔

یاد آوری کے لئے شکرگزار ہوں اور دُعا کی درخواست ہے۔

والسلام

۱۳۹۱/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۴۶ الف)

﴿فصل فی تعلیم القرآن وتعظیمه وتلاوته﴾

(قرآنِ کریم کی تعلیم، تعظیم، تلاوت اور آداب سے متعلق مسائل کے بیان میں)

قصص القرآن کی فلم بندی کا شرعی حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں کہ ایک فلم قصص القرآن کے نام سے جاری کی گئی ہے، جس کے اندر مختلف قرآنی واقعات کو فلم کے طور پر پیش کیا گیا ہے، مثلاً بنی اسرائیل کے ذبح گاؤ کا واقعہ، فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ اور بنی اسرائیل کے خروج کا واقعہ، فلم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شبیہ نہیں دکھائی گئی، بلکہ کسی اور شخص کی زبانی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احکام بنی اسرائیل تک پہنچائے گئے ہیں۔

ایسی فلم کو دیکھنے اور دکھانے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ براہ کرم مدلل بیان فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

جواب:- قرآنِ کریم کے واقعات کی مصور فلم بنانا، دیکھنا اور دکھانا ہرگز جائز نہیں، بلکہ قرآنِ کریم کی بے حرمتی کی بنا پر اس عمل میں شدید وبال کا اندیشہ ہے، اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:-

۱- قرآنِ کریم کے مضامین جس عظمت وجلال کے حامل ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان مضامین کو قرآن کریم ہی کے الفاظ میں پورے ادب واحترام کے ساتھ پڑھا یا سنا جائے، اس کے برعکس پیشہ ور اداکاروں اور بہروپیوں کو مقدس قرآنی شخصیتوں کی مصنوعی شکل میں پیش کر کے ان سے قرآن کریم کے بیان کردہ واقعات کی مصنوعی نقل کرانا، آیاتِ قرآنی کو کھیل تماشہ بنانے کے مرادف ہے، جو بنصِ قرآنی حرام ہے، آیت ہے:-

وذر الّذین اتّخذوا دینهم لعبًا ولهوًا وّغرّتهم الحیوة الدّنیا وذکّر به ان تبسل نفسٌ بما کسبت لیس لها من دون الله ولیّ ولا شفیعٌ الخ

(سورہ انعام: ۷۰)

۲- کوئی فلم جانداروں کی تصاویر سے خالی نہیں ہوتی، اور جانداروں کی تصاویر بنانا، دیکھنا اور

دکھلانا شرعاً جائز نہیں، لہٰذا قرآنی مضامین کو ایسے ذرائع سے پیش کرنا جو درجنوں احادیث کی رُو سے ناجائز ہے، نہ صرف حرام بلکہ قرآنِ کریم کی توہین کے مترادف ہے۔

۳- واقعات کی فلم اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس میں عورتوں کے کردار نہ ہوں، چنانچہ مذکورہ فلم میں بھی کردار موجود ہیں، اور خواتین کے بے حجاب مردوں کے سامنے آنا یا ان کی تصاویر کا بلا ضرورت نامحرموں کو دکھانا قرآن و حدیث کی رُو سے بالکل ناجائز ہے، اور ناجائز کام کو قرآنِ کریم کے مضامین کو بیان کرنے کے لئے ذریعہ بنانا بھی نہ صرف حرام بلکہ معاذ اللہ قرآن کریم کی توہین کے مترادف ہے۔

۴- کسی سچے سے سچے واقعے کو بھی جب فلم کی شکل دی جاتی ہے تو اس میں فلم ساز کے فرضی تخیلات کی آمیزش ناگزیر ہے، اس کے بغیر عموماً کوئی فلم تیار نہیں ہوسکتی، فلم ساز کو ایک مربوط فلم بنانے کے لئے لامحالہ واقعات کے خلاء کو اپنے فرضی قیاسات سے پُر کرنا پڑتا ہے، اور کچھ نہیں تو متعلقہ اشخاص کی شکل و شباہت، ان کی تعداد، ان کے انداز نشست و برخاست، ان کے اردگرد پائے جانے والے ماحول، پس منظر اور ان کے عادات و خصائل کو لازماً قیاسی مفروضات کی بنیاد پر پیش کرنا پڑے گا، اور فلم میں ان سب باتوں کو قرآن کریم سے ممتاز نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا یہ سارے قیاسات قرآن کریم ہی کی طرف منسوب کئے جائیں گے جو قرآنِ کریم کی معنوی تحریف کے مشابہ ہے۔

زیر بحث فلم کے بارے میں بھی ذمہ دار فلم دیکھنے والوں نے بتایا ہے کہ اس میں قرآنِ کریم کے بیان کردہ واقعات کے ساتھ بہت سی اسرائیلی روایات اور فرضی تخیلات کو قرآنی واقعات کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے، اور جن ناواقف لوگوں کو قصص القرآن سے واقف کرانے کے موہوم شوق میں یہ فلم دکھلائی جارہی ہے، ان کے لئے قرآن اور غیر قرآن میں امتیاز کرنے کا کوئی راستہ نہیں، وہ اس سارے مجموعے ہی کو قرآنی مضامین سمجھیں گے اور ان کو قرآنِ کریم کے بارے میں اس سنگین غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہوگی جو اس فلم کو بنانے یا دکھانے کے ذمہ دار ہیں۔

۵- قرآن کریم کے بیان کردہ واقعات میں بہت سے مقامات پر ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کی ایک سے زیادہ تشریحات ممکن ہیں، اور ان میں سے کسی ایک تشریح کو یقینی اور قطعی طور پر کسی دوسرے احتمال کے بغیر قرآن کریم کی حقیقی مراد قرار دینا جائز نہیں، مفسرین جب ایسی آیت کی تشریح کرتے ہیں تو عام طور سے ممکنہ احتمالات ذکر کر دیتے ہیں، ورنہ کم از کم کسی نہ کسی صورت سے یہ واضح کر دیتے ہیں کہ اتنی بات قرآنِ کریم کی ہے اور اتنی تفسیر کی، تاکہ قرآن کا غیر قرآن سے ملتبس ہونا

لازم نہ آئے، یہ صورت فلم میں کسی طرح ممکن نہیں، بلکہ فلم ساز کے ذہن میں مذکورہ آیت کیا واقعے کی جو تفسیر ہے صرف اسی کو لازماً قرآنی مضمون کی شکل میں اس طرح پیش کیا جائے گا کہ اس میں کوئی دوسرا احتمال نہیں ہوگا اور فلم کے زور سے اسی تفسیر کا نقش ذہن پر اس طرح قائم کر دیا جائے گا کہ گویا اس فلم میں بیان کردہ تصویر عین قرآن ہے، یہ صورت بھی قرآن اور غیر قرآن کے درمیان التباس پیدا کرنے کا موجب ہے، اس لئے بھی یہ فلم بالکل ناجائز ہے۔

۶۔ فلم کا اصل منشا تعلیم و تبلیغ نہیں ہوتا، بلکہ تفریح طبع اور کھیل تماشوں سے لذت حاصل کرنا ہوتا ہے، لہٰذا اس فلم کو دیکھنے والے دراصل تفریح طبع کی غرض سے فلم دیکھیں گے نہ کہ علم، عبرت یا نصیحت حاصل کرنے کی غرض سے، جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اگر یہی مضامین اپنی اصلی صورت میں وعظ و تذکیر کے لئے بیان کئے جاتے تو یہ لوگ اس میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ ہوتے، اور قرآنی مضامین کو سننے سنانے کا مقصد اصلی کھیل تفریح کو بنالینا کسی طرح جائز نہیں، بلکہ اس کا مقصد اصلی عبرت اندوزی ہے، اس کے ضمن میں تنشیط و تفریح بھی حاصل ہوجائے تو اور بات ہے، لیکن کھیل تفریح کو اصل قرار دے کر اسی کو مقصد اصلی بنالینا ہرگز جائز نہیں۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر، نیز دوسرے متعدد مفاسد کے پیش نظر ایسی فلم بنانا، دیکھنا، دکھانا سب ناجائز ہے، مسلمانوں کو اس سے سختی کے ساتھ پرہیز کرنا چاہئے اور حکومت کا بھی فرض ہے کہ نہ صرف یہ کہ ایسی فلمیں دکھانے سے باز رہے بلکہ آئندہ اس قسم کی فلموں کی نمائش کا مکمل طور پر سد باب کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۰۴/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۹۹/۳۵ د)

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	اصغر علی ربانی
دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴	۱۴۰۴/۹/۱۸ھ	۱۴۰۴/۹/۱۸ھ

ماہواری کی حالت میں تلاوت، کلمہ، دُرود پڑھنے کا حکم

سوال:- کیا ایام حیض میں عورت، سورت یا کلمہ اور دُرود وغیرہ پڑھ سکتی ہے؟

جواب:- قرآن کریم کی تلاوت تو بالکل نہیں کرسکتی، کلمہ، دُرود وغیرہ پڑھنے میں

مضائقہ نہیں۔[۱]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲/۷/۱۹ الف)

قرآنی آیات والے اخبارات کی بے حرمتی کرنا

سوال:- مولانا احتشام الحق صاحب جو جمعہ کو اخبار میں آیتیں چھپواتے ہیں، وہ دُکاندار، ردی میں پھینک دیتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

جواب:- جن کاغذات پر اللہ، رسول کا نام یا قرآنی آیات واحادیث لکھی یا چھپی ہوں ان کو بے حرمتی کی جگہ ڈالنا دُرست نہیں ہے۔[۲]

الجواب صحیح
بندہ محمد عاشق الٰہی

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۵ھ

جن کتابوں میں قرآنی آیات بھی ہوں انہیں حالتِ حیض میں پڑھنا اور چھونا، اور حالتِ حیض میں تلاوت واذکار جائز ہیں یا نہیں؟

سوال ۱:- عورت کے لئے حالتِ حیض میں ایسی کتابوں کو چھونا اور پڑھنا جن میں چند آیات کلام پاک کی لکھی ہوتی ہیں جائز ہے یا نہیں؟ ان آیات کو چھوڑ کر صرف ترجمہ، تفسیر اور مطلب پڑھ لیا جائے؟

۲:- ایسے زمانے میں زبانی کلام پاک، کلمہ جات، دُرود شریف پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- اس معاملے میں اُصول یہ ہے کہ اگر کتاب کا اکثر یا آدھا حصہ قرآنی آیات پر مشتمل ہے تو حالتِ حیض ونفاس اور جنابت میں اس کا چھونا جائز نہیں، اور اگر کتاب کا اکثر حصہ غیرِ قرآن ہے تو اس کو اس مقام سے چھونا جائز ہے جہاں قرآنی آیات لکھی ہوئی نہیں ہیں۔

قال الشامی ان کان التفسیر أکثر لا یکرہ، وان کان القراٰن أکثر یکرہ، والأولی الحاق المساواۃ بالثانی، وھذا التفصیل ربما یشیر الیہ ما ذکرناہ عن النھر، وبہ یحصل

---

(۱) وفي الدر المختار باب الحيض، ج ۱ ص ۲۹۳ (طبع ايچ ايم سعيد) ويمنع قراءة قرآن ... ولا بأس لحائض وجنب بقراءة أدعية ومسه وحملها وذكر الله تعالى وتسبيح. مزید حوالہ جات اگلے صفحے کے حاشیہ نمبر ۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) تفصیل اور دلائل کے لئے آگے صفحہ نمبر ۱۹۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

التوفیق بین القولین. (شامی ج ۱ ص ۱۶۴ طبع استنبول)۔[1]

۲۔ قرآنِ کریم کی تلاوت تو بالکل ناجائز ہے، البتہ دعائیں، اذکار و اوراد اور احادیث وغیرہ پڑھے جاسکتے ہیں۔[2]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۵/۱۲/۳ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۸/۱۸ الف)

شبینہ کی محفلوں میں لاؤڈ اسپیکر پر تلاوت، اس پر اُجرت اور سجدۂ تلاوت وغیرہ سے متعلق چند سوالات کے جوابات

چند سال سے بہت کے اطراف میں شبینہ کے نام سے ایک نئی قسم کی مجلسیں قائم ہوتی ہیں جو عموماً مغرب سے طلوعِ آفتاب کے دو ایک گھنٹہ بعد تک باقی رہتی ہیں۔۔ حاضرین کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ وہاں مائیکروفون کی ضرورت ہرگز نہیں ہوتی، لیکن شاید ہی کوئی ایسی مجلس مائیکروفون سے خالی رہتی ہے، حاضرین مجلس اکثر سوتے رہتے ہیں، کوئی خراٹے لیتا ہے، کوئی اُونگھتا ہے، کوئی باہر بیڑی سگریٹ پی رہا ہے، اس کی بدبو مجلس تک آتی رہتی ہے۔۔ گھر کے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمہ تن متوجہ ہوکر تلاوت کلام پاک سنتے ہیں، اکثر لوگ اپنے خانگی اُمور میں مشغول رہتے ہیں، گھر کے سونے والوں کے لئے یہ آواز حرجِ عظیم ہوا کرتی ہے۔ واعظین حضرات تلاوتِ قرآن ہوتے وقت بھی چائے نوش کرتے ہیں، پان کھاتے ہیں، کبھی کبھار آپس میں گفتگو بھی کرتے ہیں، کوئی سوئے ہوئے، تو کوئی بیٹھے ہوئے ہیں، بانیٔ مجلس کی طرف سے ان کو روپے ملتے ہیں، کم ہونے پر برہمی ظاہر کرتے ہیں اور کبھی پہلے سے روپے کا تصفیہ کرلیتے ہیں۔ اکثر واعظین مدارس کے مدرّس ہوتے ہیں اور ان مجلسوں کا سلسلہ عموماً ماہ کاتک سے ماہ بیساکھ تک جاری رہتا ہے، سو واعظ صاحب اس تقریب کی وجہ سے مدرسہ سے غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ بھی لیتے ہیں، علاوہ ازیں طویل

---

(۱) شامی ج:۱ ص ۱۷۷ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) فی اعلاء السنن ج ص ۲۶۲ (طبع ادارۃ القرآن) عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تقرأ الحائض ولا الجنب شیئًا من القرآن اخرجہ الترمذی ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع فاروقی کتب خانہ) وفی الدر المختار ج ۱ ص ۲۹۳ یمنع حل (دخول المسجد) الی قولہ (وقراءۃ قرآن) بقصدہ ومسہ الا بغلافہ وفی الهندیۃ ج ص ۳۸ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) ومنها حرمۃ قراءۃ القرآن لا تقرأ الحائض والنفساء والجنب شیئًا من القرآن، والآیۃ وما دونها سواء فی التحریم علی الاصح، الا أن لا یقصد بما دون الآیۃ القراءۃ مثل ان یقول الحمد للہ یرید الشکر او بسم اللہ عند الأکل أو غیرہ فإنہ لا بأس بہ وفی الدر المختار مع رد المحتار باب الحیض ج ص ۲۹۳ (طبع سعید) ولا بأس لحائض وجنب بقراءۃ ادعیۃ ومسها وحملها وذکر اللہ تعالی وتسبیح

سات مہینے میں وقتاً فوقتاً شب بیداری کی وجہ سے درسی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرسکتے، بعض ایک ہی مدرسہ کے تین چار ایسے واعظ اساتذہ باہر رہا کرتے ہیں، اس سے مدرسہ کا جو تعلیمی نقصان ہوتا ہے وہ خارج عن البیان ہے۔

سوال ۱:- ایسی مجلس میں مائیکروفون اگر اس کا کرایہ دینا پڑے خرچہ کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب:- جب مجلس کے حاضرین تک بغیر لاؤڈ اسپیکر کے آواز پہنچ جاتی ہے تو لاؤڈ اسپیکر لگانا ''غیر ضروری'' بلکہ مضر ہے، لہٰذا یہ اسراف میں داخل ہے۔

سوال ۲:- ایسی مجلس کے مائیکروفون میں کلام پاک کی تلاوت جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- اگر اس کی آواز ان لوگوں تک پہنچتی ہے جو مجلس میں حاضر نہیں اور ان کی نیند وغیرہ میں خلل اندازی ہوتی ہے یا اس سے تلاوت کلام پاک کی بے حرمتی کا امکان ہے تو مائیکروفون میں تلاوت کرنا دُرست نہیں[1]۔

قال فی رد المحتار وعلی هذا لو قرأ علی السطح والناس نیام یأثم (شامی ج ۱ ص ۵۰۹)۔

سوال ۳:- ایسی مجلس کے مائیکروفون میں سجدے کی آیات تلاوت کرنے سے مجلس سے باہر یا گھر کے لوگوں کے سننے سے ان پر سجدہ کرنا واجب ہوگا یا نہیں؟ برتقدیر اوّل وہ لوگ اگر سجدہ نہ کریں تو تلاوت کرنے والے یا بانیٔ مجلس پر گناہ عائد ہوگا یا نہیں؟

جواب:- واجب ہوگا، اور اگر انہوں نے سجدہ نہ کیا تو اس کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر لگانے والے بھی گناہ سے خالی نہ ہوں گے۔

سوال ۴:- کہتے ہیں کہ آداب تلاوت مجلس تلاوت کے لئے محدود ہیں، جب مائیکروفون میں تلاوت ہوگی تو مجلس کی تعریف میں اور توسیع ہوگی یا نہیں؟

جواب:- جی نہیں، مجلس تلاوت اسی جگہ کو کہا جائے گا جہاں حقیقتاً تلاوت ہو رہی ہے، لہٰذا بلاضرورت مائیکروفون پر تلاوت کی جائے تو باہر سننے والے عدمِ استماع وغیرہ میں معذور ہوں گے اور اس کا گناہ تلاوت کرنے والوں پر ہوگا۔

یجب علی القاری احترامه بأن لا یقرأه فی الأسواق ومواضع الاشتغال، فاذا قرأه فیها کان هو المضیع لحرمته فیکون الاثم علیه دون أهل الاشتغال (رد المحتار ج ۱ ص ۵۱۰)[2]۔

سوال ۵:- تلاوت قرآن پاک کے وقت سامع کو چائے نوش کرنا، پان کھانا یا گفتگو کرنا،

---

(۱) شامی فروع فی القراءة خارج الصلوة ج ۱ ص ۵۴۶ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) شامی مطلب الاستماع للقرآن فرض کفایة ج ۱ ص ۵۴۶ (طبع سعید)

مجلس میں لیٹنا کیسا ہے؟

جواب:- اگر تلاوت قرآن، شرائط کی رعایت کے ساتھ کی جارہی ہو تو سامعین کا چائے پینا، پان کھانا، لیٹنا یا اور کوئی ایسا کام کرنا جس سے تلاوت کی طرف سے بے توجہی کا اظہار ہو کراہت سے خالی نہیں۔

سوال ۶:- واعظ مدرس کو صاحب مجلس کی طرف سے عطیہ یا وعظ کی اُجرت لے لینے کے بعد مدرسہ سے غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ لینا کیسا ہوگا؟

جواب:- اگر مدرسہ سے باضابطہ رُخصت لی ہے اور وعظ پر اُجرت لینے کا کوئی معاہدہ منتظمین مدرسہ سے نہیں ہوا، تو جائز ہے۔

سوال ۷:- کسی مدرس صاحب کا ایسی مجلسوں میں ہمیشہ ہمیشہ جاکر مدرسہ سے غیر حاضر رہ کر اور اکثر اوقات بغیر مطالعہ درس دے کر مدرسہ یا طلبہ کو نقصان پہنچانا کیسا ہوگا؟

جواب:- مجلس اگر ان منکرات پر مشتمل نہ ہو جن کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے تو کبھی کبھی اس میں چلے جانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کو اس طرح روزانہ کا معمول بنالینا اور ایسا مشغلہ بنالینا کہ مطالعے کی فرصت نہ ملے جس سے مدرسہ کا نقصان ہو دُرست نہیں، اس صورت میں ان کی تنخواہ حلال طیب نہ رہے گی۔

سوال ۸:- واعظ صاحب کو عطیہ یا وعظ کی اُجرت لے لینے کے بعد اُخروی ثواب کی اُمید باقی رہتی ہے یا نہیں؟

جواب:- وعظ اگر اُجرت لینے کے مقصد سے نہیں کیا گیا، تو اللہ سے اُمید رکھنی چاہئے، خواہ منتظمین وعظ کچھ ہدیہ، عطیہ دے دیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۷۰ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

قرآنی آیات والے اخباری تراشوں کی بے حرمتی کرنا

سوال:- جو لوگ قرآنی آیات خبروں میں درج کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے اور اس سے قرآن کی بے حرمتی نہیں ہوگی؟

جواب:- جس کاغذ پر قرآنی الفاظ لکھے ہوئے ہوں، اس کی بے حرمتی کرنا جائز نہیں،[1] اخبارات میں بہتر یہی ہے کہ صرف ترجمہ لکھا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۱/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

حفص کے علاوہ کسی اور قراءت میں تلاوت کا حکم

سوال:- آج کل قاریوں کی ایک جماعت ہے جو طرح طرح سے قرآن پڑھا کرتے ہیں، کبھی اعراب والا حرف بغیر اعراب کے پڑھتے ہیں، اور کبھی دو جملوں کو الگ الگ پڑھا کرتے ہیں، بعض لوگوں سے دریافت کیا تو کہا کہ اعراب کی غلطی کی وجہ سے نماز نہیں ہوتی۔

جواب:- یہ قاری صاحبان غالباً حفص کے علاوہ کسی اور قراءت میں پڑھتے ہوں گے، لیکن ہمارے ملک میں نمازوں میں اور عوامی محفلوں میں حفص کے علاوہ کسی دوسری قراءت میں پڑھنے کو فقہاء نے منع کیا ہے تاکہ عوام تشویش میں نہ پڑیں، اس لئے انہیں اسے نہ پڑھنا چاہئے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۱/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۳ھ

سات قراءتوں کے مطابق تلاوتِ قرآن کا حکم

سوال:- قرآن مجید پڑھنے کے کتنے طریقے ہیں؟ رمضان میں ایک قاری صاحب کی قراءت سے مستفید ہوا، قراءت کا طریقہ انتہائی جدا تھا، مثلاً کھڑی زبر کو وہ زیر کے طریقے سے کھینچتے تھے، مثلاً "مٰلکِ یوْمِ الدّیْن" کو "مَلکِ یوْمِ الدّیْن" پڑھتے تھے، اور شاید "مِلکِ یوْمِ الدّیْن" بھی پڑھتے ہیں، مثلاً "مغضُوْب علیْهِمْ" کو بھی اسی طرح پڑھتے تھے یعنی "علیهُمْ" معلوم کرنے پر فرمایا کہ تقریباً ۷ یا ۱۰ طریقے ہیں تلاوت کلام اللہ کے، غالباً اس طریقے کی تلاوت حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتی مدظلہم بھی اکثر فرماتے ہیں۔

---

(۱) دیکھئے ص:۱۹۳ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

جواب:- قرآن کریم کا سات حروف پر نازل ہونا بخاری ومسلم وغیرہ کی صحیح احادیث سے ثابت ہے،[1] جو معنیً متواتر ہیں۔ ان سات حروف کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت کے متعدد طریقے ہیں اور ان سب پر تلاوت قرآن جائز ہے۔ "ملک یوم الدّین" میں ایک قراءت "ملک یوم الدّین" بھی ہے، "مِلِک یوم الدّین" کوئی قراءت نہیں، اسی طرح "علیہِمْ" کے بجائے "علیہُمْ" پڑھنا بھی بعض قراء توں میں دُرست ہے۔ اس مسئلے کی مکمل تحقیق کے لئے احقر کی کتاب "علوم القرآن" کی طرف رُجوع فرمائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۱۶/۲۸ ج)

قرآنِ کریم کو چومنے کا حکم

سوال:- قرآن شریف کو چومنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جائز ہے۔[2]

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۱۵ھ

ٹیپ ریکارڈ پر تلاوتِ قرآن سننے کا حکم

سوال:- حضرت جی! عرض یہ ہے کہ بندہ تبلیغی جماعت سے وابستہ ہے، اور تمام اعمال میں جڑنے کی پوری کوشش کرتا ہے، اور الحمدللہ علمائے حق دیوبند کا خدمت گزار ہے۔

مورخہ ۲۰۰۱/۸/۱۷ء کو علاقائی جوڑ کے سلسلے میں مرکز رائے ونڈ حاضری ہوئی، وہاں ایک مبلغ نے اپنے بیان میں فرمایا کہ ٹیپ ریکارڈ کی کیسٹ میں قرآن سننا، رنڈی کا گانا سننے جیسا ہے، اور مزید کہا کہ یہ فتویٰ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے دیا ہے۔

عریضہ ہذا کے ذریعہ عرض یہ کرنا ہے کہ اگر حضور والا نے اس قسم کا فتویٰ دیا ہے تو اس کی فوٹو کاپی ارسال فرمائیں، جوابی لفافہ لف ہے۔

بصورتِ دیگر اس پورے مسئلے میں شرعی نقطۂ نگاہ واضح فرمائیں، جزاکم اللہ خیراً!

---

(۱) وفي صحيح البخاري ج ۲ ص ۷۴۶ باب انزل القرآن على سبعة احرف، ان ابن عباس حدثه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اقرأني جبريل على حرف فراجعته فلم ازل استزيده ويزيدني حتى انتهى الى سبعة احرف. وفيه أيضا ... قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كذلك انزلت ان هذا القرآن انزل على سبعة احرف فاقرءوا ما تيسر منه.

(۲) في الدر المختار ج ۶ ص ۳۸۴ تقبيل المصحف قيل بدعة، ولكن روى عن عمر رضي الله عنه أنه كان يأخذ المصحف كل غداة ويقبله ويقول عهد ربي ومنشور ربي عز وجل، وكان عثمان رضي الله عنه يقبل المصحف ويمسحه على وجهه. (مرتب عفی عنہ)

جواب:- محترمی ومکرمی!　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

استغفر اللہ! بندہ نے ایسا کوئی فتویٰ نہیں دیا، نہ یہ بات دُرست ہے، جن صاحب نے بھی یہ بات کہی ہے انہوں نے غیر ذمہ داری سے میری طرف غلط بات منسوب کی ہے، ان کو میرا یہ خط دکھا کر بتادیں کہ آئندہ کسی کی طرف کوئی بات منسوب کرنے سے پہلے تحقیق کرلیا کریں۔ کیسٹ میں قرآن کریم سننا بالکل جائز ہے، اور اسے معاذ اللہ گانے سے تشبیہ دینا میرے نزدیک سخت گستاخی ہے۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۲/۶/۲۸ھ

تلاوت کے موقع پر نیند آنا

سوال:- جب بھی ہم قرآن کی تلاوت کرنے بیٹھتے ہیں تو ہمیں نیند آنے لگتی ہے، اس کے متعلق ہمیں کچھ بتائیں۔

جواب:- اگر ایسا کبھی کبھی ہوتا ہو تو نیند آنے پر تلاوت چھوڑ دیں، لیکن اگر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہو تو نیند بھگانے کے لئے کسی طبیب سے مشورہ کرکے کوئی تدبیر اختیار کریں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۰/۲۹ الف)

قرآنی آیات والے اخبارات وکاغذات کی بے حرمتی کا حکم

سوال:- اخبارات واشتہارات میں عبارت قرآن واحادیث کا چھاپنا اور ان کی بے حرمتی کرنا کیسا ہے؟ اور اس کی روک تھام کیسے کی جائے؟

جواب:- جن کاغذات پر اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لکھا، یا چھپا ہوا ہو ان کو بے حرمتی کے مقامات پر رکھنا یا پھینکنا بالکل ناجائز ہے[1]، انسان کو چاہئے کہ خود بھی اس سے پرہیز کرے اور جس حد تک ممکن ہو دُوسروں کو بھی اس سے روکے، اگر ہر شخص اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرکے اس بات کا اہتمام کرے تو اس فعل ناجائز کا شیوع بڑی حد تک رُک سکتا ہے۔

الجواب صحیح　　واللہ اعلم

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ　　احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ　　۱۳۸۷/۱۰/۲۸ھ

---

(۱) دیکھئے اگلا فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

قرآنِ کریم کے بوسیدہ اوراق کا حکم

سوال:- قرآن پاک کے ایسے نسخے جو بوسیدہ ہو چکے ہوں اور تلاوت کے لئے استعمال نہ ہوتے ہوں، اور ایسے ہی پرانے بوسیدہ سپارے اور ان کے منتشر اوراق، مذہبی رسائل اور کتابچے جن میں قرآن پاک کی آیات اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں ان کو کس نیت پر کہ ان کی بے حرمتی اور توہین نہ ہو اور ان کی راکھ کو کسی محفوظ مقام پر دفن یا سمندر برد کر دیا جائے گا، جلانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح البخاری ج ۲ باب فضائل قرآن ص ۷۴۶ پر حدیث ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن جلانے کا حکم فرمایا۔ شرعی حکم قرآن و حدیث اور فقہ حنفی کی رو سے عنایت فرمائیں۔

جواب:- فقہائے حنفیہ نے تصریح کی ہوئی ہے کہ قرآن کریم کے بوسیدہ اوراق کو جلانے کے بجائے یا تو کسی محفوظ جگہ پر دفن کر دیا جائے یا اگر وہ اوراق دُھل سکتے ہوں تو حروف کو دھو کر ان کا پانی کسی کنویں یا ٹنکی وغیرہ میں شامل کر دیا جائے، اور دفن کرنے کے لئے بھی بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان اوراق کو کسی کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے، اگر یہ دونوں کام مشکل ہوں تو ان اوراق کو کسی دریا، سمندر یا کنویں میں بھی ڈالا جا سکتا ہے۔

فی الدر المختار: الکتب التی لا ینتفع بھا یمحی عنھا اسم اللہ وملائکتہ ورسلہ ویحرق الباقی، ولا بأس بأن تلقی فی ماء جار کما ھی او تدفن وھو احسن کما فی الانبیاء وفی الذخیرۃ: المصحف اذا صار خلقا وتعذر القراءۃ منہ لا یحرق بالنار، الیہ اشار محمد وبہ نأخذ، ولا یکرہ دفنہ، وینبغی ان یلف بخرقۃ طاھرۃ ویلحد لہ، لأنہ لو شق ودفن یحتاج الی اھالۃ التراب علیہ.[1] (شامی حظر و اباحت اواخر فصل البیع)۔

اور بعض علماء نے حضرت عثمانؓ کے عمل سے استدلال کر کے قرآن کریم کے بوسیدہ اوراق کو نذرِ آتش کرنے کی بھی اجازت دی ہے، لیکن دوسرے علماء نے یہ توجیہ کی ہے کہ انہوں نے جن مصاحف کو نذرِ آتش کیا تھا وہ تمام تر قرآن کریم نہ تھے، بلکہ ان میں تفسیری اضافے وغیرہ بھی درج

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۶ ص:۴۲۲ (طبع ایچ ایم سعید) وفی بریقۃ محمودیۃ ج:۲ ص:۹۹ الکتب التی یستغنی عنھا وفیھا اسم اللہ ... ولا یحرق ... وفی التاتارخانیۃ المصحف الذی خلق وتعذر الانتفاع بہ لا یحرق بل یلف بخرقۃ طاھرۃ ویحفر حفیرۃ ویلحد بلا شق و ... بمکان طاھر لا تصل الیہ ... وفی ... او یحرق ... عن ... ولی ... وبلحد ... لا تحرق ... بعدہ
نیز دیکھئے امداد الفتاوی ج ۴ ص:۵۴، کفایت المفتی ج ۱ ص ۱۱۶، ۱۱۹، امداد المفتیین ص:۲۳۸، وامداد الاحکام ج ۱ ص:۱۵۷، ۴۳۷ (محمد زبیر)

تھے، اگر وہ خالص قرآن ہوتے تو آپ انہیں نذرِ آتش نہ فرماتے، چنانچہ مُلّا علی قاری لکھتے ہیں:

قال ابن حجر: وفعل عثمانؓ يرجح الإحراق وحرقه بقصد صيانته بالكلية لا امتهان فيه بوجه. والقياس على فعل عثمان لا يجوز، لأن صنيعه كان بما ثبت أنه ليس من القرآن أو مما اختلط به اختلاطا لا يقبل الانفكاك، وإنما اختار الإحراق لأنه يزيل الشك في كونه ترك بعض القرآن، إذ لو كان قرآنا لم يجوز مسلم أن يحرقه ويدل عليه أنه لم يؤمر بحفظ رماده من الوقوع في النجاسة. (مرقاة المفاتيح ج ۵ ص:۲۹)(۱)

خلاصہ یہ کہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے اوراق کو جلانے کے بجائے دفن کیا جائے، لیکن چونکہ بعض علماء نے جلانے کی بھی اجازت دی ہے اور اس کا مأخذ بھی ہے، اس لئے اگر کوئی نذرِ آتش کرے تو اسے حرام کہنا بھی مشکل ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۰/۱۰/۱۳۹۷ھ

تلاوت سننے میں قاری کی خوش الحانی کی طرف متوجہ ہونا اور ایک ہی سانس میں کئی آیات پڑھنے کو وجہِ فضیلت سمجھنا

سوال:- آج کل کراچی میں محافلِ قراءت ہو رہی ہیں، جن میں بیرونِ ملک سے قاری صاحبان آتے ہیں اور کلامِ پاک سناتے ہیں، اس پر زید اس طرح تبصرہ کرتا ہے: ''یہ جو آج کل کراچی میں قراءت کی محفلیں منعقد ہو رہی ہیں ان کی شکل بالکل مشاعروں کی طرح ہوتی ہے، جس طرح ایک شاعر اپنا کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کرتا ہے، پھر دُوسرا آتا ہے، اس طرح یہ سلسلہ چلتا ہے، جس شاعر کے کلام پر زیادہ داد ملتی ہے وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا، اور جس کلام پر واہ واہ نہیں ہوتی وہ منہ لٹکائے چلا جاتا ہے اور بہت دلگیر ہوتا ہے۔ کیا قرآنِ پاک جو اللہ کا کلام ہے وہ اس حد تک نعوذ باللہ اُتار دیا جائے کہ لوگ اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کریں اور مائک پر آکر گلے بازیاں کریں اور وہ قاری جس کی آواز اچھی ہو اس پر لوگ جھومنے لگیں، اور جو سادہ پڑھے اس پر لوگ منہ بسورتے رہیں اور اس پر توجہ نہ دیں، کیا یہ قرآن کی بے حرمتی نہیں ہے؟ اگر ایسا شوق ہے تو جمعہ کے دن مساجد میں کسی قاری کو موقع دیا جائے اور لوگ سنیں، اس طرح قرآن کا احترام اور قاری کا احترام باقی رہے گا، مگر اس قسم کے مقابلوں میں لوگ مسلمان ہونے کی حیثیت سے براہِ راست قرآن کو تو کچھ نہیں کہتے مگر ان کے تأثرات سے قرآن کی عظمت کو ٹھیس پہنچتی ہے، جو ایک مسلمان کے حساس قلب کے لئے تکلیف دہ ہے۔''

---

(۱) (طبع مکتبہ امدادیہ، ملتان)

اس قسم کے تبصرے پڑھ کر یہاں بہت سے لوگ بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ اس رائے کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ سب جہالت ہے، اس سے محفلِ قراءت کی مخالفت ہوتی ہے وغیرہ، شرعی حکم کیا ہے؟

جواب – قرآن کریم کی تلاوت اور اس کا سننا کارِ ثواب ہے، البتہ اس میں صرف قاری کی خوش الحانی پر نگاہ رکھنا درست نہیں، اور نہ ایک سانس میں کئی آیتیں پڑھنے کو وجہِ افضلیت قرار دینا درست ہے، اصل نظر قرآن کے مضامین پر ہونی چاہئے، اور جو نہ سمجھ سکیں وہ اس بات کی طرف نظر کریں کہ قرآنِ کریم کا صحیح تلفظ کس طرح ہوتا ہے۔　　واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

بلا شبہ داد دینے اور تعریف کرنے کے لئے تلاوت کرنا سخت منع ہے، اس نیت سے تلاوت کرنے والوں اور داد دینے والوں کے بارے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ان کے قلوب فتنے میں پڑے ہوئے ہوں گے۔

فقال عليه الصلوة والسلام: سيجيء أقوام يقيمونه كما يقام القدح يتعجلونه ولا يتأجلونه، وفي رواية: وسيجيء بعدي قوم يرجعون بالقرآن ترجيع الغناء والنوح لا يجاوز حناجرهم مفتونة قلوبهم وقلوب الذين يعجبهم شأنهم (رواه البيهقي في شعب الايمان) مشكوة ص: ۱۹۱۔ (طبع قدیمی کتب خانہ)۔

اور قرآن شریف کو دنیا کی معاش کا ذریعہ بنانا کب روا ہے، نیتوں کو اللہ خوب جانتا ہے، سب اپنی اپنی نیت کا جائزہ لیں۔　　کتبہ العبد الحقیر

محمد عاشق الٰہی بلند شہری عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

قرآن کریم کو بغیر وضو چھونے کا حکم

سوال – کسی عدالت میں مخالف پارٹی اور ان کے ہمراہ آئے ہوئے آدمی روبرو آفیسر قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر [illegible] بیان دیں، یہ ہمارے دین اسلام میں جائز ہے یا ناجائز (جبکہ ان کا وضو نہ ہو)؟ کیا قرآن شریف پر بیان دینا اور بغیر وضو قرآن شریف کو ہاتھ لگانا جائز ہے؟

وفي مرقاة شرح المشكوة ج ۵ ص۱۲۰، ۱۲۱ اقرؤا القرآن بلحون العرب وأصواتها ... بلا تكلف النغمات [illegible] ... (لا يجاوز حناجرهم) كناية عن عدم القبول ... الخ

جواب:- قرآن شریف کو بغیر وضو کے چھونا بالکل ناجائز ہے،[۱] اور حفظ کرنے اور بیعت دینے کے بارے میں جو باتیں پوچھی گئی ہیں، جب تک معاملے کی پوری تفصیل معلوم نہ ہو اس کا حکم نہیں بتایا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۱/۲۸ الف)

۱:- روزے سے متعلق قرآنی آیتِ مبارکہ
۲:- ماہِ رمضان میں پیش آنے والے اہم واقعات
۳:- حضور ﷺ کا حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دور کرنا

سوال ۱:- اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا، جس طرح پچھلی اُمتوں پر فرض کیا گیا۔ اس کے متعلق قرآن کی کون سی آیت ہے؟

۲- ماہِ رمضان المبارک میں بہت سے واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں، ان میں سے چند واقعات تحریر فرمائیں۔

۳:- رمضان شریف میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تشریف آوری حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روزانہ ہوا کرتی تھی، اس کا کیا مقصد تھا؟

جواب ۱:- وہ آیت یہ ہے "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ"۔ (سورۂ بقرہ، پارہ نمبر۲ آیت ۱۸۳)

۲- غزوۂ بدر، فتحِ مکہ، نزولِ قرآن کریم کی ابتداء، یہ اہم واقعات رمضان میں ہوئے، دُوسرے بہت سے واقعات کے لئے تاریخ کی کتابیں دیکھیں۔

۳- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآنِ کریم کا دور کرتے تھے۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۳/۲۸ ج)

---

(۱) لا یمسّہٗ الا المطھّرون (سورۃ الواقعۃ ۷۹) عن ابن عمر أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یمس القرآن الا طاھر (اعلاء السنن ج ۱ ص ۲۶۸ طبع ادارۃ القرآن) نیز دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۲۰، وتفسیر معارف القرآن ج ۸ ص ۲۸۷۔

(۲) وفی صحیح البخاری ج ۲ ص ۷۴۸ (طبع قدیمی کتب خانہ) باب کان جبریل یعرض القرآن علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، وقال مسروق عن عائشۃ عن فاطمۃ أسرّ الیّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم أن جبریل یعارضنی بالقرآن کل سنۃ وانہ عارضنی العام مرتین ولا أراہ الا حضر أجلی. حدثنا یحیی بن قزعۃ قال حدثنا ابراھیم بن سعد عن الزھری عن عبید اللہ بن عبد اللہ عن ابن عباس قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم أجود الناس بالخیر وأجود ما یکون فی شھر رمضان، لان جبریل کان یلقاہ فی کل لیلۃ فی شھر رمضان حتی ینسلخ یعرض علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم القرآن، فاذا لقیہ جبریل کان أجود بالخیر من الریح المرسلۃ (محمد زبیر حق نواز)

قرآن نہ پڑھے ہوئے شخص کے لئے الفاظ پر صرف اُنگلی پھیرنے کا حکم

سوال:- ہمارے صوبہ پنجاب کے علاقہ بھاولپور میں ایک مولوی واعظ صاحب نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ جو لوگ عدیم الفرصت ہیں جیسے کسان یا عوام الناس دہقان، تاجر یا سوداگر یا مزدور پیشہ لوگ ہوتے ہیں، وہ صبح اُٹھ کر باوضو ہوکر قرآن مجید کھول کر ایک یا دو پارے اوّل سے آخر تک اُنگلیاں پھیرتے چلے جائیں، اس طرح قرآن مجید ختم کریں، جس کا ثواب جتنا قاری عالم کو ہوگا اس سے دُگنا اس اُمّی جاہل کو ثواب ہوگا، حدیث شریف کی تمام کتابوں میں یہ حدیث درج ہے جس حدیث میں دیکھو یہ حدیث ملے گی۔ اب غضب یہ ہوگیا کہ ہمارے علاقے میں یہ رواج اتنا زور پکڑ گیا ہے کہ اکثر عورتوں اور مردوں نے قرآن مجید پڑھنا ترک کردیا ہے، اور اتنی محنت شاقہ کون اُٹھائے؟ پہلے لاکھوں میں سے ایک آدھ، سالہا سال کے بعد فضیلت تلاوت اور ختم قرآن کا ثواب حاصل کرسکتا تھا، اب تو ماشاء اللہ مولوی واعظ نے اللہ کی رحمت کو فیض عام کردیا ہے، کوئی اجڈ، اَن پڑھ ہے وہ اُنگلیاں رکھ کر قاری عالم سے دُگنا ثواب حاصل کررہا ہے، یہ حدیث کی کتاب میں ہے یا نہیں؟

جواب:- ان واعظ صاحب نے یہ بات غلط انداز سے بیان کی ہے، جو لوگ قرآن کریم کی تلاوت کرسکتے ہیں ان کے لئے قرآن کریم کے حروف پر اُنگلی پھیرنا کافی نہیں، ورنہ ایسی کوئی حدیث ہمارے علم میں ہے، البتہ جو ان پڑھ قرآنِ کریم نہیں پڑھ سکتے ان پر لازم ہے کہ قرآنِ کریم ناظرہ کی تعلیم حاصل کریں۔ ہاں! جب تک پڑھنا نہ آئے اس وقت تک اگر وہ قرآنِ کریم کھول کر بیٹھ جایا کریں اور حروف پر اُنگلی پھیر لیا کریں تو اِن شاء اللہ تلاوت کے ثواب سے محروم نہ رہیں گے، اس کا نہ یہ مطلب ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کی تلاوت کرسکتے ہیں وہ بھی یہی کام شروع کردیں، اور نہ یہ کہنا دُرست ہے کہ اس عمل کا ثواب تلاوت سے بھی دُگنا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۷/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۴۳۸/۲۸ ب)

دینیات کی کتابوں کو بغیر وضو چھونے کا حکم

قرآنی آیات کی کثرت والی کتاب کو بغیر وضو چھونا جائز نہیں

سوال ۱:- آج کل مدارس میں دینیات ودیگر کتب کو بغیر وضو چھونا جائز ہے یا نہیں؟

۲- ان کتب کی موجودگی میں استاذ کرسی پر بیٹھ سکتا ہے جبکہ کتب شاگردوں کے پاس نیچے ہوتی ہیں؟

جواب ۱- اگر کتاب میں لکھے ہوئے الفاظ کی اکثریت قرآنی آیات پر مشتمل ہو تو اسے بغیر وضو کے چھونا نہیں چاہئے، اور اگر قرآنی آیات کم ہیں اور دوسری عبارتیں زیادہ تو بغیر وضو چھوا جا سکتا ہے۔[۱]

۲- جن کتابوں میں اللہ رسول کا نام یا قرآنی آیات تحریر ہوں ان سے بلند ہو کر کھڑا ہونا یا بیٹھنا ان کے ادب کے خلاف ہے، اس لئے نشست میں اس کا اہتمام کرنا چاہئے کہ بے ادبی نہ ہو، تاہم ضرورت کے موقع پر گنجائش ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۲۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۵۶۲/۲۲ الف)

قرآنِ کریم حفظ کرنے کے بعد بھول جانے والے کا کیا حکم ہے؟

سوال:- احقر نے قرآن حفظ کیا تھا، مگر نالائقی کی وجہ سے اس کا ورد جاری نہیں رہ سکا، اب صحت کی صورت نظر نہیں آتی، ایسی صورت میں اگر موت آ گئی تو کیا قیامت کے دن اندھا اٹھایا جاؤں گا؟

جواب:- اس سلسلے میں جو حدیث وارد ہوئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ "ما من امرئ يقرأ القرآن ثم ينساه إلا لقي الله يوم القيامة أجذم"[۲] یعنی جو شخص بھی قرآن پڑھے پھر اسے بھلا دے تو وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے جذام کی حالت میں ملے گا۔ ملا علی قاری "ثم ينساه" کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "أي بالنظر عنده وبالغيب عند الشافعي أو المعنى ثم يترك قراءته نسي أو ما نسي" (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۵ ص ۹ کتاب فضائل القرآن)۔[۳] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ وعید اس شخص پر ہے جو ناظرہ پڑھنے کی اہلیت بھی اپنی لاپروائی سے ختم کر دے، لہٰذا آپ یہ عزم رکھیں کہ صحت ہونے پر قرآن کو مکمل طور پر یاد رکھوں گا اور اس کا ورد جاری رکھنے میں جو کوتاہی ہوئی ہو، اس پر اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کرتے رہیں، امید ہے کہ ان شاء اللہ اس وعید سے اللہ تعالیٰ بچا لے گا۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۱/۵ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفي الشامية ج ۱ ص ۱۷۷ إن كان التفسير أكثر لا يكره، وإن كان القرآن أكثر يكره
(۲) مشكوة المصابيح ج: ۱ ص: ۱۹۱ (طبع قديمي كتب خانه)
(۳) مرقاة المفاتيح ج ۵ ص: ۹ (طبع مكتبه امداديه ملتان)

پیشاب سے سورۂ فاتحہ لکھنا سخت حرام ہے

سوال:- محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعض حضرات جا بجا یہ پمفلٹ تقسیم کر رہے ہیں جن میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے علاج کی غرض سے پیشاب سے سورۂ فاتحہ لکھنے کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے، اور آپ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ براہ کرم اس بارے میں وضاحت فرمائیں کہ کیا آپ نے یہ کوئی فتویٰ دیا ہے؟

ابراہیم

۹/رجب ۱۴۲۵ھ

جواب:- میں نے یہ کوئی فتویٰ نہیں دیا، پیشاب یا کسی بھی نجاست سے قرآن کریم کی کوئی آیت لکھنا بالکل حرام ہے، اور میں معاذ اللہ اسے جائز قرار دینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ جن لوگوں نے میری طرف یہ فتویٰ منسوب کیا ہے ان کی تردید کرچکا ہوں، جو ''روزنامہ اسلام'' کی ۱۲/اگست ۲۰۰۴ء کی اشاعت میں شائع ہوچکی ہے، میری جس کتاب کا حوالہ میری طرف منسوب کرکے دیا جا رہا ہے، اس کی حقیقت بھی میں نے اپنی تردید میں واضح کردی ہے، اس کے باوجود جو لوگ اس فتوے کو میری طرف منسوب کر رہے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ سے، اور کسی پر بہتان لگانے سے ڈرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۹/رجب ۱۴۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۷۳۰/۴۷)

﴿کتاب التفسیر وما یتعلق بالقرآن﴾

(قرآنِ کریم کے ترجمہ اور تفسیر سے متعلق مسائل کا بیان)

"اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ" الآیۃ
کے مفہوم ومعنی کی تحقیق

سوال:- سورۂ آل عمران کی آیت ۲۳ میں ہے "اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتٰبِ اللہِ"۔

اشکال یہ ہے کہ یہاں "اُوتوا الکتب" کے بجائے "اُوْتُوْا نصیبًا مِّنَ الْکتب" کیوں فرمایا گیا؟ "الکتب" اور "کتب اللہ" سے کیا مراد ہے؟ کیا "نصیبا" فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس تحریفت کے بعد کتاب کے بجائے "نصیبا من الکتب" ہی بچا تھا؟ یا یہ کہ "الکتب" تو صرف قرآن ہے اور باقی اہلِ کتاب کو اس کا کچھ حصہ عطا ہوا تھا۔

حضرت سے بیانِ مفصل کی درخواست ہے، اس ناچیز نے "تسہیل" میں یوں لکھ دیا "کتابِ الٰہی تو ایک ہے، (الکتب پر الف لام جنس ہے)، اس کا ایک حصہ تورات کی شکل میں یہود کو، دُوسرا حصہ انجیل کی شکل میں نصاریٰ کو، اور مکمل کتاب قرآن کی شکل میں مسلمانوں کو عطا کی گئی ہے۔" کیا یہ تعبیر صحیح ہے؟

محتاجِ دُعا: محمد اسلم شیخوپوری

جواب:- مکرمی جناب مولانا محمد اسلم شیخوپوری صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، اس آیت کریمہ کی معروف تفسیریں دو ہیں۔ ایک یہ کہ "نصیبا من الکتب" میں "من" بیانیہ ہے،(۱) جس کا حاصل یہ ہے کہ "اُوتوا نصیبا" کے معنی یہ ہیں کہ ان کو نعمتوں کا ایک بڑا حصہ دیا گیا، پھر "کتب" اس حصے کا بیان ہے، جس سے مراد تورات ہے۔

دُوسری تفسیر یہ ہے کہ "من" تبعیضیہ ہے،(۲) اور "الکتب" سے مراد "توراۃ" ہی ہے، لیکن "ایتاء" سے مراد اس کی فہم عطا کرنا ہے، اور چونکہ کتابِ الٰہی کی مکمل فہم کسی انسان کے لئے ممکن نہیں، اس لئے اس کو "نصیبا من الکتب" سے تعبیر کیا گیا، یعنی فہم کا ایک حصہ عطا کیا گیا ہے، البتہ "من" تبعیضیہ ہونے کی صورت میں "الکتب" سے مراد بعض حضرات نے لوحِ محفوظ بھی لی ہے، اور بعض

(۱،۲) وفی تفسیر روح المعانی ج ۳ ص ۱۰۱ (طبع مکتبہ رشیدیہ لاہور) ومن اما للتبعیض واما للبیان علی معنی (نصیبًا) هو الکتب او نصیبًا منه لان الوصول الی کنه کلامه تعالی متعذر فان جعل بیانا کان المراد انزال الکتاب علیهم وان جعل تبعیضا کان المراد ادراک بعضهم فهم ما فیه وعلی التقدیرین اللام فی (الکتب) للعهد والمراد به التوراة وهو المروی عن کثیر من السلف، والتنوین للتکثیر وجوز ان یکون اللام فی (الکتب) للعهد والمراد به اللوح، وان یکون للجنس ... الخ وراجع ایضًا التفسیر المظهری ج ۲ ص ۲۷ ،طبع بلوچستان بک ڈپو) (محمد زبیر حق نواز)

حضرات نے جنس کتاب، اگر جنس کتاب مراد لی جائے تو اگرچہ اس میں تمام دنیا کی کتابیں شامل ہوں گی، لیکن سیاق اللہ تعالیٰ کی کتابوں کا ہے۔ اس لئے آپ نے جو تعبیر اختیار کی کہ کتاب ابھی تو ایک ہی ہے، اس کا ایک حصہ تورات کی شکل میں بنی اسرائیل کو عطا کیا گیا، یہ تعبیر بھی درست ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ کہنا کہ چونکہ انہوں نے کتاب میں تحریفات کر لی تھیں، اس لئے کتب کے بجائے "نصیبا من الکتب" کہا گیا، علاوہ اس کے کہ کہیں منقول نہیں دیکھا، فی نفسہ بھی درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ "ایتاء" تو غیر محرف تورات کا ہوا تھا، بعد میں تحریف ان کا اپنا عمل ہے، اور آیت کریمہ کے پہلے حصے میں بیان اللہ تعالیٰ کے انعام کا ہے، ان کے اپنے فعل کا نہیں۔ ان کا اپنا فعل بعد میں "ثم یتولی" سے مذکور ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم

بقلم: عبداللہ میمن

۱۴۲۲/۶/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۵/۴۹۲)

عالمِ دین کا تفسیر سنانا

سوال:- عالم محقق کا تفسیر سنانا اور سننا درست ہے یا نہیں؟

جواب:- بلاشبہ جائز ہے۔

فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۳۶ الف)

قیامت کے وقت کی تعیین سے متعلق قرآنی آیت پر ایک سوال کا جواب

سوال:- اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: "یہ لوگ (منکر) آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے اس کی خبر تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضورؐ کو قیامت کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرب قیامت کی علامات حضورؐ سے مروی ہیں، اور علمائے دین نے بھی قیامت کے متعلق بہت سی کتابیں تحریر فرمائی ہیں، جبکہ آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سلسلے میں علم نہیں تھا، تو قیامت کی علامات کیسے زیر

فرمادی گئیں؟

جواب:- مذکورہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا صحیح صحیح وقت کہ وہ کب اور کس دن آئے گی، سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، البتہ قربِ قیامت کی علامتیں خود قرآن کریم نے بتلائی ہیں اور وحیٔ الٰہی کے ذریعہ باخبر ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بتلائی ہیں، چنانچہ صحیحین[1] کی مشہور حدیث میں مروی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انسان کی شکل میں آکر کچھ سوالات کئے، ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ آپ مجھے قیامت کے بارے میں بتایئے (کہ وہ کب آئے گی)، اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس بارے میں، میں خود سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پوچھا کہ اچھا! مجھے قیامت کی کچھ علامتیں بتایئے، تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی علامتیں بتادیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۳۳/۲۸ ج)

پکتھال کے انگریزی ترجمے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل انگریزی ترجمۂ قرآنِ کریم کے مطالعے کے متعلق کہ جسے ادارہ معارفِ اسلامی، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد نے چھاپا ہے جس کے مترجم ایک انڈونیشیا کے نومسلم ہیں جن کا نام درج ذیل ہے:

Muhammad Marmaduke Pickthall

ان کے انگریزی ترجمے کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- پکتھال کے انگریزی ترجمے میں متعدد مقامات پر غلطیاں بھی ہیں، لیکن بحیثیتِ مجموعی اسے استعمال کیا جاسکتا ہے، البتہ اب تک کے شائع شدہ انگریزی تراجم میں لعل محمد چاولہ کا ترجمہ نسبتاً سب سے بہتر ہے جو اسلامک پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے۔ نیز سب سے بہتر ترجمہ وہ ہے جو معارف القرآن انگریزی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، مگر ابھی وہ زیرِ تکمیل ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۲۱/۶/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۳۵/۱۷)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان والاسلام والاحسان وعلم الساعۃ ... الخ ج:۱ ص:۱۲ (طبع قدیمی کتب خانہ کراچی)

تفسیر معارف القرآن میں ”اِلَّا کُنَّا عَلَیۡکُمۡ شُہُوۡدًا“ الآیۃ کے ترجمے کی تحقیق

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ اس وقت معارف القرآن جلد نمبر۴ پیشِ نظر ہے، سورۂ یونس رکوع نمبر۷ کی پہلی آیت میں ”اِلَّا کُنَّا عَلَیۡکُمۡ شُہُوۡدًا“ کا ترجمہ ”کہ ہم نہیں حاضر ہوتے تمہارے پاس“ سمجھ میں نہیں آرہا، ناقص فہم میں یہی آتا ہے کہ اگر لفظ ”نہیں“ نہ ہو تو ترجمہ صاف اور بے غبار ہو جائے گا، جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں مثبت ترجمہ کیا ہے: ”ہم کو سب کی خبر رہتی ہے۔“

چونکہ معارف القرآن کا ترجمہ حضرت شیخ الہند کا ہے تو احقر نے تفسیر عثمانی مطبوعہ سعودی عرب کو دیکھا تو اس میں بھی وہی معارف القرآن والا ترجمہ درج ہے۔

از راہِ کرم وضاحت فرمادیں تو عنایت بے نہایت ہوگی۔

جواب:- ”وَمَا تَکُوۡنُ فِیۡ شَاۡنٍ وَّمَا تَتۡلُوۡا مِنۡہُ مِنۡ قُرۡاٰنٍ وَّلَا تَعۡمَلُوۡنَ مِنۡ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیۡکُمۡ شُہُوۡدًا“ الآیۃ۔

ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ: اور نہیں ہوتا تو کسی حال میں اور نہ پڑھتا ہے اس میں سے کچھ قرآن اور نہیں کرتے ہو تم لوگ کچھ کام کہ ہم نہیں ہوتے حاضر تمہارے پاس۔

ترجمہ حضرت تھانویؒ: اور آپ خواہ کسی حال میں ہوں اور آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں اور تم جو کام بھی کرتے ہو، ہم کو سب کی خبر رہتی ہے۔[۲]

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے میں گو موجودہ محاورے کے اعتبار سے کچھ اغلاق ہے، لیکن ترجمہ بہرحال صحیح ہے، اس لئے کہ عربی میں استغراق پر دلالت کرنے کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ پہلے نفیِ عام لائی جائے (جو عموماً نکرہ تحت النفی کی صورت میں ہوتی ہے)، پھر استثناء لایا جائے، جیسے یہ بتانا ہو کہ ”ہر نبی معصوم ہے“ یوں کہیں کہ ”ما من نبی الا وھو معصوم“ ایسی تعبیرات کا اردو میں ترجمہ عموماً دو طرح ہوسکتا ہے، ایک یہ کہ استغراق والا مثبت جملہ ذکر کردیا جائے جیسے مذکورہ مثال کا ترجمہ یوں کیا جائے: ”جو نبی بھی ہوتا ہے وہ معصوم ہوتا ہے“۔ دوسرا یہ کہ استثناء سے پہلے والے جملے کا ترجمہ نفی سے کرکے استثناء کے بعد والے جملے کو بصورتِ نفی اس کی صفت بنادیا جائے، جیسے ”کوئی نبی ایسا نہیں جو معصوم نہ ہو“۔ حضرت تھانویؒ کا ترجمہ پہلے طریقے کے مطابق ہے، اور حضرت شیخ الہندؒ کا

---

(۱) ترجمہ شیخ الہند، تفسیر عثمانی (طبع دار...) ص ۲۷۰۔   (۲) بیان القرآن ج۵ ص ۲۰ (طبع ایچ ایم سعید کمپنی)۔

دُوسرے طریقے سے۔ اس میں اغلاق کی وجہ حرفِ نفی نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ اس ترجمے میں موصوف اور صفت کو لفظ ''کہ'' کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے، جبکہ آج کل عموماً یہ ربط ''جو''، ''جس'' وغیرہ کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ ''وَمَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیْکُمْ شُھُوْدًا'' کے ترجمے میں لفظ ''کہ'' کی جگہ ''جس پر'' وغیرہ لفظ رکھ کر دیکھئے، انشاء اللہ بات واضح ہوجائے گی۔

باقی اگر ''ہم نہیں حاضر ہوتے'' سے حرفِ نفی حذف کردیا جائے تو احقر کے ناقص فہم کے مطابق ترجمہ غلط ہوجائے گا، یہ ایسے ہی ہوگا جیسے اُوپر ذکر کردہ مثال کا ترجمہ یوں کیا جائے: ''کوئی نبی یہ نہیں جو معصوم ہو'' اسی طرح یہاں حرفِ نفی حذف کرنے سے ترجمے کا حاصل یہ نکلے گا کہ تم کوئی عمل ایسا نہیں کرتے جس پر ہم حاضر ہوتے ہوں۔

واللہ اعلم بالصواب

محمد زاہد فیصل آبادی

حال وارد دارالعلوم کراچی ۱۴

یہ جواب احقر کی ہدایت پر لکھا گیا ہے، اور احقر کی نظر میں دُرست ہے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۱۴/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱/۱۴۲)

مُعوّذتین کے قرآنِ کریم کا حصہ ہونے سے متعلق حضرت ابنِ مسعودؓ کے عقیدے کی مفصل تحقیق

سوال:- ایک مشہور تفسیرِ قرآن میں مُعوّذتین (سورۂ فلق والناس) کی قرآنیت کے متعلق بحث نے میرے ذہن کو کافی حد تک پریشان و پراگندہ کردیا ہے، اور اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ سرے سے قرآن ہی کے غیرمحرف ہونے کا ایمان نہ متزلزل ہوجائے۔ اس تفسیر میں بے شمار روایات و احادیث کے حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مُعوّذتین کو قرآن کی سورتیں نہیں مانتے تھے اور اسی لئے انہوں نے ان کو اپنے مصحف سے بھی ساقط کردیا تھا۔ بعض روایت میں اضافہ ہے کہ وہ ان سورتوں کو نماز میں بھی نہیں پڑھتے تھے۔ مفسرِ محترم نے ان روایات کو صحیح قرار دیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ یہ رائے صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی رائے تھی جو اجتہادی غلطی تھی، لہٰذا ان کی رائے کو باقی صحابہؓ کے اجماع کے مقابلے میں رَدّ کیا جاسکتا ہے۔ اس بحث سے کم از کم میں مطمئن نہیں ہوسکا، اس لئے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات کا طالب ہوں:-

۱- قرآن کی کسی آیت کا انکار کرکے آیا کوئی شخص مسلمان بھی رہ سکتا ہے؟ درآنحالیکہ یہ انکار

کتنی ہی معصومیت سے کیا جائے؟ اگر نہیں تو حضرت عبداللہؓ کے متعلق آپ کی اور دُوسرے محققین کی کیا رائے ہے؟

۲- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آخر ان سورتوں کا کیوں انکار کیا؟ یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہوسکتا ہے کہ ابن مسعودؓ کو ان کی خبر نہ پہنچ سکی ہو، کیونکہ جیسا کہ ابن حجرؒ نے بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ یہ سورتیں دورِ اوّل ہی سے متواتر تھیں اور نازل بھی مکی دور میں ہوئی ہیں، اتنے عرصے تک ابن مسعودؓ بے خبر نہیں رہ سکتے، اس دور کے مسلمانوں کا یہ طریقہ بھی تھا کہ ان تک وحی خبر متواتر کے ذریعہ پہنچے، اور وہ اس بحث میں اُلجھ پڑیں کہ مجھے تو معلوم نہیں، لہٰذا یہ قرآن نہیں ہے۔ اور پھر یہ امر بھی معلوم ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہدِ مبارک میں تو ان سورتوں کا خبرِ متواتر ہونا مخفی نہیں رہ سکتا تھا اور موجودہ قرآن کی صحت پر تو صحابہ کرامؓ کا اجماع بھی ہوچکا تھا۔ ان حالات میں حضرت ابن مسعودؓ ناواقف نہیں رہ سکتے تھے، پھر انہوں نے ان سورتوں کا کیوں انکار کیا؟

۳- عاصم، حمزہ، کسائی اور خلف جو مشہور قراء میں سے ہیں ان کی سند پر تمام اُمت کا اتفاق ہے، ان چاروں نے اس قرآن کی سند، جسے اب ہم آپ پڑھتے ہیں اور جس میں معوّذتین بھی شامل ہیں، ابنِ مسعودؓ تک پہنچائی ہے، لیکن ابن مسعودؓ سے منسوب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلۂ اسناد غلط ہے، کیونکہ اس قرآن میں مُعوّذتین شامل ہیں اور وہ ان کے منکر تھے، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ قرآن میں یہ سورتیں الحاقی ہیں۔ ابنِ مسعودؓ کے شاگردوں نے کم از کم ایک دفعہ تو ان پر جھوٹ گھڑا ہے، باقی قرآن کے متعلق بھی اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنا حصہ الحاقی ہوگا اور کتنا وہ حصہ ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، ان احادیث سے قرآن کی قطعیت متأثر نہیں ہوجاتی؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ مجھے دس بارہ دن پہلے مل گیا تھا، جواب میں تاخیر اس لئے ہوئی کہ آپ کا جواب قدرے تفصیل کا طالب تھا، اور مجھے ہجوم مصروفیات میں اتنا وقت نہ مل سکا کہ فوراً جواب لکھوں۔ بہرکیف! اب آپ کے سوالات کا جواب پیشِ خدمت ہے، خدا کرے کہ یہ جواب آپ کی تشفی کرسکے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی پوری اُمت کی طرح معوّذتین کو قرآن کا جزء مانتے تھے، اور جن روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان کو قرآن کا جزء نہیں مانتے تھے، وہ دُرست نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن کریم کی جو متواتر قراءتیں منقول ہیں ان میں مُعوّذتین شامل ہیں۔

قراءتِ عشرہ میں سے عاصم کی قراءت حضرت ابوعبدالرحمن سلمیؒ، حضرت زر بن حبیشؒ اور

حضرت ابوعمرو الشیبانیؒ سے منقول ہے، اور یہ تینوں اسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کرتے ہیں، (دیکھئے النشر فی القراءات العشر لابن الجزری ج۱ ص۱۵۶)۔[۱] اسی طرح حمزہ کی قراءت علقمہ، اسود، ابن وہبؒ، عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں۔ (ایضاً ج۱ ص۲۶)۔[۲] اس کے علاوہ قراءات عشرہ میں سے کسائیؒ اور خلفؒ کی قراءتیں بھی بالآخر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر منتہی ہوتی ہیں، کیونکہ کسائیؒ، حمزہؒ کے شاگرد ہیں، اور خلفؒ ان کے شاگرد کے شاگرد ہیں، اور اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ قراءات عشرہ کی اسانید ساری دنیا میں سب سے زیادہ قوی و مستحکم اسانید ہیں اور نسلاً بعد نسل تواتر کے ساتھ نقل ہوتی چلی آرہی ہیں، (فیض الباری ج۴ ص۲۶۲)۔[۳] اس سے اگر کوئی خبر واحد ان متواتر قراءتوں کے خلاف ہو تو وہ یقیناً واجب الرد ہے اور اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اسی بناء پر محقق علماء و محدثین کی اکثریت نے ان روایتوں کو ضعیف، موضوع یا کم از کم ناقابل قبول بتایا ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف یہ باطل مذہب منسوب کرتی ہیں، چند اقوال ذیل میں پیش خدمت ہیں

۱- شیخ الاسلام علامہ نوویؒ جو جلیل القدر محدثین میں سے ہیں شرح مہذب میں تحریر فرماتے ہیں۔

أجمع المسلمون على أن المعوذتين والفاتحة من القرآن، وأن من جحد منها شيئاً كفر، وما نقل عن ابن مسعودؓ باطل ليس بصحيح (بحوالہ اتقان ج۱ ص۸۰)۔[۴]

"مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ معوذتین اور فاتحہ قرآن کریم کا جزء ہیں، اور اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کا بھی انکار کرے تو وہ کافر ہو جائے گا، اور اس سلسلے میں حضرت ابن مسعودؓ سے جو کچھ منقول ہے وہ صحیح نہیں۔"[۵]

۲:- علامہ ابن حزمؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وكل ما روي عن ابن مسعود من أن المعوذتين وأم القرآن لم تكن في مصحفه فكذب موضوع، لا يصح وإنما صحت عنه قراءة عاصم عن زر بن حبيش عن ابن مسعود وفيها أم القرآن والمعوذتان. (المحلى لابن حزم ج۱ ص۱۳، طبع دمشق و مصر)

---

(۱) النشر في القراءات العشر لابن الجزري ج۱ ص۱۵۵ (مطبع مصطفى محمد، مصر)

(۲) ج۱ ص۱۶۵ (مطبع مصطفى محمد، مصر)

(۳) وفي فيض الباري قبيل كتاب فضائل القرآن ج۴ ص۲۶۲ طبع مكتبه حقانيه پشاور: وعلم أن سند الكسائي ينتهي إلى ابن مسعود، لأنه قرأ على حمزة ومنه ينتهي سند خلف الذي من العشرة إلى ابن مسعود فإنه قرأ على سليم وهو على حمزة وإسناد القراء العشرة أصح الأسانيد بإجماع الأمة وتلقى الأمة له بقبولها.

(۴) دیکھئے الإتقان في علوم القرآن ج۱ ص۸۰ طبع مكتبه نزار مصطفى الباز مكة المكرمة وكذا في فيض الباري ج۴ ص۲۶۲ (طبع مكتبه حقانيه پشاور)

(۵) دیکھئے الاتقان فی علوم القرآن ج۱ ص۲۱۲ (طبع ادارۂ اسلامیات ۱۴۰۲ھ بمطابق ۱۹۸۲ء)

''وہ تمام روایت جن میں کہا گیا ہے کہ معوّذتین اور سورۂ فاتحہ حضرت ابن مسعودؓ کے مصحف میں نہیں تھیں، وہ جھوٹی اور من گھڑت ہیں، بلکہ ان سے قراءت عاصم ثابت ہے جو زر بن حبیش سے منقول ہے اور اس میں معوّذتین بھی ہیں اور فاتحہ بھی۔''

۳- امام فخر الدین رازی اور قاضی ابوبکر بن عربی نے بھی اس روایت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔　　(المحلی لابن الحزم ج:۱ ص:۱۳ مطبوعہ دمشق سنہ ۱۳۴۷ھ)

۴- علامہ بحر العلوم تحریر فرماتے ہیں:-

فنسبة إنكار كونهما من القرآن اليه غلط فاحش. ومن أسند الانكار الى ابن مسعود فلا يعبأ بسنده عند معارضة هذه الأسانيد الصحيحة بالاجماع والمتلقاة بالقبول عند العلماء الكرام بل والأمة كلها كافة، فظهر أن نسبة الانكار الى ابن مسعود باطل.

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو معوّذتین کے جزء قرآن ہونے کا منکر بتانا نہایت فحش غلطی ہے، اور جس شخص نے اس انکار کی نسبت ان کی طرف کی ہے اس کی سند ان اسانید کے مقابلے میں ناقابلِ اعتبار ہے جو اجماعی طور پر صحیح ہیں اور جنہیں علمائے کرام بلکہ پوری امت نے قبول کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی طرف انکار کی نسبت باطل ہے۔''

(بحر العلوم شرح مسلم الثبوت ج:۲ ص:۲)

۵- مصر کے علمائے متأخرین کے سرخیل علامہ زاہد الکوثریؒ لکھتے ہیں -

ومن زعم أنه لم يكن في مصحفه الفاتحة والمعوذتان أو أنه كان يحك المعوذتين فكاذب قصدا أو واهم من غير قصد، والمعوذتان موجودتان في قراءة ابن مسعود المتواترة عنه بطريق أصحابه، وكذلك الفاتحة، وقراءته هي قراءة عاصم المتواترة التي يسمعها المسلمون في مشارق الارض ومغاربها في كل حين وفي كل الطبقات، وأنى يناهض خبر الآحاد الرواية المتواترة، وقد أخذ ابن حزم الرد على تقولات المتقولين في هذا الصدد في كثير من مؤلفاته

''اور جس شخص کا یہ خیال ہو کہ حضرت ابن مسعودؓ کے مصحف میں فاتحہ اور معوّذتین نہیں تھیں یا وہ معوّذتین کو مصحف سے مٹا دیا کرتے تھے تو وہ شخص یا تو جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے یا غیر شعوری طور پر وہم میں مبتلا ہے، کیونکہ معوّذتین اسی طرح سورۂ فاتحہ حضرت ابن مسعودؓ کی اس قراءت میں موجود ہیں جو ان کے شاگردوں کی سند سے متواتراً منقول ہے۔ اور ان کی قراءت عاصم کی وہ مشہور قراءت

( ) فواتح الرحموت ج:۲ ص:۳ (طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان)

ہے جسے مشرق ومغرب کے تمام مسلمان ہر زمانے اور ہر طبقے میں نقل کرتے چلے آئے ہیں، اور یہ اخبارِ آحاد اس متواتر قراءت کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہیں؟ اور علامہ ابن حزمؒ نے اپنی متعدد کتابوں میں اس قسم کے اقوال کی بڑی اچھی تردید کی ہے۔" (مقالات الکوثری ص ۱۲)(۱)

یہ چند اقوال صرف نمونے کے لئے پیش کئے گئے ہیں، ورنہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے محقق علماء نے ان روایات کو صحیح ماننے سے انکار کیا ہے۔

اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ اور علامہ نورالدین ہیثمیؒ نے تصریح کی ہے کہ ان روایتوں کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۶۰۳(۲) ومجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۴۹)(۳)

پھر ان روایتوں کو غیر صحیح کیسے کہا جاسکتا ہے؟ لیکن جو حضرات علم حدیث سے واقف ہیں، ان پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ صرف راویوں کا ثقہ ہونا کسی روایت کے صحیح ہونے کے لئے کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں کوئی علت یا شذوذ نہ پایا جائے۔ تمام محدثین نے "حدیث صحیح" کی تعریف میں یہ بات لکھی ہے کہ وہ روایت ہر قسم کی علت اور شذوذ سے خالی ہو۔ چنانچہ اگر کسی روایت میں کوئی علت یا شذوذ پایا جاتا ہو تو راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود اس کو صحیح قرار نہیں دیا جاتا۔ حافظ ابن الصلاحؒ اپنے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:-

فالحديث المعلل هو الحديث الذي اطلع فيه على علة تقدح في صحته مع أن الظاهر السلامة منها ويتطرق ذلك إلى الإسناد الذي رجاله ثقات الجامع شروط الصحة من حيث الظاهر ويستعان على إدراكها بتفرد الراوي وبمخالفة غيره له مع قرائن تنضم إلى ذلك تنبه العارف بهذا الشأن. (بحوالہ مقدمہ فتح الملہم ج ۱ ص ۵۴)(۴)۔

"پس حدیث معلل وہ حدیث ہے جس میں کوئی ایسی "علت" معلوم ہوئی ہو جو اس حدیث کی صحت کو مجروح کرتی ہو، باوجودیکہ ظاہری نظر میں وہ حدیث صحیح سالم معلوم ہوتی ہو، اور یہ "علت" اس سند میں بھی واقع ہوجاتی ہے جس کے راوی ثقہ ہوتے ہیں اور جس میں بظاہر صحت کی تمام شرائط موجود ہوتی ہیں، اور اس علت کا ادراک علم حدیث میں بصیرت رکھنے والوں کو مختلف طریقوں سے ہوجاتا ہے، کبھی راوی کو متفرد دیکھ کر، اور کبھی یہ دیکھ کر کہ وہ راوی کسی دوسرے راوی کی مخالفت کررہا ہے اور اس کے ساتھ کبھی دوسرے قرائن بھی مل جاتے ہیں۔"

(۱) (مطبع ایچ ایم سعید)
(۲) فتح الباری ج ۸ ص ۷۴۳ (مطبع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور)
(۳) (مطبع دار الکتاب العربی، بیروت لبنان)
(۴) فتح الملہم ج ۱ ص ۱۴۶ (طبع مکتبۃ دارالعلوم کراچی)

حدیث کی ایک قسم "شاذ" ہے، اس کے راوی بھی ثقہ ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ اپنے سے زیادہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرتے ہیں اس لئے ان کی حدیث قبول نہیں کی جاتی۔

لہٰذا جن روایتوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ وہ معوّذتین کو قرآن کریم کا جزء نہیں مانتے تھے، علامہ نوویؒ اور ابن حزمؒ وغیرہ نے ان کو، راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود مندرجہ ذیل تین وجوہ سے قابلِ قبول نہیں سمجھا:-

۱:- یہ روایتیں معلول ہیں اور ان کی سب سے بڑی علت یہ ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ان قراءتوں کے خلاف ہیں جو ان سے بطریقِ تواتر منقول ہیں۔

۲- مسند احمد کی وہ روایت جس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ صریح قول نقل کیا گیا ہے کہ "انھما لیستا من کتاب اللہ" (معوّذتین اللہ کی کتاب کا جزء نہیں ہیں) صرف عبدالرحمٰن بن یزید نخعی سے منقول ہے، اور کسی نے صراحۃً ان کا یہ جملہ نقل نہیں کیا۔ (دیکھئے مجمع الزوائد للہیثمی ج ۷ ص ۱۴۹(۱)، والفتح الربانی ج ۱۸ ص ۳۵۱، ۳۵۲(۲))

اور متواترات کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ جملہ یقیناً شاذ ہے، اور محدثین کے اُصول کے مطابق "حدیثِ شاذ" مقبول نہیں ہوتی۔

۳:- اگر بالفرض ان روایتوں کو صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی بہر حال یہ اخبارِ آحاد ہیں اور اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ جو خبرِ واحد متواترات اور قطعیات کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو قراءتیں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں ان کی صحت قطعی ہے، لہٰذا ان کے مقابلے میں یہ اخبارِ آحاد یقیناً واجب الرد ہیں۔

اب صرف ایک سوال رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ روایتیں صحیح نہیں ہیں تو ان ثقہ راویوں نے ایسی بے اصل بات کیونکر روایت کردی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان روایتوں کی حقیقت یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ معوّذتین کو قرآن کریم کا جزء تو مانتے ہوں لیکن کسی وجہ سے انہوں نے اپنے مصحف میں ان کو نہ لکھا ہو۔ اس واقعے کو روایت کرتے ہوئے کسی راوی کو وہم ہوا اور اس نے اسے اس طرح روایت کردیا کہ وہ انہیں سرے سے جزءِ قرآن ہی نہیں مانتے تھے، حالانکہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ معوّذتین کو جزءِ قرآن ماننے کے باوجود انہوں نے اپنے مصحف میں ان کو نہیں لکھا تھا، ورنہ لکھنے کی وجوہ بہت سی ہوسکتی ہیں، مثلاً علامہ زاہد الکوثریؒ نے فرمایا ہے کہ انہوں نے معوّذتین کو

---

(۱) (مطبع دار الکتاب العربی، بیروت لبنان)

(۲) ناشر احمد عبدالرحمٰن، البنا الساعاتی

اس لئے نہیں لکھا کہ ان کے بھولنے کا کوئی ڈر نہ تھا، کیونکہ یہ ہر مسلمان کو یاد ہوتی ہیں۔ (مقدمات المعوذتین ص ۲)[1]۔

اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ بھی نہیں لکھی تھی، اور امام ابوبکر الانباریؒ نے اپنی سند سے روایت کی ہے کہ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ "لو کتبتھا لکتبتھا مع کل سورۃ" (اگر میں سورۂ فاتحہ لکھتا تو اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا)۔ امام ابوبکر فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ہر سورت سے پہلے سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، اس لئے ہر سورت کا افتتاح فاتحہ سے ہونا چاہئے۔ لہٰذا حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں نے اسے نہ لکھ کر اختصار سے کام لیا اور مسلمانوں کے حفظ پر اعتماد کیا[2]۔

بہرکیف اگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ اور معوذتین تحریر نہ فرمائی ہوں تو اس کی بہت سی معقول توجیہات ہوسکتی ہیں، اور ان سے یہ سمجھنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ ان کو قرآنِ کریم کا جز نہیں مانتے تھے، جبکہ ان سے تواتر کے ساتھ پورا قرآن ثابت ہے۔

اس تحقیق کے بعد آپ کے تمام سوالات کا جواب ہوجاتا ہے، کیونکہ وہ اس قصے کو صحیح قرار دینے پر مبنی ہے۔

یہ مکتوب احقر نے حضرت والد صاحب مدظلہم کو بھی سنادیا تھا، انہوں نے بھی اس کی تائید و تصدیق فرمائی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۲/۷/۱۳۹۳ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷ ۲۴ د)

"اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ" کی تفسیر

سوال:- محترمی جناب مفتی صاحب! مہربانی فرماکر اس آیت کا خلاصۂ تفسیر تحریر فرمادیں "اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ"۔

جواب:- اس آیت کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کو بھی موت آنی ہے اور ان کو بھی۔" آیت کا سیاق و سباق یہ ہے کہ مشرکین کے عقیدۂ شرک کا ابطال کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپؐ میں اور ان مشرکین میں جو اختلاف ہے اس کا فیصلہ دونوں کی وفات

---

(۱) (مطبع ایچ ایم سعید)
(۲) تفسیر القرطبی ج:۱ ص ۱۴ ، ۱۱۵ (مطبع دار الکتاب العربی للطباعۃ والنشر ۱۳۸۷ھ - ۱۹۶۸ء انتشارات ناصر خسرو، ایران)

کے بعد یقینی طور پر ہو جائے گا، جب مومن وکافر سب بارگاہ الٰہی میں جمع ہوں گے تو ان مشرکین کو خود پتہ چل جائے گا کہ وہ کتنی غلطی پر تھے۔[1]

یہ اس آیت کا خلاصہ تفسیر ہے، یہ آیت حیات انبیاء کے عقیدے کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ انبیاء کی اور عام انسانوں کی موت میں یہ فرق ہوتا ہے کہ انبیاء کی روح کا تعلق ان کے اجسام کے ساتھ عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ باقی رہتا ہے، اس لئے ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، اور ان کی ازواج مطہرات سے ان کے بعد کسی کے لئے نکاح جائز نہیں ہوتا، اور اسی لئے اس آیت میں دونوں کی موت کو الگ الگ ذکر فرمایا گیا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۱۰/۵ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۰۹ ۲۲ ب)

"تفہیم القرآن" کا بغیر تنقید کے مطالعہ کرنا

سوال:- مولانا مودودی کی تفسیر "تفہیم القرآن" بغیر کسی تنقید کے پڑھنا پڑھانا کیسا ہے؟

جواب:- "تفہیم القرآن" میں بہت سی باتیں جمہور کے مسلّمات و اقوال کے خلاف ہیں، اس لئے اسے بقولِ سائل بلا تنقید پڑھنا پڑھوانا درست نہیں ہے۔ درسِ قرآن کے لئے حضرت تھانویؒ یا علامہ عثمانیؒ کی مستند تفاسیر سے استفادہ کیا جائے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
یکم ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۴ ۱۸ الف)

سب سے پہلی تفسیر کون سی ہے؟

سوال:- کسی صاحب نے "ابلاغ" میں لکھا ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے سب سے پہلے قرآن پاک کی تفسیر لکھی ہے۔ میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ علامہ ذہبی کے بیان کے مطابق فن تفسیر میں سب سے پہلے حضرت سعید بن جبیرؓ نے کتاب لکھی ہے، اور مؤرخ ابن خلکان کے بیان کے مطابق ابن جریجؒ متوفی سنہ ۵۰ ھ نے سب سے پہلے تفسیر لکھی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ متوفی سنہ ۲۸ھ نے بھی ایک تفسیر لکھی تھی۔ جناب سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں اپنی تحقیق

(۱) دیکھئے خلاصہ تفسیر معارف القرآن ج ۷ ص ۵۵۵۔

ہونے کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

جواب:- جہاں تک ہماری معلومات رہنمائی کرتی ہیں، حضرت ابی بن کعبؓ ہی سب سے پہلے صاحب تصنیف مفسر ہیں۔ صحابہ کرامؓ میں سے بہت سے حضرات تفسیر کا درس دیا کرتے تھے، لیکن کسی کی تفسیر کا کتابی شکل میں مدون ہونا ثابت نہیں ہے، اور حضرت ابی بن کعبؓ کے بارے میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وأما أبي بن كعب فعنه نسخة كبيرة يرويها أبو جعفر الرازي عن الربيع بن أنس عن أبي العالية عنه وهذا إسناد صحيح، وقد أخرج ابن جرير وابن أبي حاتم منها كثيرا، وكذا الحاكم في مستدركه وأحمد في مسنده (الاتقان ج ۲ ص ۱۸۹، حجری قاهرة سنة ۱۳۱۸ هـ)

ترجمہ: "رہے حضرت ابی بن کعبؓ تو ان سے ایک بڑا نسخہ منقول ہے، جسے ابوجعفر رازی، ربیع بن انس عن ابی العالیہ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں، اور یہ سند صحیح ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اس نسخے سے بہت سی روایات لی ہیں، اسی طرح حاکم نے مستدرک میں اور امام احمدؒ نے مسند میں بھی۔"[۲]

رہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، سو اگرچہ وہ باتفاق مفسرین کے امام ہیں، لیکن اوّل تو ان کی تفسیر کتابی شکل میں کسی صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، آج کل "تنویر المقباس" کے نام سے جو نسخہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب ہے اس کی سند نہایت ضعیف ہے، کیونکہ یہ نسخہ محمد بن مروان السدی الصغیر عن الکلبی عن ابی صالح کی سند سے ہے، اور اس سلسلۂ سند کو محدثین نے "سلسلة الکذب" قرار دیا ہے۔[۳]

اور اگر بالفرض حضرت ابن عباسؓ کی تفاسیر کا کوئی کتابی مجموعہ ثابت بھی ہو تب بھی اسے علم تفسیر کی پہلی کتاب قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ حضرت ابی بن کعبؓ ان سے متقدم ہیں، حضرت ابن عباسؓ کی وفات طائف میں سنہ ۶۹ھ میں (سنہ ۲۸ھ میں نہیں، جیسا کہ سائل نے لکھا ہے) ہوئی ہے، جبکہ حضرت ابی بن کعبؓ سنہ ۲۰ھ میں وفات پا چکے تھے۔[۴] (مقدمہ تفسیر مراغی ج ۱ ص ۷)

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن ج ۳ ص ۱۲۱۸ (طبع مکتبه نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة)

(۲) اردو ترجمے کے لئے دیکھئے اتقان ج ۲ ص ۴۶۵ (طبع ادارۂ اسلامیات لاہور)

(۳) وفي مقدمة تفسير المراغي ج ۱ ص ۶، ۷ (مطبع مصطفى، مصر) طريق أبي النضر محمد بن السائب الكلبي المتوفى سنة ۱۴۶ هـ وهي أوهى الطرق ولا سند د وتبعه طريق محمد بن مروان السدي الصغير المتوفى سنة ۱۸۶ هـ وقد طبع تفسير نسب الى ابن عباس يروونه بهذا الطريق صاحب القاموس سماه تنوير المقباس من تفسير ابن عباس"

(۴) (مطبع مصطفى، مصر)

علامہ ذہبی اور قاضی ابن خلکان کے اقوال ہماری نظر سے نہیں گزرے، یہ اپنی جگہ درست ہے کہ حضرت سعید بن جبیرؒ اور ابن جریجؒ کی تفسیریں بھی کتابی شکل میں مدوّن ہوئی تھیں، لیکن چونکہ یہ حضرات تابعین میں سے ہیں، اور حضرت ابی بن کعبؓ کی تفسیر ان سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی، اس لئے اوّلیت کا شرف حضرت ابی بن کعبؓ ہی کو حاصل ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۴رمحرم ۱۳۸۷ھ[1]

جناب مودودی صاحب کا حضرت داوٗد علیہ السلام کے قصے میں اوریاء کی بیوی کا واقعہ ذکر کرنا

سوال:- مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ "مگر اس کی اصلیت صرف اس قدر تھی کہ حضرت داوٗد نے اپنے عہد کی اسرائیلی سوسائٹی کے عام رواج سے متأثر ہوکر اوریاء سے طلاق کی درخواست کی تھی الخ" اس عبارت پر اعتراض یہ ہے کہ کیا خدا کا نبی بری سوسائٹی سے متأثر ہوسکتا ہے؟ دُوسری عرض یہ ہے کہ مفسرین حضرات نے اس واقعے کو نقل کیا ہے، لیکن کیا کسی مفسر نے یہ لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک باقی تمام تاویلات سے یہ تاویل ہی مرجح ہے؟

۲:- عصمت، انبیاء علیہم السلام کے لوازمِ ذات میں سے ہے یا نہیں؟

۳- کیا انبیاء علیہم السلام کو نبوت سے قبل بھی وہی عصمت حاصل ہوتی ہے جو کہ نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے؟

جواب ا:- اصل یہ ہے کہ محقق مفسرین نے حضرت داوٗد علیہ السلام کے اس واقعے میں اوریاء کی بیوی کے قصے کو اختیار نہیں کیا، حافظ ابن کثیرؒ تحریر فرماتے ہیں کہ: اکثرها ماخوذ من الاسرائيليات، ولم يثبت فيها عن المعصوم حديث يجب اتباعه، لكن روى ابن ابى حاتم ههنا حديثًا لا يصح سنده، لأنه من رواية يزيد الرقاشى عن انسؓ، ويزيد وان كان من الصالحين لكنه ضعيف الحديث عند الأئمة۔[2]

اوریاء کا یہ قصہ درحقیقت بائبل کی کتاب سموئیل سے ماخوذ ہے، جس کے مصنف کا آج تک پتہ ہی نہیں چل سکا، لہٰذا بہت سے محققین نے صحیح یہ قرار دیا ہے کہ دراصل حضرت داوٗد علیہ السلام نے خصم کے بجائے مظلوم سے خطاب فرمایا، جس سے طرفداری متوہم ہوتی تھی اور اسے خلافِ عدل سمجھ

(۱) یہ فتویٰ "البلاغ" کے شمارہ صفر ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔
(۲) تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۵۷، سورة ص

کر استغفار فرمایا۔ (بیان القرآن ج ۱۰ ص ۸)۔[1]

امام رازیؒ نے اسی قسم کی دو توجیہات بھی نقل کی ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ص ۱۸۹)۔[2]

لہٰذا آیت کی بے غبار اور محقق تفسیر تو وہی ہیں جو امام رازیؒ یا حضرت تھانویؒ اور علامہ آلوسیؒ وغیرہ نے نقل کی ہیں۔

البتہ بعض مفسرین نے اس کو بھی اختیار کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں کسی شخص سے اس کی بیوی کو طلاق دینے کی درخواست کرنا مروت کے خلاف نہ سمجھا جاتا تھا، اور قانونی قباحت تو اس میں آج بھی نہیں ہے، اس لئے حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریاء سے اسی قسم کا مطالبہ کیا تھا۔ فقیل: انہ علیہ السلام رأی امرأۃ رجل فسألہ أن یطلقها فاستحی أن یردہ ففعل فتزوجها وهی أم سلیمان، وکان ذلک جائزًا فی شریعتہ معتادًا فیما بین أمتہ غیر مخل بالمروءۃ. (روح المعانی ج:۲۳ ص:۱۸۵)۔[3]

لہٰذا یہ تفسیر جو سوال میں نقل کی گئی ہے بے اصل تو نہیں، مگر اول تو مرجوح ہے، دوسرے ''سوسائٹی کے رواج سے متأثر ہونے'' کا لفظ قدرے خلافِ احتیاط ہے، اس کے بجائے ''سوسائٹی کے عام رواج کے مطابق'' کا لفظ ہوتا تو مناسب تھا، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبی کسی بُرے کام میں سوسائٹی کے رواج سے متأثر ہوگئے، کیونکہ یہ کام نہ ناجائز تھا اور نہ خلافِ مروت۔ ہاں! نبوت کے مقامِ بلند کے پیشِ نظر حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے بُرا سمجھ کر اس پر استغفار فرمایا۔

۲- عصمت، انبیاء علیہم السلام کے لئے لازم ہے، اور ان سے کسی وقت بھی یہ صفت جدا نہیں ہوتی، ان کی لغزشوں کا ذکر قرآن کریم وغیرہ میں آیا ہے، وہ سب خلافِ اَولیٰ باتیں تھیں، جو شرعاً معصیت نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کو ان کی جلالتِ قدر کی وجہ سے ان پر بھی تنبیہ کی گئی۔

۳- صحیح یہ ہے کہ نبوت سے قبل بھی انبیاء علیہم السلام سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۰/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) بیان القرآن ج ۱۰ ص ۸ (طبع سعید) نیز تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن حضرت کاندھلوی ج ۶ ص ۳۰۲ تا ۳۱۲ (طبع مکتبہ عثمانیہ لاہور)۔

(۲) دیکھئے تفسیر کبیر ج:۲۶ ص:۱۹۰ تا ۱۹۹۔

(۳) (طبع مکتبہ رشیدیہ لاہور)

"وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ .... الخ" میں قنوت کا معنی "قراءت" سے کرنا

سوال:- سورۃ الاحزاب میں پارہ ۲۲، رکوع دوم کی آیت وں یوں شروع ہوتی ہے: ان المسلمین والمسلمات والمؤمنین والمؤمنات والقانتین والقانتات ... الخ" یہاں "القانتین والقانتات" کے معنی حضرت شاہ رفیع الدین نے قرآن پڑھنے والے، قرآن پڑھنے والیاں کیا ہے۔ اس کا ترجمہ شیخ الہند نے عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں کیا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ قنوت کا معنی قرآن پڑھنا کیسے ہوگیا؟ دونوں بزرگ مذکورہ بالا چوٹی کے عالم ہیں، لغوی لحاظ سے قنوت، قرآن پڑھنے کے معنی میں نہیں آتا، سائل ایک طالب علم ہے اور چاہتا ہے کہ عقلی، نقلی طور سے اس ترجمے کی توجیہ اسے سمجھائی جائے، نیز یہ بھی شبہ گزرتا ہے کہ کاتب وغیرہ سے غلطی ہوئی ہوگی۔

جواب:- قنوت کے لغت میں بہت سے معانی آتے ہیں، جن میں سے ایک قراءت بھی ہے، حضرت شاہ رفیع الدین کا ترجمہ اسی معنی کے مطابق ہے۔[1] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

قرآنِ کریم کو رسمِ عثمانی کے علاوہ کسی اور رسم الخط میں لکھنا

سوال:- لوگوں کو قرآن کریم پڑھانے کے لئے قرآن کو رسمِ عثمانی کے سوا کسی اور رسم الخط میں لکھنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- قرآن کریم کو رسمِ عثمانی کے سوا کسی اور رسم الخط میں لکھنا بالاجماع ناجائز ہے،[2] لوگوں کو قرآن کریم پڑھانے کے لئے عربی رسم الخط سکھایا جائے، انہیں رسم الخط میں لکھنا درست نہیں۔

---

(۱) وفی لسان العرب ج:۔۔ ص:۔۔۔ لغت قنت ویرد بمعان متعددة کالطاعة والخشوع والصلاة والدعاء والعبادة والقیام وطول القیام والسکوت فیصرف فی کل واحد من هذه المعانی الی ما یحتمله لفظ الحدیث الوارد فیه وفیه ایضًا بعد اسطر. القانت الذاکر لله تعالی، کما قال الله تعالی "امن هو قانت اناء الیل ساجدا وقائما" وکذا فی المنجد ص:۔۔۔ نیز قنوت کا ایک معنی "قراءت" بھی ہے، دیکھئے اردو منجد ص:۳۸، ومصباح اللغات ص:۷۰۹۔ (از مرتب)۔

(۲) وفی الاتقان فی علوم القرآن النوع السادس والسبعون فی مرسوم الخط وآداب کتابته ج:۲ ص:۱۱۵۳ (طبع مکتبة نزار مصطفی الباز مکة المکرمة) قال اشهب سئل مالک هل یکتب المصحف علی ما احدثه الناس من الهجاء؟ فقال لا، الا علی الکتبة الاولی رواه الدانی فی المقنع ثم قال ولا مخالف له من علماء الامة وقال الامام احمد یحرم مخالفة مصحف الامام فی واو او یاء او الف او غیر ذلک وفی خلاصة الفتاوی ص:۔۔۔ ص:۲۵ ۔۔۔ لانه خلاف ۔۔۔ الخ. وکذا فی ۔۔۔ ص:۵۱ ۔۔۔ ص:۳۰۰، دلیل الحیران ص:۔۔ ۔۔۔ فی رسم مصحف الامام ص:۳۶، ۔۔۔ فی رسم ۔۔۔ ج:۱ ص:۳۶۹، لطائف البیان فی رسم القرآن ج:۲ ص:۲۷، الجامع لما یحتاج الیه من رسم المصحف ص:۵۲.

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جواہر الفقہ ج ۱ ص ۳۷ مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۰/۲۸ ب)

وحی سے متعلق مقدمہ معارف القرآن کی ایک عبارت کی وضاحت

سوال:- حضرت مولانا نے معارف القرآن کے مقدمہ میں جہاں وحی کی حقیقت بیان کی ہے وہاں راقم الحروف کے ایک مقامی دوست نے ایک شبہ کی طرف توجہ دلائی۔ حضرت مولانا سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اس کی وضاحت فرمادیں۔ وہ یہ ہے کہ راقم الحروف نے اپنی کوتاہ نظر سے یہ عبارت لکھی ہوئی پائی "چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعہ اسے مذکورہ بالا باتوں کا علم حاصل ہوتا رہے۔ ایک انسان کے حواس، یعنی آنکھ، کان، منہ اور ہاتھ پاؤں، دوسرے عقل اور تیسرے وحی" (نیز معارف القرآن کے انگریزی ترجمے میں Has Created ہے)۔ اور دوسرے صفحہ پر یہ لکھا ہوا پڑھا "۔۔۔ سے اپنا پیغمبر قرار دے دیتا ہے اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے، اسی کلام کو "وحی" کہا جاتا ہے۔" چنانچہ راقم الحروف کی ناقص فہم میں یہ شبہ سا ہوتا ہے کہ چونکہ یہاں وحی کا لفظ عام ہے، وحی متلو اور وحی غیر متلو دونوں پر مشتمل ہے، لہٰذا وحی متلو پر اشکال نظر آتا ہے، لہٰذا رہنمائی فرمائیں۔ عبدالحفیظ خان دواؤد، کینیا

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، "وحی" کے معنی ہیں "اللہ تعالیٰ کا کسی بندے (پیغمبر) پر اپنا کلام نازل فرمانا یا کسی اور طرح سے اُسے خبر دینا" اور اس معنی میں وحی مخلوق، حادث اور غیر قدیم ہے۔ جو چیز قدیم اور غیرِ مخلوق ہے وہ اللہ کا کلامِ نفسی ہے، لیکن وحی کا اس کلامِ نفسی سے متعلق ہونا حادث اور مخلوق ہے، لہٰذا اس عبارت میں کوئی اِشکال نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۲/۴/۱ھ

﴿کتاب الحدیث و ما یتعلق به﴾

(حدیث اور اس سے متعلق مسائل کا بیان)

مرسل حدیث کی حجیت سے متعلق احناف کا موقف

سوال:- مرسل روایت سے متعلق محدثین (جمہور) کا جو مسلک ہے وہ تو معلوم ہے، اور علمائے احناف کا مسلک معلوم ہے کہ ان کے ہاں مرسل روایت مقبول و حجت ہے، لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ مرسل روایت کا مقبول ہونا اکابر علمائے حنفیہ کے نزدیک علی الاطلاق ہے یا اس کی چند صورتیں مستثنیٰ ہیں، یعنی مثلاً ایک مرسل روایت کسی صحیح متصل سند والی مرفوع روایت کے مخالف ہے اور اس کے منافی ہے، حتیٰ کہ ان میں تطبیق کی صورت بھی نہ ہو، یا مثلاً اس مرسل روایت سے کوئی عقیدہ ثابت ہو، یا کسی مسلّم عقیدے کے خلاف ہو (مثلاً روایۃ العرنیین)، یا پھر اس مرسل روایت سے کسی صحابی کی ناموس وغیرہ پر زد پڑتی ہو، تو کیا یہ سب صورتیں اور اس قسم کی دوسری صورتیں بھی مرسل روایت کی مقبول ہیں؟ یا یہ صورتیں اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں، یعنی ایسی صورت میں وہ مقبول نہیں ہوتی، اگر اس قسم کی صورتوں میں اکابر علمائے حنفیہ مرسل روایت کو قبول نہیں فرماتے، اور جناب کو ایسے حوالے معلوم ہوں تو مہربانی فرما کر اپنی اولین فرصت میں مجھے ان حوالہ کتب وغیرہ سے مطلع فرمائیں، نہایت شدید ضرورت ہے۔ ہاں! متقدمین اکابر حنفیہ کی کوئی قید نہیں لیکن اگر متقدمین میں سے حوالہ جات ہوں تو وہ بھی بہتر ہے، ورنہ متأخرین اکابر حنفیہ کے بھی حوالہ جات کافی ہوں گے، حتیٰ کہ معاصرین علماء جیسے حوالہ جات ہوں تو وہ بھی تحریر فرمائیں، والسلام!　　　محب محمد شاہد رشدی (حیدرآباد، سندھ)

جواب:- حدیث مرسل کے بارے میں عرض یہ ہے کہ اس بارے میں عام طور پر حنفیہ کے مسلک کو درست طور پر سمجھا نہیں گیا۔ حنفیہ، محدثین کی اصطلاح کے مطابق مرسل کو علی الاطلاق حجت نہیں کہتے، بلکہ جو مرسل حنفیہ کے نزدیک حجت ہوتی ہے اس کے لئے تین شرطیں ہیں -

١ - پہلی شرط یہ ہے کہ مرسل قرونِ ثلاثہ مشہود لہا بالخیر میں سے کوئی ہو۔ ٢ - دوسری شرط یہ ہے کہ وہ خود جرح و تعدیل وغیرہ سے باخبر امام اور ثقہ ہو۔ ٣ - تیسری شرط یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قول یا فعل کو صیغۂ جزم مثلاً "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كذا" روایت کرے، لہٰذا معنعن کرے گا تو اس شرط کے مفقود ہونے کی بنا پر حدیث حجت نہ ہوگی، چنانچہ محقق ابن ہمام نے "التحریر" میں مرسل کی یہ تعریف فرمائی ہے "المرسل قول الامام الثقة قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مع حذف من السند"(١)۔

---

(١) التقریر والتحبیر علی تحریر الامام الکمال بن الہمام، مسئلۃ مرسل ج ٢ ص ٢٩٦ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)

یہ تعریف چونکہ محدثین کی تعریف سے مختلف ہے، اس لئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حنفیہ ہر اس حدیث کو حجت مانتے ہیں جو محدثین کی اصطلاح کے مطابق مرسل ہو، حالانکہ صورت حال ایسی نہیں ہے۔ اس مسئلے پر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ نے مقدمۂ فتح الملہم ص ۸۰ تا ۸۲ پر مفصل بحث کی ہے، اس کو ملاحظہ فرمائیں تو انشاء اللہ حنفیہ کا اصل موقف سامنے آجائے گا۔

ان شرائط کے ساتھ جو حدیث مرسل ہو وہ بعض اوقات مسند سے بھی قوی ہوسکتی ہے، لیکن کم از کم اس کے ہم پلہ تو ضرور ہوگی، لہٰذا اگر کسی مسند موصول حدیث کا ایک حدیث مرسل کے ساتھ تعارض ہو تو وہی معاملہ کیا جائے گا جو دو موصول حدیثوں میں تعارض کے وقت کیا جاتا ہے، اور اگر مرسل کی مذکورہ تین شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو وہ حنفیہ کے نزدیک حجت ہی نہیں ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ حدیث موصول صحیح اس پر راجح ہوگی، هذا ما فهمت من مذهب الحنفية۔ واللہ اعلم

۱۴۰۴/۱/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۴۹/۳۵ الف)

"من جدّد قبرًا ومثّل مثالًا .... الخ" حدیث ہے یا نہیں؟

سوال:- ہماری مسجد میں سیکریٹری اور کارکن جماعت اسلامی کے ہیں، مسجد کا چبوترہ ایک شخص کو دیا ہوا تھا، میری دکان کرایہ پر سامنے تھی، صبح جب میں قرآن شریف کی تلاوت کرتا تو وہ شخص ریڈیو پر فحش فحش ریکارڈ بلند آواز سے چلاتا رہتا، مسجد کے کارکنوں سے شکایت کی، کوئی شنوائی نہ ہوئی، جماعت کے آدمی نے کہا کہ یہ سب تمہاری شہ پر ہورہا ہے۔

محرم کے مہینے میں ان میں سے بعض ایسے لوگ آتے ہیں جو خود شیعہ ہیں، میں نے ایک حدیث پڑھی غالباً عربی الفاظ یہ ہیں "من جدّد قبرًا ومثّل مثالًا فهو زائر لیخرج الاسلام" یہ کہہ کر اس شخص نے مجھے مارا، کیا یہ حدیث صحیح ہے؟

جواب:- ان الفاظ سے کوئی حدیث ہمارے علم میں نہیں، اور حدیث کی کتابوں میں تلاش سے بھی نہیں ملی، آپ نے جس کتاب میں دیکھی ہو اس کا مفصل حوالہ لکھ کر بھیجیں تو کچھ کہا جاسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

سندِ حدیث میں لفظِ "نا" کا مطلب

سوال:- سند میں لفظ "نا" کا استعمال کرتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب:- سند میں جو لفظ "نا" ہوتا ہے، وہ "حدثنا" کا مخفف ہے، یعنی ہم سے حدیث

بیان کی۔

واللہ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۱۱/۳۲ ج)

ہندوستان سے فرحت بخش ہوا آنے سے متعلق حدیث کی تحقیق

سوال:- کیا کوئی حدیث شریف اس مضمون کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ ”ہندوستان سے ایسی فرحت بخش ہوا آتی ہے“ یا یہ مضمون ہو کہ ”میرا سینہ کشادہ ہو جاتا ہے اور مجھے فرحت محسوس ہوتی ہے“ یا یہ مضمون ہو کہ ”ہندوستان کے لوگ مجھے عزیز ہیں، کیونکہ وہ مجھے دیکھے بغیر ایمان لائیں گے۔“؟

جواب:- اس مضمون کی کوئی حدیث احقر کے علم میں نہیں ہے، اور کتب حدیث میں سرسری تلاش سے ملی بھی نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۱۲/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۰۵/۲۰ و)

مطالعے کے لئے حدیث کی مستند کتب

سوال:- حدیث کی مستند ترین کتب برائے مطالعہ ارشاد ہوں۔

جواب:- ”انوار الباری“ (مکتبہ نشر العلوم، بجارہ روڈ بجنور، یوپی)، ”الأدب المفرد“ امام بخاریؒ، ”ریاض الصالحین“ از امام نوویؒ اور ”مشکوٰۃ المصابیح“ کے اردو ترجمے چھپے ہوئے ہیں، لیکن فقہی احکام کے بارے میں صرف ایک آدھی حدیث کو دیکھ کر خود سے کوئی شرعی حکم نہ نکالیں، کیونکہ احادیث سے فقہی احکام مستنبط کرنے کے لئے وسیع و عمیق علم کی ضرورت ہے، جب تک تمام احادیث نگاہ کے سامنے نہ ہوں ان سے فقہی احکام کا مستنبط کرنا درست نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۲/۱/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۹۲/۱۹ الف)

طوالتِ عمر کی فضیلت میں ایک حدیث

سوال:- طوالت عمر کی فضیلت میں ایسی کوئی حدیث موجود ہے یا نہیں؟ اس طرح کہ ”جتنی عمر بڑھتی جائے گی اس دس سال کے معاصی کی مغفرت ہوتی جائے گی“؟

جواب:- اس مضمون کی کوئی حدیث کہیں نظر سے نہیں گزری، البتہ بڑی عمر کی فضیلت میں

یہ حدیث نسائی[1] اور ترمذی[2] وغیرہ میں مروی ہے کہ "من شاب شيبة في الإسلام كانت له نوراً يوم القيامة" (الجامع الصغیر ص ...)[3] یعنی جو شخص اسلام کی حالت میں بوڑھا ہو جائے تو بڑھاپے کی سفیدی اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگی۔ اور ابوداؤد کی روایت میں الفاظ یہ ہیں: "لا تنتفوا الشيب فإنه نور المسلم، من شاب شيبة في الإسلام كتب الله له بها حسنة وكفر عنه بها خطيئة ورفعه بها درجة" رواه ابوداؤد (مشکوٰۃ، کتاب اللباس، باب الترجل ص ۳۸۲)[4]۔ یعنی سفید بالوں کو مت نوچو کیونکہ وہ مسلمان کا نور ہے، جو شخص اسلام کی حالت میں بوڑھا ہوا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کی وجہ سے ایک نیکی لکھے گا اور ایک خطا معاف کرے گا اور ایک درجے میں اضافہ فرمائے گا۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳/۱۲۸ الف)

اثرِ صحابی نقل کرنے کے بعد "أو كما قال رضي الله عنه" کہنا
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی پر لمبا درود پڑھنا
کیا حدیث کے پڑھنے پر بھی "تلاوت" کا لفظ بولا جا سکتا ہے؟

سوال ۱- حدیث نقل کرنے کے بعد "كما قال عليه السلام" کہا جاتا ہے، اثرِ صحابی میں بھی کیا یہ حکم ہے؟

۲- حدیث پڑھتے ہوئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی آتا ہے تو "صلی اللہ علیہ وسلم" کہا جاتا ہے، کیا یہ بھی درست ہے "صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وبارک وسلم"؟

۳- لفظ "تلاوت" جیسے عام طور پر قرآن پر بولا جاتا ہے، مثلاً جیسے "میں نے تلاوتِ قرآن کی"، تو حدیث پر بھی یہ لفظ بولنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- حدیث و آثار کے نقل کرنے میں جس قدر احتیاط سے کام لیا جائے، بہتر ہے۔ لہٰذا آثارِ صحابہ میں بھی "او كما قال رضي الله عنه" کہنے میں کوئی حرج نہیں۔

۲:- بلاشبہ جائز بلکہ مستحسن ہے۔

---

(۱) سنن نسائی ج ۲ ص ۲۷ (مکتب المطبوعات الإسلامية، حلب)
(۲) جامع الترمذی، باب ما جاء في فضل من شاب شيبة في ... الخ ج ۳ ص ۱۷۲ (دار احياء التراث العربي)
وكذا في صحيح ابن حبان ذكر اعطاء الله جل وعلا نوراً في القيامة، ج ۷ ص ۲۵۱ (مؤسسة الرسالة، بيروت)
(۳) الجامع الصغير للسيوطي رقم الحديث ۸۷۶۳ ج ۳ ص ۱۷۵۳ (مكتبة نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة)،
وكذا في المشكوة ص ۳۸۲ باب الترجل (قديمي كتب خانه)
(۴) مشكوة المصابيح (قديمي كتب خانه)

۳- احادیث کے اندر لفظ "تموت" کے استعمال میں شرعاً تو کوئی اشکال نہیں، لیکن عرف و محاورے کے خلاف ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۹۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

ایک حدیث یا مقولہ؟

سوال:- ذرا کرم اس حدیث کے معنی سمجھا دیجئے: "الا ان اولیاء الله لا یموتون ..... الخ"۔

جواب:- یہ الفاظ حدیث کے کسی مجموعے میں ہمیں نہیں ملے، یہاں تک کہ موضوع احادیث کے مجموعے "اللآلی المصنوعة فی الاحادیث الموضوعة" (للحافظ السیوطی) اور "الأحادیث الموضوعة للشوکانی" بھی اس سے خالی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کا مقولہ ہے، حدیث نہیں ہے۔ بہرحال اگر اس جملہ کا یہ مطلب لیا جائے کہ اولیاء اللہ اپنے کارناموں کی وجہ سے زندہ جاوید ہوتے ہیں تو درست ہے، لیکن اگر یہ مطلب لیا جائے کہ اولیاء اللہ کو موت نہیں آتی تو غلط ہے۔ قرآن کا واضح ارشاد ہے: "كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ"[1] یعنی ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۸۷/۳/۲۳ھ[2]

بظاہر دو متعارض احادیث میں تطبیق (فارسی)

سوال:- تطبیق ومطلب احادیث ذیل مطلوب است، امید است بزبان فارسی عام درقید تحریر برآورده بنده را ازموج خلجان رہا نمائید، جواب بزبان فارسی ضرورت نیست بلکہ اردو زبان کافی باشد۔

عاصم ابن کلیب الجرمی عن أبیہ قال حدثنا رجل من الانصار انه كان مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في جنازة فلقيه رسول امرأة من قريش يدعوه الى طعام فجلسنا مجلس الغلمان من آبائهم، فنظر آباؤنا الى النبي صلى الله عليه وسلم وفي يده أكلة فقال: ان هذه الشاة تخبرني أنها أخذت بغير حلها، فقالت: يا رسول الله انه لم يزل يعجبني أن نأكل في بيتي واني أرسلت الى البقيع فلم يوجد فيه شاة وكان أخي اشترى شاة بالأمس فأرسلت بها الى

(۱) سورۂ آل عمران: ۱۸۵
(۲) [illegible]

أهله بالثمن، فقال: أطعموها الأسارى. (مشكل الآثار للطحاويؒ ج ۴ ص:۱۳۲)۔[1]

غرض اینکہ این حدیث سنداً ومتناً مضطرب است۔

سنداً- در حدیث مشکل الآثار عاصم عن أبيه عن رجل أحسبه من الأنصار أبو حنيفة عاصم بن كليب عن أبي بردة ابن أبي موسى عن أبي موسى الأشعري أبو حنيفة عاصم عن أبيه عن رجل من أصحاب النبي والحاكم والذي لم يذكرا عاصما بل خالفاه في تمام السند۔

متناً: از حدیث مشکل الآثار معلوم میشود نیز از مشکوٰۃ کہ آنحضرت بجنازہ رفتہ بود و بعد از رجوع از جنازہ داعی زن آمدہ بود، واز حدیث ابوحنیفہ معلوم میشود کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم برائے ملاقات یک قوم رفتہ بود ایشان شاۃ را ذبح کردہ، واز بعض مفہوم میشود کہ یکی از صحابہ برائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شاۃ تیار کردہ بود دعوت دادند، واز حاکم معلوم میشود کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحاب بزنی مرور نمودند آن برائے شان شاۃ ذبح نمودند۔

جواب:- در حدیث مذکور ہیچ اضطراب نیست، واقعہ اینست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برائے جنازہ رفتہ بودند کہ بعد از فراغ زنے از انصار مردے را فرستاد وآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را دعوت طعام داد، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف بردند، پس در روایت مشکل الآثار ومشکوٰۃ مکمل واقعہ بیان کردہ شدہ است، ودر روایت ثالثہ کہ از امام ابوحنیفہ مروی است قصہ جنازہ حذف کردہ، ومراد از قوم در "زاد قوما من الأنصار في دارهم" ہمان زن است، واین مراد نیست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برائے زیارت قوم انصار رفتہ بود کہ زنان ایشان را مدعو کردہ وما در روایت رابعہ کہ در آن "صنع رجل من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم" آمدہ است پس بظاہر نسبت صنع طعام بمرد مجاز است کہ مراد از رسول زن داعی بود نہ کہ داعی، واما روایت خامسہ کہ دران مرور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بر زن داعی مذکور است، پس بروایات سابقہ متعارض نیست، زیرا کہ ممکن است کہ وقت رفتن بجنازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرور بر زن فرمودہ وزن ایشان را دعوت دادہ، پس بعد از فراغ آن زن دوبارہ مردے را فرستاد کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را یاد دہانی وقتیکہ بموجب روایت مشکوٰۃ زن داعی زن متوفی بود۔

اما اختلافیکہ در سند نظر می آید اضطراب نیست بلکہ تعدد طرق است۔ فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۲ھ

جواب صحیح
محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۶ /۱۹ الف)

---

(۱) مشكل الآثار للطحاويؒ باب بيان مشكل ما روي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم مما يقضي بين المختلفين من الفقهاء في الشاة المغصوبة اذا ذبحت وشويت لخ رقم الحديث ۳۰۰۵، ۳۰۰۶ ج ۷ ص ۴۵۵ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت)

رأی الحنفية فی قبول الأحاديث الضعيفة في فضائل الأعمال

(فضائل اعمال میں ضعیف احادیث قبول کرنے میں حنفیہ کی رائے سے متعلق عربی فتوی)

الى فضيلة الشيخ الفقيه البارع والمحدث المتقن مولانا محمد تقى العثمانى
حفظه الله ونفع به

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

أحمد اليكم الله الذى لا اله الا هو، ونصلى ونسلم على المبعوث رحمة للعالمين وعلى اله وصحبه أجمعين، وبعد!

من يمن الايمان والحكمة من صنعاء أبعث اليكم بهذه الرسالة سائلا الله العلى القدير أن يحفظكم وأن يكثر في الأمة الاسلامية من أمثالكم، ولكم حرصت على لقائكم عندما زرت مدينتكم كراتشى قبل عامين ولكن مع الأسف لم أجدكم فيها، فقد كنتم حينها خارج بلادكم الباكستان، وكاتب هذه السطور هو محبكم فى الله عادل بن حسين أمين اليمنى الندوى وقد حدثنى عنكم عندما كنت فى الهند مولانا العلم الشامخ الأديب العملاق العالم الربانى سماحة الشيخ أبى الحسن الندوى حفظه الله تعالى وكذلك الأستاذ الفاضل سلمان الحسينى الندوى، وصدق القائل "والأذن تعشق قبل العين أحيانا" وأسأل الله أن ييسّر لى الاجتماع والاستفادة منكم وهو على ذلك قدير.

فضيلة الشيخ، لقد أردت أن أستفسركم وأوجه اليكم هذا السؤال الهام، الا وهو ما ذكره العلامة المحقق محمد عبدالحى اللكنوى رحمه الله تعالى فى كتابه النفيس - الأجوبة الفاضلة فى صفحة ٤٣ - عندما نقل كلام شمس الدين السخاوى فى (القول البديع فى الصلاة على الحبيب الشفيع) وذكر كلام الحافظ ابن حجر العسقلانى رحمه الله فى جواز رواية الحديث الضعيف فى فضائل الأعمال وشروطه الثلاثة المذكورة هناك: وقد نقل العلائى الاتفاق على الشرط الأول، وأما الشرط الثانى والثالث فقد نقلا عن العز بن عبدالسلام وعن ابن دقيق العيد.

والسؤال هنا هو: ما هو رأى علماء الحديث من السادة الحنفية فى هذه الشروط؟ هل يعتبرونها أصلا هذا ما فى جواز رواية الحديث الضعيف فى فضائل الأعمال أم لا؟"

وهل لهم أقوال في هذه المسئلة؟ نرجو منكم عناية لرجاء البسط الشافي الكافي في الجواب، ولكم بذلك عظيم الأجر والثواب من الله تعالى.

وأنتهز هذه الفرصة لمعرفة وقتكم المناسب حتى تتكرموا بزيارة لنا إلى اليمن الميمون، وبالأخص إلى الجامعة الإيمان التي يترأسها فضيلة الشيخ عبدالمجيد الزنداني ويدرس فيها مجموعة طيبة من أهل العلم كالشيخ الدكتور عبدالكريم زيدان وغيره، والجامعة تحرص كثيرًا على استقدام علماء من البلاد الإسلامية، وقد زار الجامعة كثير منهم ونتمنى أن تبدوا وتظهروا استعدادكم حتى يوجه شيخنا الزنداني دعوة إلى فضيلتكم، ويتيح الله زيارتكم لهذه البلاد ورؤية ما فيها من الآثار والعلم، ولا أنسى أن أقول لكم إن الأستاذ سلمان الحسيني الندوي قد زار الجامعة قبل ثلاثة أعوام، ويحرص على أهمية الاتصال العلمي والثقافي بعلماء شبه القارة الهندية، ونتمنى زيارة فضيلة الشيخ من أعلام علماء هذه القارة، ودعوتي هذه لكم هي أصالة عن نفسي ونيابة عن الجامعة التي أعمل فيها، ونأمل منكم قبول هذه الدعوة الصادقة وعدم ردّها، ففيها مفتاح خير وبركة إن شاء الله تعالى.

في الأخير أرجو المعذرة من الإطالة، وأطلب منكم صالح دعواتكم لكاتب هذه السطور المبتلى بالعجز والتقصير - كما يعلم الله ذلك - وبلّغوا سلامي على محبيكم وتلامذتكم وأنا في انتظار جواب السؤال وجواب الدعوة.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

وكتبه محبّكم في الله

عادل بن حسن أمين اليماني الندوي

صنعاء - جامعة الإيمان - يمن

الاجابة:-

إلى فضيلة الشيخ عادل بن حسن أمين اليمني الموقر، حفظه الله تعالى ورعاه

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

فقد تسلمت رسالتكم الكريمة، وقد تشرفت بمطالعتها والتعرف عليكم، فجزاكم الله تعالى خيرًا، وأجزل لكم مثوبة.

سألتم عن رأي الحنفية في قبول الأحاديث الضعيفة في فضائل الأعمال، وما ذكر الإمام السخاوي رحمه الله تعالى من ثلاثة شروط لقبول الحديث الضعيف، فهو المختار عند

جمع كبير من الحنفية، ومن أهم هذه الشروط أن الحديث الضعيف لا يثبت به حكم جديد، حتى الاستحباب على سبيل الجزم، وإنما معنى قولهم أن يؤكد به حكم ثبت سابقا بنص صحيح أو حسن، أو أن يعمل به على سبيل الاحتياط والاحتمال، دون الجزم بالقول بسنيته أو استحبابه، وهناك جمع من العلماء الحنفية يقبلون الحديث الضعيف حتى لإثبات حكم جديد في الفضائل، وإن مشايخي الذين شرفني الله بالتلمذ عليهم، كانوا يختارون الرأي الأول، فمثلا: حديث صوم السابع والعشرين من رجب، لم يثبت في حديث صحيح، ولذلك أنكر الشيخ أشرف علي التهانوي رحمه الله سنية هذا الصوم أو استحبابه، ولكن أجاز أن يصوم أحد على سبيل احتمال الاستحباب.

أما إذا تأيد الحديث الضعيف بتعامل العلماء فإنه يمكن عند الحنفية أن يثبت له حكم جديد، وهذا مثل فضل صلاة التسبيح وإحياء ليلة النصف من شعبان، وأمثلة ذلك كثيرة

وإني أشكركم على ما دعوتموني إلى جامعة الإيمان باليمن، وكم يسعدني أن أتشرف بزيارة العلماء وطلبة العلم هناك، وإني أقبل هذه الدعوة بكل اعتزاز وسرور، ولكن الأشهر الثلاثة القادمة مرهقة بالأسفار الأخرى، فلعل ذلك إنما يتيسر بعد الحج، في بداية شهر محرم الحرام إن شاء الله تعالى، وإن وصلت إلي الدعوة الرسمية في خلال شهر ذي الحجة، فسوف أحدّد التاريخ بالضبط إن شاء الله تعالى.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

محمد تقي العثماني

من الرياض ۹ من شوال ۱٤۱۹هـ

وعنواني الدائم: دار العلوم كراتشي ١٤،

الرمز البريدي ۷٥۱۸۰ باكستان

(فتویٰ نمبر ۱۰/۳۶۰)

"لن تجتمع أمتي على الضلالة" کے بعد "فإن أجمعت أمتي على الضلالة .... الخ" کے الفاظ حدیث میں ہیں یا نہیں؟

سوال:- "لن تجتمع أمتي على الضلالة" کے بعد "فإن أجمعت أمتي على الضلالة

وفي عون المعبود ج: ... ص: ... طبع دار الكتب العلمية بيروت: ولم يثبت في صوم رجب نهي ولا ندب ولا نهي لعينه، ولكن أصل الصوم مندوب إليه

فأنا بریٔ منهم" کے الفاظ بھی حدیث میں ہیں یا نہیں؟

جواب:- "لن تجتمع أمتی علی الضلالة"[1] کے بعد "فان أجمعت أمتی علی الضلالة فأنا بریٔ منهم" کے الفاظ کسی مستند کتاب میں ہمیں نہیں ملے۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

حدیث "بعثت الی الأسود والأحمر" کی تحقیق؟

سوال:- "بعثت الی الأسود والأحمر" کی حدیث کس کتاب اور کس مقام پر ہے؟

جواب:- ان الفاظ کے ساتھ کوئی حدیث نظر سے نہیں گزری، اور مراجعت کتب کی اس وقت فرصت نہیں، البتہ مضمون صحیح ہے اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔[2]

فقط واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۸۵/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) دیکھئے مجمع الزوائد للہیثمی ج ۵ ص ۲۱۸ طبع دار الریان للتراث قاهرة و دار الکتاب العربی بیروت نیز ملاحظہ فرمائیے مشکوة المصابیح باب الاعتصام بالکتاب والسنة ج ۱ ص ۳۰ طبع قدیمی کتب خانہ کراچی)

(۲) سائل نے اپنے سوال میں "بعثت الی الأسود والأحمر" کے الفاظ ذکر کئے ہیں جبکہ ان الفاظ کے بجائے "بعثت الی الأحمر والأسود" کے الفاظ مختلف کتب حدیث میں موجود ہیں، چنانچہ مجمع الزوائد للهیثمی ج۸ ص۲۵۸ (طبع دار الریان للتراث ودار الکتاب العربی قاهرة وبیروت) میں ہے: عن ابی موسی قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: أعطیت خمسا بعثت الی الأحمر والأسود وجعلت لی الأرض طهورا ومسجدا وأحلت لی الغنائم ولم تحل لمن کان قبلی ونصرت بالرعب شهرا وأعطیت الشفاعة ولیس من نبی الا وقد سأل شفاعته وانی اختبأت شفاعتی ثم جعلتها لمن مات لا یشرک بالله شیئا. رواه أحمد متصلا ومرسلا والطبرانی ورجاله رجال الصحیح. وعن ابن عباس أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: أعطیت خمسا لم یعطهن نبی قبلی ولا أقولهن فخرا بعثت الی الأحمر والأسود ونصرت بالرعب [illegible] طرق ضعیف اور بعض صحیح ہیں۔ دیکھئے صحیح ابن حبان ج ۳ ص۳۷۵ (طبع مؤسسة الرسالة بیروت) رقم الحدیث: ۶۳۶۲ معجم الأوسط طبرانی ج۷ ص ۲۵۷ (طبع دار الحرمین قاهرة) موارد الظمآن ج ۱ ص ۷۵ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) سنن الدارمی ج ۲ ص ۲۹۵ (طبع دار الکتاب العربی بیروت) ومجمع الزوائد ج ۱ ص ۲۶۹ (طبع دار الکتاب العربی بیروت) مصنف ابن ابی شیبة ج ۲ ص ۳۰۳، ۳۰۴ (طبع مکتبة الرشد ریاض) مسند أحمد ج ۱ ص۲۵۰ (طبع مؤسسة قرطبة) (محمد زبیر حق نواز)

عمامہ کی فضیلت میں حدیث

سوال:- کسی حدیث میں عمامہ کی خصوصی فضیلت موجود ہے یا نہیں؟

جواب:- عمامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور یہی اس کی فضیلت ہے، اس کے علاوہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان ایک امتیازی علامت یہ ہے کہ مسلمان ٹوپی پر عمامہ پہنتے ہیں۔ "فرق ما بین المسلمین والمشرکین العمائم علی القلانس"۔(۱)

واللہ اعلم

۱۰/۲/ ۱۳۹۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۸ / ۳۰ د)

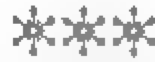

(۱) وفي جامع الترمذي باب العمائم على القلانس رقم الحديث ۱۷۸۴ ج ۴ ص ۲۴۷ (طبع دار احياء التراث العربي بيروت) قال ركانة سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ان فرق ما بيننا وبين المشركين العمائم على القلانس وكذا في سنن ابي داود رقم الحديث ۴۰۷۸ ج ۴ ص ۵۵ (طبع دار الفكر)

﴿کتاب ما یتعلق بالدعوة والتبلیغ﴾

(دعوت وتبلیغ کے مسائل)

تبلیغ اور جہاد کے فرضِ عین اور فرضِ کفایہ سے متعلق تحقیق اور مروّجہ تبلیغی جماعت اور اس میں اوقات لگانے کی شرعی حیثیت

سوال:- سیدی حضرت اقدس حضرت مولانا جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ، مزاج گرامی! دل سے دُعائیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو ہمیشہ صحت و عافیت کے ساتھ خدمتِ دین کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

حضرت! اس ناکارہ کے دل میں حضرت کی جو محبت و عظمت ہے، اس کے اظہار میں طوالت ہوجائے گی، مختصراً عرض ہے کہ حضرت کے لئے دل و جان سے، دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دُعائیں نکلتی رہتی ہیں۔

حضرت کی مصروفیت تو واقعی ہوتی ہیں، تاہم ایک مسئلہ میں حضرت کی رائے مطلوب ہے، دُوسری کسی جگہ سے حضرت جیسی تسلی متوقع نہیں تھی، اُمید ہے جواب سے بہرہ مند فرمائیں گے۔

حضرت! اکابر کی کتابوں سے اور حضرت کے ایک مستقل وعظ ''دین کی حقیقت تسلیم و رضا'' سے یہ بات دل میں بیٹھ گئی ہے کہ دین شوق پورے کرنے کا نام نہیں بلکہ اس وقت جو حکم اور وقت کا تقاضا ہو، اس کے پورے کرنے کا نام دین ہے۔ لیکن دُوسری طرف اپنے اکابر تبلیغی جماعت والوں کے ہاں دین کی حقیقت کو ''قربانی'' کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے تردد ہوتا ہے کہ صحیح طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے؟

مثلاً ہمارے پاکستان کے سابقہ امیر ...... صاحب مدظلہم کا جس ہفتے کا سہ روزہ متعین تھا، اسی ہفتے ان کے سسر کا انتقال ہوگیا، اب وہ سوچ میں تھے کہ کیا کریں؟ تسلیم و رضا کے پیش نظر تو سہ روزہ کو اس ہفتے مؤخر بھی کیا جاسکتا تھا، تاکہ غمزدہ بیوی کو شوہر کے ساتھ رہنے سے تسلی ہو، لیکن امیر صاحب پاکستان نے سہ روزہ کو مقدم رکھا اور چلے گئے، واپسی پر فکرمند تھے کہ بیوی ضرور خفا ہوگی، لیکن بیوی خلافِ توقع بہت محبت سے پیش آئی، اور عرض کیا کہ حضرت ابا جی خواب میں ملے تھے، انہوں نے کہا کہ ... آئے تو اس پر خفا نہ ہونا، اس کے سہ روزہ پر جانے سے اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمادی ہے۔ اب تسلیم و رضا کے تحت نہ نکلتے تو یہ مغفرت کا بہانہ کیسے بنتا؟

اکثر اکابر تبلیغ والوں سے سنتے ہیں کہ انتظامی چلوں اور سالوں سے ثواب تو ہوتا ہے لیکن کفر نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ اس کے لئے ''قربانی'' شرط ہے کہ گھر میں بیوی بیمار ہے، کھیت میں فصل تیار ہے،

جیب میں رقم نہیں، حالات خراب ہیں، تب نکلے گا تو ہدایت عام ہوگی۔ اب تسلیم و رضا کے پیشِ نظر جب بیوی بیمار ہے تو اس کی دلجوئی ضروری ہے، فصل تیار ہے تو کٹائی ضروری ہے، اب اس میں تسلیم و رضا کو دیکھا جائے یا قربانی کو؟ غالباً غزوۂ تبوک میں کھجور بالکل پکی ہوئی تھیں، لیکن دین کی حقیقت قربانی کے پیشِ نظر صحابہؓ اللہ کے راستے میں نکل گئے۔

ایک صاحب نے ایک عالم سے پوچھا کہ ایک شخص اللہ کے راستے میں نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا بوڑھا والد نابینا ہے، جوان بیوی ہے اور آس پاس ماحول بھی سازگار نہیں، اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں۔ اس عالم نے کہا کہ صورتِ مسئولہ میں یہ شخص اگر نکلتا ہے تو بڑا ظالم ہے۔ اس عالم کو بتایا گیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر کی یہی حالت تھی جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے تھے۔ اب تسلیم و رضا کے تحت تو نہ نکلنا سمجھ میں آتا ہے، لیکن بزرگ کہتے ہیں کہ جب اس حالت میں نکلے گا تو جہاں گھر لوٹے گا وہاں اس کا یقین بھی بنے گا اور گھر والوں کا یقین بھی بنے گا کہ حقیقی محافظ اور رازق تو اللہ ہے۔

بعض لوگوں سے یہ بھی سنتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وقت چونکہ بلوغِ اسلام نہیں ہوا تھا، اس لئے ان پر یہ ذمہ داری بڑھی ہوئی تھی، اب تو بلوغِ اسلام ہوگیا ہے، اب وہی ذمہ داری نہیں، جبکہ تبلیغ والے کہتے ہیں کہ جب بے دینی اور دین سے دوری اس دور کے مثل عود کر آئی ہو تو کیا حکم وہی عود کر نہیں آئے گا؟

اکابر اہلِ علم، تبلیغ میں نکلنے کی شرعی حیثیت کو فرضِ کفایہ کہتے ہیں، جبکہ تبلیغ کے بزرگ کہتے ہیں کہ کفایہ کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ فرض کی ادائیگی میں کفایت بھی کر جائے، اب اربوں انسان دین سے دور ہیں، تو کیا سینکڑوں اور ہزاروں کا نکلنا اس فرض کی ادائیگی میں کفایت کر رہا ہے؟

بعض ساتھیوں سے یہ بھی سنتے ہیں کہ ایک سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے تو افطار کروادیئے تھے لیکن تبلیغی سفر موقوف نہیں فرمایا۔ اسی طرح حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو جب غسلِ جنابت کی حاجت تھی، وقت کا تقاضا تو غسل تھا، لیکن انہوں نے اسی ناپاکی کی حالت میں اللہ کے راستے کو مقدم رکھا۔

حضرت! اُمید ہے کہ میں نے اپنے اشکال کی وضاحت کافی حد تک کردی ہے، مزید طوالت مناسب نہیں لگتی۔ حضرت اپنی فقیہانہ بصیرت و خداداد فہم کے تحت اس بات کی کسی قدر تفصیل سے وضاحت فرمادیجئے کہ بعض اوقات جب دین کا تقاضا تبلیغ والے پیش کرتے ہیں تو اس وقت کوئی نہ کوئی شرعی تقاضا بھی درپیش ہو جائے تو تسلیم و رضا کے تحت اس تقاضے کو پورا کیا جائے یا صحابہ کرامؓ کی طرح

قربانی کر کے ان تقاضوں کو مؤخر کر دیا جائے؟

حضرت! مذکورہ اشکال کے ساتھ ایک بات ضمناً عرض کرتا چلوں کہ بعض امور میں اکابر اہل علم اور اکابر اہل تبلیغ کے زاویۂ نگاہ میں کچھ فرق محسوس ہوتا ہے، مثلاً عام اہل علم تبلیغ میں نکلنے کو فرض کفایہ اور تبلیغ والے فرض عین بتلاتے ہیں، جیسے آج سے نصف صدی قبل حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے صحبت اہل اللہ کے فرضِ عین ہونے کا فتویٰ دیا تھا، کیونکہ بدون صحبت اہل اللہ اس وقت اصلاحِ ظاہر و باطن قریب قریب ناممکن تھی۔ اب یہ بات بھی مشاہدہ ہے کہ نکلنے سے نہ صرف عوام بلکہ علماء کرام کی دینی حالت میں جو انقلاب آتا ہے اس کا خود مشاہدہ ہے اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے، تو اگر مقدمۃ الواجب واجبٌ کے تحت نکلنے کو فرض عین بتایا جائے تو اس کی کیا شرعی حیثیت ہوگی؟　　والسلام

بندہ محمد راشد

جواب:- مکرمی و محترمی!　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، آپ احقر ناکارہ کے لئے جس طرح دعائیں کرتے ہیں، اس پر کس زبان سے شکر ادا کروں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بہترین صلہ دنیا و آخرت میں عطا فرمائیں، آمین۔

آپ نے تبلیغی جماعت کے بارے میں جو باتیں پوچھی ہیں، ان کے بارے میں چند اصولی باتیں عرض کرتا ہوں، خدا کرے کہ وہ باعثِ اطمینان ہوں۔

۱- جب جہاد فرضِ عین ہو جائے تو اس وقت ایک ایمرجنسی کی حالت ہوتی ہے، اس وقت نہ تجارت جائز ہے، نہ بیوی بچوں کے عام حقوق اس طرح باقی رہتے ہیں جیسے امن کی حالت میں ہوتے ہیں، اور نہ جہاد کے سوا کوئی اور ایسا کام جائز ہوتا ہے جو جہاد کے منافی یا اس کی راہ میں رکاوٹ بننے والا ہو۔[1] آپ نے صحابہ کرامؓ کے عہد مبارک کی جتنی مثالیں پیش کی ہیں، وہ سب اسی حالت سے متعلق ہیں، غزوۂ تبوک میں جہاد کے فرضِ عین ہونے کا اعلان خود قرآن کریم میں بھی فرمایا گیا تھا،[2] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دو ٹوک الفاظ میں واضح فرما دیا تھا، لہٰذا پکی ہوئی کھیتیاں یا گھر والوں کے مسائل اس فرضِ عین کی ادائیگی میں مانع نہیں ہو سکیں۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ جیسے جانباز صحابی کو حکم دیا کہ وہ مدینہ منورہ میں رہ کر کمزوروں کی دیکھ بھال کریں۔ حضرت علیؓ کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ جہاد کی فضیلت حاصل کریں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے تسلیم و

(۱) تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تصنیف "تکملۃ فتح الملہم" کتاب الامارۃ، مسئلۃ فرضیۃ الجہاد ج:۳ ص ۳۷۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) ما کان لاھل المدینۃ ومن حولھم من الاعراب ان یتخلفوا عن رسول اللہ ولا یرغبوا بانفسھم عن نفسہ' الآیۃ سورۃ التوبۃ ۱۲۰

رضا کی خاطر مدینہ منورہ میں رہے، اور کمزوروں کی دیکھ بھال کی۔(۱) حضرت حنظلہؓ کا واقعہ بھی ایسے ہی وقت کا ہے جب دُشمن حملہ آور ہو چکا تھا اور جہاد فرضِ عین تھا۔(۲) حضرت صدیقِ اکبرؓ پر بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت فرض ہو چکی تھی، اور انہوں نے اسی فریضے کو ادا فرمایا، ورنہ عام حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کی خدمت کو جہاد پر مقدّم قرار دیا، اور ایسے صحابہؓ کو لوٹا دیا جو والدین کو روتا ہوا چھوڑ کر جہاد کے لئے آئے تھے۔(۳)

اگر سہ روزہ یا چلے پر نکلنا اسی درجے میں فرضِ عین قرار دیا جائے جس درجے میں جہادِ نفیرِ عام کے وقت فرض ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تجارت، صنعت، زراعت کچھ جائز نہ ہو، بلکہ ہر انسان ہر وقت تبلیغی سفر پر ہی رہے، جیسا کہ جہاد کے فرضِ عین ہونے کے وقت دُوسرا کوئی کام جائز نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر سہ روزہ یا چلّہ لگانا فرضِ عین ہے تو اس کی حد کیا ہے؟ کتنے سہ روزوں اور کتنے چلّوں سے یہ فرضِ عین ادا ہو جائے گا؟ تو اوّل تو یہ تعیین کس بنیاد پر کی گئی؟ کیا قرآن و حدیث کا کوئی حکم اس کی تعیین کرتا ہے؟ دُوسرے سہ روزہ لگانے کے بعد جب آدمی پورے مہینے تجارت یا زراعت میں مصروف ہوگا تو کیا اس وقت تبلیغی سفر فرضِ عین نہیں ہوگا؟ اگر نہیں ہوگا تو وہ فرضِ عین کہاں رہا؟ اور ہوگا تو تجارت اور کسبِ معاش کیسے جائز ہوا؟

۲ - آپ نے لکھا ہے کہ: ”ایک سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے تو افطار کرا دیئے، لیکن تبلیغی سفر موقوف نہیں فرمایا“ اوّلاً تو یہ تبلیغی سفر نہیں تھا، فتحِ مکہ کے جہاد کا سفر تھا۔(۴) دُوسرے روزے، مشقتِ شدیدہ کی وجہ سے افطار کرائے گئے،(۵) سفر موقوف کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، زیادہ سے

(۱) وفي صحيح البخاري باب من حبسه العذر عن الغزو ج:۱ ص:۳۱۸ حدثنا أحمد بن يونس ثنا زهير ثنا حميد أن أنسا حدثهم قال رجعنا من غزوة تبوك مع النبي صلى الله عليه وسلم ... الخ وثنا سليمان بن حرب ثنا حماد هو ابن زيد عن حميد عن أنس أن النبي صلى الله عليه وسلم كان في غزاة فقال إن أقواما بالمدينة خلفنا ما سلكنا شعبا ولا واديا إلا وهم معنا فيه حبسهم العذر ... الخ وكذا في صحيح مسلم ج:۲ ص:۱۴۱ (طبع قديمي كتب خانه)

(۲) وفي المغني لابن قدامة ج:۹ ص:۱۷۳ (طبع دار الفكر بيروت) مسئلة قال وواجب على الناس إذا جاء العدو أن ينفروا المقل منهم والمكثر ولا يخرجوا إلى العدو إلا بإذن الأمير إلا أن يفجأهم عدو غالب يخافون كلبه فلا يمكنهم أن يستأذنوه ... أن النفير يعم جميع الناس ممن كان من أهل القتال حين الحاجة إلى نفيرهم لمجيء العدو إليهم ولا يجوز لأحد التخلف إلا من يحتاج إلى تخلفه لحفظ المكان والأهل والمال ومن يمنعه الأمير ... وذلك لقول الله تعالى: انْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا (التوبة) وقول النبي صلى الله عليه وسلم إذا استنفرتم فانفروا ... وقال بعد أسطر ... وقد نفر من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو جنب يعني غسيل الملئكة حنظلة بن الراهب ... الخ

(۳) دیکھئے الصحيح لمسلم ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع قديمي كتب خانه) و جامع الترمذي ج:۱ ص:۲۰۰ (طبع فاروقي كتب خانه)

(۴، ۵) وفي الترمذي ج:۱ ص:۸۹ (طبع فاروقي كتب خانه) باب ما جاء في كراهية الصوم في السفر، عن جابر بن عبد الله أن رسول الله صلى الله عليه وسلم خرج إلى مكة عام الفتح فصام حتى بلغ كراع الغميم وصام الناس معه فقيل له إن الناس قد شق عليهم الصيام، وإن الناس ينظرون فيما فعلت، فدعا بقدح من ماء بعد العصر فشرب والناس ينظرون إليه، فأفطر بعضهم وصام بعضهم ... الخ .... (باقی اگلے ...)

زیادہ شدید گرمی تھی، صرف اتنی بات سے جہاد کو ترک کرنا ضروری نہ تھا، کیونکہ اس مشقت کا اثر زیادہ سے زیادہ اپنی ذات پر تھا، کسی کا حق یا مال تلف نہیں ہو رہا تھا۔

۳:- آپ نے فرضِ کفایہ کا جو مطلب لکھا ہے، اگر کفایہ کا یہی مطلب ہے تو پوری تاریخ اسلام میں جہاد کو کبھی ''فرضِ کفایہ'' نہ ہونا چاہئے تھا، کیونکہ غیر مسلموں کی تعداد تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کے تین گنے سے بھی ہمیشہ زائد رہی ہے۔ کروڑوں انسان ہر دور میں دین سے دُور رہے ہیں، لہٰذا جب فقہائے اُمت نے جہاد کو فرضِ کفایہ قرار دیا تو کیا اس وقت دُنیا کی اکثریت مسلمان ہوگئی تھی؟ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا سے تشریف لے گئے تو صحابہ کرامؓ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی جاتی ہے، جو ظاہر ہے کہ اس وقت کی دُنیا کی آبادی کا بہت مختصر حصہ تھا۔ لیکن کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغی سفر کو فرضِ عین قرار دے کر کبھی صحابہ کرامؓ کو یہ حکم دیا کہ وہ سب اپنے حقوقِ واجبہ ترک کر کے دُوسرے شہروں اور ملکوں میں جائیں؟ واقعہ یہ ہے کہ ''فرضِ کفایہ'' کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اگر مسلمانوں کی معتد بہ جماعت یہ کام کر رہی ہے تو اس کا یہ عمل دُوسروں کے فریضے کی ادائیگی کے لئے بھی کافی ہوجاتا ہے۔

۴:- ''تسلیم و رضا'' اور ''قربانی'' میں کوئی تعارض نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت قربانی چاہتی ہے، کبھی یہ قربانی جان کی ہوتی ہے، کبھی مال کی، کبھی خواہشات کی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو تبوک جانے سے روکا اور انہوں نے سرِ تسلیم خم کردیا تو یہ تسلیم و رضا بھی تھی اور خواہش کی قربانی بھی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ کو جنگ بدر میں شرکت سے روکا اور انہوں نے اطاعت کی تو یہ بھی خواہش کی قربانی تھی۔ جب جہاد فرضِ عین ہوجائے اس وقت جان، مال اور دُنیوی خواہشات کی قربانی دی جاتی ہے۔ اور جب فرضِ کفایہ ہو، اور انسان کے لئے شرعاً جانا جائز ہو تب بھی وہ انہی چیزوں کی قربانی پیش کرتا ہے، لیکن جب تک فرضِ عین نہ ہو، یہ قربانی اپنی ذات کی حد تک محدود رہتی ہے، دُوسرے اصحاب حقوق کی قربانی نہیں کی جاتی۔ ہاں! اگر اصحاب حقوق اپنے حقوق خوشی سے چھوڑ دیں تو ان کے لئے باعث اجر ہے، اور اس صورت میں جہاد یا دعوت کے کام میں شرکت باعثِ اجرِ عظیم ہے۔ آپ نے جن بزرگ کی مثال دی کہ ان کے سسر کا انتقال ہوگیا تھا، پھر بھی وہ سہ روزہ پر چلے گئے، ان کے بارے میں عرض یہ ہے کہ اگر ان کی اہلیہ کو ان کے جانے

(گزشتہ سے پیوستہ) وفی جامع الترمذی، أبواب فضائل الجهاد، باب فی الفطر عند القتال ج ۱ ص ۲۰۱، ۲۰۲ (طبع مذکور) عن أبی سعید الخدری قال لما بلغ النبی صلی اللہ علیہ وسلم عام الفتح مرّ الظهران فآذنا بلقاء العدو فأمرنا بالفطر فأفطرنا أجمعین. هذا حدیث حسن صحیح. مزید احادیث اور تفصیل کے لئے دیکھئے درس ترمذی ج ۲ ص ۵۵۵۔ (محمد زبیر حق نواز)

سے کوئی ناقابلِ برداشت تکلیف نہیں ہوئی تو شرعاً ان کا یہ عمل ناجائز نہیں تھا، البتہ افضل ہونے میں رائیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ اور خواب کوئی شرعی حجت نہیں ہے جس سے کسی حکمِ شرعی پر استدلال کیا جائے۔

۵:- یہ بات احقر کی فہمِ ناقص سے بالاتر ہے کہ تبلیغ میں نکلنے پر ہمیشہ صحابہ کرامؓ کے جہاد کے واقعات سے استدلال کیا جاتا ہے، لیکن عملاً جہاد کے بارے میں طرزِ عمل یہ ہے کہ گویا جہاد کوئی شرعی فریضہ ہی نہیں ہے، بلکہ اسے عملاً منسوخ سمجھا جاتا ہے اور جہاد کی بعض اوقات مخالفت بھی کی جاتی ہے۔

۶:- مذکورہ بالا گزارشات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں تبلیغی جماعت کا مخالف ہوں، یا یہ کہ تبلیغ کے کام کو اہمیت نہیں دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تبلیغ کا کام نہایت اہمیت کا حامل ہے، خاص طور پر تبلیغی جماعت نے بفضلہ تعالیٰ مجموعی حیثیت سے بڑا قابلِ تعریف کام کیا ہے اور اس سے اُمت کو بہت فائدہ پہنچا ہے، لیکن کسی کام کی اہمیت واضح کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اسے ہر قیمت پر فرضِ عین قرار دیا جائے۔ دُوسرے، جہاں تبلیغی جماعت کے ساتھ تعاون و تناصر ضروری ہے، وہاں بعض غلو آمیز باتوں کی اصلاح بھی ضروری ہے جو بعض نو وارد یا حدود کی رعایت نہ رکھنے والے حضرات سے سرزد ہوتی رہتی ہیں، اور اب بعض اوقات احکامِ شرعیہ میں تصرف کی حد تک پہنچ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کی صحیح فہم اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۸/۳/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۴۵/۲۷۶)

عورتوں کے لئے تبلیغی اجتماع میں شرکت کا حکم

سوال:- جس طرح مرد مسجد میں تبلیغ کرتے ہیں، اسی طرح عورتیں بھی مبلغ ہیں، محلے کی عورتوں کو دعوت دیتی ہیں، ان کی طرف سے مرد، مسجد میں اعلان کرتے ہیں کہ فلاں جگہ عورتوں کا اجتماع ہے، آپ حضرات اپنی ماں، بہنوں کو وہاں بھیجیں۔ عورتوں کا اس قسم کے اجتماع کے لئے غیر محرم کے گھر جانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر عورتیں پردے کے اہتمام کے ساتھ تبلیغی اجتماع میں جائیں تو جائز ہے، بلکہ بحالاتِ موجودہ ایسے اجتماعات میں عورتوں کی شرکت مفید ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۵۵۲ ھ)

جو خود دین کا پابند نہ ہو، کیا وہ تبلیغ کرسکتا ہے؟

سوال:- ایک شخص خود تو دین کا پابند نہیں ہے، لیکن وہ تبلیغ کرتا ہے، تو کیا وہ ایسا کرسکتا ہے؟
جواب:- کرسکتا ہے،[1] لیکن خود بھی دین کی پابندی کی پوری کوشش کرنی واجب ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۵/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۸/۲۸ الف)

ایک حدیث کی رُو سے تبلیغ کو ترک کرنے کا حکم

سوال:- جب تم دیکھو کہ حرص کی اطاعت کی جارہی ہے، خواہش نفس کی پیروی کی جارہی ہے، دُنیا کو آخرت پر ترجیح دی جارہی ہے، اور ہر شخص اپنی رائے کو اچھا سمجھتا ہے تو اپنی فکر کرو اور عوام کی فکر چھوڑ دو۔ کیا وہ وقت اس وقت موجود ہے؟ اگر موجود ہے تو ''عوام کی فکر'' اس میں کون سے اُمور شامل ہیں؟ کیا تبلیغ ترک کردی جائے؟

جواب:- حدیثِ مذکور[2] میں جس زمانے کا ذکر ہے، بظاہر ابھی وہ دَور نہیں آیا، ابھی تبلیغِ دین کا فریضہ ساقط نہیں ہوا، بحالاتِ موجودہ تبلیغ فائدے سے خالی نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲۸/۲/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۳۲۹/۱۹ الف)

والدین کی اجازت کے بغیر تبلیغ یا کسی اور سفر پر جانے کا حکم

سوال:- بندہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں رہتا ہے، ایک نہایت معتبر عالم نے بیان کیا کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں یہ فتویٰ دیا ہے کہ والدین کی اجازت کے بغیر تبلیغی جماعت کے ساتھ جانا جائز ہے، لیکن معارف القرآن میں تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہیں ملا۔ غالباً ان کو کتاب کے نام

---

(۱) تفصیل کے لئے معارف القرآن ج:۷ ص ۲۲۴، ۲۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی التفسیر للطبری ج ۷ ص ۹۰ (طبع دار الفکر بیروت) عن ابی امیة الشعبانی قال سألت أبا ثعلبة الخشنی کیف نصنع بهذه الآیة "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ" فقال ابو ثعلبة سألت عنها خبیرًا سألت عنها رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال ائتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنکر حتی اذا رأیت شحًا مطاعًا وهوًی متبعًا واعجاب کل ذی رأی برأیه فعلیک بخویصة نفسک وذرهم فان وراءکم أیاما أجر العامل فیها کأجر خمسین منکم ... الخ اور حدیثِ مذکور کے آخری الفاظ کے ہم معنی الفاظ "علیک بأمر خاصة نفسک ودع امر العامة" جامع الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الفتن ص ۴۳۶ (طبع قدیمی کتب خانہ) میں بھی موجود ہیں۔ (مرتب عفی عنہ)

میں مغالطہ ہوا، آپ کی طرف رجوع فرمانے کا انہوں نے مشورہ دیا، اس بنا پر آنجناب سے درخواست ہے کہ اگر مفتی محمد شفیع صاحب نے یہ فتویٰ تحریر فرمایا ہو تو اس کا متن مع استفتاء تحریر فرمادیں اور ساتھ ہی کتاب کا نام اور صفحے کا حوالہ بھی تحریر فرمائیں، کیونکہ تبلیغی حضرات بڑی شدّت کے ساتھ اس چیز کو بیان فرماتے ہیں کہ اس وقت ان حضرات کا جماعتوں میں جانا تبلیغ کے لئے نہیں ہے بلکہ اس وقت ان کا گھر سے نکلنا اس بات کے لئے ہے کہ مسلمان کو اس کی کھوئی ہوئی دولت، جس کو دعوت الی اللہ کہتے ہیں، دوبارہ مل جائے اور ہر مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کے غم اور جذبے کو اپنا غم اور جذبہ بنائے، اور اسی چیز کو یہ حضرات دین کی اساس کہتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ اس کے نہ ہونے کی وجہ سے آج سرِعام اللہ کے احکام کو توڑا جا رہا ہے اور سنتوں کو پامال کیا جا رہا ہے۔

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ان حالات کی بناء پر کسی شخص کا والدین اور بیوی بچوں کے حقوق کی وجہ سے گھر میں بیٹھے رہنا ناجائز ہے، اور اپنی بات کے حق میں یہ دلائل پیش کرتے ہیں کہ وہ تمام صحابہ کرامؓ جو اپنے والدین کو، اپنے بیوی بچوں کو فاقوں میں چھوڑ کر گھروں سے نکلے، کیا انہوں نے غلط کیا؟ اور اس سلسلے میں بے شمار واقعات پیش کرتے ہیں۔ اور یہاں تک کہتے ہیں کہ کیا نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں غلط حکم دیا؟ اس سلسلے میں قرآنِ پاک کی آیتیں پیش کرتے ہیں، مثال کے طور پر: "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ"، "اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا"، "قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآءُکُمْ وَاَبْنَآءُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ" وغیرہ وغیرہ۔

میرے جیسے حضرات ان کے یہ بھاری بھرکم دلائل سن کر خاموش ہو جاتے ہیں، ابھی پچھلے دنوں ایک صاحب نے بیان کیا کہ مسلمان کا دعوت نہ دینا ساری انسانیت پر ظلم ہے، مطلب یہی ہے کہ جن چیزوں کی وجہ سے یہ دعوت دینے سے رُکے گا وہ بھی ظلم کہلائے گا۔ براہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں، نیز یہ کہ اگر یہ کام حق ہے تو کس درجے کا حق ہے؟ یعنی نفلی عبادت کے زُمرے میں ہے یا سنت و واجب؟ یا موجودہ حالت میں سارے فرائض سے بڑھ کر سب سے بڑا فرض ہے؟

جواب:- والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا کوئی فتویٰ اس اطلاق کے ساتھ احقر کے علم میں نہیں، ویسے مسئلہ یہ ہے کہ اگر والدین تنگ دست ہوں اور بیٹے کے سفر پر جانے کی صورت میں ان کے خرچ کا انتظام نہ ہو، یا ضعیف اور بیمار ہوں اور ان کی خدمت اور خبرگیری کے لئے اور کوئی موجود نہ ہو، تب تو ان کی اجازت اور مرضی کے خلاف کسی بھی سفر میں جانا جائز نہیں، خواہ وہ سفر تبلیغ کا ہو، یا تحصیلِ علم کا، یا حج و عمرہ کا، لیکن اگر ان کے خرچ کا بھی انتظام ہے اور خبرگیری کرنے والے بھی موجود ہیں تو ایسی صورت میں فقہاء نے ایسے سفر کی اجازت دی ہے جس میں ہلاکت کا

گمان غالب نہ ہو، اس حال میں اگر والدین کی اجازت کے بغیر بھی کوئی شخص تبلیغ کے سفر پر چلا جائے تو إن شاء اللہ گناہ نہ ہوگا۔

قال محمدؒ فی السیر الکبیر اذا أراد الرجل أن یسافر الی غیر الجهاد لتجارة أو حج أو عمرة وکره ذلک أبواه فان کان یخاف الضیعة علیهما بأن کانا معسرین ونفقتهما علیه، وماله لایفی بالزاد والراحلة ونفقتهما فانه لا یخرج بغیر اذنهما . وان کان لا یخاف الضیعة علیهما بأن کانا موسرین لم تکن نفقتهما علیه.

ان کان سفرا لا یخاف علی الولد الهلاک فیه کان له أن یخرج بغیر اذنهما . . وکذا الجواب فیما اذا خرج للفقه. (عالمگیریة ج ۵ ص ۳۶۵ کتاب الحظر والاباحة باب ۲۶)[1]

البتہ اگر یہ سفر ایسا خطرناک ہو کہ اس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو، مثلاً جہاد (بشرطیکہ نفیرِ عام نہ ہو) یا شدید گرمی یا سردی میں پیدل صحراؤں، پہاڑوں کا سفر ہو تو اس میں والدین کی اجازت ضروری ہے۔ شمس الائمہ سرخسیؒ تحریر فرماتے ہیں: لأن بر الوالدین وترک ما یلحق الضرر والمشقة بهما فرض علیه عینا والجهاد فرض علی الکفایة اذا لم یقع النفیر عاما فعلیه أن یقدم الأقوی، وفی خروجه الضرر والمشقة بهما فان المجاهد علی خطر فی التمکن من الرجوع. (شرح السیر الکبیر ج ۴ ص ۲۸)[2]۔ اس صورت کے لئے علامہ سرخسیؒ نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ: ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ”میں آپؐ کے ساتھ جہاد کرنے کے لئے آیا ہوں اور والدین کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں“، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”واپس جاؤ اور جس طرح انہیں روتا چھوڑ کر آئے ہو اب جا کر انہیں ہنساؤ“ (ایضاً ص ۱۲۸)[3]۔

اور جو صحابہ کرامؓ والدین کو چھوڑ کر جہاد کے لئے جاتے تھے وہ یا تو نفیرِ عام کی بناء پر یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی حکم سے یا والدین کی اجازت اور رضامندی سے جاتے تھے، اور عام سفروں میں جانا ہوتا تو ان کی خبرگیری کا انتظام کر کے جاتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نہ علی الاطلاق یہ کہا جاسکتا ہے کہ تبلیغی سفر کسی بھی حال میں والدین کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر حال میں جائز ہے، بلکہ اس کی تفصیل وہی ہے جو

---

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

(۲، ۳) شرح السیر الکبیر رقم المسئلة: ۲۱۶، ۲۱۷ ج:۱ ص:۱۹۲ (ناشر مولانا نصر اللہ منصورؒ)

وفی الدر المختار کتاب الجهاد ج ۴ ص ۱۲۴، ۱۲۵ (طبع سعید) لا یفرض علی صبی وبالغ له أبوان أو أحدهما لأن طاعتهما فرض عین وقال علیه الصلوة والسلام للعباس بن مرداس لما أراد الجهاد " الزم أمک فان الجنة تحت رجل أمک " سراج، وفیه لا یحل سفر فیه خطر الا باذنهما وما لا خطر فیه یحل بلا اذن وفی الشامیة (قوله فیه خطر) کالجهاد وسفر البحر والخطر لخ (قوله وما لا خطر) کالسفر للتجارة والحج والعمرة یحل بلا اذن الا ان خیف علیهما الضیعة. سرخسی

اُوپر گزری۔

حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے بھی حقوق الوالدین[1] میں یہی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۲/۲۸ الف)

تبلیغ میں وقت لگانے کے ساتھ حقوق العباد ادا کرنا لازم ہے

سوال:- تبلیغی جماعت میں وقت لگانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کا کام کیسا ہے؟ نیز تبلیغِ دین کی شرائط کیا ہیں؟ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا کیا حکم ہے؟

جواب:- تبلیغی جماعت کا کام مفید ہے، البتہ تبلیغِ دین کی شرائط کسی عالمِ دین سے معلوم کرلی جائیں، ان کے مطابق عمل کیا جائے، اور حقوق العبد کی ادائیگی کا پورا اہتمام کیا جائے۔

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

بعض تبلیغی واعظوں کی طرف سے غیرمحتاط باتوں کی بناء پر تبلیغی جماعت کو ترک کرنا

سوال:- تبیغ جو خاکسار کے نزدیک صحیح بھی ہے، اس میں چند لوگ (واعظ) وعظ کے درمیان شرک کی باتیں کہہ دیتے ہیں، چونکہ جماعت میں اکثر اَن پڑھ ہوتے ہیں، ایسی حالت میں ان کے ساتھ جانا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- تبیغی جماعت سے دین کو مجموعی طور پر بڑا نفع پہنچ رہا ہے، اس میں شریک ہونا بہتر ہی بہتر ہے، البتہ بعض اوقات چونکہ جماعت کے اُمراء عالم نہیں ہوتے، اس لئے ان کے منہ سے غیرمحتاط باتیں نکل جاتی ہیں، ایسے موقع پر اُن کو نرمی اور محبت سے سمجھا دینا چاہئے، اور وہ بات نہ سمجھیں تو جماعت کے اکابر میں سے کسی کی طرف رُجوع کرکے ان کے ذریعہ فہمائش کرادینی چاہئے، لیکن اس بناء پر جماعت کو نہ چھوڑیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۵۵/۲۷ د)

(۱) دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۴۸۵ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

﴿کتاب التصوّف والکشف والالهام والرّؤیاء﴾

(تصوّف، کشف، الہام اور خوابوں سے متعلق مسائل کا بیان)

شیطان کا خواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں نہ آسکنا

سوال:- شیطان، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل مبارک میں نہیں آسکتا، لیکن کیا شیطان کسی اور صورت میں آکر یہ کہنے کی طاقت رکھتا ہے کہ نعوذ باللہ یوں کہہ دے کہ میں رسول ہوں یا یہ کہنے کی طاقت نہیں رکھتا؟ اس کی وضاحت فرمادیں۔

جواب:- شیطان، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت اور حلیہ مبارکہ میں نہیں آسکتا[1]، لیکن کسی اور کی صورت میں آکر دھوکا دے سکتا ہے، یعنی یہ جھوٹا دعویٰ کرسکتا ہے کہ میں یا فلاں شخص رسول ہوں۔ ان الشیطان قد یأتی النائم فی صورة ما من معارف الرائی وغیرهم فیشیر له الی رجل آخر. هذا فلان النبی وهذا الملک الفلانی أو من أشبه هؤلاء ممن لا یمثل الشیطان به فیوقع اللبس علی الرائی بذلک. (الاعتصام للشاطبیؒ ج ۱ ص ۲۱۲)[2]۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۱/۲۸ ب)

بزرگ سے ملاقات کے موقع پر خود اپنے ہاتھ کو چومنا

سوال:- کسی عالمِ دین یا بزرگ سے ملاقات کرنے کے بعد خود اپنے ہاتھ کو چومنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- فی الدر المختار: وکذا ما یفعله الجهال من تقبیل ید نفسه اذا لقی غیره فهو مکروه فلا رخصة فیه۔ (شامی حظر واباحت ج ۵ ص ۳۳۷)[3]۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دُوسرے سے ملاقات کے وقت اپنے ہاتھ چومنا مکروہِ تحریمی ہے، البتہ کسی بزرگ کے ہاتھ کبھی کبھی

---

(۱) عن ابی هریرة رضی الله عنه انّ رسول الله صلی الله علیه وسلم قال. من رای فی المنام فقد رای فان الشیطان لا یتمثل بی، وفی روایة فی صورتی متفق علیه مشکوة المصابیح ج ۲ ص ۳۹۴ وانظر فی جامع الترمذی، باب ما جاء فی قول النبی صلی الله علیه وسلم من رای فی المنام فقد رای ج ۲ ص ۵۲ (طبع میر محمد کتب خانه)
نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۲۲۳ تا ۲۲۵۔

(۲) الاعتصام للشاطبیؒ ج:۱ ص:۲۶۳ (طبع دار المعرفة بیروت).

(۳) الدر المختار، حظر واباحت ج ۲ ص ۳۸۳، وفی مجمع الانهر شرح ملتقی الأبحر ج ۴ ص ۲۰۵ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) کتاب الکراهیة وتقبیل ید العالم وفی الدر المنتقی تحته ان لنیل الدنیا کره کتقبیل ید نفسه أو ید صاحبه

بقصدِ تبرک چوم لئے جائیں تو مضائقہ نہیں۔ کما فی الدر۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۹ الف)

کشفِ قبور اور انوار وتجلیات کے مشاہدے کی شرعی حیثیت

سوال:- .... صاحب نے اپنے خلیفہ .... صاحب کو نوشکی ضلع چاغی بھیجا ہے، یہ ان کے پُرانے مرید ہیں، .... صاحب کا مسلک مختصراً درج ذیل ہے۔ ۱:- تصوف میں نقشبندی اویسی سلسلہ، ۲:- کشفِ قبور، دعویٰ کے ساتھ فرماتے ہیں چھ مہینے کے اندر ان کو سب کچھ ہم دِکھاتے ہیں اور رُوحانی طور پر براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات وغیرہ، ۳:- کشفِ قبور کو اس وقت ایک سنت مردہ قرار دے دیا گیا ہے، کوئی اس کے احیاء کی کوشش کرے گا تو اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ اس طریق میں شمولیت اختیار کرنا کیسا ہے؟ کیا رُوحانی تربیت حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے شریعتِ مطہرہ میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- کشفِ قبور اور بعض انوار وتجلیات کا مشاہدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے کسی بندے کو کرادیا جائے تو ممکن بھی ہے اور اس میں کوئی بات خلافِ شرع بھی نہیں، البتہ یہ چیزیں شریعت وطریقت میں مقصود نہیں،[2] مقصود اتباعِ سنت وشریعت اور اصلاحِ اعمال واخلاق ہے، اس قسم کے کشف وغیرہ کو مقصود بنانا یا سنت قرار دینا، بدعت ہے، اور جو لوگ اس کو مقصود سمجھ کر کریں ان کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہئے، ان کے بجائے ایسے شیخ کو اختیار کریں جو متبعِ سنت ہوں اور اعمال واخلاق کی اصلاح کی فکر کرتے ہوں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۰/۱۰/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۱۱/۳۲ ج)

بغیر عمل کے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا حسنِ ظن رکھنا

سوال:- اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا حسنِ ظن بلا عمل رکھنے کا کیا حکم ہے؟ بالخصوص فرائضِ شرعیہ مثل نماز جس کا ہر ایک مکلف ہے، چھوڑ کر حسنِ ظن رکھنا دُرست ہے یا نہیں؟ ایسا نظریہ رکھنے والے شخص کا کیا حکم ہے؟ اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ کو ہماری عبادت کی ضرورت نہیں، وہ ویسے ہی

---

(۱) وفی الدر المختار مع رد المحتار ج ۲ ص ۳۸۳ (ولا بأس بتقبیل ید) الرجل (العالم) والمتورع علی سبیل التبرک .... الخ.

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے، شریعت وطریقت ص ۲۷۷، شریعت وتصوف ص ۱۷۱، کشف الحقیقۃ ص ۶۵ تا ۱۱۰، تعلیم الدین ص ۷۰، ۸۵۔

معاف کردے گا۔

جواب:- اللہ کی ذات سے مغفرت کا حسنِ ظن رکھنا اچھی بات ہے، لیکن اس کا حق اس شخص کو پہنچتا ہے جو اللہ کے اَحکام کی پابندی کرتا ہو،[۱] اس لئے اس خیال سے فرائضِ شرعیہ کا چھوڑنا گناہِ عظیم ہے۔[۲] اللہ عبادت کا محتاج نہیں، لیکن انسان اپنی نجات اور فائدے کے لئے اس کی عبادت کا محتاج ہے، اگر صرف یہ حسنِ ظن کافی ہوتا تو اللہ کو قرآن اور حدیث کے ذریعہ اتنے اَحکام بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی تاکید کیوں فرماتے تھے؟ اس شخص کو چاہئے کہ اپنے ان خیالات سے توبہ کرے۔

واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸ الف)

شیخِ طریقت کے لئے کیا شرائط ہیں؟

سوال:- شیخِ طریقت کے لئے کیا شرائط ہیں؟ اور مجتہد کی کیا شرائط ہیں؟

جواب:- شیخِ طریقت ہونے کے لئے بہت سی شرائط ہیں، جن کی تفصیل یہاں مشکل ہے، مختصر یہ ہے کہ کسی کامل شیخِ طریقت نے اسے بیعت کرنے کی اجازت دی ہو، تفصیل کے لئے دیکھئے ''قصد السبیل'' از حضرت تھانویؒ و ''آداب الشیخ والمرید'' از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور مجتہد کے لئے بھی بہت سی شرائط ہیں جن کی تفصیل اُصولِ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

سوال۲:- شریعت، طریقت، حقیقت ومعرفت کی کیا تعریف ہے؟

جواب:- اس کا جواب بھی تفصیل طلب ہے، ''تعلیم الدین'' یا ''قصد السبیل'' یا ''شریعت و

(۱، ۲) وفی جامع الترمذی ج ۴ ص ۶۳۸ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) باب ۲۴۵۹ عن شداد بن أوس عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: الکیّس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت، والعاجز من اتبع نفسه هواها وتمنّی علی الله. قال هذا حدیث حسن ومعنی قوله من دان نفسه یقول حاسب نفسه فی الدنیا قبل أن یحاسب یوم القیامة.
وفی الترمذی أیضًا ج ۲ ص ۶۴ (طبع ایچ ایم سعید) باب ما جاء فی حسن الظن بالله تعالی، عن ابی هریرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان الله تعالی یقول أنا عند ظن عبدی بی، وأنا معه اذا دعانی. هذا حدیث حسن صحیح. وفی تحفة الأحوذی ج ۳ ص ۵۳ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) أی أنا أعامله علی حسب ظنه بی، وأفعل به ما یتوقعه منی من خیر أو شر، والمراد الحث علی تغلیب الرجاء علی الخوف وحسن الظن بالله. وقال القرطبی فی المفهم معنی ظن عبدی بی ظن الاجابة عند الدعاء وظن القبول عند التوبة وظن المغفرة عند الاستغفار وظن المجازاة عند فعل العبادة بشروطها تمسکًا بصادق وعده، قال: ویؤیده قوله فی الحدیث الآخر ادعوا الله تعالی وأنتم موقنون بالاجابة. قال: لذلک ینبغی للمرء أن یجتهد فی القیام بما علیه موقنًا بأن الله یقبله ویغفر له، لأنه وعد بذلک وهو لا یخلف المیعاد. قال: وأما ظن المغفرة مع الاصرار فذلک محض الجهل والغرّة وهو یجر الی مذهب المرجئة ..... الخ. (محمد زبیر)

طریقت" تصانیف حضرت تھانویؒ کا مطالعہ فرمایئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۲۶/۲۷ و)

خواب کی وجہ سے قبر کو اُکھاڑنا

سوال:- میری بیٹی جس کا نام عظیمہ عرف "چھوگڑیا" تھا، جس کو لانڈھی مل ایریا کے قبرستان میں دفن کردیا ہے، اس کو بڑی تکلیف اُٹھانی پڑی، خیر یہ تو خدا کی مرضی ہے، اس کی عمر ۵ سال تھی، مجھ سے بہت پیار کرتی تھی، ۱۰ دن فوت ہوئے ہوئے ہیں، مگر میرے خواب میں برابر آتی ہے، میرے کانوں میں دن کے وقت یہ آواز گونجتی رہتی ہے کہ: "بابا میں زندہ ہوں، مجھے باہر نکالو۔" آج مؤرخہ ۲۱ر شعبان کو میں نے کچھ ساتھیوں کے ساتھ قبر کے سرہانے کا پتھر نکال کر دیکھا تو وہ ویسے ہی سو رہی تھی، میرے سوا کسی نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا، کیا اس کا کچھ کفارہ ادا کرنا ہوگا؟

جواب:- اس قسم کے خوابوں کی وجہ سے قبر کو اُکھاڑنا شرعاً بالکل ناجائز ہے،[1] اور ایسا کرنے سے آپ نے گناہ کا ارتکاب کیا، اب اس کا کفارہ یہی ہے کہ صدقِ دِل کے ساتھ توبہ و استغفار کریں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۶/۲۸ ج)

خواب کی قسمیں اور خواب میں شیطانی خیالات واوہام اور رُؤیائے صادقہ میں فرق کی تدبیر

سوال:- انسان عالمِ خواب میں کچھ نظارے دیکھتے ہیں، دو حال سے خالی نہیں، رُوحانی یا تخیلی، اگر شقِ اوّل ہے تو کسی اجنبی یا جان پہچان بزرگوں کو دیکھنا اور کلام کرنا۔ کسی اجنبی مردہ بمع قبر یا جان پہچان کو لین دین، خوشی یا غمی میں دیکھنا، کلام کرنا کسی اجنبی عورت یا جان پہچان کو اجنبی مقام یا جانی پہچانی جگہ میں دیکھنا، کلام کرنا، صحبت کرنا کیسا ہے؟ نیز بچہ، جوان، بوڑھی میں تو فرق نہیں ہے؟ اور کیا یہ واقعۃً ایسا ہوتا ہے؟

دریافت طلب اَمر یہ ہے کہ اگر واقعی رُوح کو اپنے جسم سے نکل کر کہیں جانا دُرست ہے تو رُوح کی صحبت سے جسم میں حرارت ولذّت محسوس ہونا کیسا ہے؟

---

(۱) وفي الاعتصام للشاطبيؒ ج ۱ ص ۲۶۰ (طبع دار المعرفة بيروت) ان الرؤيا من غير الأنبياء لا يحكم بها شرعًا على حال إلّا أن تعرض على ما في أيدينا من الاحكام الشرعية فان سوغها عمل بمقتضاها، وإلّا وجب تركها والاعراض عنها وانما فائدتها البشارة أو النذارة خاصة وما استفادة الأحكام فلا ... الخ نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۵۳۰۔

اگر شقِ آخر ہے تو انسان جاگتے وقت کتنا ہی اپنا خیال دوڑائے لیکن اسے اجنبی عورت، اجنبی مقام اور اجنبی بزرگوں کا تو خیال آتا ہی نہیں اور نہ ہی کوئی چیز کھانے سے یا صحبت کرنے سے حرارت و لذّت محسوس ہوتی ہے، اگر خواب نبوّت کے چالیس حصوں میں سے ایک ہے تو بعض خواب شیاطین و جنات کی طرف سے بھی ہوتے ہیں، ان میں فرق کرنے کی کوئی معقول تدبیر تحریر فرمائیں۔

جواب:- بعض خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں، اور رُؤیائے صادقہ ہوتے ہیں، ان کو حدیث میں نبوّت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا ہے،[1] بعض شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں جن میں عموماً فسق و فجور یا گندگیاں نظر آتی ہیں، بعض محض خیالات ہوتے ہیں،[2] اور چونکہ ان تینوں کے درمیان فرق کرنے کی کوئی یقینی صورت موجود نہیں، اس لئے دین میں خواب حجت نہیں ہیں،[3] اور خواب میں رُوح کا تعلق جسم سے باقی رہتا ہے اس لئے رُوحانی لذّت والے خواب کا اثر جسم بھی محسوس کرتا ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۴/۲۸ ب)

کیا بینک ملازم رہتے ہوئے شیخِ کامل بن سکتا ہے؟

سوال:- ایک شخص کسی شیخِ کامل سے منسلک ہے، وہ کسی بینک یا ازقسم بینک میں ملازمت کرتے ہوئے اللہ کا مقرب بندہ بن سکتا ہے؟ اور اس کے ذمہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے رُشد و ہدایت کی کوئی دینی خدمت سپرد کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- بینک کی ملازمت ناجائز ہے،[4] دُوسری ملازمت تلاش کی جائے اور جب تک

---

(۱) وفی جامع الترمذی باب أن رؤیا المؤمن جزء من ستة وأربعین جزأ من النبوة ج ۲ ص ۵۱ (میر محمد کتب خانہ) عن عبادة بن الصامت أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال رؤیا المؤمن جزءٌ من ستة وأربعین جزء من النبوة.

(۲) اور خواب کی ان تینوں قسموں (یعنی رُؤیائے صادقہ اور شیطان کی طرف سے آنے والے خواب اور محض خیالات) کا ذکر اس حدیث شریف میں آیا ہے: عن أبی ہریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اقترب الزمان لم تکد رؤیا المؤمن تکذب، وأصدقہم رؤیا أصدقہم حدیثا، ورؤیا المسلم جزء من ستة وأربعین جزأ من النبوة، والرؤیا ثلاث فالرؤیا الصالحة بشری من اللہ، والرؤیا من تحزین الشیطان، والرؤیا مما یحدث الرجل نفسہ، فاذا رای أحدکم ما یکرہ فلیقم ولیتفل ولا یحدث بہ الناس قال وأحب القید فی النوم وأکرہ الغلّ القید ثبات فی الدین ہذا حدیث صحیح جامع الترمذی، باب أن رؤیا المؤمن جزء من ستة وأربعین جزأ من النبوة ج ۲ ص ۵۱ (طبع میر محمد کتب خانہ)

(۳) وفی الاعتصام للشاطبیؒ ج ۱ ص ۲۶۰ (طبع دار المعرفة بیروت) أن الرؤیا من غیر الأنبیاء لا یحکم بہا شرعا علی حال الا أن تعرض علی ما فی أیدینا من الأحکام الشرعیة فان سوغتہا عمل بمقتضاہا، والا وجب ترکہا والاعراض عنہا وانما فائدتہا البشارة أو النذارة خاصة، وأما استفادة الأحکام فلا الخ نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج ۱ ص:۵۳۰ سوال نمبر ۲۶۰۔

(۴) بینک ملازمت کی اقسام اور اس کے حکم سے متعلق فتویٰ ان شاء اللہ "کتاب الاجارۃ" میں اپنے مقام پر آئے گا۔ (محمد زبیر)

دُوسری ملازمت باوجود کوشش کے نہ ملے اس ملازمت کو بُرا سمجھتے ہوئے اس میں لگے رہیں، اور جونہی ملازمت ملے چھوڑ دیں، اس دوران میں عام دینی خدمات انجام دے سکتے ہیں، مگر مرشد و مربی کا منصب اس ملازمت کو باقی رکھتے ہوئے حاصل نہیں ہوسکتا۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۶/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۶۴۹ الف)

ایک خواب کی حقیقت

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے کہ میرے والد کو کثرت سے رُؤیائے صادقہ ہوتے تھے اور میرے والد کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا محبت، عشق اور تعلق ہے، جس کی مثال عالم میں کم ملے گی، والد بیمار ہوگئے تو خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ تم بیمار ہوتے ہو تو میں بھی بیمار ہو جاتا ہوں، تمہارے سر میں درد ہوتا ہے تو میرے سر میں بھی درد ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسے خواب یقین کرنے کے قابل ہیں؟ اور یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرنا شریعت میں کیا حکم رکھتا ہے؟ عنداللہ جواب سے مطلع فرما کر اس ذہنی اُلجھن سے نجات دلائیں۔

جواب:- نہ یقین کرنے کی ضرورت ہے، نہ انکار کرنے کی، اگر کسی مسلمان کو اس قسم کا خواب نظر آئے تو اس میں کوئی بُعد نہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ واقعۃً ایسا خواب کسی کو نظر آیا ہے یا نہیں؟ اس کو معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ بجز دیکھنے والے کے قابلِ اعتماد ہونے کے، کوئی نہیں۔ اگر قابلِ اعتماد ہو تو تصدیق بھی کی جاسکتی ہے اور یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں ہے جس پر ایمان لانا واجب ہو، اس لئے اگر کوئی شخص اس پر یقین نہ کرے تب بھی اس کو ہدفِ ملامت نہیں بنا سکتے۔ واللہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۵۹/۳۰ د)

قطب اور ابدال کی حقیقت
اور کیا زمین میں چار قطب ہوتے ہیں؟

سوال:- چند لوگ کہتے ہیں کہ زمین کے چار قطب ہیں جو کہ زمین کے چار برابر حصوں میں رہتے ہیں اور یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے، یہ قطب زمین کی حفاظت کرتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- اقطاب وابدال تکوینیات کی اصطلاحیں ہیں، جن کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، قرآن وحدیث میں بھی ان کی تفصیلات موجود نہیں ہیں، البتہ صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے مکاشفات وتجربات ہیں،( ) جن کی تردید بھی نہیں کی جاسکتی، لیکن دین کے کسی مسئلے پر عمل یا عقیدہ ان اصطلاحات کو جاننے یا تسلیم کرنے پر موقوف نہیں ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۵۵/۲۷ و)

سلسلۂ قادریہ کے افراد میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی رُوح کے حلول کا عقیدہ

سوال:- کیا حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی رُوح، سلسلۂ قادریہ کے آدمیوں کے اندر حلول کرکے بات کرسکتی ہے؟ اگر نہیں کرسکتی تو ایسا بولنے اور عقیدہ رکھنے والوں کا کیا حکم ہے؟

جواب:- حلول کا یہ عقیدہ اسلام کے قطعی طور پر خلاف ہے، ایسا عقیدہ رکھنے والا گمراہ ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۰/۲۸ ب)

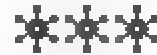

( ) قطب اور بدل وغیرہ القاب سے متعلق تحقیق وتفصیل کے لئے علامہ سیوطی رحمہ اللہ کا رسالہ "الخبر الدال علی وجود القطب والأوتاد والنجباء والأبدال"، اور حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "معارف لدنیہ" ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

﴿کتاب الذکر والدعاء والتعویذات﴾

(ذکر، دُعا اور تعویذات کے بیان میں)

دُعا کس قسم کی عبادت ہے؟

سوال:- دُعا عبادت ہے، اگر عبادت ہے تو کس قسم کی ہے؟ دُعا کو تمام عبادتوں کا مغز بتلاتے ہیں، حدیث کی رُو سے تمام عبادتوں کا نچوڑ ہے، کوئی ناسمجھ انسان عبادتوں کا نچوڑ سمجھ کر دُعا کو ہی عبادت نہ تصوّر کرنے لگے؟

جواب:- دُعا عبادت بھی ہے،(۱) اور عبادتوں کا مغز بھی،(۲) لہٰذا اسے عبادت سمجھنا دُرست ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دُوسری عبادتیں انجام نہ دی جائیں بلکہ جتنی عبادتیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائی ہیں ان سب پر حسبِ مراتب عمل کرنا چاہئے، انہی میں سے دُعا بھی ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰/۲۸ الف)

عزّت حاصل کرنے کے لئے ''یا عزیز'' کا وظیفہ پڑھنا

سوال:- مجموعۂ وظائف کے صفحہ ۱۵۵ پر درج ہے اسمِ اخلاص عزیز اس کو ایک لاکھ مرتبہ پڑھے توجہ سے یعنی مطلب اس کا اصطلاحِ تصوّف میں یہ ہے کہ اے اللہ! مجھ کو اپنی عزّت کے واسطے سے عزّت والوں میں داخل کر، عزّت والوں کا کام مجھے عطا کر، مجھ کو عزّت دے، عزّت والے بندوں میں داخل کر، اگر یا کے ساتھ پڑھے تو یا عزیز بالتنوین پڑھے۔ مندرجہ بالا وظیفہ پڑھ سکتے ہوں یا نہیں؟ اگر میں ایک ہی مرتبہ ایک لاکھ مرتبہ نہ پڑھ سکوں تو کوئی متبادل طریقہ ہوسکتا ہے؟ وظیفہ پڑھنے کے درمیان کیا احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں؟

جواب:- مذکورہ بالا مقاصد کے لئے ''یا عزیز'' کا وظیفہ پڑھنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، اور شرعی اعتبار سے اس کی کوئی خاص مقدار مقرّر نہیں، عملیات کے نقطۂ نظر سے ایک لاکھ مرتبہ

---

(۱) الدعاء هو العبادة، صحيح ابن حبان ج ۲ ص ۱۲۴ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) و مشكوة المصابيح ج:۱ ص ۱۹۴ (طبع قديمي كتب خانه)

(۲) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الدعاء مخ العبادة رواه الترمذي، مشكوة المصابيح كتاب الدعوات ج ص ۱۹۴

پڑھا جائے تو مضائقہ نہیں، اور اس کے طریقے کے بارے میں کسی عامل سے رجوع کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۹/۲/۱۳۹۵ھ
(فتویٰ نمبر ۵۲۳/۲۸ ب)

ذکر جہراً افضل ہے یا سراً؟

سوال:- تیرہ محرم الحرام کے رسالہ "خدام الدین" (لاہور) میں یہ لکھا ہے کہ ذکر جہری مبتدیوں کے لئے ہے اور اس کے کئی فائدے ہیں، مثلاً زبان رواں، دماغ و دل متوجہ ہو جاتا ہے، مبتدیوں میں غیر کی طرف نہیں جاتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں کا ذکر قبول نہیں فرماتا، مگر منتہی دو طرح سے ذکر کرتے ہیں، مگر مبتدیوں کے لئے یہی ایک طریقہ ہے، کیونکہ ابتداء میں یکسوئی حاصل نہیں ہوتی، بعد میں تربیت سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس پر میرے ایک دوست نے کہا کہ یہ بدعت ہے، میں نے بڑے بڑے [illegible] کا ثبوت دیا مگر اس نے کہا یہ بدعت ہندوستان، پاکستان ہی میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ چیزیں نہ تھیں؟ کیا ذکر جہر و سر دونوں طرح جائز ہے اور اس میں افضل کون سا ہے؟"

جواب:- اس معاملے میں محقق علماء کا مسلک یہ ہے کہ ذکر دونوں طرح جائز ہے، سراً بھی اور جہراً بھی، پھر مختلف حالات و مواقع کے اعتبار سے فضیلت بدلتی رہتی ہے، کہیں آہستہ ذکر کرنا افضل ہے اور کہیں جہراً، لہٰذا کسی پابند شریعت شیخ کامل نے مرید کے حالات کے پیش نظر ذکر جہر کی تلقین کی ہو تو اسے جہراً ذکر کرنا جائز ہے، لیکن دو شرطوں کے ساتھ، ایک یہ کہ اس کا یہ ذکر جہر کسی شخص کی نیند میں خلل یا کسی اور معقول تکلیف کا موجب نہ ہو، دوسرے یہ کہ جہر کو عبادت مقصودہ نہ سمجھا جائے بلکہ اسے علاج کے طور پر اختیار کیا جائے۔ آپ کے دوست کا ذکر جہر کو بدعت کہنا درست نہیں، قرآن و حدیث میں ذکر جہر کا بھی ثبوت ملتا ہے، قرآن کریم میں ہے: "ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ." (سورۃ البقرۃ:۱۱۴)

ظاہر ہے کہ ذکر جہر سے منع کرنا، اس طرح ذکر سے بھی ممکن نہیں، اور اس کے علاوہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد بلند آواز سے "لا إلٰهَ إلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ"[1] پڑھا کرتے

(۱) الصحیح للامام مسلمؒ باب استحباب الذکر بعد الصلوۃ ج ۱ ص ۲۱۸ (طبع قدیمی کتب خانہ)

تھے، اس طرح اور بھی کئی روایات سے ذکر جہر کا ثبوت ملتا ہے، تفصیلی دلائل حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے امداد الفتاویٰ ج ۵ ص ۵۹ مطبوعہ کراچی میں کتاب السلوک کے تحت بیان فرمائے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۹ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۷۵/۱۹ الف)

"لا اِلٰہ اِلّا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ احدًا صمدًا" والی حدیث صحیح ہے یا نہیں؟

سوال:- کیا یہ حدیث صحیح ہے: "لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ احدًا صمدًا لم یلد ولم یولد ولم یکن لہٗ کفوًا احد"؟ اور کون سی کتاب میں ہے؟

جواب:- مندرجہ بالا الفاظ حافظ عبدالعظیم منذری نے الترغیب والترہیب[2] میں بحوالہ طبرانی نقل کئے ہیں، راوی حدیث حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ ہیں، اور اس روایت میں ہے اس کو گیارہ بار

امداد الفتاویٰ ج ۵ ص [illegible] ... متعلق چند فقہی عبارات یہ ہیں:

وفي رد المحتار ج ٥ ص ٣٩١ الحظر والاباحة: وقد حرر المسألة في الخيرية وحمل ما في فتاوى القاضي على الجهر المضر وقال إن هناك أحاديث اقتضت طلب الجهر وأحاديث طلب الإسرار والجمع بينهما بأن ذلك يختلف باختلاف الأشخاص والأحوال فالإسرار أفضل حيث خيف الرياء أو تأذي المصلين أو النيام، والجهر أفضل حيث خلا مما ذكر لأنه أكثر عملاً ولتعدي فائدته إلى السامعين ويوقظ قلب الذاكر فيجمع همه إلى الفكر ويصرف سمعه إليه ويطرد النوم ويزيد النشاط. وكذا في فتاوى شامية ج [illegible] ص ٢٢٠ وفي فتاوى الخيرية ج ٢ ص ١٠٩ طبع بولاق مصر والجمع بينهما بأن ذلك يختلف باختلاف الأشخاص والأحوال كما جمع بين الأحاديث الطالبة للجهر والطالبة للإسرار به ولا يعارض ذلك خير الذكر الخفي لأنه حيث خيف الرياء وتأذي المصلين أو النيام والجهر ذكر بعض أهل العلم أنه أفضل حيث خلا مما ذكر لأنه أكثر عملاً ولتعدي فائدته إلى السامعين الخ

وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ج [illegible] ص [illegible] طبع مكتبة الاسد دمشق، وفي طبع "قديمي كتب خانه" ص [illegible] [illegible] أهل الإسرار [illegible] أفضل [illegible] الأحاديث كثيرة [illegible] وقيل الجهر أفضل لأحاديث كثيرة منها ما رواه ابن الزبير كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا سلم من صلاته قال بصوته الأعلى لا إله إلا الله وحده لا شريك له [illegible] وكان ابن عمر يأمر من يقرأ عليه [illegible] ولأنه أكثر عملاً [illegible] الخ [illegible] امداد المفتیین ص [illegible] ص ۵۰۔

۲ الترغيب والترهيب ج ٢ ص ٢٠[illegible] طبع مصطفى البابي، مصر (محمد زبیر)

پڑھنے پر بیس لاکھ نیکیاں ملیں گی، لیکن حدیث ضعیف ہے۔(۱)

واللہ اعلم
۱۳۸۷/۲/۲ھ

ایک مہمل وظیفہ

سوال – وظیفہ ہے ”جس تو جان تو آنکھ ہو، تو ہاں تو قدرت ہے، تو ماں تو نبی جی کی جھولی بھرے بیچ میں ہے قرآن تو“ کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- یہ مہمل قسم کا وظیفہ ہے، اس کے بجائے اندیشے کے موقع پر ”اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ“(۲) پڑھنا چاہئے۔

وسیلہ اختیار کرکے دُعا کرنا کیسا ہے؟

سوال:- وہابی کسی بھی کسی درمیانی واسطے کی شفاعت کے قائل نہیں، خواہ وہ اللہ کا کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو، وہ کہتے ہیں جس طرح ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے اور کسی کے واسطے کے بغیر بجا لائے، اسی طرح وہ اپنی حاجات و مشکلات کو بلاواسطہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرے اور امداد کا طالب ہو، کیا درمیانی طور پر وسیلہ اختیار کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب:- بے شک اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ مانگنا بھی جائز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس طرح توسل کرے کہ یا اللہ! آپ کا فلاں بندہ آپ کا مقبول بندہ ہے، مجھے اس سے محبت ہے، اور اس محبت کی بناء پر میں اس کا وسیلہ پیش کرکے آپ سے فلاں چیز مانگتا ہوں تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت

---

(۱) عن عبدالله بن أبي أوفى قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من قال إحدى عشرة مرة لا إله إلا الله وحده لا شريك له، أحدا صمدا لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوا أحد، كتب الله له ألفي ألف حسنة. أخرجه ابن عساكر في تاريخ دمشق في ترجمة علي بن الحسن بن عبدالرزاق أبي الحسن الشعراني ج [illegible] ص ۳۵۱ طبع دار الفكر. وقال في المجمع ج ۱۰ ص ۸۵ طبع دار الكتب بيروت: رواه الطبراني وفيه فائد أبو الورقاء وهو متروك. وقال البوصيري في إتحاف الخيرة المهرة ج [illegible] ص [illegible] طبع دار الوطن الرياض: رواه الطبراني وعبد بن حميد وأبو يعلى الموصلي، قلت: مدار هذه الطرق على أبي الورقاء، واسمه فائد العطار وهو ضعيف، ضعفه أحمد بن حنبل وابن معين وأبو حاتم وأبو زرعة وابن حبان والبخاري وأبو داود والترمذي والنسائي والساجي والعقيلي ... وغيرهم وقال الحاكم أبو عبدالله الحافظ روى عن ابن أبي أوفى أحاديث موضوعة.

(۲) دیکھئے سنن أبي داود، باب كيف الرقى ج ۲ ص [illegible] طبع مكتبه حقانيه ملتان، وجامع الترمذي، باب ما جاء في الرقى إذا اشتكى. (محمد زبیر حق نواز)۔

نہیں ہے، بلکہ اس کے جواز پر قرآن وسنت سے دلائل موجود ہیں۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۱/۳۰ د)

فرض نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھی جانے والی دُعا کا حکم

سوال:- فرضوں کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر جو "بسم اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الرحمن الرحیم، اللّٰھم اذھب عنی الھم والحزن" پڑھتے ہیں، کیا یہ کسی حدیث میں ہے یا مستحب ہے یا بزرگ پڑھتے آئے ہیں؟ اس پر بعض لوگ اعتراض بھی کرتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:- ابن السنی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوتے تھے تو اپنے داہنے ہاتھ سے اپنی پیشانی پر مسح فرماتے اور یہ الفاظ پڑھتے تھے "أشھد ان لا الٰہ الا اللہ ھو الرحمن الرحیم، اللّٰھم أذھب عنی الھم والحزن" (کتاب الأذکار للنوویؒ ص:۳۵)۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۹/۱۹ الف)

---

(۱) وفي جامع الترمذي ج ۲ ص ۱۹۷ طبع سعيد عن عثمان بن حنيف ان رجلا ضرير البصر أتى النبي صلى الله عليه وسلم ... فدعا بهذا الدعاء اللهم اني اسألك وأتوجه اليك بنبيك محمد نبي الرحمة ... وفي التفسير المظهري ج ۳ ص ۹۳ طبع سعيد ... الدعاء ... الحرمة والعظمة فيكون من باب الوسيلة وقد قال تعالى وابتغوا اليه الوسيلة ... وقال بعد سطر نعم ذكر العلامة المناوي في حديث اللهم اني اسألك وأتوجه اليك بنبيك نبي الرحمة، عن عز بن عبد السلام انه ينبغي كونه مقصورا على النبي صلى الله عليه وسلم ... وقال السبكي يحسن التوسل بالنبي الى ربه ولم ينكره احد من السلف ولا الخلف الا ابن تيمية ... ونازع العلامة ابن امير حاج في دعوى الخصوصية واطال الكلام على ذلك.
توسل بالانبیاء والصالحین کی مختلف صورتوں اور شرائط سے متعلق تفصیلی بحث کے لئے حضرت والا مدظلہم کی تصنیف تکملہ فتح الملہم "مسئلۃ التوسل" ج ۵ ص ۷۲۰ کا مطالعہ فرمائیں۔

(۲) ص ۹۲ مطبع مصطفی محمد، مصر، وفي مسند البزار والأوسط للطبراني كان صلى الله عليه وسلم اذا صلى وفرغ من صلوته مسح بيمينه على رأسه وقال بسم الله الذي لا اله الا هو الرحمن الرحيم، اللهم اذهب عني الهم والحزن ... (طبع دار الكتاب بيروت) ... وفي مجمع الزوائد ... (طبع دار الكتب بيروت) وفيه زيد العمي وقد وثقه غير واحد وضعفه الجمهور، وبقية رجال احد اسنادي الطبراني ثقات وفي بعضهم خلاف، وراجع ايضا كشف الاستار عن زوائد البزار ج ۴ ص ۲۲ طبع موسسة الرسالة بيروت، وكذا في مجمع البحرين ج ۸ ص ۳۳۰ رقم الحديث ۴۶۶۳ و ۴۶۶۴ (طبع مكتبة الرشد، رياض) (محمد زبیر حق نواز)

اسمِ اعظم سے کیا مراد ہے؟

سجدے کی حالت میں دُعا مانگنے کا حکم

سوال ۱:- اسمِ اعظم سے کیا مراد ہے؟ جن آیات میں اسمِ اعظم کا گمان غالب ہے ان کی نشاندہی کردیں تو مہربانی ہوگی۔

۲:- سجدے کی حالت میں دُعا مانگنا کیسا ہے؟

جواب ۱:- اسمِ اعظم مشہور سے اللہ تعالیٰ کے اس مبارک نام کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ دُعا کرنا زیادہ اُمیدِ قبولیت رکھتا ہے، اس نام مبارک کی تعیین میں مختلف احادیث و روایات اور علماء کے مختلف اقوال منقول ہیں، حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان الفاظ سے دُعا شروع کی "اللهم انی أسألک بأن لک الحمد لا اله الا أنت الحنان المنان بديع السموت والأرض يا ذا الجلال والاكرام يا حی يا قيوم أسألک"۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "دعا الله باسمه الأعظم الذی اذا دعی به أجاب واذا سئل به أعطی"۔ "اس شخص نے اللہ تعالیٰ کے اس اسمِ اعظم کے ذریعے دُعا مانگی ہے جس کے ذریعے جب بھی دُعا کی جائے اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں اور اس کے ذریعے جب کوئی چیز مانگی جائے وہ دے دیتے ہیں۔"[1] نیز بعض روایات میں ہے کہ اسمِ اعظم سورۂ بقرہ، آلِ عمران اور سورۂ طٰہٰ میں ہے، مشکوٰۃ کی ایک اور حدیث میں مروی ہے کہ اسمِ اعظم ان دو آیتوں میں ہے "وَإِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ" اور "الٓمّٓ اللهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ"[2]۔

بعض صحابہؓ سے مروی ہے کہ "الحی القيوم" اسمِ اعظم ہے، امام رازیؒ اور علامہ نوویؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے، علامہ جزریؒ نے فرمایا ہے کہ "میرے نزدیک اسمِ اعظم "لا اله الا هو الحی القيوم" ہے۔" بعض حضرات نے لفظ "ربّ" کو، اور بعض نے لفظ "اللہ" کو اسمِ اعظم قرار دیا ہے،[3] اور بعض علماء نے فرمایا کہ "اسمِ اعظم" ایک راز ہے جس سے کوئی واقف نہیں۔ علمائے محققین نے اس سے

---

(۱) رواه الترمذی وابو داؤد والنسائی وابن ماجه، مشکوة المصابیح باب اسماء الله تعالى ج: ۱ ص: ۱۹۹، ۲۰۰ (طبع قديمی كتب خانه).

(۲) وفی مشكوة المصابيح ج: ۱ ص: ۲۰۰ عن اسماء بنت يزيد ان النبی صلى الله عليه وسلم قال: اسم الله الأعظم فی هاتين الآيتين: وَإِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ، وفاتحة آل عمران الٓمّٓ اللهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ رواه الترمذی وابو داؤد وابن ماجة والدارمی

(۳) امام رازی، علامہ نووی، علامہ جزری رحمہم اللہ اور بعض دیگر حضرات کے مذکورہ بالا اقوال کے لئے دیکھئے: مرقاۃ المفاتیح ج ۵ ص ۱۰۳ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

میں یہ فرمایا ہے کہ درحقیقت تمام اسمائے باری تعالیٰ عظیم ہیں اور کسی کو کسی پر فضیلت نہیں، لہٰذا ایسا اسم اعظم جس سے زیادہ عظمت کسی اسم باری کو حاصل نہ ہو مستند روایات سے ثابت نہیں ہے، اور جن جن اسماء کے بارے میں احادیث میں وارد ہوا ہے کہ وہ اسم اعظم ہیں ان سے مراد یہ ہے کہ یہ بھی باری تعالیٰ کے عظیم اسماء میں سے ہیں اور ان کے ذریعے خاص طور پر دعا قبول ہوتی ہے، اسی لئے اس بارے میں مختلف روایات مروی ہیں۔

اور متفقہ طور پر کسی ایک نام کو ہی اطلاق اسم اعظم کہنا مشکل ہے، مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا تمام اقوال نقل کرنے کے بعد، امام طبرانیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں وعندی ان الأقوال كلها صحيحة اذ لم يرد في خبر منها أنه الاسم الأعظم ولا شئ أعظم منه۔ (مرقاۃ المفاتیح ج ۵ ص ۱۰۲ باب اسماء اللہ تعالیٰ، طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

۲ - فرائض کے رکوع وسجود میں تو اذکار مسنونہ کے سوا کچھ اور نہ پڑھنا چاہئے، البتہ نوافل کے سجدے میں دعا درست ہے، لیکن دعا ماثورہ ہو یا کم از کم عربی زبان میں ہو اور آخرت سے متعلق ہو۔

لما في الدر المختار ودعا بالعربية وحرم بغيرها[1] وفي رد المحتار ينبغي أن يدعو في صلوته بدعاء محفوظ وأما في غيرها فينبغي أن يدعو بما يحضره۔ (شامی ج ۱ ص ۳۵۰، ۳۵۲)[2]۔

اور نماز کے علاوہ خاص دعا کے لئے سجدہ کرنا اور اس میں دعا کرنا کہیں منقول نظر سے نہیں گزرا، لیکن خاص کچھ حرج بھی نہیں، کیونکہ صورت تذلل کی ہے، مگر اس کو عادت بنانا یا سنت سمجھنا درست نہیں، کذا فی امداد الفتاوی ج ۱ ص ۵۴۰[3]۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۹۸۱/۲۸ ج)

مسجد میں بلند آواز سے فضائل کی کتاب پڑھنا
دورانِ تلاوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آنے پر دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال ۱:- تبلیغ والے مسجد میں فرضوں کے بعد بلند آواز سے فضائل کی کتاب پڑھتے ہیں یا تقریر کرتے ہیں، اس وقت بہت سے نمازی نمازیں پڑھتے رہتے ہیں، مصلّیوں میں ایسے مسبوق بھی

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۵۲۱ (طبع سعید)
(۲) رد المحتار تتمة تحت مطلب في خلف الوعيد وحكم الدعاء بالمغفرة للكافر ولجميع المؤمنين ج ۱ ص:۵۲۳ (طبع سعید)
(۳) دیکھئے امداد الفتاوی ج ۱ ص ۵۵۶ سجدۂ دعا۔

ہوتے ہیں جو کہ سنت ونوافل ادا کرتے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ تسبیح وغیرہ میں مشغول مصلیوں کی طرف سے شکایت ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے ہماری تسبیحات میں خلل واقع ہوتا ہے، منع کرنے سے وہ نہیں مانتے، بلکہ تبلیغ والے کہتے ہیں کہ جو کہ صحن وغیرہ میں تسبیح ونوافل پوری کرو۔ شرعاً کیا حکم ہے؟

۲- تلاوت قرآن شریف میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم شریف آئے اس وقت درود پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ یا بعد ختم تلاوت کے پڑھے؟

جواب ۱:- مسجد میں فضائل کی کتاب پڑھنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ مفید ہے، البتہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس سے نمازیوں کی نماز میں خلل نہ پڑے، لہٰذا اگر نمازی نماز میں مشغول ہوں تو ان سے دُور ہٹ کر کتاب پڑھی جائے یا ان کے فارغ ہونے کا انتظار کیا جائے، نمازیوں کو دوسری جگہ نماز پڑھنے کو کہنا دُرست نہیں۔ کما یفهم من عبارة الشامیة تحت قول الدر: ورفع صوت بذکر الا للمتفقه، وفی حاشیة الحموی عن الامام الشعرانی أجمع العلماء سلفا وخلفا علی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرها الا أن یشوش جهرهم علی نائم أو مصل او قاری. (شامی ج: ص:۶۶۰ أحکام المساجد من الصلوٰة)۔[1]

۲- تلاوت کے بعد پڑھنا چاہئے۔[2]

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۵۲ ۔ ۲۷)

نماز کے بعد "اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَهُ یُصَلُّوْنَ" بلند آواز سے پڑھنا

سوال:- ہمارے پیش امام صاحب کچھ دنوں تک یہ آیت نماز کے بعد پڑھتے تھے "ان اللہ وَمَلٰٓئِکَتَهُ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ .... الخ"، چند دن ہوئے انہوں نے اس آیت کو ترک کر دیا، میں نے ایک دن ان سے وجہ دریافت کی تو جواب دیا کہ نماز میں خلل آتا ہے اور تم سمجھ گئے ہو، اور اس کے بعد چل دیئے، میں نے یہی بات سیکریٹری مسجد، جو ایک شریف آدمی ہے، سے ذکر کی، انہوں نے پیش امام صاحب کو ذکر کیا ہو یا نہ کیا ہو، مجھے اس کا علم نہیں، ایک دن نماز عشاء کے بعد امام صاحب نے

---

(۱) شامی ج ۱ ص:۶۶۰ (طبع ایچ ایم سعید)، وفی الشامیة ج ۲ ص ۳۹۸ وفی الملتقی وعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنه کره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة والزحف والتذکیر وفیها ... فالاسرار أفضل حیث خیف الریاء أو تأذی المصلین ... الخ وفی المرقاة شرح مشکوٰة ج ۲ ص ۳۵۷ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان) قوله تعالی "ولا تجهر بصلاتک ... الخ ویسن الاسرار فی سائر الأذکار أیضا الا فی التلبیة ... الخ. وراجع أیضا الدر المختار ج ۱ ص ۵۲۳،۵۰۹

(۲) وفی الهندیة ج ۵ ص ۳۱۶ طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ: ولو قرأ القرآن فمر علی اسم النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابه فقراءة القرآن علی تألیفه ونظمه أفضل من الصلوة علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ذلک الوقت فان فرغ ففعل فهو أفضل ... الخ

درسِ قرآن میں اسی آیت کو شروع کیا اور جو کچھ ان کے علم میں تھا، بیان کیا، اور شاید مجھ کو چغل خور کہا اور دیگر تنقیدیں کیں، اب عرض یہ ہے کہ کیا اس بارے میں میں اس تنقید کا مستحق ہوں جو پیش امام صاحب نے میرے بارے میں بیان کی ہے؟

جواب:- آپ نے جتنی بات لکھی ہے، اگر واقعہ صرف اتنا ہی ہے تو آپ کا کوئی قصور نہیں، امام صاحب نے بھی چغل خوری کا صریح الزام آپ پر نہیں لگایا، اگر ان کے دل میں کسی وجہ سے آپ کی طرف سے کدورت پیدا ہوگئی ہو تو اسے ملاقات اور باہمی افہام و تفہیم سے دور کردیجئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۲/۱۹ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(اس جواب کے بعد سائل کی طرف سے اسی بارے میں دوبارہ سوال آیا جو درج ذیل ہے) (مرتب)

سوال:- عرض ہے کہ دوبارہ ارسال ہے، آپ نے جو جواب دیئے ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ مولانا سے بڑا جھگڑا ہے، جھگڑا کوئی نہیں ہے جو امام صاحب سے ملاقات سے دور کیا جاسکے، میں تو ازروئے شرع چاہتا ہوں کہ:-

۱:- اُوپر والی آیت پڑھنے سے نماز میں خلل ہوتا ہے یا کہ نہیں؟

۲- اس آیت کا اگر درس دیا جائے تو اس میں چغل خوری اور ریا کا ذکر ہے؟ جسے ذکر کرنا چاہئے، ان دونوں باتوں میں بھی شرعی جواب چاہتا ہوں۔

جواب ۱:- نماز کے بعد جبکہ لوگ نماز میں مشغول ہوں بلند آواز سے تلاوتِ قرآن یا تقریر نہیں کرنا چاہئے،(۱) لہٰذا اگر امام صاحب نے اس وجہ سے آیت کو پڑھنا چھوڑ دیا تو انہوں نے ٹھیک کیا ہے، اس پر کسی کو اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔

۲- اس آیت میں تو چغل خوری اور ریاکاری کا ذکر نہیں ہے، لیکن اگر آیت کے ذیل میں کوئی بات آجائے اور یہ مسئلہ بیان کردیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۸۸/۶/۲۰ھ

---

(۱) دلائل کے لئے پچھلے صفحہ ۲۶۶ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

جنات کو قید کرنے یا جلانے کا حکم

سوال:- عاملین لوگ جنات کو آگ میں جلا دیتے ہیں، حالانکہ یہ عذاب اللہ رب العزت کے ساتھ مخصوص ہے، جنات کو آگ میں جلانا شریعت مطہرہ کی چار چیزوں یعنی قرآن، سنت، قیاس، اجماع سے ثابت کیا جائے۔ نیز عامل لوگ جنات کو ہنڈی یا بوتل میں مخصوص مدت تک کے لئے قید کردیتے ہیں، پھر آزاد کرنے کے وقت جنات سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ تم نے چونکہ ایک مسلمان کو ایذاء پہنچائی تھی اس بناء پر تمہیں قید کیا گیا، اب آزاد کیا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اعلیٰ پر زور نہ کرے، اگر تم نے دوبارہ مخلوق خدا کو تنگ کیا تو پھر دوبارہ قید کرلئے جاؤ گے۔ شریعت مطہرہ کیا اس کی اجازت دیتی ہے؟ فرق کرنے کی کوئی معقول تدبیر بیان فرمائیں۔

جواب:- اس بارے میں قول فیصل یہ ہے کہ اگر جنات کا اثر ان کو جلائے بغیر زائل ہوسکتا ہو مثلاً دم کرنے یا دعا کرنے سے یا ان کو مار کر یا دھمکا کر، تب تو قتل کرنا یا جلانا جائز نہیں، لیکن اگر مذکورہ طریقوں سے نہ جائے تو قید کرنا یا قتل کرنا یا جلانا جائز ہے، بہتر عامل کو یہ چاہئے کہ پہلے نرم طریقے استعمال کرے اور جب اس بات کا اطمینان ہوجائے کہ یہ جن جلائے بغیر نہیں جائے گا، تب جلانے کا اقدام کرے، علامہ بدر الدین شبلی حنفی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے علامہ ابوالعباس ابن شیبہؒ کے اس قول کی تصدیق کرتے ہیں کہ:-

يجوز بل يستحب وقد يجب أن يذب عن المظلوم وأن ينصر فإن نصر المظلوم مأمور به بحسب الإمكان وإذا برئ المصاب بالدعاء والذكر وأمر الجن ونهيهم وانتهارهم وسبهم ولعنهم ونحو ذلك من الكلام حصل المقصود، وإن كان ذلك يتضمن مرض طائفة من الجن أو موتهم فهم الظالمون لأنفسهم إذا كان الراقي الداعي المعالج لم يتعد عليهم كما يتعدى عليهم كثير من أهل العزائم فيأمرون بقتل من لا يجوز قتله

(آكام المرجان في غرائب الأخبار وأحكام الجان ص باب ٥٣، طبع نور محمد كراچی)

آگے علامہ شبلی لکھتے ہیں: فحاصل ذلك أنه متى حصل المقصود بالأهون لا يصار إلى ما فوقه ومتى احتيج إلى الضرب وما هو أشد منه صير إليه ومن قبيل ما نال من الجن قتل عائشةؓ الجني الذي كان لا يزال يطلع في بيتها۔ (ص:۱۱۴)

اور انہوں نے صفحہ ۲۰ پر باب ۲ کے تحت سند سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ایک جن کو قتل کیا تھا، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جن کو جلانے کے

بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''اگر کسی تدبیر سے پیچھا نہ چھوڑے تو درست ہے، بہتر ہے کہ اس تعویذ میں یہ عبارت لکھ دیں کہ اگر نہ جائے تو جل جائے''۔(۱) واللہ اعلم

۱۳۷۷/۶/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۵۴/۲۸ ب)

جنیہ سے انسان کے نکاح کا حکم اور انسانوں پر جنات کے اثرات کی شرعی حیثیت

سوال:- ''البلاغ'' ۱۳۹۵ھ پڑھا تو کچھ نکات ایسے پائے گئے جن کی تشریح مطلوب ہے، مثلاً صفحہ ۴۱ پر ''کیا انسان کا نکاح جنی عورت سے ہوسکتا ہے؟'' کے عنوان کے تحت ساتویں سطر میں مذکور ہے کہ مسلمان مرد سے مسلمان جنیہ کا نکاح ہوا اور اس سے اولاد بھی ہوئی۔ اس میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش ہی نہیں کہ جنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور یہ بات نص سے ثابت ہے، مگر جب جنات کو ناری مخلوق کہا گیا ہے اور وہ دیکھنے میں بھی نہیں آتے تو کس طرح انسان سے ان کا تعلق اور پھر میاں بیوی کی حد تک قائم رہ سکتا ہے؟ جنات میں مسلم وغیر مسلم کا مسئلہ واضح ہے، مگر سائنسی نقطۂ نظر سے نہ سہی تو بھی بغیر مدلل تشریح کے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جنیہ عورت اگر توالدی اہل بھی ہے تو کیونکر انسان خاکی کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہ سکتی ہے؟ اس لئے آپ سے گزارش ہے کہ آپ ''جنات کا انسانوں پر اثر'' کے عنوان کی تشریح فرمائیں۔ ہم اخبارات و رسائل میں پڑھتے ہیں اور عاملین حضرات کے قصے کہانیوں سے سنتے چلے آئے ہیں کہ جنات -

الف - غیب کی خبریں سناتے ہیں، مثلاً فلاں چیز چوری کرنے والا فلاں فلاں ہے اور فلاں جگہ رہتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ب - فلاں عامل نے جنات کو کوزے میں بند کر رکھا ہے، جس طرح سمندر کوزے میں بند کئے جانے کا محاورہ ہے۔

ج - فلاں پیر نے چلہ کشی کے بعد جنات پر قابو پایا ہے اور جنات اس کے تابع ہیں (گویا سلیمانِ ثانی ہیں)۔

د - ڈاکٹروں نے مریض کو لاعلاج قرار دے دیا، مگر فلاں عامل نے مریض کو جنات کے زیر اثر بتایا اور علاج کر کے شفا دی۔ کچھ عرصہ قبل اخبارات میں اس مسئلے پر بڑی لے دے شروع ہوگئی تھی، بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک مندرجہ بالا چند نکات کا تعلق ہے وہ کچھ یوں ہیں:-

(۱) امداد الفتاویٰ ج ۴ ص ۸۸، ۸۹۔

الف - حضرت سلیمان علیہ السلام کے عصا کو جب تک دیمک نے کھوکھلا نہ کردیا اور وہ نہ گرگئے جنات برابر کام کرتے رہے، لہٰذا غیب جاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ انبیاء بھی غیب کا علم نہ جانتے تھے (حوالہ ''البلاغ'' ہذا ۱۳۱)۔

ب - انگریز قوم بڑی توہم پرست ہے، انگلینڈ میں ایک بار ٹی وی پر بدروحوں کو لایا گیا (آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ محض تصویری خاکے اور کیمرہ ٹرک تھی) اکثر نے یقین کرلیا کہ فی الحقیقت بدروحوں سے ملاقات کا شرف نصیب ہوا، شعبدہ بازی کے کئی کھیل دیکھے، انسانی ذہن کی تیزی، مسلسل مشق، لگاتار محنت اور لگن نے وہ وہ کرتب پیش کئے کہ عقل دنگ رہ گئی، مگر یہ سب کچھ شعبدہ بازی کی مہارت کا نتیجہ تھا، ابن خلدون نے اس پر معرکۃ الآراء بحث کی ہے جو صحیح ہے، اور اس کا لب لباب وہی ہے جو اوپر لکھ آیا ہوں۔ ایک مسلمان عالم تو کیا ایک دہریہ بھی یہ پوچھ سکتا ہے جو ہمارے یہاں ڈبہ پیر اور عاملین کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ راسپوٹین (دنیا کا سب سے بڑا مکار) جو پیشین گوئی کرتا تھا پوری ہوجاتی تھی، ۱۹۳۳ء میں کشمیر کا ایک مسلمان (نام یاد نہیں رہا) نے انگلینڈ میں تین مقامات پر دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگے پاؤں چل کر دکھایا تھا، جبکہ ڈاکٹروں نے اس کے تمام جسم پر ایسی ادویات کا استعمال کیا تھا جس سے جسم پر ملی ہوئی کسی بھی دوائی کا اثر زائل ہوجایا کرتا ہے، مگر وہ کامران رہے، اس کے انٹرویوز لئے گئے تو اس نے بتایا کہ یہ اس کی خدا کی ذات پر کامل اعتماد کی ایک معمولی جھلک ہے اور اس اعتماد نے اس کی قوت ارادی کو ناقابل شکست بنادیا ہے۔ غرض اس طرح کے واقعات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں مگر عاملین کا جنات کو کوزے میں بند کرلینا کیا شرعی حیثیت رکھتا ہے؟ جبکہ یہ بات بغیر ذہن پر زور دیئے سمجھ میں آجاتی ہے کہ خالد بن ولیدؓ زہر کھاکر کیوں نہ مرے، جبکہ اس زہر کو اگر کنویں میں حل کردیا جاتا تو ایک لشکر کی موت واقع ہوسکتی تھی، یا حضرت عمرؓ کا خطبہ کے دوران ساریہ کو آواز دے کر جبل کی جانب متوجہ کرنا بغیر تذبذب کے سمجھ میں آسکتا ہے۔

ج - سائنس تسلیم کرے یا نہ کرے، عقل سمجھے یا نہ سمجھے مگر ہمارا ایمان ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا جنات اور چرند پرند پر غلبہ تھا، اور وہ ان کی زبان سے بھی واقف تھے، واقعۂ ہدہد اس پر دال ہے، مگر یہ عاملین کیونکر سلیمان بن گئے؟ اس کی شرعی حیثیت پر بحث فرمائیے۔

د - تشنج کی کئی اقسام ہیں، ایک ایسا مریض جس کی عمر کم اور وزن ۵۰ ۶۰ پونڈ ہوتا ہے تشنج کی حالت میں اتنے زور کا مظاہرہ کرتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی پہلوان سے واسطہ پڑ رہا ہو، پٹھوں کے تناؤ کی وجہ سے یہ حالت پیدا ہوجاتی ہے، مگر ہمارے یہاں کے عاملین نے اسے [illegible] جن کے سر باندھنے کی سعادت یوں حاصل کی ہے کہ مریض پر جنات کا غلبہ ہے اور یہ سارا زور جنات یا ایک

جن (نر ہو یا مادہ) کا ہے وگرنہ ایسے کم عمر اور کم وزن رکھنے والے مریض میں اتنا زور کہاں سے آسکتا ہے؟ وغیرہ، جہاں تک ڈاکٹری علاج کا تعلق ہے وہ سائنس کا ایک پہلو ہے، اور یہ بات آپ پر عیاں ہے کہ سائنس کافی حد تک ثبوت تو دیتی ہے مگر عقیدہ نہیں دے سکتی، جبکہ فلسفہ نہ ثبوت دیتا ہے اور نہ ہی عقیدہ، جبکہ مذہب ثبوت بھی دیتا ہے اور عقیدہ بھی (مگر اسلام کے لئے لفظ ''مذہب'' کا استعمال درست نہیں سمجھتا، اس لئے کہ اسلام دین ہے، جبکہ مذہب ایک حصہ جیسے آنکھ، کان، ناک وغیرہ ایک جسم کے مختلف حصے ہیں) سائنس کے تابع ڈاکٹری علم نے اگر مریض کا علاج کردیا تو بات سمجھ میں آسکتی ہے، فلسفے نے اگر کچھ مزید گرہیں لگائی ہیں تو بھی سمجھ میں آنے والی بات ہے، مگر دین نے اگر صرف عاملین کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ جنات پر حکمرانی کریں اور چاہیں تو جیب میں ڈالے پھریں، تو یہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

قرآن مجید، احادیث دونوں میں سے کوئی بھی ہو، اس کا اثر ظاہر ہو رہا ہے، خدا کا کلام تو افضل ترین کلام ہے، اس کا اثر ہوتا ہے اور ہوگا بھی، مگر عاملین جس طرح بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ انہیں چلہ کشی کے دوران جنات کو قابو کرنے کی صلاحیت ملی اور وہ جنات کو قابو کرسکتے ہیں اور ان کا انسانی جسم پر اثر زائل کرسکتے ہیں، گویا عامل کا چلہ دافع بلا ہے نہ کہ کلام اللہ، آپ یہ واضح کریں کہ انسانی جسم پر جن کا اثر کیونکر ہوسکتا ہے؟ اور اگر ہوسکتا ہے تو کس حد تک؟ اور پھر جنات کو قابو میں لایا جانا کس طرح ثابت ہے؟ جبکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ قرآن وحدیث اور دیگر علوم از قسم فقہ، صرف ونحو وغیرہ کے بجائے ہمیں ہماری نانیاں دادیاں جنوں، پریوں کے قصے بچپن میں سناتی رہی ہیں، ان داستانوں کا لازمی نتیجہ و نفسیاتی اثر ہوتا ہے جو بڑے ہوکر لاشعور میں موجود رہتا ہے۔ پھر ہسٹریا کی ایک مریضہ کے اصلی علاج کی بجائے اسے عامل کی بدکرداری کے سامنے لا ڈالا جاتا ہے اور وہ بے ضمیر، گندم نما جو فروش، سلیمان ثانی ہونے کا مدعی، چند سکوں کے لالچ میں جنات کا اثر بتاکر ایک انسان کی زندگی کی خوشیاں لوٹ لیتا ہے۔ میرے بیان کردہ ان چار نکات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- جواب میں تاخیر ضرور ہوئی، لیکن آپ کا سوال قدرے تفصیل چاہتا تھا، جس کی فرصت اس سے پہلے نہ مل سکی، اب آپ کے سوال کا جواب پیش خدمت ہے۔

ا:- جہاں تک انسان اور جنات کے درمیان نکاح کا تعلق ہے، شریعت میں اس کی اجازت تو نہیں ہے لیکن جہاں تک اس کے عقلی امکان کا تعلق ہے اس میں کوئی بات غیر ممکن نہیں ہے، علامہ بدرالدین شبلی معروف محقق عالم ہیں، انہوں نے اپنی کتاب ''آکام المرجان فی غرائب الأخبار وأحکام الجان'' کے باب ۳۰ میں صفحہ:٦٦ پر اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے۔

اور آپ نے جو اعتراض کیا ہے کہ خاکی انسان کا نکاح ناری جن سے کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا یہ جواب دیا ہے کہ انسان بے شک خاکی اور جن بے شک ناری ہیں، لیکن جس طرح انسانوں میں سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام خاک سے پیدا کئے گئے لیکن ان کے بعد جب توالد و تناسل جاری ہوا تو ہر انسان براہِ راست خاک سے پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ اس میں تمام عناصر کارفرما رہے، اسی طرح جنات میں سب سے پہلا جن جس کا قرآنی نام "الجان" ہے، براہِ راست آگ سے پیدا کیا گیا تھا، اس کے بعد تمام جنات توالد و تناسل سے پیدا ہوتے رہے اور ان میں بھی انسانوں کی طرح دُوسرے عناصر کارفرما رہے ہیں، لہٰذا اب جنات مطلق آگ یا حرارت کا پیکر مجسم نہیں ہوتے بلکہ ان میں حرارت و برودت کا اعتدال ہوتا ہے، اس بناء پر عقلی طور سے انسان اور جن کے درمیان جنسی اختلاط ممکن ہے۔[1]

علامہ شبلی نے اس پر یہ استدلال بھی کیا ہے کہ قرآن کریم نے جنت کی حوروں کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ "لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ"[2] یعنی ان کو جنتیوں سے پہلے نہ کسی انسان نے چھوا اور نہ کسی جن نے۔ اگر جن و انس کے درمیان اختلاط عقلاً ناممکن ہوتا تو یہاں جن کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

خلاصہ یہ کہ عقلاً نکاح ہونا غیر ممکن نہیں، اور علامہ شبلیؒ نے اس پر سند کے ساتھ کچھ واقعات بھی لکھے ہیں کہ جنات وانسان کے درمیان شادیاں ہوئیں، ان واقعات کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن ان کو قطعاً ناممکن نہیں کہا جاسکتا، اور معارف القرآن میں بھی صرف اتنی ہی بات کہی گئی ہے۔

۲- دُوسرا مسئلہ آپ نے یہ لکھا ہے کہ جنات کے انسانوں پر چڑھ جانے اور انسانوں کو ان کو تابع بنا لینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اتنی بات تو قرآن و حدیث کے قطعی دلائل سے ثابت ہے کہ "جن" انسانوں سے الگ ایک مخلوق ہیں، وہ عام نظروں کو نظر نہیں آتے، اور ان میں مؤمن و کافر، صالح و فاسق ہر طرح کے ہوتے ہیں، لہٰذا اتنی بات پر تو ایمان رکھنا ضروری ہے، رہا یہ کہ وہ انسانوں کو پریشان کرنے کے لئے ان پر چڑھ جاتے ہیں یا نہیں؟ نیز یہ کہ جو عاملین انہیں اُتارنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ صحیح ہے یا نہیں؟ سو یہ کوئی ایمانیات کا مسئلہ نہیں جس پر ایمان رکھنا ضروری ہو، بلکہ واقعات کا مسئلہ ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں جنات کے انسانوں کو پریشان

۱- [illegible] دیکھئے معارف القرآن ج ۲ ص ۵۷۲۔

۲- سورۃ الرحمٰن [illegible]

کرنے کے واقعات اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ ان کا انکار مشکل ہے،[1] ایک واقعہ تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنایا ہے جو شمائل ترمذی میں موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”بنو عذرہ“ قبیلے کا ایک شخص جس کا نام خرافہ تھا، اسے جنات پکڑ کر لے گئے تھے، وہ ایک عرصے تک جنات کے درمیان مقیم رہا، پھر وہی اسے انسانوں کے پاس چھوڑ گئے، اب وہ واپس آنے کے بعد عجیب عجیب قصے سنایا کرتا تھا، اس لئے لوگ (ہر عجیب بات کو) خرافہ کا قصہ کہنے لگے۔

(شمائل ترمذی ص ۲۱ باب ما جاء فی کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی السحر)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جن اتارنے کے واقعات بھی بعض روایات میں موجود ہیں چنانچہ ابوداؤد، مسند احمد اور معجم طبرانی وغیرہ میں یہ حدیث مروی ہے کہ-

عن أم أبان بنت الوازع عن أبيها أن جدها انطلق إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم بابن له مجنون أو ابن أخت له فقال يا رسول الله إن معي ابنا لي أو ابن أخت لي مجنون أتيتك به لتدعو الله تعالى له، قال ائتني به، قال فانطلقت به إليه وهو في الركاب فأطلقت عنه وألقيت عنه ثياب السفر وألبسته ثوبين حسنين وأخذت بيده حتى انتهيت إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال أدنه مني واجعل ظهره مما يليني، قال فأخذ بمجامع ثوبه من أعلاه وأسفله فجعل يضرب ظهره حتى رأيت بياض إبطيه ويقول أخرج عدو الله فأقبل ينظر نظر الصحيح ليس بنظره الأوّل .... الخ. (آكام المرجان ص:۱۱۳ باب ۵۳)

ام ابان اپنے والد سے روایت کرتی ہیں کہ ان کے دادا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے ایک مجنون (اس کے معنی پاگل بھی ہو سکتے ہیں اور جن زدہ بھی) بیٹے یا بھتیجے کو لے گئے اور عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! میں اپنے اس بیٹے یا بھتیجے کو جو مجنون ہے دعا کے لئے لایا ہوں“، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اسے میرے پاس لے آؤ“، میں آپ کے پاس لے گیا، آپ نے فرمایا کہ ”اسے مجھ سے قریب کردو اور اس کی پشت میری طرف کردو“، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کپڑے پکڑ کر اس کی پشت پر مارنا شروع کیا یہاں تک کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دینے لگی، آپ مارتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ ”اے اللہ کے دشمن نکل!“ چنانچہ وہ تھوڑی دیر میں تندرستوں کی طرح دیکھنے لگا.... الخ۔

لہٰذا اگر کسی پر جن کا اثر ہو جائے تو اس کا علاج عملیات کے ذریعہ کرنا نہ صرف ممکن ہے، اور

---

(۱) وفي كتاب الروح ص ۴۶۵: إن تداخل الأجسام المحال أن تتداخل جسمان كثيفان أحدهما في الآخر بحيث يكون حيزهما واحداً، وأما أن يدخل لطيف في كثيف يسري فيه فهذا ليس بمحال

نہ شرعاً ناجائز، بشرطیکہ اس میں کوئی خلافِ شرع طریقہ اختیار نہ کیا جائے، اور اگر کسی شخص کو جن اتارنے کا طریقہ آتا ہو تو اسے قدرتِ خداوندی میں دخل اندازی نہیں کہا جاسکتا، جس طرح بیماری کے جراثیم مارنے پر انسان کو قدرت دی گئی ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے جن اتارنے پر بھی کسی کو قدرت دے دی ہو تو کیا بعید ہے؟(۱) البتہ جنات کو غلام بنانا اگرچہ عقلاً ممکن ہے لیکن شرعاً جس طرح آزاد انسان کو اسبابِ شرعیہ کے بغیر غلام بنانا جائز نہیں، اسی طرح آزاد جنات کو غلام بنانا بھی درست نہیں(۲)، البتہ ایک تو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس مسئلے کا تعلق ایمانیات سے نہیں، واقعات سے ہے۔ دوسرے جو عامل یہ دعویٰ کرے کہ جنات اس کو مستقبل کی غیبی خبریں دیتے ہیں وہ باطل ہے۔ تیسرے یہ کہ جنات کو قابو میں کرنے کے لئے بہت سی سفلی اعمال جادوگر کرتے ہیں جن کا مقصد شیاطین کو خوش کرنا ہوتا ہے، وہ باجماعِ اُمت حرام اور ناجائز ہیں۔ چوتھے یہ کہ اس مقصد کے لئے ایسے منتر پڑھنا جس کے معنی سمجھ میں نہ آتے ہوں یہ بھی ناجائز ہے(۳)۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۳۲/۲۱ ب)

بے پردہ خاتون سے جھاڑ پھونک کرانے کا حکم

سوال:- مندرجہ ذیل طریقے سے جھاڑ پھونک کرنا یا اس سے استفادہ کرنا ازروئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟ ایک غیر شادی شدہ بالغ خاتون جنھوں نے یہ طریقہ اپنا رکھا ہے کہ ان کے بیان کے مطابق کوئی ولی یا سائیں بابا کا سایہ ان پر ہوگیا ہے اور اس ولی یا سائیں بابا نے خاتون کو یہ حکم دیا ہے کہ ان کے حکم سے تم انسانیت کی خدمت کرو، یہ بات ظاہر نہیں ہوئی کہ یہ سائیں بابا زندہ ہیں یا مردہ؟ بلکہ خاتون سے جب بھی اس کے متعلق پوچھا گیا تو فرماتی ہیں کہ نہیں یہ بتانے کی اجازت نہیں۔ طریقۂ علاج یہ ہے کہ یہ خاتون بناؤ سنگھار کرکے بے پردہ بیٹھ جاتی ہیں اور ہر آنے والے سے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اس کا حال پوچھتی ہیں، مریض اپنا حال بتاتا ہے، خاتون کے سامنے پھولوں کا ہار ...

---

(۱) وفي مشكوة المصابيح كتاب الطب والرقى ص ۳۸۸ (طبع قديمي كتب خانه) عن عوف بن مالك الأشجعي قال كنا نرقي في الجاهلية فقلنا يا رسول الله كيف ترى في ذلك فقال اعرضوا على رقاكم لا بأس بالرقى ما لم يكن فيه شرك (رواه مسلم) وفي الشامية ج ۶ ص ۳۶۳ ولا بأس بالمعوذات اذا كتب فيها القرآن او اسماء الله تعالى (الى قوله) وانما تكره العوذة اذا كانت بغير لسان العرب ولا يدرى ما هو ولعله يدخله سحر او كفر او غير ذلك واما ما كان من القرآن او شيء من الدعوات فلا بأس به (تفصیل [illegible] فرمائیں)۔

(۲) [illegible] کے لئے معارف القرآن ج ۷ ص ۲۹۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب عفی عنہ)

(۳) [illegible] ص ۲۰۔

ہوتا ہے جس کے متعلق خاتون کا کہنا ہے کہ وہ ولی یا سائیں بابا اس پردے کے سامنے براجمان ہوتے ہیں جنھیں صرف وہ خاتون ہی دیکھ سکتی ہیں، کوئی دوسرا شخص اس ولی یا سائیں بابا کی آواز نہیں سن سکتا۔ خاتون، مریض کا حال اس پردے کی طرف رُخ کرکے دہراتی ہیں اور تھوڑی دیر منتظر رہتی ہیں گویا انہیں کوئی خاموش پیغام مل رہا ہے، پھر مریض کو بتاتی ہیں کہ سائیں بابا نے کہا ہے کہ تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔

سائل کو دو باتیں ازروئے شرع غلط محسوس ہوئیں:-

۱- اسلام میں پردہ بنیادی حکم ہے، مگر یہ خاتون صرف بے پردہ ہی نہیں بلکہ پوری طرح میک اپ کرکے مجلس میں بیٹھتی ہیں اور ہر ایک سے بے تکلفانہ گفتگو کرتی ہیں، مزید یہ کہ جب پردے کی طرف توجہ دلائی گئی تو فرماتی ہیں کہ سائیں بابا نے انہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ بلکہ بے پردگی کا یہ عالم ہے کہ ان کی مکمل میک اپ میں تصویریں اخبارات اور رسائل میں چھپتی ہیں۔

۲- مریضوں سے سوال وجواب کے درمیان یہ بتانا کہ ”سائیں بابا نے یہ فرمایا ہے کہ تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا“ گویا براہِ راست علم غیب کا دعویٰ ہے، جبکہ علم غیب صرف اللہ کو ہے۔

مجھے فتویٰ کی ضرورت اس لئے بھی پڑی ہے کہ میری بچی کافی دنوں سے بیمار ہے، علاج جاری ہے، مسنون دعائیں پڑھ کر دم کرتا ہوں، یا کسی کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جائز طریقے سے علاج کرتے ہیں تو ان کے پاس بھی حاضر ہوتا ہوں، مذکورہ خاتون کی شہرت سن کر ارادہ ہوا کہ میں بھی اپنی بچی کو لے کر ان کے پاس جاؤں مگر ان کا طریقہ دیکھ کر مجھے اُلجھن ہوگئی، لہٰذا مذکورہ خاتون کے بارے میں شرعی فتویٰ کیا ہے؟ خاتون کا دعویٰ روحانیت اور یہ اعلان کرنا کہ ان پر اللہ تعالیٰ کے کسی ولی یا سائیں بابا کا سایہ ہوگیا ہے اور وہ ان کے حکم سے انسانیت کی خدمت کر رہی ہیں جبکہ دوسری طرف طریقہ غیر شرعی ہے، نیز یہ کہ جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ یہ قوت روحانی یا سائیں بابا کا سایہ ان پر ان کے کسی خاص عملیات یا ریاضت کی وجہ سے حاصل ہوا؟ تو جواب نفی میں ملا، خاتون کا کہنا ہے کہ انہوں نے کوئی عمل یا ریاضت نہیں کی، براہِ کرم جواب دیں کہ اس خاتون کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- مذکورہ خاتون سے علاج کروانا اور اس غرض سے اس کے پاس جانا جائز نہیں، اور جن دو غلط باتوں کا سائل نے ذکر کیا ہے وہ بلاشبہ غلط اور گناہ ہیں، اور اس کی غیب کی بتائی ہوئی باتوں پر بحیثیت غیب یقین کرنا کفر ہے، مذکورہ خاتون کا بے پردہ، بناؤ سنگھار کے ساتھ مردوں کے سامنے بیٹھنا شریعت کے بالکل خلاف ہے، اور اس خلافِ شریعت عمل پر سائیں بابا کی طرف سے اجازت کا ذکر، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ خاتون کا دعویٰ غلط ہے یا انہیں کوئی شیطان بہکا رہا ہے، ایسی صورت

میں ان کی باتوں کا یقین کر کے ان پر عمل کرنا جائز نہیں ورنہ ایسے لوگوں سے علاج کرنا درست ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۸۵/۵/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۴۹/۳۶ د)

چور یا گم شدہ چیز معلوم کرنے کے لئے منتر اور ٹوٹکے معتبر ہیں یا نہیں؟

سوال:- چور یا گم شدہ چیز معلوم کرنے کے بارے میں بعض ٹوٹکے اور منتر جیسے وغیرہ وغیرہ درست ہیں یا نہیں؟ اور کیا یہ معتبر ہیں یا نہیں؟

جواب:- اس قسم کے عمل شرعاً حجت نہیں ہیں، ان پر اعتماد نہ کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۳۲۵ [illegible])

قبرستان میں قبلہ رُو ہو کر ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنا

سوال:- صلوٰۃ جنازہ کے متصل بعد دُعا ثابت نہیں، مسلّم ہے، اور بعد الدفن دعا مسنون ہے، مگر وضاحت طلب امر یہ ہے کہ بعد الدفن اور بعد پڑھنے سورۂ بقرہ کا اوّل و آخر، جو دعا کی جاتی ہے آیا اس میں ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنی چاہئے یا ہاتھ چھوڑ کر؟ قبل ازیں تو دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرتے کراتے رہے، مگر حضرت مولانا خیر محمد صاحب مرحوم کی نماز حنفی مترجم نظر سے گزری، جس میں درج ہے کہ بغیر ہاتھ اُٹھائے دعا کرنی چاہئے جبکہ اس کے مقابل حافظ ابن حجرؒ نے صحیح ابی عوانہ سے فتح الباری ج ۱۱ ص ۱۲۲ میں حدیث عن ابن مسعود رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی قبر عبداللہ ذی البجادین الحدیث وفیہ فلما فرغ من دفنہ استقبل القبلۃ رافعا یدیہ، سے ثابت ہوتا ہے کہ ہاتھ اُٹھا کر دعا فرمائی ہے، جو بات سنت یا مستحب ہو بحوالہ کتب ارشاد فرمادیں کہ آیا بعد الدفن ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنی چاہئے یا چھوڑ کر؟

جواب:- قبرستان میں قبلہ رو ہونے کی صورت میں ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور جائز ہے، حتیٰ کہ صحیح مسلم میں بیت البقیع کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت عائشہ

دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۲ [illegible] ج ۲ ص ۹۹

فرماتی ہیں۔

حتی جاء البقیع فقام فاطال القیام ثم رفع یدیه ثلاث مرات (ج۱ ص۳۱۳ قبیل کتاب الزکوۃ)۔[1]

اس کے تحت علامہ نوویؒ لکھتے ہیں: فیه استحباب اطالة الدعاء وتکریرہ ورفع الیدین فیه۔ اور حنفیہ کے اصول پر بھی مسئلہ یہی ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں: ویکرہ عند القبر کل ما لم یعهد من السنة والمعهود منها لیس الا زیارتها والدعاء عندها قائما کما کان یفعل صلی الله علیه وسلم فی الخروج الی البقیع۔ (البحر الرائق)۔[2]

اوپر گزر گیا کہ بقیع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رفع یدین ثابت ہے، اس کے علاوہ صحیح ابوعوانہ کی جو حدیث آپ نے نقل فرمائی ہے وہ فتح الباری کی "کتاب الاستیذان باب الدعاء مستقبل القبلة" کے تحت حافظؒ نے نقل کی ہے، اور اس پر سکوت کیا ہے، وہ بھی اس کی دلیل ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس پر فتویٰ دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: فی رد المحتار آداب زیارة القبور "ثم یدعو قائما طویلا"۔[3] اس سے دعا کا جائز ہونا ثابت ہوا، اور ہاتھ اٹھانا مطلقاً آداب دعا سے ہے، پس یہ بھی درست ہوا۔ (امداد الفتاویٰ)۔[4]

لہٰذا اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ رفع یدین جائز ہے، البتہ اکابر دیوبند کا عام معمول ترک رفع کا رہا ہے، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ہندوستان میں قبر پرستوں کی کثرت تھی جو صاحب قبر سے دعا مانگتے تھے، ان کے ساتھ تشبہ سے پرہیز کے لئے وہ ہاتھ اٹھائے بغیر دعا کرتے تھے، لیکن کسی نے رفع یدین کو ناجائز بھی نہیں کہا، بلکہ بعض مستند علمائے دیوبند کو احقر نے خود ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے دیکھا ہے، لہٰذا حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ نے جو بات لکھی ہے وہ مبنی بر احتیاط ہے، رفع یدین کے ناجائز ہونے کی بنا پر نہیں، ھذا ما عندی!

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱۲/۲۸ ب)

تعویذ کے ذریعہ علاج کرانے کا حکم

سوال:- گزارش یہ ہے میری اہلیہ عرصہ ۴ سال سے تکلیف میں ہے، حالت بدلتی رہتی ہے،

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانہ)
(۲) البحر الرائق ج ۲ ص:۱۹۶ (طبع سعید).
(۳) شامیة ج ۲ ص:۲۴۲.
(۴) امداد الفتاوی ج۱ ص:۵۰۰.

رہ گھٹنا اور ایسا محسوس کرنا کہ پھٹ جائے گا، ٹانگوں میں ایسا محسوس ہونا کہ کوئی کاٹ رہا ہے، پورے جسم کا ٹھنڈا ہونا یا جلتا ہوا محسوس ہونا، گھر سے بھاگنے کی کوشش کرنا، کپڑے پھاڑ لینا، جسم پر ورم ہونا، جسم کا کثیف ہونا، پورے جسم یا کندھوں پر انتہائی بوجھ محسوس ہونا، پیٹھ کی حرکتیں محسوس ہونا جن کا تذکرہ نہیں کیا جاسکتا، اور مدینہ طیبہ کی طرف جاتے وقت ایسی غلط باتیں ذہن میں آتی ہیں کہ آدمی ایمان سے جائے، اور کبھی راستے سے واپس آنے لگتی ہے، اس قسم کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں، بعض وقت بے چینی ایسی ہوتی ہے کہ حد سے بڑھ جاتی ہے، اس کا علاج ڈاکٹروں سے بہت کرایا لیکن آرام آنے کے بجائے ان دواؤں کے جسم پر الٹے اثرات ہوئے، ڈاکٹروں نے کہا کہ روحانی علاج کرو، ۱۹۷۸ء سے مختلف لوگوں سے روحانی علاج بھی کرایا، اس علاج میں وہ تعویذ باندھنے، پینے یا جلانے کے لئے دیتے ہیں، کوئی بھی ایسا روحانی پیشوا نہیں ملا جو بغیر تعویذات کے علاج کرے، میرے بچوں پر بھی مختلف کیفیات ہوتی ہیں، ان کا علاج بھی روحانی کرانے سے کچھ افاقہ ہوتا ہے، یہاں کے انگریزی اخبار میں تعویذوں کے استعمال کے بارے میں استفتاء پر ایسی باتیں لکھی ہیں جس سے میں انتہائی پریشان ہوگیا ہوں، اس کے مطابق تعویذات کا استعمال اسلام میں ممنوع ہے۔

میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں میری رہبری فرمائیں، کیا میں اپنی بیوی اور بچوں کا علاج تعویذات کے ذریعے کرا سکتا ہوں؟ اگر نہیں کرا سکتا تو میرے لئے اور کوئی راستہ بتائیں کیونکہ بیوی اور بچوں کے علاج کا میں ذمہ دار ہوں۔　　سائل - عبدالوحید، جدہ سعودی عرب

جواب:- تعویذ کے ذریعے علاج کرنا شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ تعویذ میں جو کلمات لکھے جائیں ان کے معنی معلوم ہوں، اور ان میں کوئی بات مشرکانہ نہ ہو، مثلاً آیاتِ قرآنی پر مشتمل تعویذ میں کچھ حرج نہیں ہے۔[1] سعودی عرب کے بعض علماء تعویذوں کی ممانعت کے بارے میں جو احادیث پیش کرتے ہیں ان سے مراد ایسے تعویذ ہیں جن میں مشرکانہ باتیں ہوں،[2] یا جن کو اللہ تعالیٰ کے بجائے بذاتِ خود شافی سمجھا جائے، ورنہ آیاتِ قرآنی کا دم کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور تعویذ لکھ کر

(۱ و ۲) وفي مشكوة المصابيح ج ۲ ص ۳۱۱ طبع قديمي كتب خانه: عن عوف بن مالك الأشجعي قال: كنا نرقي في الجاهلية فقلنا يا رسول الله كيف ترى في ذلك؟ فقال: اعرضوا علي رقاكم، لا بأس بالرقى ما لم يكن فيه شرك. رواه مسلم ج ۲ ص ۲۲۴ طبع قديمي كتب خانه، وكذا في ابي داؤد ج ۲ ص ۱۸۶ طبع مكتبه حقانيه ملتان. وفي شرح مسلم ج ۲ ص ۲۲۳ طبع ... ولا بأس بالمعوذات اذا كتب فيها القرآن او اسماء الله تعالى ... وانما تكره العوذة اذا كانت بغير لسان العرب، ولا يدرى ما هو ولعله يدخله سحر او كفر او غير ذلك، واما ما كان من القرآن او شيء من الدعوات فلا بأس به ... الخ

نیز مفصل تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی تصنیف تکملۃ فتح الملہم ج ۴ ص ۳۱۷ ملاحظہ فرمائیں۔

پلانا یا لٹکانا حضراتِ صحابہؓ وتابعین سے ثابت ہے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۱/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۴۷/۱۱۷)

قرآنِ کریم کے نقش کے علاوہ کسی اور تعویذ کا حکم

سوال:- میرے ماموں زاد بھائی کہتے ہیں کہ نقش قرآن مجید کے علاوہ باقی نقوش وتعویذ کا حدیث سے ثبوت نہیں، میں نے کہا کہ بزرگوں کے تجربات ہیں ان سے بھی مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے، لیکن وہ تسلیم نہیں کرتے، لہٰذا کیا حکم ہے؟

جواب:- جن تعویذوں میں کوئی خلافِ شرع بات نہ ہو وہ جائز ہیں، تعویذ میں صرف قرآنی آیات درج کرنا ہی ضروری نہیں۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۹/۲۵ھ

ماہواری کی حالت میں تلاوت اور ذکر کا حکم

سوال:- کیا ایامِ ماہواری میں عورت، سورت یا کلمہ، درود وغیرہ پڑھ سکتی ہے؟

جواب:- قرآن کریم کی تلاوت تو بالکل نہیں کرسکتی، کلمہ اور درود پڑھنے میں مضائقہ نہیں۔(۳)

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۷۶۲/۱۹ الف)

اسم ''بدوح'' کی تحقیق

سوال:- ''یا بدوح'' کیا اللہ کا نام ہے؟ جبکہ تلاش کے بعد بھی معلوم نہ ہوسکا۔

جواب:- ''یا بدوح'' قرآن میں تو یہ نام نہیں ہے، مگر بعض اہلِ علم نے لکھا ہے کہ عبرانی

(۱،۲) مسلم شریف بعد کتاب الطب والمرض والرقی ج ۲ ص ۲۲۳ (تکملة فتح الملهم ج ۴ ص ۳۷۰ طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔ فتاوی شامية ج ۶ ص ۳۶۳، ۳۶۴۔ عبارت سابقہ فتویٰ کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) في الهندية ج ۱ ص ۳۸ ومنها حرمة قراءة القرآن لا تقرأ الحائض والنفساء والجنب شيئا من القرآن والآية وما دونها سواء في التحريم على الأصح وفيه أيضا ج ۱ ص ۳۸ ويجوز للجنب والحائض الدعوات وجواب الأذان ونحو ذلك وكذا في الدر المختار ج ۱ ص ۲۹۳ ولا بأس لحائض وجنب بقراءة أدعية ومسها وحملها وذكر الله تعالى وتسبيح (و[illegible] ج ۲ ص ۱۸۳)۔

زبان میں اللہ کا نام ہے۔(۱)

فقط واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۹-۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۲-۹ الف)

ناچاقی دُور کرنے کے لئے شوہر پر تعویذ کرنے کا حکم

سوال:- زید کی بہن عمر کے نکاح میں عرصہ ۱۰ یا بارہ سال سے ہے، اور ہر طرح فرمانبردار اور طاعت گزار ہے، لیکن عمر اسے ہمیشہ مارتا پیٹتا ہے، اور تکلیف اور آزار پہنچاتا ہے، زید اور اس کی بہن صبر سے کام لیتے ہیں، مگر اس ظالم پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا، طلاق حاصل کرنا چند وجوہات کی بنا پر مشکل ہے، اس صورت میں عملیات سے عمر کو مطیع کرنا یا سرزنش کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یا اور کوئی صورت ہو تو بتادیں۔

جواب:- سب سے اچھا راستہ تو یہ ہے کہ عمر کے لئے خوش خلقی کی دعا کیجئے اور نرمی اور فہمائش سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے، لیکن اگر یہ چیزیں کارگر نہ ہوں تو کسی دیندار اور پابندِ شرع عامل سے ایسے تعویذ وغیرہ دینے میں کوئی حرج نہیں(۲) جن سے شوہر کے دل میں بیوی کی محبت پیدا ہوجائے، لیکن تعویذات وعملیات کے ذریعہ اسے نقصان پہنچانا ہرگز جائز نہیں سخت گناہ ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۸ ۱۹ الف)

رمضان میں تراویح کے بعد وعظ کرنے اور چالیس مرتبہ صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- چند سالوں سے ہمارے شہر گلوسٹر برطانیہ میں رمضان شریف میں یہ دستور چلا آرہا ہے کہ روزانہ تراویح کی نماز کے بعد تھوڑی دیر کے لئے کچھ وعظ و بیان ہوتا ہے، جس کے بعد امام

(۱) ... مزید تفصیل کے لئے دیکھئے فتاوی دار العلوم دیوبند (مدلل مکمل) ص ۳۳۸، وفتاوی دار العلوم دیوبند (عزیز الفتاوی) ص ۹۲۔

(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص ۲۷۸ والا حاشیہ۔

صاحب چالیس صلوٰۃ وسلام کو جہراً پڑھتے ہیں اور باقی حضرات سنتے ہیں، اس کے بعد دعا ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ درود شریف پڑھنے کا یہ طریقہ شرعاً جائز ہے؟

جواب:- یہ طریقہ فی نفسہ جائز ہے، البتہ چالیس صلوٰۃ وسلام جہراً پڑھنے کا ایسا التزام و اہتمام جائز نہیں جس سے ایسا کرنے کے مسنون یا ضروری ہونے کا شبہ ہو، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اس کی پابندی نہ کی جائے، کبھی کرلیں، کبھی چھوڑ دیں، نیز بہتر یہ ہے کہ درود شریف آہستہ پڑھا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۱۰/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۵/۴۰۰)

کیا ظاہری اسباب نہ ہونے کی صورت میں بھی دعا کا اثر ہوتا ہے؟

سوال:- اگر ظاہری اسباب و وسائل میسر نہ ہوں تب بھی دعا کا اثر ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب:- جی ہاں! دعا بھی دوسرے وسائل واسباب کی طرح ایک وسیلہ ہے، اور دوسرے مادی وسائل کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۷۰ ج)

اسمِ اعظم سے کیا مراد ہے؟

سوال:- اسم اعظم کی دعائیں کون سی ہیں؟ اور اس سے کیا مراد ہے؟ کتاب کا حوالہ درج فرمادیں۔

جواب:- اسم اعظم بعض حضرات نے "یا حی یا قیوم" کو کہا ہے، بعض نے "لَآ اِلٰہَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" کو، بعض نے "رب رب" کو، بعض نے "اللہ" کو، بعض نے "لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" کو، اور یہ تمام صیغے دعا کی قبولیت کے لئے مجرب ہیں، البتہ اسم

---

(۱) وفی مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۱۹۹ عن أنس قال کنت جالسا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد ورجل یصلی فقال اللھم إنی أسألک بأن لک الحمد لا إلہ إلا أنت الحنان المنان بدیع السموات والأرض یا ذا الجلال والإکرام یا حی یا قیوم أسألک فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم دعا اللہ باسمہ الأعظم الذی إذا دعی بہ أجاب وإذا سئل بہ أعطی رواہ الترمذی وأبو داود والنسائی وابن ماجہ وفیہ أیضا ج ۱ ص ۲۰۰ عن أسماء بنت یزید أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اسم اللہ الأعظم فی ھاتین الآیتین وإلھکم إلہ واحد لا إلہ إلا ھو الرحمن الرحیم وفاتحۃ آل عمران الٓمٓ اللہ لا إلہ إلا ھو الحی القیوم رواہ الترمذی وأبو داود وابن ماجہ والدارمی

عظم کے بارے میں محققین کی تحقیق یہ ہے کہ کسی ایک اسم اعظم بارے میں قطعی و معین طور سے اسم اعظم کا
مشکل ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۰/۲۸ ج)

روزہ افطار کے وقت دُعا زیادہ قبول ہوتی ہے

سوال:- دُعا کی مقبولیت کے متعلق سنا ہے کہ روزہ کھولنے کے وقت اور روزہ رکھنے کے وقت زیادہ قبول ہوتی ہے، کیا یہ دُرست ہے؟

جواب:- افطار کے وقت دُعا کی قبولیت کی اُمید حدیث سے ثابت ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۰/۲۹ ج)

تعویذ میں اگر کوئی خلافِ شرع بات نہ ہو تو جائز ہے

سوال:- تعویذ بنانا، چاہے قرآن شریف کی آیات سے ہو، جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- تعویذ میں اگر کوئی بات خلافِ شرع نہ ہو تو اس کا بنانا رکھنا جائز ہے۔[3]

واللہ اعلم
۱۳۸۲/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۵۵/۱۲ و)

عمل ''حضرات'' کی شرعی حیثیت

سوال:- از روئے شریعت عمل حضرات کی کیا حیثیت ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟ اور عمل حضرات کے ذریعہ کیا ہوا فیصلہ قابلِ قبول ہونا چاہئے یا نہیں؟

وفي مرقاة وقال ابو جعفر الطحاوي الحنفي الآثار في تعيين الاسم الأعظم عندي ... كلها صحيحة اذ لم يرد في خبر منها انه الاسم الأعظم ج ۵ ص ۱۰۲

(۲) عن عبد الله بن عمرو بن العاص قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ان للصائم عند فطره لدعوة ما ترد. كتاب الدعاء ج ۲ ص ۲۲۹ في سنده اسحاق بن عبيد الله المدني ... وقال ابن حجر هذا حديث حسن ... لا ترد دعوته، وفي الزوائد اسناده صحيح

(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص ۲۷۸ کا حاشیہ نمبر ۔

جواب:- عمل "حاضرات" کی مفصل کیفیت اور حقیقت اب تک ہمیں کسی قابلِ اعتماد ذریعے سے معلوم نہیں ہوسکی، البتہ اتنا واضح کردینا ضروری ہے کہ اگر اس عمل کے ذریعے جنات کو اس طرح تابع یا مسخر بنایا جاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مختار نہ رہیں، بلکہ عامل کی مرضی کے مکمل تابع ہوجائیں تو یہ عمل بالکل ناجائز ہے، کیونکہ جنات حُر ہیں، اور انہیں غیرشرعی طریقے سے غلام بنانا بالکل حرام ہے۔(۱) اور اگر اس کی حقیقت کچھ اور ہے تو اسے مفصل لکھ کر مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیا جائے۔ واللہ اعلم

۱۳۹۸/۱۱/۲۷ھ

"بدیع العالم" نام رکھنے اور صرف "اِلَّا اللّٰہ" کا ذکر کرنے کا حکم

سوال:- خدمتِ بابرکت میں عرض ہے کہ بندہ کے دل میں اپنے نام کے متعلق مدت سے ایک اشکال ہے، وروہ یہ ہے کہ بندہ کا نام "بدیع العالم" رکھا گیا، حالانکہ "بدیع" کا لفظ شانِ باری تعالیٰ میں وارد ہوا ہے، اس لئے بندہ کے دل میں یہ خوف ہے کہ اس نام پر مؤاخذہ ہوجائے، لہٰذا کیا اس لفظ کے کوئی ایسے معنی ہیں جس کی بناء پر اِشکال کا دفعیہ ہوجائے۔

دیگر عرض یہ ہے کہ صرف "اِلَّا اللّٰہ" کا ذکر کیسا ہے؟ یہ ذکر جائز ہے یا نہیں؟ ہمارے بعض حضرات اس کو ناپسند کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ "اِلَّا" بمعنی غیر ہے، لہٰذا "اِلَّا اللّٰہ" کا ذکر درحقیقت غیراللہ کا ذکر ہے۔

عرض گزار احقر بدیع العالم
سابق پرنسپل عالیہ مدرسہ
(لکشام بنگلہ دیش)

جواب:- مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ باعثِ افتخار ہوا۔

"بدیع" ان اسمائے حسنیٰ میں سے نہیں ہے جن کا استعمال غیراللہ کے لئے جائز نہ ہو، اس لئے یہ نام ناجائز تو نہیں ہے، البتہ ایک دعوے کا پہلو اس میں ضرور ہے، اس کی وجہ سے بدلنا چاہیں تو اختیار ہے۔

---

(۱) في أحكام القرآن ج ۳ ص ۲۲۳ فهذا يشهد فعله عليه السلام على أن تسخير الجن كان غير مرضي عنده لكمال الأدب في شأن سليمان عليه السلام فغيره أولى به وهو الذي فهم من جوازه ذلك لكن الجن الذي استعمله وسخره من الكفرة وأما المسلم فلا يحل استرقاقه أو تقييده من غير وجه كما في الانسان كما لا يخفى

نیز جنات کو مسخر کرنے سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن ج ۷ ص ۲۶۵، ۲۶۶۔

"الا اللہ" کا ذکر دوازدہ تسبیح کا ایک جزو ہو کر اس لئے درست ہے کہ اس سے پہلے پورے کلمے "لا الہ الا اللہ" کی تسبیحات پڑھی جا چکی ہوتی ہیں، اس لئے ہر "الا اللہ" کے ساتھ "لا الہ" محذوف و ملحوظ ہوتا ہے، نیز مشائخ یہ بھی بتاتے ہیں کہ "لا معبود الا اللہ" "لا محبوب الا اللہ" وغیرہ کا تصور کریں۔

البتہ دوازدہ تسبیح کے جزء کے بغیر، یا مذکورہ تصور کے بغیر "الا اللہ" کا ذکر واقعی نہ منقول ہے نہ معقول۔ دعا کی درخواست ہے، والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۳/۲/۱۲ھ

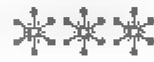

﴿کتاب حقوق المعاشرۃ وآدابها﴾

(حقوقِ معاشرت اور اس کے آداب)

گھریلو ناچاقی اور والد کی سخت مزاجی کا حل اور طلاق کے معاملے میں والد کی اطاعت واجب ہے یا نہیں؟

سوال:- محترم جناب مفتی صاحب، دار العلوم کورنگی کراچی   السلام علیکم

مؤدبانہ عرض ہے میں مندرجہ ذیل مسئلے کا حل قرآن اور سنت کی روشنی میں چاہتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ اس مسئلے سے اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی مول لئے بغیر نکلوں۔

میں اپنے والدین کا ایک ہی لڑکا ہوں، نیز یہ کہ میری دو بہنیں بھی ہیں۔ ان بہنوں میں سے ایک بہن شادی شدہ ہے۔ میں اپنی دونوں بہنوں سے بڑا ہوں، میں حتی الامکان اپنے ماں باپ کی فرمانبرداری کی کوشش کرتا ہوں اور اللہ پاک کا شکر ہے کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں۔ میرے والد جن کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہے، بہت ہی سخت مزاج آدمی ہیں، نیز یہ کہ وہ حد درجہ انا پرست آدمی بھی ہیں، اور وہ اپنی بات کے آگے کسی کی بات سننا یا ماننا پسند نہیں کرتے۔ میری والدہ تقریباً پچاس سال کی ہیں اور وہ مستقل بیمار رہتی ہیں، کچھ عرصہ قبل ان کا رسولی کا آپریشن ہوا تھا، جس کا انہوں نے ذہن پر اتنا اثر لیا کہ ان کے اعصاب بری طرح متأثر ہوئے، بہت زیادہ علاج اور گھر والوں (بشمول میرے والد اور میری بیوی) کی دیکھ بھال کی وجہ سے ان کی ذہنی حالت تو بحال ہوگئی، لیکن ہاتھ پاؤں میں طاقت نہیں رہی، جس کی وجہ سے ان کی دیکھ بھال کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ میرے والد نے میری شادی میرے (مرحوم) ماموں کی لڑکی سے کردی اور اس سے میری تین عدد لڑکیاں ہیں، میری شادی کے بعد سے اب تک میری زندگی اور میری بیوی کی زندگی کے ہر معاملے میں میرے والد صاحب کی مرضی چلتی ہے اور بعض اوقات اس وجہ سے میں اپنی بیوی اور بچوں کے حقوق صحیح طور پر ادا نہیں کر پاتا ہوں۔ میں ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازم ہوں اور اپنے بہت سارے فرائض اپنی ملازمت میں مصروفیت کی وجہ سے بھی ادا نہیں کر پاتا ہوں۔ میری بیوی کا گو کہ میرے والد بہت خیال بھی رکھتے ہیں مگر بعض معاملوں میں بری طرح ناراض بھی ہوتے ہیں اور اکثر بہت نازیبا الفاظ کا استعمال بھی کرتے ہیں، جس کو میں اور میری بیوی والدین کا حق سمجھ کر برداشت بھی کرتے ہیں۔

یوں ہم نے سات سال بڑی مشکل سے اپنے والد کی خوشی کو پورا کرتے گزارے ہیں اور

بہت سے مرحلے ایسے بھی آئے جب میرے والد نے ہم کو گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا، مگر ہم نے اپنی عاقبت خراب ہونے کے ڈر سے معافی تلافی کر کے ان کو منا لیا۔

اب صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ میرے والد بہت ساری باتیں اور ہماری غلطیاں جن کو وہ نظر انداز کر سکتے ہیں یا ان پر سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کر سکتے ہیں، اس پر بھی سخت رویہ اختیار کرتے ہیں اور معاملات کو انتہائی حد تک بگاڑ دیتے ہیں، اور بات بات پر ہم کو نکل جانے کو کہہ دیتے ہیں، اور کبھی کبھی میری بیوی کو طلاق دلوانے کی بات بھی کرتے ہیں، جب وہ ہم کو نکالنے کی بات کرتے ہیں تو مجھے یہ بھی کہتے ہیں کہ تمہیں اپنی ماں کا آخری دیدار تک نہیں کرنے دوں گا اگر تم کو گھر سے نکالا۔ دوسری طرف میری بیوی جو کہ خود بھی بہت زیادہ اچھے مزاج کی نہیں ہے، مگر میرے سمجھانے پر ساری چیزیں برداشت کرتی ہے، بعض اوقات میرے ماں باپ کی خدمت میں لاپروائی بھی کر جاتی ہے جس پر میں اسے ڈانٹتا ہوں تو سمجھ جاتی ہے۔ زیادہ تر خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتی ہے، مگر فطرتاً زیادہ خوش مزاج نہیں ہے، میری بہنوں کا حق اور مقام خیال رکھتی ہے، کبھی کبھی معمولی کی ناچاقی بھی ہو جاتی ہے، اپنے گھر والوں کی برائی سن کر اس کا مزاج خراب ہو جاتا ہے جو کہ میرے والد اکثر ناراضگی کی حالت میں بہت کرتے ہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میری کیفیت ایسی ہے جیسے مجھے کسی نے تلوار سے درمیان سے چیر دیا ہو، یعنی میں اپنے والدین سے بھی بہت محبت کرتا ہوں خاص طور پر اپنی ماں اور بہنوں سے، اور اپنے بیوی بچوں سے بھی بہت محبت کرتا ہوں، اور اپنے روزگار یعنی دفتری مسائل کے ساتھ ساتھ ان گھریلو مسائل سے بہت پریشان رہتا ہوں۔ مجھے اپنی بچیوں کے مستقبل کی بھی بہت فکر رہتی ہے کہ اگر میرا گھر خراب ہوا یعنی مجھے اپنی بیوی کو چھوڑنا پڑا اپنے والد کی مرضی کی وجہ سے، تو میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ یا اگر مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑا اور گھر والوں یعنی اپنے والد کی ناراضگی مول لینا پڑی تو میرے والدین خاص طور پر والدہ کا خیال کون رکھے گا؟ دوسرے، اللہ بھی ناراض ہوگا۔

یعنی میں دنیا اور آخرت دونوں کے کھو جانے کے خوف میں رہتا ہوں، ابھی کچھ دن پہلے بھی اس طرح کا مسئلہ ہو گیا تھا، ہوا یوں تھا کہ میری بیوی اپنی والدہ کے یہاں گئی ہوئی تھی، اس دوران میری والدہ بیت الخلاء میں پھسل گئیں اور مجھے ان کو لے جا کر ٹانکے لگوانے پڑے، کیونکہ ان کا سر پھٹ گیا تھا اور زخم آیا تھا۔

میری بیوی کو والد صاحب نے دوسرے دن فون پر آنے کے لئے کہہ دیا اور کہہ دیا کہ تم جتنی

جلدی ہوسکے آجاؤ، میں نے اپنے دفتر سے فون کیا اور اس سے کہا کہ جلدی تو جانا مگر بدحواس مت ہونا، میری بیوی کو گھر پہنچنے میں تاخیر ہوگئی اور والد صاحب حسبِ مزاج بہت برہم ہوئے، اس موقع پر میری بیوی نے بھی کچھ غلط ردِّعمل کا اظہار کیا، جس کی وجہ سے معاملات بہت بگڑ گئے، میرے سمجھانے پر میری بیوی نے والد صاحب سے معافی مانگ لی۔

یہاں پر اب میں یہ بتاؤں میری زندگی میں یہ مسئلے مسائل بہت بڑھ گئے ہیں، اور اب معاملات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ میرے ذہن میں ایک دن یہ خیال آیا کہ میں دبئی جا کر نوکری کروں اور بیوی بچوں کو بھی وہیں بلالوں اور والدین کو اکثر وہیں بلا لیا کروں، یا میں خود ان سے ملنے آجایا کروں، مگر اس میں بھی والد صاحب کی ناراضگی اور والدہ کی خدمت سے محرومی کا ڈر لگا رہتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ کیونکہ کسی بھی فیصلے میں اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی کا ڈر رہتا ہے کہ والدین یا بیوی بچوں کے حقوق کے سلسلے میں قیامت کے روز میری پکڑ نہ ہوجائے۔

مندرجہ بالا تفصیلات کے بعد میری آپ سے گزارش ہے کہ میرے مسئلے کا قرآن اور سنت کی روشنی میں ممکنہ حل بیان کریں تاکہ میں اپنے دین کی حدود میں رہتے ہوئے اس مسئلے کو حل کرسکوں اور ذہنی سکون پاسکوں۔

میں اس سلسلے میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا اور اللہ پاک سے دُعا کروں گا کہ آپ کو اس کا اجر دے۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جو حالات آپ نے لکھے ہیں ان میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ خوش اُسلوبی کے ساتھ اپنی رہائش علیحدہ کرلیں۔ اور علیحدہ رہ کر والدین کی جتنی خدمت کرسکتے ہوں کریں، آپ کسی وقت اگر ممکن ہو تو اپنے والد صاحب سے نرمی کے ساتھ بات کریں کہ مزاجوں کے اختلاف وغیرہ کی وجہ سے ساتھ رہنے میں آپ کی حق تلفیاں ہوجاتی ہیں اور مسائل پیدا ہوتے ہیں، اس لئے کوئی ایسی صورت پیدا کرلینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں یہ مسائل پیدا نہ ہوں، اور آپ کی خدمت احسن طریقے سے کرنے کا موقع ملے۔ اگر اس بات چیت کے نتیجے میں کوئی ایسا راستہ پیدا ہوجائے جس سے گھر میں رہتے ہوئے مسائل حل ہوسکیں تو خیر، ورنہ علیحدگی اختیار کرلیں، اس پر بھی اگر والد صاحب ناراض ہوں تو اِن شاء اللہ اس کا گناہ آپ پر نہیں ہوگا، آپ ہر ممکن طریقے سے ان کی خدمت اور ان کی رضاجوئی کی کوشش ہر حال میں جاری رکھیں، یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اگر باپ بیوی کو طلاق

دینے کا حکم دے تو اس کی تعمیل شرعاً واجب نہیں ہے، جب تک بیوی واقعۃً طلاق دینے کی لائق نہ ہو۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۲۰/۵/۱۳۹۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵۰/۷۵)

شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر جانا، جائز امر میں شوہر کی اطاعت واجب ہے

سوال ا:- کیا مسلمان عورت خاوند کی بغیر اطلاع یا بغیر اجازت محلے میں قرآن خوانی یا میت میں یا قریبی رشتہ داروں میں یا مارکیٹ میں کوئی سامان خریدنے جا سکتی ہے، جبکہ وہ تین بچوں کی ماں بن چکی ہو؟

۲- کیا شریعت[2] نے خاوند کو اس کی منکوحہ مسلمان بیوی پر فوقیت یا فضیلت عطا کی ہے؟ یا عورت، خاوند کے ہر حکم کی پابند ہے[3] اور نافرمانی کی صورت میں گناہ گار ہوگی؟

جواب ا:- شوہر کی اجازت یا مرضی کے خلاف مذکورہ مقاصد میں سے کسی بھی مقصد کے لئے گھر سے باہر جانا بیوی کے لئے جائز نہیں۔[4]

۲- شوہر کی اطاعت بیوی پر واجب ہے،[3] البتہ وہ کسی ایسے کام کا حکم دے جو شرعاً ناجائز ہو تو ایسی صورت میں اس کی مخالفت ضروری ہے۔[4] اور اس لحاظ سے شوہر کو بیوی پر فوقیت حاصل ہے، لقولہ تعالیٰ ''الرجالُ قوّامون علی النساء''[5] ولقولہ تعالیٰ ''وللرجالِ علیھن درجۃ''[6]

واللہ سبحانہ اعلم
۲۹/۸/۱۳۹۷ھ

---

(۱) اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے دیکھئے [illegible] ''تعدیل حقوق [illegible]'' ص ۲۹۵ [illegible]

(۲) وفی رد المحتار ج ۳ ص [illegible] طبع سعید: فلا تخرج الا لحق لھا او علیھا او لزیارۃ ابویھا کل جمعۃ مرۃ او المحارم کل سنۃ ولکونھا قابلۃ او غاسلۃ لا فیما عدا ذلک، وفی [illegible] فیما عدا ذلک [illegible] عدا ذلک من زیارۃ الأجانب وعیادتھم والولیمۃ لا یاذن لھا ولا تخرج ... الخ

(۳) وفی مشکوۃ المصابیح باب عشرۃ النساء ص ۲۸۱ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لو کنت آمرًا أحدًا ان یسجد لأحد لأمرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا۔ رواہ الترمذی۔ وفیہ ایضا ص ۲۸۳ عن ابی ھریرۃ [illegible] والزوج علی الزوجۃ لقولہ تعالیٰ ''ولھنّ مثل الذی علیھنّ بالمعروف'' ... فیدل علی لزوم طاعتھن الأزواج

(۴) وفی الصحیح للامام مسلم رقم الحدیث ۱۸۳۹ ج ۳ ص ۱۴۶۹ [illegible] لا طاعۃ فی معصیۃ اللہ انما الطاعۃ فی المعروف، وفی مصنف ابن ابی شیبۃ رقم الحدیث ۳۳۷۱۷ ج ۶ ص ۵۴۵ طبع مکتبۃ الرشد، ریاض) لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق

(۵) سورۃ النساء: ۳۴۔ (۶) سورۃ البقرۃ ۲۲۸ (۷) [illegible]

گھر میں ٹیلی ویژن لانے کے لئے باپ کو گھر سے نکالنا، عالم کا والد اور بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرنا

سوال ۱:- کن کن وجوہ سے مسلمان اپنے عزیز و رشتہ دار، بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرسکتا ہے؟ اور کن وجوہ سے منع ہے؟

۲- ایک لڑکا شادی شدہ ہے، صاحب ثروت ہے، کراچی میں دو مکان ہیں، ایک کو کرایہ پر دیا ہوا ہے، باپ موجود ہے جس کی عمر ۷۰ سال ہے، بڑھئی کا کام کرتا تھا، باپ کے پاس اس لڑکے کے مکان کے سوا اور کوئی جگہ رہائش نہیں ہے۔ لڑکا کھیل تماشے کا عادی ہے، بیوی ریڈیو پر گانا سنتی رہتی ہے، بیوی نے لڑکے سے شکایت کی، میاں بیوی کی رائے ٹیلی ویژن لانے کی ہوئی تو میاں بیوی نے مشورے سے والد کو تنگ کرنا شروع کیا، آخر باپ تنگ آکر چھوٹی بیٹی کے یہاں چلا گیا، ٹیلی ویژن بھی آگیا اور محلے والوں کو دیکھنے کی دعوت بھی دی جانے لگی، اس طرح کھیل تماشا دیکھنے کے لئے بہانہ بناکر باپ کو گھر سے نکال دینا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

۳- ایک شخص نے لڑکے کو علم دین کے لئے لگایا، دیوبند خیال کے ہیں، لڑکا دس سال درس نظامی حاصل کرتا رہا اور چار سال بعد نیو کراچی میں والد نے مکان بھی خرید دیا اور شادی کردی، یہ مولوی صاحب جب دو سال کے تھے تو والدہ کا انتقال ہوگیا تھا، باپ نے ہی پرورش کی تھی، لیکن شادی کے بعد مولوی صاحب نے اپنے والد، بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرلیا ہے، غیروں سے میل جول ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب ۱:- اس سوال کے جواب میں بہت تفصیل ہے، کوئی خاص صورت معین کرکے لکھیں تو اس کا حکم بتادیا جائے گا۔

۲- صورت مسئولہ میں لڑکے کا عمل سراسر خلاف شرع ہے، گھر میں ٹیلی ویژن رکھنا بذات خود ایک فتنہ ہے، چہ جائیکہ اس کی خاطر باپ کو تنگ کرکے گھر سے نکلنے پر مجبور کرنا۔ اس میں تو بہت سے گناہ جمع ہوگئے۔[1]

۳:- صورت مسئولہ میں اس لڑکے کا عمل درست نہیں، جو صحیح معنی میں عالم دین ہو وہ یہ نہیں کرسکتا، اس کو چاہئے کہ اپنے اس عمل سے توبہ کرکے اپنے والد اور اعزہ کے حقوق ادا کرے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۶/۱/۱۳۹۷ھ

(حاشیہ ۱، ۲ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

غیبت کے چرچوں کی وجہ سے پڑوسیوں کے گھر آمد و رفت سے رُکنا

سوال:- ہر جگہ میں آج کل فتنہ اور غیبت کا بہت زور ہے، ہمسایہ وغیرہ کو غیبت کے چرچے سے منع کروں تو عورتیں نہیں رکتیں، بہرحال فتنہ وغیبت کی وجہ سے بیمار پرسی اور ماتم پرسی میں بھی جانا نہیں چاہتی، اگر جاؤں تو غیبت اور دیگر مفاسد میں مبتلا ہونا پڑتا ہے، اگر نہ جاؤں تو پڑوسی ناراض ہوتے ہیں، کیا حکم ہے؟ اور ایسی صورت میں اگر میت والوں سے یہ کہا جائے کہ میں بہت زیادہ مشغول تھی تو کہیں یہ جھوٹ تو نہیں ہوگا؟

جواب:- حقوق شرعیہ مثلاً عیادت وتعزیت میں جانا چاہئے[۱] البتہ جب یہ اندیشہ ہو کہ غیبت یا کسی اور برائی میں مشغول ہونا ہوگی تو اس صورت میں اہل میت سے اپنے آپ کو مشغول کہنے میں جھوٹ بھی ان شاء اللہ نہ ہوگا، اور نیت اپنی گھریلو مشغولیت یا ذکر اللہ میں مشغول ہونے کی کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۱/ ۲۹ ب)

ناجائز اُمور میں باپ کی اطاعت کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ یہاں ایک شخص اپنے بیٹے کو نماز پڑھنے اور مسجد میں جانے اور قرآن پاک پڑھنے سے منع کرتا تھا، لوگ اسے کمیونسٹ کہتے، بعض مرزائی کہتے، اس کے پڑوس میں میت ہوئی وہ اس کے جنازے میں شریک نہ ہوا، ایک مرزائی کے جنازے میں شریک ہوا اور پوری رسومات میں شریک ہوا، اس کے بعد اس کے بیٹے محمد قاسم نے باپ کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیا کہ میرا باپ مرزائی ہے، اب محمد قاسم کہتا ہے کہ میرا باپ مرزائی ہے، مجھ کو اس سے کیا معاملہ کرنا چاہئے؟

جواب:- باپ کی اطاعت صرف جائز کاموں میں واجب ہے، لہٰذا اگر باپ کسی جائز کام کا حکم دے تو بیٹے کو اس کی اطاعت کرنا چاہئے، اور اس کے ساتھ حسن سلوک اور اس کی خدمت میں

---

(۲) وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا، إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما. واخفض لهما جناح الذل من الرحمة" الآية (الاسراء: ۲۳، ۲۴) وانظر تفسير هذه الآية (الاسراء ۲۲) وفي جامع الترمذي ابواب البر والصلة باب ما جاء في عقوق الوالدين ج۲ ص:۱۲ (طبع فاروقی کتب خانہ)

(۱) وفي مشكوة المصابيح باب السلام ص ۳۹۸ طبع قديمي كتب خانه عن علي قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم للمسلم على المسلم ست بالمعروف يسلم عليه اذا لقيه ويجيبه اذا دعاه ويشمته اذا عطس ويعوده اذا مرض ويتبع جنازته اذا مات ويحب له ما يحب لنفسه رواه الترمذي والدارمي

کوتاہی نہیں کرنی چاہئے، لیکن اگر وہ کسی ناجائز کام کا حکم دے یا فرائض شرعیہ کی ادائیگی سے روکے تو اس کی اطاعت واجب نہیں، لقوله تعالىٰ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَىَّ" الآية۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۳۹/۲۷ و)

والدہ کے حکم سے بیوی کو طلاق دینے کا حکم

سوال:- میری عمر ۳۶ سال ہے، والد صاحب قبلہ کا انتقال ۱۹۵۹ء میں ہوا، اس کے بعد ساری ذمہ داری مجھ پر آئی، ہم تین بھائی بڑے ہیں، پھر دو بہنیں ہیں، میں منجھلا ہوں، جب سے مجھ پر ذمہ داری آئی میں نے اپنی دونوں بہنوں اور بڑے بھائی کی شادی کردی، ان فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے میں شادی نہ کرسکا، والدہ صاحبہ تین سال تک رشتے کی تلاش میں رہیں، کہیں لڑکی پسند نہ آئی، کہیں لڑکی والوں نے انکار کردیا، میں پرست نہ ہونے کی وجہ سے غلط راستہ اختیار کرلیا، ایک غریب لڑکی تھی، ہم دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے، پھر ایک مرتبہ ہم سے غلطی ہوئی اور حمل ہوگیا، ہم نے اسقاط کروادیا، دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، میں نے توبہ کی، مگر تعلق میں کمی نہ ہونے کے سبب اور لڑکی کے یہ کہنے کے سبب کہ اب وہ کبھی شادی نہیں کرے گی کیونکہ اس کی زندگی خراب ہوئی ہے۔ میں اس کے ساتھ اس خیال سے ملتا رہا کہ کہیں غلط راہ پر نہ چلی جائے، ہوسکے تو کہیں اس کی شادی کرادوں، اسی دوران ہم سے تیسری غلطی ہوئی اور حمل ٹھہر گیا (اس دوران میں اپنی والدہ کو منانے کی کوشش کرتا رہا کہ شادی ہوجائے، مگر وہ نہ مانیں، اگر مان جاتیں تو شاید یہ غلطی نہ ہوتی)، تیسری مرتبہ اسقاط کرانے کے حق میں نہ تھا، اگرچہ وہ راضی تھی۔ چنانچہ ایک قاضی صاحب سے بات کی اور باقاعدہ چند دوستوں کے سامنے نکاح کرالیا، دوستوں کو بھی پتہ تھا کہ میرا نکاح ہو رہا ہے، تاریخ میں نے دو ماہ پہلے کی ڈلوائی، اب والدہ، بھائی، بہنوں کو علم ہے کہ کہیں میں نے شادی کرلی ہے، مگر والدہ شدید ناراض ہیں، چونکہ میں ان کے ارمانوں کا مرکز تھا، اب والدہ کہتی ہیں کہ اس لڑکی کو طلاق دے دو، تو میں معاف کردوں گی، دودھ بھی بخش دوں گی، ورنہ نہیں۔ میں حقیقتاً نمازی ہوگیا ہوں، اللہ سے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں، مجھے ماں کی بھی ضرورت ہے، اور اس بدنصیب بیوی کی بھی، لیکن یہ آگ پانی کس طرح ملیں گے، آپ کوئی وظیفہ لکھیں تاکہ دُنیا میں شرمندگی نہ ہو۔

---

[1] سورۃ لقمان: ۱۵ وفی الصحیح للامام مسلم رقم الحدیث ۱۸۴۰ ج۳ ص ۱۴۶۹ (طبع دار احیاء التراث العربی) لا طاعة فی معصیة الله، انما الطاعة فی المعروف الخ وفی مصنف ابن ابی شیبة رقم الحدیث ۳۳۷۱۷ ج۶ ص: ۵۴۵ (طبع مکتبة الرشد، ریاض) لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق

جواب:- آپ سے اور آپ کی بیوی سے جو گناہ سرزد ہوئے ان پر صدق دل سے توبہ استغفار کیجئے، اور اپنی زندگی کو احکام الٰہی کے مطابق بنانے کی فکر میں لگ جائیں، ان شاء اللہ سچی توبہ ہوگی تو اللہ تعالیٰ یہ گناہ معاف کر دے گا۔ اب اگر آپ اپنی بیوی سے مطمئن ہیں اور کوئی وجہ طلاق دینے کی نہیں پاتے تو آپ پر اس معاملے میں والدہ کے حکم کی تعمیل واجب نہیں،(۱) البتہ والدہ کو راضی کرنے کے لئے انہیں اصل حقیقت مناسب طریقے پر بتا دیجئے۔ نیز قرآن و حدیث کے وہ احکام دکھائیے جس میں تصریح ہے کہ سچی توبہ سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو معاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر وہ راضی ہو جائیں فبہا، ورنہ آپ پر اس معاملے میں ان کی تعمیل واجب نہیں،(۲) انہیں دوسرے طریقوں سے خوش کرنے کی کوشش کیجئے اور اپنی بیوی کو بھی ہدایت کیجئے کہ وہ ان کی خدمت سے ان کی رضامندی حاصل کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۴۲ ج)

مرزائیوں سے تعلق رکھنے والے رشتہ داروں سے تعلق کا حکم

سوال:- زید کا قریبی رشتہ دار بکر مرزائی ہے، زید کا شرعی قانون کے مطابق بکر کے ساتھ کسی قسم کا میل جول نہیں ہو سکتا، مگر زید کے رشتہ دار ایسے آدمیوں کے گھر خوشی غمی میں جاتے ہیں جہاں بکر کی آمد و رفت ہے، یہ آدمیوں سے مراد بھی رشتہ دار ہی ہیں کہ جن سے برادری کے تعلقات ہیں، مگر یہ لوگ باوجود مسلمان ہونے کے بکر وغیرہ سے میل جول رکھتے ہیں اب جو ان تعلق داروں کے گھر، معاملات وغیرہ میں شریک ہو اور بکر کی آمد و رفت وہاں ہو تو کیا شرعاً ایسے گھر جانا جائز ہے؟ جو لوگ ایسے ہوں کہ ان کے ہاں مرزائی کا آنا جانا ہو یا ان کی برادری کے گھر مرزائی کا آنا جانا ہو، ان سے تعلق کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب:- صورت مسئولہ میں زید کے لئے اپنے مسلمان رشتہ داروں کے یہاں آنے جانے کی گنجائش ہے، البتہ اسے چاہئے کہ وہ اپنے مسلمان رشتہ داروں کو مرزائیوں سے قریبی تعلقات رکھنے سے حکمت کے ساتھ روکتا رہے۔(۳)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۲/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲ ۲۹ ب)

---

(۲) اس مسئلے کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ کا رسالہ "تعدیل حقوق الوالدین" امداد الفتاویٰ ج ۴ ص ۲۶۰ تا ۲۶۵ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

(۳) وفی تکملة فتح الملهم ج ۵ ص ۳۵۲ قال ابن عبد البر: أجمع العلماء على أن من خاف من مكالمة أحد وصلته ما يفسد عليه دينه أو يدخل مضرة في دنياه يجوز له مجانبته وبعده ورب صرم جميل خير من مخالطة تؤذيه الخ

اُستاذ کو گالی دینے کا حکم

سوال: - کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے میں کہ کوئی شاگرد اُستاذ کو گالیاں دیدے تو اس کا کیا حکم ہے؟ عاق ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب: - کسی مسلمان کو گالیاں دینا حرام ہے، سباب المسلم فسوق، الحدیث۔[1] خاص طور پر اُستاذ کو گالی دینا بڑا گناہ ہے، حدیث میں علماء کی تعظیم کا ذکر ہے، اور جو علماء کی توہین کرے گا فرمایا گیا ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۳/۱/ ۹۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۳۳/۱۸ الف)

والدین اور اساتذہ کے لئے تعظیماً کھڑے ہونے کی شرعی حیثیت

سوال: - والدین یا اساتذہ کے لئے تعظیماً کھڑا ہونا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب: - والدین، اُستاذ، اہلِ علم یا دُوسرے قابلِ تعظیم افراد کے لئے کھڑا ہونا بغرضِ تعظیم جائز ہے بلکہ فقہاء نے اسے مستحب لکھا ہے، درمختار میں ہے: وفي الوهبانية يجوز بل يندب القيام تعظيمًا للقادم كما يجوز القيام ولو للقارئ بين يدي العالم وقال الشاميؒ تحته أي ان كان ممن يستحق التعظيم قال في القنية قيام الجالس في المسجد لمن دخل عليه تعظيمًا وقيام قارئ القرآن لمن يجيء تعظيمًا لا يكره اذا كان ممن يستحق التعظيم (شامي ج ۵ ص ۲۴۶ كتاب الحظر والاباحة قبيل فصل البيع)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۵۵/۲۷ و)

والدین کے کہنے پر بلا عذرِ شرعی، بیوی کو طلاق دینے کا حکم

سوال: - عام طور پر مشہور ہے کہ صرف والدین کے کہنے پر بلا عذرِ شرعی بھی بیوی کو طلاق دے دینی چاہئے، کیا یہ دُرست ہے؟ گھر میں جھگڑے کی وجہ سے اگر والدین اس پر مجبور کریں تو کیا حکم ہے؟

---

(۱) وفي صحيح البخاري باب ما ينهى عن السباب واللعن ج ۲ ص ۸۹۳ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم سباب المسلم فسوق، وقتاله كفر وفيه أيضًا ان النبي صلى الله عليه وسلم يقول لا يرمي رجل رجلًا بالفسوق ولا يرميه بالكفر الا ارتدت عليه ان لم يكن صاحبه كذلك۔

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج ۶ ص ۳۸۴ (طبع سعيد) وفي صحيح البخاري ج ۲ ص ۹۲۶ باب قول النبي صلى الله عليه وسلم قوموا الى سيدكم" عن ابي سعيد ان اهل قريظة نزلوا على حكم سعد فارسل النبي صلى الله عليه وسلم اليه فجاء، فقال قوموا الى سيدكم ... الخ وفي حاشية البخاري وفيه استحباب القيام عند دخول الافضل وهو غير القيام المنهي، لأن ذلك بمعنى الوقوف وهذا بمعنى النهوض ... الخ

جواب:- اگر شوہر طلاق دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں سمجھتا تو اسے اپنے والدین کو نرمی کے ساتھ سمجھانا چاہئے کہ طلاق بالکل آخری قدم ہے جسے بغیر شدید مجبوری کے اختیار نہ کرنا چاہئے، حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ "ابغض المباح الی اللہ الطلاق"[1]، یعنی مباحات میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز طلاق ہے، اُمید ہے کہ نرمی اور حکمت سے فہمائش کی جائے گی تو والدین سمجھ جائیں گے، اور اگر پھر بھی وہ نہ سمجھیں تو طلاق نہ دے[2]، اور راضی کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۶۴/۱۸ الف)

بھائی بہنوں سے بیوی کی ملاقات پر پابندی لگانے کا حکم

سوال:- کیا کسی مسلمان شوہر کو سدی شریعت نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اپنی ذاتی وجوہات رنجش، عداوت، غرور، تکبر کی وجہ سے اس کے بھائیوں بہنوں سے ملاقات کرنے پر پابندی لگائے؟

جواب:- بھائیوں سے بیوی کے ملنے پر بلاوجہ پابندی لگانا شوہر کے لئے مناسب نہیں ہے، البتہ کوئی معقول وجہ ہو، مثلاً ان سے ملنے سے فساد کا اندیشہ ہو، تو بات دُوسری ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۹/۵۶)

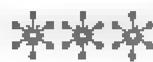

(۱) سنن ابی داؤد ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۳۸۰ تا ۳۸۵، وعزیز الفتاویٰ ص:۱۵۳۔

کتاب السیر والمناقب

(انبیاء اور مختلف شخصیات کے حالات ومناقب)

قسطنطنیہ پر حملے میں شرکت کی بناء پر یزید کے جنتی ہونے کا عقیدہ رکھنا

سوال:- عن خالد بن معدان ان عمير بن الأسود العنسي حدثه أنه أتى عبادة بن الصامت وهو نازل في ساحل حمص وهو في بناء ومعه أم حرام قال عمير فحدثتنا أم حرام أنها سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: أوّل جيش من أمتي يغزون البحر قد أوجبوا، قالت أم حرام: قلت: يا رسول الله! أنا فيهم؟ قال: أنت فيهم، قالت: ثم قال: أوّل جيش من أمتي يغزون مدينة قيصر مغفور لهم، فقلت: أنا فيهم يا رسول الله؟ قال: لا

قسطلانی شارحِ بخاری نے لکھا ہے کہ: كان أوّل من غزا مدينة قيصر يزيد بن معاوية ومعه جماعة من سادات الصحابة كابن عمرو وابن عباس وابن الزبير وأبي الأنصاري وتوفي بها أبو أيوب سنة اثنين وخمسين من الهجرة۔ علامہ ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: قال المهلب في هذا الحديث منقبة لمعاوية لأنه أوّل من غزا البحر ومنقبة لولده لأنه أوّل من غزا مدينة قيصر۔ اس پرچہ میں یزید کے متعلق احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جنتی ہے جیسے کہ بخاری کا حوالہ دیا گیا، حقیقت سے آگاہ کریں۔

جواب:- جو حدیث منسلکہ پرچہ میں نقل کی گئی ہے وہ صحیح بخاری میں صحیح سند کے ساتھ موجود ہے، پھر علماء نے اس پر کلام کیا ہے کہ اس لشکر سے کون سا لشکر مراد ہے؟ جہاں تک پہلے سمندری جہاد کا تعلق ہے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں حضرت معاویہؓ کے ہاتھوں انجام پایا، البتہ قسطنطنیہ پر پہلی بار حملہ آور ہونے والا لشکر کون سا تھا؟ اس بارے میں اقوال مختلف ہیں، ایک قول یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے سفیان بن عوفؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر قسطنطنیہ روانہ کیا تھا، جس میں حضرت ابن عباسؓ، ابن زبیرؓ اور ابو ایوب انصاریؓ موجود تھے، اور اسی میں حضرت ابو ایوبؓ کی وفات ہوئی، علامہ عینیؒ نے اس قول کو زیادہ راجح قرار دیا ہے، قلت الاظهر ان هؤلاء السادات من الصحابة كانوا مع سفيان هذا ولم يكونوا مع يزيد بن معاوية لأنه لم يكن اهلاً ان يكون هؤلاء السادات في خدمته۔ یہ زیادہ ظاہر ہے کہ یہ اکابر صحابہ سفیانؓ کے ساتھ ہوں گے، یزید

بن معاویہ کے ساتھ نہیں کیونکہ وہ اس بات کا اہل نہ تھا کہ یہ حضرات صحابہؓ اس کی خدمت میں رہیں۔
(عمدۃ القاری ج:۱۴ ص:۱۹۸، ۱۹۹ ادارۃ الطباعۃ المنیرۃ، وکذا فی طبع دار الفکر)۔

لیکن تاریخی طور پر یہ قول زیادہ مشہور ہے کہ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں ہوا ہے، اس سے بعض علماء نے یزید بن معاویہ کی فضیلت اخذ کی ہے، لیکن حافظ ابن حجرؒ، علامہ بدرالدین عینیؒ اور دُوسرے علمائے محققین نے اس کی تردید کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ حدیث مذکور میں ایک عام حکم دیا گیا ہے کسی فرد کی تخصیص نہیں، لہٰذا یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص دُوسرے اسباب کی بناء پر اس عام حکم سے خارج ہو، (فتح الباری ج:۶ ص:۷۸) گویا یہ ایسا ہی ہے جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے "من قال لا إله إلّا الله دخل الجنة" جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک عام حکم ہے اور لا الٰہ الا اللہ کہنے کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو، لیکن اگر دُوسرے گناہوں کا ارتکاب کرے یا بعد میں مرتد ہوجائے تو وہ اس عام حکم سے خارج ہوجائے گا، صحیح بات یہ ہے کہ اس حدیث کا اصل مقصد قسطنطنیہ کے جہاد کی ترغیب دینا اور اس جہاد میں شرکت کی فضیلت کا اظہار ہے، جس کو یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے اس کا انکار کرنا بھی غلط ہے۔

لیکن اس فضیلت کی بناء پر اس کے دُوسرے ناجائز افعال کا جواز تلاش نہیں کیا جاسکتا، یزید بن معاویہ نے اگر اس جہاد میں شرکت یا اس کی سربراہی کی تو بلاشبہ اس کا یہ عمل نیک اور باعثِ اجر ہے، لیکن اس نیک عمل سے ان ناجائز افعال کا جواز ثابت نہیں کیا جاسکتا جو اس نے اپنے عہدِ حکومت میں انجام دیئے ہوں، چنانچہ اہل سنت والجماعت کا مسلک اس کے بارے میں یہی ہے کہ وہ مسلمان تھا، اسی لئے محقق علماء نے اس پر لعنت کرنے کو جائز قرار نہیں دیا، اور نہ یہ کہنا دُرست ہے کہ قیامت میں اس کی بخشش نہیں ہوگی۔ اس نے اپنے عہد میں بلاشبہ بعض ناجائز افعال کئے، ان افعال کو ناجائز قرار دیا جائے گا، اس کے بعد معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، وہ چاہے تو مغفرت کردے اور چاہے تو سزا دے، ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ جس سے دُنیا میں اس کے مغفور لہ یا معذب ہونے کا فیصلہ کرسکیں۔ یزید کے بارے میں اہل سنت کے مسلک کی بہترین ترجمانی علامہ ابن تیمیہؒ نے ان الفاظ میں کی ہے: الناس فی یزید طرفان ووسط، قوم یعتقدون أنه من الصحابة أو من الخلفاء الراشدین المهدیین أو من الأنبیاء وهذا كله باطل، وقوم یعتقدون أنه كافر منافق فی الباطن .. وكلا القولین باطل یعلم بطلانه كل عاقل، فإن الرجل ملك من ملوك المسلمین وخلیفة من الخلفاء الملوك لا هذا ولا هذا. (منهاج السنة لعلامة ابن تیمیة ج:۲ ص:۲۴۲ طبع مكتبة الریاض الحدیثة، ریاض)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یزید کو خلفائے راشدین مہدیین میں سے

سمجھنا بھی غلط ہے، اور اسے کافر، منافق قرار دینا بھی صحیح نہیں، اہل حق کا مسلک اس افراط و تفریط کے درمیان ہے، اس اعتدال پر قائم رہنا چاہئے اور اس قسم کی فضول بحثوں میں نزاع و جدال یا ان میں اپنی عمر کے اوقات صرف کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۰/۱/۱۳۹۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۴۳/۲۲ الف)

قبیلۂ ''جون'' کی عورت اُمیمہ بنت شراحبیل سے متعلق شیعوں کا من گھڑت قصہ

سوال:- یہ واقعہ بخاری میں موجود ہے یا نہیں؟ شیعوں کی کتاب سے نقل کردہ یہ واقعہ عدالت میں پیش کرنا ہے۔ میرے سامنے جو کتاب ہے اس کے ص ۶۷ پر یہ واقعہ یوں نقل کیا گیا ہے اور میں اس کو حرف بحرف نقل کر رہا ہوں۔ ''ایک جونیہ عورت کو حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) کسی تدبیر سے اس کے گھر سے منگا بھیجا اور شہر کے باہر جا کر درختوں کے پتوں کی آڑ کر کے اس سے اپنا مطلب پورا کرنا چاہا، اس پر وہ چیخنے اور دُعائیں دینے لگی، جب کسی طرح راضی نہیں ہوئی معاملہ طول کھینچ گیا، پکڑ دھکڑ کا خوف ہوا، راز فاش ہوجانے کی گھڑی پہنچ گئی، انتہائی درجے کی رُسوائی کا اندیشہ ہوگیا، اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بالکل مایوس ہوگئے تو اس کو کچھ دے دلا کر واپس کردیا۔''

یہ نہایت درجہ رُسوا کرنے والا واقعہ بھی اس صحیح بخاری کی جلد نمبر ۶ ص ۱۶۲ میں موجود ہے۔ اس کو بھی پڑھ کر آج کی دُنیا حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عفت و شرافت کی کتنی دھجیاں اُڑاتی ہوں گی؟

جواب:- آپ کا خط ملا، شیعوں کی جس کتاب سے آپ نے عبارت نقل کی ہے، وہ ان لوگوں نے اپنی عادت کے مطابق غلط طور پر گھڑ کر بیان کی ہے، اصل واقعہ جو صحیح بخاری میں مروی ہے اس کا خلاصہ دُوسری روایات کی روشنی میں یہ ہے کہ قبیلۂ جون کا ایک سردار مسلمان ہوکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور اس نے ذکر کیا کہ ہمارے قبیلے میں ایک خاتون اُمیمہ بنت شراحبیل بیوہ ہوگئی ہیں اور انہوں نے آپ کے ساتھ نکاح کی رغبت ظاہر کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حالات معلوم کرنے کے بعد نکاح کی رضامندی فرمادی اور نکاح کر بھی لیا اور ان کے وطن سے مدینہ طیبہ بلوالیں، جو صاحب ان کو لے کر آئے تھے انہوں نے ان کو بنوساعدہ کی ایک حویلی میں ٹھہرایا اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی، آپ وہاں تشریف لے گئے اور منکوحہ ہونے کی حیثیت سے ان کے کمرے میں داخل ہوئے، اور جب ان سے کوئی بات شروع کی تو انہوں نے یہ کلمہ کہا: ''میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ تم نے ایک ایسی ذات کی پناہ مانگی ہے جو پناہ مانگنے کے لائق ہے، چنانچہ آپ نے اس کے بعد اسے طلاق دے دی اور ان کو جوڑے دے کر واپس ان کے گھر بھجوانے کا حکم دے دیا۔

واقعہ کا یہ خلاصہ صحیح بخاری کتاب الأشربة حدیث نمبر ۵۶۳۴، صحیح مسلم کتاب الأشربة، باب اباحة النبیذ، اور طبقات ابن سعد ج:۸ ص:۱۴۳ سے ماخوذ ہے۔[1]

رہا یہ سوال کہ اس خاتون نے پناہ کیوں مانگی؟ اس کے بارے میں بعض ضعیف روایتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ کچھ ازواج مطہرات نے ان کو یہ سکھا دیا تھا کہ ''اعوذ باللہ منک'' کا کلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے، اور مقصد یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ کلمہ سن کر ان کو طلاق دے دیں۔ لیکن یہ روایات واقدی اور ہشام بن الکلبی کی روایتیں ہیں، جو طبقات ابن سعد میں ان کے حوالے سے بیان کی گئی ہیں، اور یہ دونوں ناقابل اعتبار راوی ہیں، جو اپنے جھوٹ اور اپنے رفض میں مشہور ہیں، لہٰذا اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، ورنہ امہات المومنینؓ سے یہ توقع ہو سکتی ہے۔

احقر نے تمام متعلقہ روایات کو سامنے رکھنے کے بعد تکملة فتح الملهم[2] میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاید یہ خاتون دماغی اعتبار سے نارمل نہیں تھیں، ان کے کچھ اور جملے بھی صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہیں، جن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ ہے واقعہ کی مختصر حقیقت اس کو مذکورہ کتاب کی عبارت سے ملا کر دیکھئے کہ دونوں میں کتنا تضاد ہے؟ جس کو تحریف اور بددیانتی کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔

والسلام
۱۴۰۰/۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۴۱/۱۴۴ الف)

بعض تاریخی روایات کی بنیاد پر صحابہ کرامؓ کے حق میں بدگمانی کرنا

سوال:- کیا کوئی ان غلطیوں سے صحابہ کرامؓ کی توہین کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے؟

۱- عمرو بن العاص نے امیر معاویہ کو کہا اب میں ایک ایسی چال چلوں گا کہ یا تو جنگ ختم ہو جائے گی یا حضرت علی کی فوج میں نفاق پڑ جائے گا، اس نے اپنی فوج کے متعدد نیزوں پر قرآن بند چڑھوا دیئے۔

(۱) صحیح بخاری ج ۲ ص:۸۴۲، صحیح مسلم ج ۲ ص ۹۸، ۱۹۹، وطبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۴۳، ۱۴۴
(۲) کتاب الأشربة ج:۳ ص ۲۵۰

۲:- حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن العاصؓ نے ایک گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر مشورہ کیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو اپنے منصب سے معزول کریں، عمرو بن العاص نے فریب کیا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کو منبر پر فیصلے کے لئے کھڑا کردیا، حضرت ابوموسیٰ اشعری نے اعلان کیا کہ ہم دونوں کو معزول کرتے ہیں، بعد میں حضرت عمرو بن العاص نے حضرت علی کی معزولی کا اعلان کیا اور حضرت معاویہ کی معزولی کی نفی کی، ابوموسیٰ اشعری ان کے بیان پر ششدر رہ گئے اور فرمایا کہ یہ اعلان صریح غداری اور بے ایمانی ہے۔

۳:- امیر معاویہ نے زبردستی سے یزید کے لئے بیعت لی تھی، لیکن امام حسین متفق نہ ہوئے، خلفائے راشدین کا تو یہ حال تھا کہ خلافت کا معاملہ رائے شوریٰ پر چھوڑتے تھے مگر امیر معاویہ نے قیصر وکسریٰ کی سنت کے مطابق بادشاہت کا سلسلہ جاری کردیا۔

جواب:- عبارت مذکورہ میں صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ تاریخ کی بعض کتابوں میں موجود ہیں، لیکن خاص طور سے مشاجرات صحابہ کے بیان میں تاریخی روایت اس قدر مختلف، بسااوقات متضاد ہیں کہ ان سے صحیح واقعات کا پتہ معلوم کرنا بڑا مشکل ہے، لہٰذا ان کی بنیاد پر صحابہؓ کے حق میں بدگمانی کرنا، دانش مندی کے خلاف ہے، ان کا معاملہ انہی پر چھوڑا جانے اور ان کی حرمت وعظمت دل میں رکھنی چاہئے "تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ"[1]۔

فقط واللہ اعلم بالصواب
۱۳۸۷/۱۱/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۳۳۵ الف)

حضرت فاطمہؓ کے نکاح کی تاریخ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کا نکاح کس تاریخ میں ہوا؟ اور مہر کتنا مقرر ہوا تھا؟

جواب:- حضرت فاطمہ کا نکاح رمضان سنہ۲ھ میں ہوا، اور چار سو مثقال چاندی مہر مقرر کیا گیا، تاریخ نکاح کے بارے میں رجب سنہ۲ھ کا بھی ایک قول ہے۔ (الاصابہ[3]، الاستیعاب[2])۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۳/۶/۲ھ

---

(۱) سورۃ البقرۃ: ۱۳۴ و ۱۴۱۔
(۲) ج:۴ ص:۳۶۶ (طبع مصطفیٰ محمد، مصر)
(۳) ج:۴ ص:۱۸۹۳، ۱۸۹۴ (طبع دار الجیل بیروت)

جواب صحیح ہے، چار سو مثقال چاندی ہمارے مروجہ وزن کے اعتبار سے ڈیڑھ سو تولہ تقریباً ہوتے ہیں۔ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

حضرت خدیجہؓ کے مال سے تجارت کرنے پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی کمیشن مقرّر تھا؟

سوال:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت خدیجہؓ کا مال لے کر تجارت کے لئے جاتے تو ابتداء میں آپ کے لئے کوئی کمیشن مقرر ہوتا تھا یا نہیں؟

جواب:- علامہ واقدی نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جن لوگوں کو اپنے مال کی تجارت کے لئے روانہ کرتی تھیں ان سے مضاربت کا معاملہ کرتی تھیں، یعنی منافع میں سے ایک مناسب حصہ ان کو دیا کرتی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انہوں نے عام لوگوں سے دُگنا حصہ مقرّر کیا تھا، وأنا أعطيك ضعف ما أعطي رجلا من قومك. وكانت تستأجر الرجال وتدفع اليهم المال مضاربة (الزرقانی شرح المواہب ج ۱ ص ۱۹۸)۔[1]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۹/۱۸ الف)

حضرت معاویہؓ کے بارے میں کتاب ''شہیدِ کربلا'' اور بعض اکابر کی عبارات کا جواب

سوال:- گزارش یہ ہے کہ آپ کی تصنیف کردہ کتاب ''حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق'' کو پڑھ کر بے حد مسرّت ہوئی۔ کافی لوگ جنھوں نے خلافت و ملوکیت کا مطالعہ کیا تھا حضرت معاویہؓ کو طعن وتشنیع کی نگاہ سے دیکھتے تھے، آپ کی کتاب پڑھ کر کافی حد تک ان کے شبہات کا ازالہ ہوگیا ہے۔ مگر آپ کے والد ماجد مفتیٔ اعظمؒ کی کتاب ''کربلا'' کے صفحہ گیارہ سے لے کر بیس تک کے مطالعے سے مخالفین کے شبہات کو تقویت پہنچتی ہے جو حضرت معاویہؓ کو بغض وعناد سے دیکھتے ہیں۔ ''کربلا'' میں مفتی صاحبؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ خلافت کا سلسلہ جب امیر معاویہؓ پر پہنچتا ہے تو حکومت میں خلافتِ راشدہ کا وہ رنگ نہیں رہتا جو خلفائے راشدینؓ کی حکومتوں کو حاصل تھا۔ (ص ۱۱)

جنابِ من! اگر یہ بات مان ہی لی جائے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کو خلافتِ راشدہ میں

---

(۱) (طبع دار المعرفة بیروت)

شمار نہ کیا جائے تاہم معاویہؓ کے بعد جو اُمراء اور سلاطین ہوئے ہیں، خود عمر بن عبدالعزیزؒ بھی۔ ان سب سے معاویہؓ کا دور بہتر اور افضل ہے، یہ اقرار اور اعتراف خود ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھی کر رہے ہیں، جس کو آپ کا بھی مؤید کہتے ہیں۔

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکومت پر کسی قلم کار نے یہ نہیں لکھا کہ ان کی حکومت خلافتِ راشدہ کے رنگ کی نہ تھی، بلکہ کچھ نے تو انہیں خلیفہ راشد ہی مانا ہے، اس کے علاوہ اہلِ سنت کی کتابوں کو دیکھ کر شبہات کچھ پکے ہونے لگتے ہیں۔

۱:- ہدایہ جلد ثالث میں ہے کہ سلطان جائر کی تقلید جائز ہے، جیسا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ۔

۲ -''مؤمن کے ماہ و سال'' مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ص ۳۵ میں ہے: ''اسی سال سنہ ۴۳ھ میں امیر معاویہؓ نے زیاد بن اُمیہ کو اپنا نائب بنایا اور یہی وہ پہلا عمل ہے جس کے ذریعے اُحکام رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی کی گئی، (ثعلبی وغیرہ)۔'' خلافت و ملوکیت کے صفحہ ۱۷۴ میں نظر ڈالیں تو اس نے بھی یہی لکھا ہے کہ معاویہؓ نے کتاب اللہ و سنت رسول کی خلاف ورزی کی، برائے کرم آپ صحیح مسئلہ سے آگاہ کریں۔

جواب:- آپ کا خط ملا، احقر نے اپنی کتاب ''حضرت معاویہؓ'' میں ایک مستقل باب اسی موضوع پر لکھا ہے کہ علمائے اہل سنت کے نزدیک حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت کی صحیح حیثیت کیا تھی؟ اسے ملاحظہ فرمالیں، خلاصہ اس کا بھی یہی ہے کہ آپؓ کے عہد کو خلافتِ راشدہ کے برابر تو نہیں کہا جاسکتا، لیکن آپؓ ایک امام عادل تھے۔ لہٰذا اگر حضرت والد صاحبؒ نے یہ لکھا ہے کہ آپؓ کے عہد میں خلافتِ راشدہ کا مثالی رنگ باقی نہیں رہا تھا، تو اس میں علمائے اہل سنت کے موقف کے خلاف کوئی بات نہیں ہے، اور اس کا مقابلہ ''خلافت و ملوکیت'' کی ان عبارتوں سے نہیں کیا جاسکتا جن پر احقر نے تنقید کی ہے۔

جہاں تک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کا تعلق ہے، اس کو خلافتِ راشدہ قرار دینے پر اتفاق نہیں ہے، اور حضرت معاویہؓ بلاشبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے صحابیت کی بناء پر بدرجہا فوقیت رکھتے ہیں، لیکن اگر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ حکومت کو بحیثیت مجموعی کوئی شخص بہتر کہے تو اس سے مُسلّم اُصول بظاہر متاثر نہیں ہوتا۔

جہاں تک صاحب ہدایہ کی عبارت کا تعلق ہے! اس میں سلطان جائر ایک فقہی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے، فقہ میں جو شخص امام برحق کے مقابلے میں برسرِ جنگ ہو خواہ وہ کتنا متقی ہو اور اپنے اجتہاد سے ایسا کر رہا ہو اس کو اصطلاحاً ''سلطانِ جائر'' ہی کہتے ہیں، لیکن صاحب ہدایہ نے احتیاط

فرمائی ہے کہ حضرت معاویہؓ کو آپ نے سلطان جائر نہیں کہا،[1] بلکہ یہ کہا ہے کہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، اس کے باوجود صحابہ کرامؓ نے ان سے قضاء کو قبول کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام برحق کے مدمقابل (جسے اصطلاحاً سلطان جائر کہتے ہیں) کی تقلید جائز ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی جو عبارت[2] آپ نے نقل فرمائی ہے، وہ درحقیقت بعض ضعیف تاریخی روایات پر مبنی ہے، اور احقر یہ واضح کر چکا ہے کہ وہ روایات قابلِ اعتماد نہیں ہیں، حضرت شیخ عبدالحق صاحبؒ نے ضمنی طور پر انہیں ذکر کر دیا ہے، شاید تحقیق کا موقع نہ ملا ہو، اور حضرت معاویہؓ کا عذر اگر ان کے سامنے آتا تو شاید ان کی رائے بھی مختلف ہوتی، اس کے ساتھ ہی ان کی عبارت اور خلافت وملوکیت کی عبارت کا موازنہ کرکے دیکھ لیجئے کہ کون سی عبارت توہین آمیز ہے؟ اور اُصولی طور پر یہ بات بھی احقر لکھ چکا ہے کہ ایک صحابیؓ پر کسی ضعیف روایت کی بنیاد پر الزام عائد کرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ بعد کے کسی عالم کے بارے میں یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ان سے تسامح ہوا ہے۔

والسلام

۱۴۰۸/۱۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۸۳/۳۹ ج)

حضرت عباسؓ کی اولاد سادات میں شامل ہے

سوال:- ایک آدمی کہتا ہے کہ سیّدزادیاں اُمتوں پر جائز ہیں، اس نے ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ عباسی بھی سیّد ہوسکتے ہیں، ہم اس سے ناواقف ہیں، آپ بیان فرمادیں۔

جواب:- سوال کا خط کشیدہ جملہ سمجھ میں نہیں آیا، واضح کرکے لکھیں، اور سادات تمام بنوہاشم ہیں، لہٰذا حضرت عباسؓ کی اولاد بھی سادات میں شامل ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۳۳ الف)

---

(۱) ھدایۃ ثالث، کتاب ادب القاضی ص ۱۳۳ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان)

(۲) دیکھئے: "مؤمن کے ماہ وسال" ص ۳۰ (طبع دارالاشاعت)۔

(۳) وفی رد المحتار ج ۲ ص ۳۵۰، قوله ولا الی بنی هاشم، اعلم ان عبد مناف وهو الاب الرابع للنبی صلی الله علیه وسلم اعقب اربعة وهم هاشم والمطلب ونوفل وعبدشمس، ثم هاشم اعقب اربعة انقطع نسل الکل الا عبد المطلب فانه اعقب اثنی عشر، تصرف الزکاة الی اولاد کل اذا کانوا مسلمین فقراء الا اولاد عباس وحارث واولاد ابی طالب من علی وجعفر وعقیل ... الخ

یزید کے بارے میں جنتی ہونے کا عقیدہ

سوال:- قوم کو اس وقت ایسے مسائل درپیش ہیں جن کے حل کی طرف فکر کی ضرورت ہے، لیکن کچھ لوگوں نے بخاری شریف کی حدیث سے غلط استدلال کرکے یزید جیسے فسق و فجور کو جنتی ہونا ثابت کیا ہے، براہِ کرم آپ اس حدیث کی وضاحت فرمائیں۔

جواب:- ہر شخص کو اپنے ایمان اور عملِ صالح کی فکر کرنی چاہئے، یزید کے صالح یا فاسق ہونے کی تحقیق شرعاً کچھ ضروری نہیں، اور نہ آخرت میں اس کے بارے میں سوال ہوگا، قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ: "تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَا کَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ"[1]۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ"[2]۔ لہٰذا ان فضول بحثوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۱۴۶ الف)

یزید کے نام کے ساتھ "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھنا

سوال:- ایک کتاب بنام رشید بن رشید مصنفہ ابو یزید محمد دین بٹ نظر سے گزری، جس میں یزید کو "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھا ہے، کتاب مذکور میں بہت سے علمائے دیوبند کی رائے بھی درج ہے، گزارش ہے کہ اس مسئلہ کی حقیقت سے مطلع فرمائیں۔

جواب:- یزید کو کافر کہنا درست نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ "صلی اللہ علیہ وسلم" یا "رضی اللہ عنہ" لگانا ان کلمات کی بے ادبی ہے، اس سے پرہیز کرنا چاہئے، یہ اُمت مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے، اس پر عمل کرنا چاہئے، اور اس سے زائد فضول و لایعنی بحثوں میں پڑنا کسی طرح درست نہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۸۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

کیا حضرت یوسف علیہ السلام کا زلیخا سے نکاح ہوگیا تھا؟

سوال:- کیا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اس عورت کا عقد نکاح ہوگیا تھا جس نے

---

(۱) سورة البقرة: ۱۳۴ و ۱۴۱

(۲) جامع الترمذی أبواب الزهد ج:۲ ص ۵۵ (طبع فاروقی کتب خانه ملتان)

بُرے ارادے سے مکان کے دروازے بند کردیئے تھے؟

جواب:- بعض تاریخی روایات میں ایسا آیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح زلیخا سے ہوگیا تھا،(۱) لیکن قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۲۳ الف)

کیا یزید بن معاویہؓ پر لعنت بھیجنا ثواب ہے؟

سوال:- یزید بن معاویہؓ پر ہر روز ایک سو بار لعنت بھیجنا کیا کارِ ثواب عمل ہے؟

جواب:- ہرگز نہیں،(۲) یزید کے بارے میں یہ عقیدہ کافی ہے کہ اس نے حضرت حسینؓ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ غلط تھا، لیکن اس پر لعنت بھیجنا اہل سنت کا عقیدہ نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۳/۹ الف)

پاک رحموں اور پاک صلبوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا مطلب

سوال:- نبی علیہ السلام کی حدیث ہے کہ میری پیدائش پاک رحموں اور پاک صلبوں سے ہے، حضرت عبداللہ والد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منی رحم مائی آمنہ میں آنا کیسا ہے؟ اگر بذریعہ منی ہے تو کیا حضرت عبداللہ کی منی پاک تھی؟ اگر پاک تھی تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منی کے متعلق احکام غسل دھونا آیا ہے، اگر پلید تھی تو حدیث پر حرف آتا ہے؟

جواب:- پاک رحموں اور پاک صلبوں سے مراد صحیح النسب ہونا ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباء و اجداد صحیح النسب تھے، اس کا مطلب منی کی طہارت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۲ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

علامہ ابنِ تیمیہؒ کے بارے میں جمہور علماء کی رائے

سوال:- بندۂ ناچیز نے مولوی محمد عمر صاحب کی ایک کتاب پڑھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ

(۱) دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج ۵ ص ۹۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے امداد الفتاویٰ "تحقیق لعن یزید" ج ۵ ص ۴۲۵۔

حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کو بڑے بڑے محدثین معاذ اللہ کافر کہتے ہیں۔ آپ مہربانی فرماکر بندۂ ناچیز کو اس حقیقت سے آگاہ کریں کہ جمہور علماء کی کیا رائے ہے؟ یا کوئی کتاب بتائیں جس میں مولوی عمر کو مکمل جواب دیا ہو، بندہ آپ کے جواب کا منتظر رہے گا۔

جواب:- شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ بڑے عالم گزرے ہیں، البتہ انہوں نے بعض مسائل میں جمہور فقہاء و محدثین اور علمائے اُمت سے اختلاف کیا ہے۔ جمہور اُمت نے ان کے تفردات کو قابلِ عمل نہیں سمجھا، اور اس بناء پر بعض حضرات نے ان کی تردید میں کتابیں بھی لکھی ہیں، ان کے مفصل حالات علامہ ابوزہرہ کی کتاب ''ابن تیمیہ'' میں مل سکتے ہیں، جس کا اردو ترجمہ شائع ہوگیا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۲/۳۰ ج)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کا حکم

سوال ۱:- ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کا کیا حکم ہے؟

۲- سنا ہے ''تقریر دلپذیر'' شائع فرمارہے ہیں، مجھے ضرورت ہے۔

جواب ۱:- اس کے بارے میں علماء کا اختلاف رہا ہے، اکثر حنفی علماء اس کے قائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فضلات پاک تھے، ملّا علی قاری اور علامہ شامی وغیرہ کا رُجحان بھی اسی طرف ہے، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: صحح بعض أئمة الشافعية طهارة بوله صلى الله عليه وسلم وسائر فضلاته وبه قال أبو حنيفة كما نقله في المواهب اللدنية عن شرح البخاري للعيني وصرح به البيري في شرح الأشباه وقال الحافظ ابن حجر تظافرت الأدلة على ذلك، وعد الأئمة ذلك من خصائصه صلى الله عليه وسلم ونقل بعضهم عن شرح المشكوة لملّا علي قاري أنه قال اختاره كثير من أصحابنا، وأطال في تحقيقه في شرحه على الشمائل في باب ما جاء في تعطره عليه الصلوة والسلام۔ (شامی باب الانجاس ج ۱ ص ۳۱۸)[1]۔

۲- غالباً دارالاشاعت مقابل مولوی مسافر خانہ بندر روڈ کراچی یہ کتاب شائع کر رہا ہے، آپ ان سے خط لکھ کر معلوم کرلیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۱/۳/۲۶ھ

(۱) رد المحتار مطلب في طهارة بوله صلى الله عليه وسلم ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع سعيد)
نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۸۰ تا ۸۲۔

کتاب الطھارۃ

(طہارت کا بیان)

﴿فصل في الوضوء والغسل والتيمّم﴾

(وضو، غسل اور تیمّم کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب ومکروہات کا بیان)

جنازے کے لئے کئے گئے وضو سے فرائضِ پنج گانہ پڑھ سکتے ہیں

سوال:- کیا جنازے کی نماز کے لئے کیا گیا وضو فرائضِ پنج گانہ کے لئے بھی کافی ہے؟ یعنی اس سے فرائضِ پنج گانہ پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- ظاہر ہے کہ وضو ایک طہارت مطلقہ ہے، جب وہ مکمل ہوجائے تو ہر عبادت جو طہارت کے ساتھ مشروط ہو اس سے ادا ہوسکتی ہے،(1) ہر عمل کے لئے جداگانہ نیت وضو کے ساتھ کرنا کسی کے نزدیک شرط نہیں، اس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۳/۱۱/۱۳۷۹ھ (2)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

غسل خانے میں بات کرنے کا حکم

سوال:- غسل خانہ اور پاخانہ میں بات کرنے کو عوام ناجائز سمجھتے ہیں، سو شرعاً اس کی کوئی اصل ہے؟

جواب:- قال ابن عابدینؒ عبارۃ الغزنویۃ ولا یتکلم فیہ أی فی الخلاء، وفی الضیاء عن بستان أبی اللیث یکرہ الکلام فی الخلاء، وظاہرہ أنہ لا یختص بحل قضاء الحاجۃ وذکر بعض الشافعیۃ أنہ المعتمد عندھم، وزاد فی الامداد ولا یتنحنح أی إلا بعذر کما إذا خاف دخول أحد علیہ. (رد المحتار ج:۱ ص:۳۱۸)۔(3)

---

(1) وفی الہندیۃ ج:۱ ص:۲۶ (طبع مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ) تیمم لصلوٰۃ الجنازۃ أو لسجدۃ التلاوۃ أجزأہ أن یصلی المکتوبۃ بلا خلاف۔ نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۷۷، وکفایت المفتی ج:۲ ص:۳۱۷ (جدید ایڈیشن دار الاشاعت)۔

(2) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرین افتاء (دورِ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

(3) فتاویٰ شامیہ ج:۱ ص:۳۴۴ طبع ایچ ایم سعید۔

عبارت مرقومہ سے معلوم ہوا کہ بیت الخلاء میں تصریف یہ کہ بوقت قضاء حاجت بات کرنا مکروہ ہے، بلکہ دوسرے حالات میں بھی بولنا درست نہیں، مثلاً کوئی شخص اگر بیت الخلاء میں وضو کر رہا ہو تو تسمیہ اور دوسری دعائیں پڑھنا بھی درست نہیں، کما قال الشامیؒ، اسی طرح بے ضرورت کھانسنا بھی مکروہ ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
(۱)
۱۳۷۹/۱۱/۲۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دانت میں چاندی بھری ہوئی ہو تو وضو اور غسل کا حکم

سوال:- دانتوں میں کیڑا لگ جانے کی وجہ سے اور کوئی علاج مستقل مفید نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر نے علاج چاندی بھروائی ہے، اس صورت میں وضو میں کوئی نقص تو نہیں رہے گا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں وضو میں تو کوئی اشکال ہی نہیں، غسل میں اشکال ہوسکتا تھا لیکن فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ مواضعِ ضرورت میں نیچے تک پانی پہنچانا ضروری نہیں۔

چنانچہ درمختار میں ہے:-

ولا یمنع ما علی ظفر صباغ ولا طعام بین أسنانه او فی سنه المجوف به یفتی وقیل ان صلبا منع وهو الاصح، وقال الشامی: قوله وهو الاصح صرح به فی شرح المنیة وقال لامتناع نفوذ الماء مع عدم الضرورة والحرج (شامی ج:۱ ص:۱۵۴ مبحث الغسل، طبع ایچ ایم سعید)

وقد تقرر فی موضعه ان مفاهیم الکتب حجة، فدل علی انه لا یمنع عدم نفوذ الماء فی مواقع الضرورة، وقد صرح به امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۸.

اور عالمگیریہ میں ہے: قال محمد فی الجامع الصغیر: ولا یشد الأسنان بالذهب ویشدها بالفضة یرید به اذا تحرکت الاسنان وخیف سقوطها فاراد صاحبها ان یشدها یشدها بالفضة ولا یشدها بالذهب، وهذا قول ابی حنیفة، وقال محمد: یشدها بالذهب ایضا (عالمگیریة ج:۵ ص:۳۳۶)۔[۲]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۳۹ ج)

---

(۱) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرینِ فتویٰ (تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔
(۲) کتاب الکراهیة الباب العشرون، وکذا فی امداد الفتاوی ج:۱ ص:۱۹

برہنہ ہوکر غسل کرنا

سوال:- غسل (فرض، سنت، مستحب) اگر مکان میں پردے کا پورا انتظام ہے تو برہنہ ہوکر کرسکتا ہے؟ اور جو وضو غسل کے لئے کیا ہے، بعد میں نماز کے لئے یہی وضو برقرار رہوگا یا نیا وضو کرنا ہوگا؟

جواب:- بہتر تو یہی ہے کہ کوئی کپڑا وغیرہ باندھ کر غسل کیا جائے، لیکن برہنہ ہوکر غسل کرنا جبکہ پردے کا پورا انتظام ہے، بھی بلاکراہت جائز ہے۔[1] غسل میں جو وضو کیا جاتا ہے وہ بعد میں نماز پڑھنے کے لئے کافی ہے، نیا وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔[2]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۱۴ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

گردن کے مسح کی شرعی حیثیت

سوال:- گردن کا مسح سنت ہے یا بدعت؟ مع الدلیل بیان کیجئے۔

جواب:- قال فی الدر المختار (فی مستحبات الوضوء) ومسح الرقبة بظهر يديه (لا الحلقوم) لأنه بدعة،[3] وقال الشامی تحت قوله لانه بدعة اذ لم يرد فی السنة، وقال فی البحر قوله ومسح رقبته يعنی بظهر اليدين۔[4] اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مسح رقبہ تو مستحب ہے، لیکن حلقوم کا مسح بدعت ہے، چونکہ سنت سے ثابت نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۷۹/۱۱/۲۵ھ[5]

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مرض کی وجہ سے پانی نقصان دہ ہو تو تیمّم کیا جاسکتا ہے

سوال:- زید کی بیوی ایک طویل بیماری میں مبتلا ہے حتی کہ نل کے پانی سے وضو کرنے سے

---

(۱) روى البخاري عن أم هانئ بنت أبي طالب تقول ذهبت إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم عام الفتح فوجدته يغتسل وفاطمة تستره، وعن ميمونة قالت سترت النبي صلى الله عليه وسلم وهو يغتسل من الجنابة فغسل يديه ... الخ صحيح البخاري، كتاب الغسل ج ۱ ص ۴۲ (طبع قديمي كتب خانه كراچي)۔

(۲) وفي مشكوة المصابيح ج ... ص ۴۸ (طبع قديمي كتب خانه) عن عائشة قالت كان النبي صلى الله عليه وسلم لا يتوضأ بعد الغسل رواه الترمذي وأبو داؤد والنسائي وابن ماجة۔ وفي المرقاة ج ۱ ص ۳۳۸ لا يتوضأ بعد الغسل أي اكتفاء بوضوئه الأول في الغسل وهو سنة، وكذا في عزيز الفتاوى ص ۱۷۵، وامداد المفتين ص ۷۵۔

(۳) فتاوى شامية ج:۱ ص:۱۲۴

(۴) البحر الرائق ج:۱ ص ۲۸۔ نیز دیکھئے امداد الفتاوی ج:۱ ص:۱۳۔

(۵) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرین فتاویٰ (دورِ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

بھی اس کے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے، کیا اس بیماری کی وجہ سے زید کی بیوی کے لئے تیمّم کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب:- کسی طبیب سے مشورہ کیا جائے، اگر وہ وضو کو مضر قرار دے تو تیمّم کیا جاسکتا ہے۔(۱)

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۱۹ الف)

غسل کے بعد دوبارہ وضو کا حکم

سوال:- اگر وضو کرتے وقت ستر کھلا ہوا ہو مثلاً غسل کے دوران جو وضو کیا جاتا ہے تو یہ وضو نماز کے لئے کافی ہوگا یا نہیں؟ یا کپڑے پہننے کے بعد دوبارہ وضو کرنا ہوگا؟

جواب:- غسل کے وقت کیا ہوا وضو نماز کے لئے کافی ہے،(۲) بشرطیکہ اس وضو کے بعد کوئی ایسا امر نہ پیش آیا ہو جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اور اس میں ستر کھلے ہونے سے کچھ فرق واقع نہیں ہوتا۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۱۳۳ ج)

(۱) وفی الدر المختار باب التیمم ج ص۲۳۲: من عجز عن استعمال الماء ... لمرض یشتد أو یمتد بغلبة ظن أو قول حاذق مسلم ... تیمم، وکذا فی الہندیة الباب الرابع فی التیمم ج ص ۲۸

(۲) وفی مشکوٰة المصابیح ج ۱ ص ۴۸ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یتوضأ بعد الغسل. رواہ الترمذی وأبو داؤد والنسائی وابن ماجة. وفی المرقاة ج ۱ ص ۳۳۸ لا یتوضأ بعد الغسل أی اکتفی بوضوئه الأول فی الغسل وهو سنة، وکذا فی عزیز الفتاوی ص۱۷۵

﴿فصل فی النّجاسات وأحکام التطهیر﴾

(نجاسات کے اَحکام اور پاکی کا طریقہ)

ناپاک رُوئی کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال:- رُوئی اگر ناپاک ہوجائے تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب:- علامہ شامی نے تطہیر کے جو طریقے ابن وہبان سے نقل کئے ہیں، ان میں سے ایک ندف بھی ہے، جس کے معنی ہیں ''دھننا''۔ (ملاحظہ ہو شامی ج:۱ ص:۲۹۰)(۱) اور یہ طریقہ رُوئی ہی پر چسپاں ہوسکتا ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲۶ھ (۲)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

تیل کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال:- گھی اور تیل اگر نجس ہوجائیں تو تطہیر کا طریقہ کیا ہے؟

جواب:- تیل کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو کسی برتن میں ڈال کر اتنا ہی پانی اس میں ڈال دیا جائے اور ہلا کر چھوڑ دیا جائے جب تک کہ تیل اُوپر آجائے، پھر برتن میں سوراخ کرکے یا نتھار کر پانی علیحدہ کردیا جائے، تین مرتبہ یہی عمل کرنے سے تیل پاک ہوجائے گا۔ (کذا فی العالمگیریة ج:۱ ص:۴۳)(۳)۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲۶ھ (۴)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وآخر دون العرک والدف والجفاف .... الخ. فتاوی شامیة ج ۱ ص ۳۱۵ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرین فتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

(۳) عالمگیریة، الباب السابع فی النجاسة واحکامها ج ۱ ص ۴۲ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) وفی الدر المختار ج ۱ ص ۳۳۴ (طبع ایچ ایم سعید) ویطهر لبن وعسل ودبس ودهن یغلی ثلاثا. وفی الشامیة تحته قال فی الدرر لو تنجس العسل فتطهیره أن یصب فیه ماء بقدره فیغلی حتی یعود الی مکانه والدهن یصب علیه الماء فیغلی فیعلو الدهن الماء فیرفع بشیء هکذا ثلاث مرات وهذا عند ابی یوسف خلافا لمحمد وهو اوسع، وعلیه الفتوی

(۴) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرین افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر)

تطہیرِ اشیاء کے طریقوں کی تعداد اور مکمل تفصیل

سوال: -تطہیرِ اشیاء کے کیا کیا طریقے ہیں؟ اور ان میں کیا تفصیل ہے؟

جواب: -تطہیرِ اشیاء کے دس طریقے ہیں:-

۱- دھونا، جیسے ناپاک کپڑا، وغیرہ اسی طریقے سے پاک کیا جاتا ہے۔

۲- پھیر لینا، یہ طریقہ ان اشیاء کے لئے مخصوص ہے جو شفاف ہوں، جیسے آئینہ، تلوار وغیرہ۔

۳- (فرک) کھرچنا، یہ طریقہ منی سے تطہیر کے لئے ہے، عالمگیریہ میں اس کو مطلق چھوڑا گیا ہے، لیکن العرف الشذی میں حضرت شاہ صاحب نے اس طریقے کو قرونِ اولیٰ کے ساتھ بایں وجہ مخصوص قرار دیا ہے کہ اس زمانے میں منی بہت غلیظ ہوتی تھی، اور آج کل عام طور سے منی کی رقت شائع ہے، اس لئے منی رقیق کے لئے محض فرک کافی نہیں۔

۴- مَلنا اور رگڑنا (حت و دلک) اور یہ طریقہ اس صورت کے لئے ہے جبکہ نجس چیز ثخین ہو اور نجاست متجسد (یعنی خشک ہونے کے بعد نظر آنے والی) ہو۔

۵- سوکھ جانا، یہ حکم زمین اور اس میں گڑی ہوئی چیزوں کے لئے ہے، جیسے دیواریں درخت، اینٹیں وغیرہ، یہ تمام چیزیں صرف سوکھ جانے سے پاک ہوجاتی ہیں۔

۶- جلانا، گوبر اور نجس مٹی اس طریقے سے پاک ہوجاتے ہیں، اسی طرح اگر بکری وغیرہ کا سر جو خون میں لتھڑا ہوا ہو اس قدر جلایا جائے کہ خون بالکل زائل ہوجائے تو وہ طاہر ہوجاتا ہے۔

۷- ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیل کردینا استحالہ، مثلاً شراب کو کسی مٹکے میں سرکہ بنا دینا، یہ بھی تطہیر کا سبب بن جاتا ہے۔

۸- دباغت، خنزیر اور آدمی کے علاوہ تمام جانوروں کی کھالوں کو دھوپ میں رکھ کر یا نمک لگا کر مدبوغ کرلیا جائے تو وہ پاک ہوجاتی ہیں۔

۹:- ذکاۃ یعنی حیوان کا ذبح کردینا اس کی جلد کو پاک کردیتا ہے اور گوشت کو بھی، خواہ وہ حیوان غیر ماکول ہو۔

۱۰- نزح، یعنی اگر کنویں میں نجاست گرجائے تو اس کی مناسبت سے کنویں کا پانی کھینچ لینا۔

یہ دس طریقے عالمگیریہ میں ص ۴۲ سے ۴۶ تک نقل کئے گئے ہیں، اور ابن وہبانؒ اور علامہ حصکفیؒ نے ان کے ساتھ چند چیزیں اور ملا کر انہیں اشعار میں جمع کردیا ہے، ابن وہبان کے اشعار علامہ شامیؒ نے نقل فرمائے ہیں:-

واحر دون الفرک والندف والجفا ... ف والنحت قلب العین والغسل یطور

ولا دبغ تخلیل ذکاۃ تخلل ... ولا المسح والنزح الدخول التغوّر

وزاد شارحها بیتا، فقال:-

وأکل وقسم غسل بعض ونحته ... وندف وغلی بیع بعض تقور (١)

(شامی ج:١ ص ٢٩٠)

علامہ حصکفیؒ نے انہی اشعار کو ذرا سا بدل کر فرمایا ہے ؎

وغسل ومسح والجفاف مطهر ... ونحت وقلب العین والحفر یذکر

ودبغ وتخلیل ذکاۃ تخلل ... وفرک ودلک والدخول التغور

تصرفه فی البعض ندف ونزحها ... ونار وغلی غسل بعض تقور (٢)

جس سے مندرجہ ذیل طریقہ ہائے تطہیر مزید معلوم ہوئے:-

۱:- کھودنا، اور یہ طریقہ زمین کو پاک کرنے کے لئے ہے۔

۲- دخول، جس کی تفسیر علامہ ابن عابدینؒ نے یہ کی ہے کہ پاک پانی کا ایسے چھوٹے حوض میں داخل ہونا کہ جو ناپاک ہوگیا ہو، جبکہ ایک طرف سے اس کا پانی نکل رہا ہو، اور نیا پاک پانی داخل ہو رہا ہو، تو اگرچہ حوض کا پانی قلیل ہو، لیکن پھر بھی وہ پاک ہوجاتا ہے۔ (کذا فی رد المحتار ج ۱ ص ۲۹۰)۔ (٣)

۳- تغور، یعنی کنویں کا اتنا پانی خشک ہوجائے کہ جتنا نجاست گرنے کی وجہ سے نکالنا واجب تھا تو یہ پانی نکالنے کے قائم مقام ہوجائے گا۔

۴- تصرف، یعنی ایک نجس چیز میں تصرف کرنا، مثلاً گندم کے ڈھیر میں سے کچھ ناپاک ہوجائے تو اس کے اندر اکل، بیع، ہبہ اور صدقہ وغیرہ کے ذریعہ تصرف کرلیا جائے تو وہ پاک ہوجاتا ہے۔

۵- جوش دینا، جیسے کہ اگر تیل یا گوشت نجس ہوجائیں تو ان کو جوش دے کر پاک کیا جاسکتا ہے۔

۶- تقویر، یعنی جہاں جہاں نجاست ہو، وہاں وہاں سے اس نجس چیز کا علیحدہ کردینا، چنانچہ اگر جما ہوا گھی ناپاک ہوجائے تو اس میں یہی طریقہ استعمال کیا جائے گا۔

یہ چھ طریقے مزید ملا کر کل سولہ طریقہ ہائے تطہیر معلوم ہوئے۔ (٤)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

(۵)

۱۳۷۹/۱۱/۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) فتاوی شامیة ج:١ ص:٣١٥ (طبع ایچ ایم سعید) (۲) الدر المختار ج ١ ص ٣٣٥ (طبع ایچ ایم سعید)

(۳) شامیه ج:١ ص:٣١٥ (طبع ایچ ایم سعید)

(۴) تطہیر شیء کے مذکورہ طریقے فتاویٰ عالمگیریہ ج ۱ ص ۴۱ تا ۴۵ (مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) میں بھی موجود ہیں۔

(۵) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرین افتاء (رجسٹر تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

مٹی کا تیل پاک ہے

سوال:- کروشین تیل پاک ہے یا ناپاک؟ اگر نجس ہے تو نجاست خفیفہ ہے یا غلیظہ؟ بغیر دھوئے نماز درست ہوگی یا نہیں؟

جواب:- کروشین تیل معلوم نہیں کیا ہوتا ہے؟ اگر مراد مٹی کا تیل ہے تو وہ پاک ہے، اسی طرح اور کوئی تیل جو معدن سے نکلتا ہو وہ بھی پاک ہے۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۹/۱۱/۱۳۹۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۴۳ الف)

بیت الخلاء کے لوٹے سے طہارت حاصل کی جاسکتی ہے

سوال:- مسجد میں بھنگی وغیرہ صفائی کرتے ہیں، مگر وہ پیشاب خانے اور بیت الخلاء دھوتے وقت زور زور سے پانی بہاتے ہیں، استنجے کے لوٹے وہیں رکھے ہوتے ہیں، کیا ایسے برتنوں میں پانی لے کر پھر طہارت کی جاسکتی ہے؟

جواب:- ان برتنوں کے ناپاک ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے ان کو تین مرتبہ دھوئیں، پھر بے تکلف ان سے طہارت حاصل ہوسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴/۶/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۵۸۸ ب)

دھوبی کے دُھلے ہوئے کپڑوں کا حکم

سوال:- کپڑے جو کہ نجس ہوتے ہیں ان کے بارے میں طہارت کے اُصول کے مطابق پاک پانی سے تین مرتبہ سختی سے نچوڑنے کے اَحکام ہیں، جبکہ آج کل دھوبی گندے نالوں میں یا حوض وغیرہ میں دھوتے دیکھے جاتے ہیں، پھر گندی جگہوں پر وہ کپڑے سکھاتے ہیں، کیا ایسے دھلے ہوئے کپڑے پہن کر نماز پڑھی جاسکتی ہے؟

جواب:- اصل میں تو کسی دھوبی کو مقرر کرتے وقت اس بات کا اطمینان کرنا چاہئے کہ وہ کپڑوں کو پاک کرکے دھوتا ہے یا نہیں؟ لیکن جب تک ناپاک پانی سے دھونے کا صرف اندیشہ ہو اس

---

(۱) [illegible] تیل سے مٹی کا تیل مراد ہے [illegible] میں مٹی سے تیل [illegible] (محمد [illegible])

وقت تک اجتہاد کے عام کی بناء پر ان کی طہارت ہی کا حکم کیا جاتا ہے۔[1] واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸۸/۲۸ ب)

کتے کی دباغت شدہ کھال پاک ہے

سوال:- خلاصہ سوال یہ ہے کہ ماہنامہ "البلاغ" بابت ماہ شوال سنہ ۱۳۸۷ھ میں "آپ کے سوال" کے عنوان کے تحت کتے کی کھال کے بارے میں یہ فتویٰ دیا گیا ہے کہ کتے کی کھال کو اگر شرعی طور پر ذبح کیا جائے تو اس کی کھال دباغت کی طرح صاف کیا جائے کہ وہ مرنے سے محفوظ ہو جائے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ناپاک، نجس، حرام، گندی چیز کو کسی بھی طریقے سے ذبح کریں، اول تو فقط ذبح وہاں جائز ہی نہیں ہے، پھر اس کی شرعی حیثیت؟

جواب:- حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے "ایما اھاب دبغ فقد طھر" أو کما قال علیہ السلام، اخرجہ مسلم فی صحیحہ[2] یعنی جس کھال کو بھی دباغت دے دی جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔ دوسرے دلائل کی روشنی میں اس سے صرف خنزیر اور انسان کی کھال کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس لئے فقہائے کرام کہتے ہیں: کل اھاب دبغ فقد طھر جازت الصلوۃ فیہ والوضوء منہ الا جلد الخنزیر والآدمی ... ولیس الکلب بنجس العین، الا تری انہ ینتفع بہ حراسۃ واصطیادًا بخلاف الخنزیر (ھدایہ ص ۲۰ ج ۱)۔[3]

ان عبارتوں سے معلوم ہوگیا کہ کتے کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے، اور کتے کا حکم خنزیر کی طرح نہیں ہے جو کسی حال پاک نہیں ہوتا، اور کتے کو ذبح کرنا کھانے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کی کھال وغیرہ استعمال کرنے کے لئے ہو سکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۶/۱۸ الف)

---

(۱) [illegible] ... میں دوسرے امام کے قول [illegible] ... جائے گا۔ دیکھئے امداد الفتاویٰ ج: ... ص ۱۰

(۲) وفی الصحیح لامام مسلم ج: ... ص ۵۹ ... طبع قدیمی کتب خانہ عن عبداللہ بن عباس قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: اذا دبغ الاھاب فقد طھر

(۳) (طبع مکتبہ شرکت علمیہ) وفی الدر المختار ج ۱ ص: ۲۰۳، ۲۰۴ (وکل اھاب دبغ وھو یحتملھا طھر) وما ... [illegible] ... وفی البحر الرائق ج ۱ ص ۱... [illegible] ... بالمیتۃ، لأن جلد المذکاۃ یجوز بیعہ قبل الدباغ

ذبح کرنا کوئی فرض واجب نہیں، اگر کوئی شخص کرلے تو اس کا حکم لکھا ہے۔

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

کیا دھوبی سے کپڑے دُھلانے کے بعد دوبارہ دھونا ضروری ہے؟

سوال:- کیا کسی فیکٹری کے دھوبی سے کپڑے دھلوانے سے کپڑے پاک ہو جاتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- یہ تو فیکٹری کے طریقۂ کار پر منحصر ہے۔ اگر وہ کپڑوں کو پاک کرنے کا اہتمام کریں یعنی کپڑوں کا میل کاٹ کر انہیں دھونے سے پہلے ہر کپڑے کو الگ تین مرتبہ دھوئیں تب تو کپڑوں کے پاک ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے، اور اگر کوئی اور طریقہ اختیار کرتے ہیں تو اس کی وضاحت کی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۶/۶/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دھوبی سے کپڑا دُھلوانے کے بعد کیا دوبارہ پاک کرنا ضروری ہے؟ اور کیا کپڑا پاک کرتے وقت کلمہ طیبہ پڑھنا ضروری ہے؟

سوال:- کپڑوں کی دُھلائی کے بعد اس کو پاک کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کس صورت میں؟ اور کیا اس وقت کلمہ طیبہ پڑھنا ضروری ہے؟

جواب:- اگر کپڑے دھونے والے نے دھوتے وقت پاک کرنے کا اہتمام کیا ہے تب تو دوبارہ پاک کرنے کی ضرورت نہیں، اور اگر یہ معلوم ہو کہ دھوتے وقت پاکی کا اہتمام نہیں ہوا تو بعد میں پاک کریں۔ اور پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے اتنا دھویا جائے کہ نجاست کا اثر زائل ہو جائے، تین مرتبہ دھولیں تو بہتر ہے۔ اور اس وقت کلمہ طیبہ پڑھنا ضروری نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۵/۵/۱۳۹۵ھ

(فتویٰ نمبر ۵/۲۹ ن)

ہاتھی کی سونڈ سے نکلنے والے پانی کا حکم مچھلی کا پتہ پاک ہے یا نہیں؟

سوال ۱:- ہاتھی کی سونڈ سے جو پانی نکلتا ہے وہ عادۃً گرمی کے سبب اپنے بدن پر چھڑکا کرتا ہے، یہ پانی پاک ہے یا نہیں؟

۲- مچھلی کا پتہ پاک ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- ہاتھی کی سونڈ کا پانی دراصل اس کا لعاب ہے، جو فقہاء کی تصریحات کے مطابق ناپاک ہے، درمختار میں ہے "وسؤر (خنزير وكلب وسباع بهائم) ومنه الهرة البرية (وشارب خمر فور شربها وهرة فور اكل فارة نجس)" اور سباع بہائم کے تحت علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: هي ما كان يصطاد بنابه كالاسد والذئب والفهد والنمر والثعلب والفيل ... الخ

(شامي استنبولي "مطلب في السؤر" ج ۱ ص ۲۰۵)۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھی کا جھوٹا نجس ہے، جو لعاب ہی کی فرع ہے، جیسا کہ عالمگیریہ میں ہے عرق كل شيء معتبر بسؤره (ج ۱ ص ۲۴)۔[2] اور فتاویٰ قاضی خان میں خود سوال مذکور کا جواب بایں طور مصرح ہے لعاب الفيل نجس كلعاب الفهد والاسد ... خرطومه نجسة. (خانية ج ۱ ص ۱۷)۔[3] لہٰذا ہاتھی کی سونڈ سے نکلنے والا پانی ناپاک ہے۔

۲- کوئی جزئیہ تو نہیں ملا، البتہ چونکہ مچھلی کا خون ناپاک نہیں ہے جیسا کہ علامہ علاء الدین حصکفی نے درمختار میں تصریح کی ہے، اور علامہ شامی نے اس کے تحت تحریر فرمایا ہے لأنه ليس بدم حقيقة، لانه اذا يبس يبيض والدم يسود (رد المحتار، باب الانجاس ج ۱ ص ۲۹۲)۔[4]

یعنی مچھلی کا خون درحقیقت خون نہیں، چونکہ وہ خشک ہونے کے بعد سفید ہو جاتا ہے، حالانکہ خون خشکی کے بعد سیاہ رہتا ہے، اس لئے خون پر قیاس کرکے پتہ کو بھی پاک کہنا بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ خون پر پتے کو قیاس کرنا اس لئے درست نہیں کہ پتہ حرام ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے کتاب الذبائح ج:۵ ص:۱۷۲ میں ذکر فرمایا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی حرمت سے اس کی نجاست لازم نہیں، جیسے کہ زہر کا استعمال ناجائز ہے، اس کے باوجود اس کی وجہ سے وہ نجس نہیں ہوتا، اسی طرح پتہ بھی ایک کیمیاوی اثرات کا مجموعہ ہے، جو مضرت کی وجہ سے اگر ناجائز ہو تو اس سے اس کی پاکی پر اثر نہیں پڑتا۔

اس تحریر کے بعد ایک عبارت مصرحہ پر نظر پڑی: ومرارة كل شيء كبوله. (عالمگیریة ج:۱ ص ۴۶)۔[5] ہر چیز کا پتہ حکم میں اس کے پیشاب کی طرح ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناپاک ہے،

---

(۱) شامیہ ج ۱ ص ۲۲۲ طبع ایچ ایم سعید۔
(۲) فتاویٰ عالمگیریہ ج ۱ ص ۲۴ (طبع مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)
(۳) خانية على هامش الهندية ج ۱ ص ۲ [illegible]
(۴) فتاوی شامية ج ۱ ص ۳۱۹،۳۲۰ (طبع ایچ ایم سعید)
(۵) فتاوی عالمگیرية ج ۱ ص ۴۶ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) وفی الدر المختار ج ۱ ص ۳۲۹ طبع سعید
مرارة كل حيوان كبوله ... الخ [illegible]

لیکن مچھلی کا پیشاب ہونا خود مشکوک ہے، اس لئے دوسرے اہل علم سے بھی رجوع کر لیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۷۹/۱۱/۲۳ھ[1]

ہاتھ پر نجاست لگنے کی صورت میں کتنی مرتبہ دھونا لازم ہے؟

سوال:- ہاتھ پر پیشاب لگ گیا، پانی سے تو دھویا جتنی دیر میں تین بار پانی ڈالا جاتا ہے، تو پاک ہو گیا یا ہاتھ کو دو مرتبہ اور دھوئیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ہاتھ کو اتنا دھونا ضروری ہے کہ پیشاب کے ہاتھ سے چھوٹ جانے کا غالب گمان ہو جائے، البتہ تین مرتبہ پانی ڈالنا ضروری نہیں، لما فی الدر المختار: ویطهر محل غیرها ای غیر مرئیة بغلبة ظن غاسل طهارة محلها بلا عدد، به یفتی (شامی ج ۱ ص ۲۲۰)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
[illegible]/۹/۱۳۹[illegible]ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳۶/۲۸ الف)

جوتے یا چپل وغیرہ کو وضو خانے میں دھونے کا حکم

سوال:- جوتا اور چپل خراب ہو جائے اور مٹی لگ جائے یا خراب پانی میں گر جائے تو کیا وضو خانے میں دھویا جا سکتا ہے؟

جواب:- بہتر یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کو مسجد کے وضو خانے کے بجائے کسی اور جگہ دھویا جائے، لیکن اگر ضرورت کے وقت وہاں جوتے دھوئے جائیں تو مضائقہ نہیں، البتہ بعد میں اس جگہ کو صاف کر دینا چاہئے تاکہ نمازیوں کو تکلیف نہ ہو۔

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۸۳/۲)

---

(۱) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجہ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔
(۲) الدر المختار ج ۱ ص ۳۳۱ (طبع ایچ ایم سعید) (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی أحکام الماء﴾
(پانی اور کنویں وغیرہ سے متعلق مسائل کا بیان)

تالاب سے پانی لیتے وقت اگر گھڑے میں مینگنی آجائے تو کیا کرے؟

سوال:- ہمارے علاقے میں پانی جمع کرنے کی غرض سے تالاب بنے ہوئے ہیں، بارش کا پانی اس میں جمع ہوتا ہے، کبھی کبھی جب ہم اس سے پانی لیتے ہیں تو اس میں ایک آدھی مینگنی یا گوبر آجاتا ہے، کیا یہ پانی پاک ہے یا نہیں؟

جواب:- تالاب سے پانی لیتے وقت کوئی مینگنی آجائے تو اسے گھڑے سے نکال کر پھینک دے تو پانی پاک ہوگا، اور اگر مینگنی گھڑے میں رہ گئی تو احتیاط اس میں ہے کہ اس سے وضو اور غسل نہ کیا جائے، فی الهداية: فان وقعت فيها بعرة أو بعرتان من بعر الابل أو الغنم لم تفسد الماء الى قوله: ولا يعفى القليل فى الاناء على ما قيل لعدم الضرورة، وعن ابى حنيفة أنه كالبئر فى حق البعرة والبعرتين (هداية ج: ص ٢٢)۔ وفى فتح القدير: فى الشاة تبعر فى المحلب قالوا ترمى البعرة أى من ساعته فلو أخر .... لا يجوز. (ص ٩٠)۔[۲]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۵۵/۱۸ الف)

''دہ در دہ'' حوض میں نجاست گرنے کا حکم

سوال:- ایک مسجد کا حوض پختہ ''دہ در دہ'' پانی سے بھرا ہوا تھا، اس میں چند ٹین کے لوٹے گر گئے جن کے نکالنے کے لئے بندوبست کیا گیا، ان لوٹوں کے ساتھ تین چپل بھی نکل آئے، یہ معلوم نہیں کہ کب سے گری ہوئی تھیں؟ چونکہ ماء کثیر تھا تو زید (امام مسجد) نے تمام پانی نکلوادیا اور حوض خالی ہوگیا، آج کل پانی کی جو قلت ہے وہ ظاہر ہے، اور جواب میں مولانا عبدالحی کا یہ سوال و جواب پیش کیا:-

سوال:- اگر حوض دہ در دہ تھا اور پانی کم ہوجانے پر اس میں نجاست پڑی پھر

---

(۱) (طبع مکتبہ شرکت علمیہ) (۲) فتح القدیر ج:۱ ص:۸۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

حوض میں پانی [illegible] اور وہ [illegible] اور کوئی چیز ان میں سے باہر نہیں نکلی تو وہ حوض کا پانی درست ہے یا نہیں؟

جواب: بعض کے نزدیک درست ہے، اور بعض کے نزدیک درست نہیں ہے۔

جواب: حوض کا پانی [illegible] شیر (دہ در دہ) ہو تو اس میں نجاست کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا جب تک کہ پانی کا رنگ، بو یا مزہ نہ بدل جائے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر پانی کے اندر کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا تھا تو حوض خالی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔[1] فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ کا جو سوال و جواب نقل کیا گیا ہے اس سے استدلال درست نہیں ہے، اس کی صورت بالکل مختلف ہے۔[2]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۵ / ۱۹ الف)

کنویں میں سانپ گرنے کی صورت میں کیا حکم ہے؟

سوال: ایک کنویں میں سانپ کا بچہ [illegible] اور ایک [illegible] موٹا مر کر [illegible] اور جدا نہیں ہوا، کیا اس کے نکالنے سے پانی صاف ہے یا ناپاک؟ اور اگر سارا پانی نکالنا ہے تو اس میں بہت دشواری ہے، اگر یہ سانپ نہ نکالا جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب: اگر سانپ خون والا تھا تو [illegible] پانی ناپاک ہے، اور اس کو نکالنے کے بعد کنویں کا تمام پانی نکالنا واجب ہے۔ اور [illegible] دشواری ہو اگر وہ اس وجہ سے ہے کہ کنواں [illegible] (یعنی اس میں ہر وقت پانی آتا رہتا ہے) تب تو اس قدر پانی نکالنا کافی ہو جائے گا جتنا کہ نکالنا شروع کرتے وقت ہے، اور اس کا اندازہ دو ایسے عادل شخص کا [illegible] جن کو کنویں کی مساحت وغیرہ میں مہارت تامہ حاصل ہو، اس کے بعد جو پانی آئے گا وہ پاک ہوگا۔ اور اگر دشواری عام کنوؤں میں بھی معلوم ہوتی ہے تو وہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج ۱ ص ۱۹۰ [illegible] الی ۱۹۲ وکذا بحوض او بحر کذلک ای وقع فیہ نجس لم یر اثرہ [illegible] فی الطہر واختیر بأن المعتبر عشر فی عشر [illegible] الخ وفی الشامیۃ قولہ: لم یر اثرہ ای من طعم او لون او ریح الخ وفی شرح الوقایۃ کتاب الطہارۃ ج [illegible] ص ۱۰ [illegible] ولا [illegible] کذا وقع فیہ نجس الا [illegible] کان عشرۃ اذرع فی عشرۃ اذرع ولا ینحسر ارضہ بالغرف فحکمہ حکم الماء الجاری [illegible]

(۲) دیکھئے مجموعہ فتاویٰ [illegible] ج ۳ ص ۲۱ [illegible] مولانا عبدالحی لکھنوی (طبع قدیم) باب حوض ج [illegible] ص ۲۰۰ (طبع میر محمد کتب خانہ)۔

شرعاً معتبر نہیں، پورا پانی نکالنا ضروری ہوگا، جس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

۱- تنویر الابصار میں ہے: اذا وقعت نجاسة فی بئر دون القدر الکثیر او مات فیها حیوان دموی وانتفخ او تفسخ ینزح کل مائها بعد اخراجه (شامی ج ۱ ص ۲۱۱، ۲۱۲)۔ [1]

۲- درمختار میں ہے: (وان تعذر) نزح کلها لکونها معینا (فبقدر ما فیها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبی (یوخذ ذلک بقول رجلین عدلین لهما بصارة بالماء) به یفتی (شامی ج ۱ ص ۲۱۳)۔ [2]

اور اگر سانپ خون والا نہیں تھا تو اس کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہے، اس کو نکالنے کے بعد مزید پانی نکالنے کی حاجت نہیں۔ درمختار میں ہے:-

ویجوز رفع الحدث (بما ذکر وان مات فیه) ای الماء ولو قلیلا (غیر دموی کزنبور ومائی مولد کسمک وسرطان، وضفدع الا بریة له دم سائل وهو ما لا سترة له بین اصابعه فیفسد فی الاصح کحیة بریة ان لها دم والا لا۔ علامہ شامی "والا لا" کے تحت تحریر فرماتے ہیں: ای وان لم یکن للضفدع البریة و لحیة البریة دم سائل فلا تفسد (شامی ج ۱ ص ۱۷۱)۔ [3]

یہ تفصیل اس صورت میں تھی جبکہ سانپ خشکی کا ہو، اور اگر پانی کا سانپ ہے تو وہ مطلقاً ہر صورت پانی کو فاسد نہیں کرتا، جیسا کہ علامہ ابن عابدین نے لکھا ہے: اما المائیة فلا تفسد مطلقا کما علم مما مر۔ (رد المحتار ج: ۱ ص: ۱۷۱)۔ [4]

واللہ سبحانہ اعلم

۲۷/۱/۱۳۷۹ھ [5]

کیا ٹینکی سے آنے والا پانی ''ماءِ جاری'' کے حکم میں ہے؟

سوال: آج کل پمپ سسٹم میں یہ ہوتا ہے کہ مکان کی چھت پر پانی کی ایک ٹینکی ہوتی ہے، اور نیچے پمپ کے ذریعے سے اس میں پانی جمع کر دیا جاتا ہے، اس ٹینکی سے تمام مکان میں پانی پہنچایا جاتا ہے، تو اگر اوپر سے پانی ٹینکی میں آ رہا ہو اور نیچے سے پائپ کے ذریعہ پانی نکل رہا ہو تو کیا یہ پانی ''ماءِ جاری'' ہوگا یا نہیں؟

---

(۱) ج:۱ ص:۲۱۱، ۲۱۲ (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) الدر المختار ج ۱ ص ۲۱۳ (ایضاً)
(۳) شامیة ج ۱ ص ۱۸۳ الی ۱۸۵ (طبع ایچ ایم سعید)
(۴) شامیة ج ۱ ص ۱۸۵ (طبع سعید)
(۵) [illegible]

اور اگر کسی ٹنکی میں ایسے وقت میں جبکہ پانی ٹھہرا ہوا ہو، کسی ایک جانب سے یا دونوں جانبوں سے پانی نکل رہا ہو تو کیا جس وقت پانی جاری ہوگا اس وقت وہ ٹنکی پاک ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب — قال في منية المصلي عن ابي يوسف ماء الحمام بمنزلة الماء الجاري. (واختلف المتأخرون في بيان هذا القول، قال بعضهم مراده حالة مخصوصة وهو اذا كان الماء يجري من الانبوب الى حوض الحمام والناس يغترفون منه غرفا متداركا، وقال تحته العلامة الحلبي نقلا عن فتاوى قاضي خان: وان كان الناس يغترفون من الحوض بقصاعهم ولا يدخل من الانبوب ماء او على العكس اختلفوا فيه، واكثرهم على انه يتنجس ماء الحوض، وان كان الناس يغترفون بقصاعهم ويدخل الماء من الانبوب اختلفوا فيه واكثرهم على انه لا يتنجس (انتهى) فهذا هو الذي ينبغي أن يعتمد عليه (كبيري شرح منية ص:۱۰۰)۔(۱)

وقال العلامة طاهر البخاري: وفي الفتاوى وحوض الماء اذا اغترف رجل منه وبيده نجاسة وكان الماء يدخل من انبوبه في الحوض والناس يغترفون من الحوض غرفا متداركا لم يتنجس (خلاصة الفتاوى ج [illegible] ص [illegible] طبع امجد اکیڈمی لاہور) ومثله في الدر المختار على الشامي ج:۱ ص:۹۰۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ وہ حوض صغیر جس کے ایک جانب سے پائپ کے ذریعہ پانی آرہا ہو اور دوسری جانب سے اس میں سے پانی بھر رہے ہوں تو "ماء جاری" کے حکم میں ہے، آج کل جو ٹنکیوں کی صورت مروج ہے وہ بھی بظاہر اس میں داخل ہے۔ مگر اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ علامہ شامی نے اس حکم کو اس صورت میں خاص کیا ہے کہ جبکہ پانی اوپر کی طرف سے نکل رہا ہو، اور اگر نیچے سے کسی سوراخ وغیرہ کے ذریعے سے پانی نکل رہا ہو جیسا کہ مروجہ چھت کی ٹنکیوں سے بذریعہ پائپ نکلتا ہے تو اس صورت میں یہ حکم نہ ہوگا۔

اس کا جواب میرے ذہن میں یہ ہے کہ علامہ شامی نے یہ حکم حوض کے بارے میں بیان فرمایا(۲) اور اس کی تلی میں اگر سوراخ ہو تو یقیناً وہ اس حکم میں نہ ہوگا، کیونکہ اس وقت حوض سے پانی کا خروج نہایت سست رفتار سے اور بہت کم ہوگا، بخلاف اس صورت کے کہ ٹنکی سے پانی پوری قوت و

(۱) غنية المتملي ص:۱۰۲، ۱۰۳ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور)

(۲) شامي مطلب لو أدخل الماء من أعلى الحوض وخرج من أسفله فليس بجار ج:۱ ص:۱۹۰

شدت کے ساتھ نیچے بہتا ہو، ان دونوں میں فرق ہوگیا۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۰/۵/۸ھ[2]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ہندو خاکروب کی دھوئی ہوئی جگہ پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- صدر مملکت پاکستان نے جیسا کہ حکم صادر کیا ہے کہ تمام سرکاری دفتر میں نماز ادا کی جائے، ہمارے یہاں ہندو خاکروب ہیں، اس سے ہم وہ جگہ جو ہم نے نماز کے لئے تجویز کی ہے پانی سے دھلوانا چاہتے ہیں، اگر وہ ہندو خاکروب اپنے ہاتھ پاؤں دھوکر اس جگہ کی دھلائی کرے تو اس جگہ پر نماز پڑھنا درست ہے؟

جواب:- مذکورہ ہندو خاکروب اپنے ہاتھ پاؤں دھوکر اگر زمین کو دھوئے اور اگر جو پانی استعمال کرے تو وہ پاک ہو تو اس جگہ نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۱/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۱۴ الف)

---

(۱) تفصیل کے لئے "خیر الکلام فی حوض الحمام" مصنفہ حضرت مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کا مطالعہ فرمائیں۔
(۲) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرین افتاء (درجہ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

فصل فی أحکام الجنب والمعذور
(جنبی اور معذور سے متعلق مسائل کا بیان)

غسلِ جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری نہیں

سوال:- کیا غسل جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری ہے؟ اور تیل، مہندی وغیرہ کا دھونا ضروری ہے؟

جواب:- غسل جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری نہیں، تاہم چھڑا دیں تو بہتر ہے۔

فی الدر المختار: ولا یمنع الطهارة ونیم .... وحناء ولو جرمه، به یفتی ودرن ووسخ، وکذا دهن ودسومة، وفی رد المحتار أی کزیت وشیرج بخلاف نحو شحم وسمن جامد. (شامی ج:۱ ص:۱۵۴)۔

سوال:- تیل کے علاوہ کوئی چکنی چیز لگی ہو تو صرف پانی سے بال دھونا کافی ہے یا تیل چھڑانا ضروری ہے؟

جواب:- جو چیزیں ایسی چکنی ہیں جیسے تیل، چھڑانے کا حکم نہیں دیا گیا، اور جن کی چکناہٹ کا زائل کرنا ممکن ہو زائل کرے اور جس کا ازالہ متعذر ہو وہ معاف ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۸ /۲۸ ب)

حالتِ جنابت میں دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- حالتِ جنابت میں درود شریف کا معمول پورا کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- حالتِ جنابت میں صرف قرآن کریم کی تلاوت ممنوع ہے، لیکن دعائیں، ذکر و تسبیحات اور دُرود شریف پڑھنا منع نہیں، البتہ مستحب یہ ہے کہ درود شریف اور اذکار وضو کر کے

(۱) رد المحتار ج:۱ ص:۱۵۴ (طبع سعید)، وفی الهندیة الفصل الأول فی فرائضه ج:۱ ص:۴ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) واذا ادهن فأمر الماء علیه ولم یصل یجزیه ... الخ

کم از کم وضو کرلے۔ لما فی الدر المختار: ولا بأس لحائض وجنب بقراءة أدعية ومسها وحملها وذكر الله تعالى وتسبيح. وقال الشامي: إلى أن وضوء الجنب لهذه الأشياء مستحب كوضوء المحدث. (شامی ج:۱ ص:۱۹۳)۔[1]

واللہ اعلم
[illegible]/۳/۱۳۹۰ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۶/۲۹ ب)

جنابت کی حالت میں قرآن چھونے کا حکم

سوال:- ایک شخص پر غسل واجب ہے، وضو کرکے قرآن مجید پر ہاتھ لگا کر پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- جنابت کی حالت میں جب انسان پر غسل واجب ہو اس کے لئے قرآن کریم کا چھونا، پڑھنا سب ناجائز ہے،[1] اور صرف وضو کرنے سے جنابت ختم نہیں ہوتی، اس لئے صرف وضو کرنے سے قرآن کریم کا چھونا یا پڑھنا بھی جائز نہیں ہوتا، اس کے لئے غسل ضروری ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۲/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۹۷/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

ایک ہی شب میں دوبارہ ہم بستری کے لئے غسلِ جنابت ضروری نہیں

سوال:- اپنی بیوی سے صحبت کرنے کے بعد اگر دوبارہ خواہش ہو تو کیا دوبارہ صحبت کے لئے غسلِ جنابت کرنا ضروری ہے؟

---

(۱) فتاویٰ شامیہ ج:۱ ص:۲۹۳ طبع ایچ ایم سعید۔ وفی مشکوٰۃ المصابیح ج:۱ ص:۴۹ طبع قدیمی کتب خانہ: عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تقرأ الحائض ولا الجنب شيئا من القرآن. رواه الترمذي. وفي المرقاة المفاتيح ج:۲ ص:۲۰ [illegible] وفي شرح السنة [illegible] لا يجوز له قراءة القرآن [illegible] والحائض إن جمهور العلماء على الحرمة [illegible] وفي الدلالة عليها أحاديث كثيرة [illegible] كلها ضعيفة [illegible] وهو حجة في الأحكام.
وفي الدر المختار ج:۱ ص:۱۷۲ ويحرم به تلاوة قرآن ولو دون آية على المختار بقصده ومسه.
وفي الهندية ج:۱ ص:۳۸ ومنها حرمة قراءة القرآن لا تقرأ الحائض والنفساء والجنب شيئا من القرآن والآية وما دونها سواء في التحريم على الأصح (محمد زبیر حق نواز)

جواب:- دوبارہ صحبت کرنے کے لئے غسلِ جنابت ضروری نہیں، البتہ بیچ میں وضو کرلینا بہتر ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۵/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵۱/ ۲۸ ب)

کئی مرتبہ ہم بستری کے بعد ایک غسلِ جنابت کافی ہے

سوال:- کیا اپنی بیوی سے ایک شب میں جتنی مرتبہ ہم بستری کی جائے اتنی مرتبہ غسل کرنا بھی ضروری ہوگا؟ یعنی ایک شب میں ایک دفعہ ہم بستری ہوئی، تو دوسری دفعہ جب ہم بستری کرے کیا پہلے غسل کرے؟ ورنہ یہ فعل حرام ہے؟

جواب:- ایک شب میں ہم بستری خواہ کتنی مرتبہ کی جائے سب کے لئے آخر میں ایک غسل کافی ہے،[۲] البتہ اگر کسی ہم بستری کے بعد غسل کرلیا تو آئندہ ہم بستری کے بعد نیا غسل کرنا ہوگا۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵۳/ ۱۸ الف)

لیکن ہر بار غسل کرنا افضل ہے، اور یہ مشکل ہو تو صرف وضو کرے، اور وہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی گناہ نہیں، آخر میں غسل کرے۔[۳]

محمد عاشق الٰہی

ایک ہی شب میں دوبارہ ہم بستری سے پہلے اگر غسل نہ کرے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- عورت کے ساتھ ہم بستری کرنے کے بعد دوبارہ اگر ہم بستری کی ہو تو دوبارہ غسل کرنا ضروری ہے یا اسی حالت میں ہم بستری کرسکتے ہیں؟

جواب:- دوبارہ ہم بستری کا ارادہ ہو تو پہلے غسل یا وضو کرلینا مستحب ہے، لیکن اگر نہ کرے تو کوئی گناہ بھی نہیں۔[۴]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۲/ ۲۸ الف)

---

(۱) تا (۳) وفي مشكوة المصابيح ج ۱ ص ۴۹ طبع قديمي كتب خانه عن ابي سعيد الخدريؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا اتى احدكم اهله ثم اراد ان يعود فليتوضا بينهما وضوءا. رواه مسلم. وفيه ايضا بعده عن انس قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يطوف على نسائه بغسل واحد. (رواه مسلم)

وفي الدر المختار ج ۱ ص ۱۷۵ ... لا يكره معاودة اهله قبل غسله الا اذا احتلم ... قال في الحلبي ظاهر الحديث انما يفيد الندب لا نفي الجواز المفاد من كلامه

پیشاب کے قطروں کی بناء پر کپڑے کی پاکی اور وضو کا حکم

سوال:- مثانے کی کمزوری کی بناء پر اکثر پیشاب کرنے کے بعد قطرے نکل جاتے ہیں، اکثر وضو کرنے کے بعد ایسا ہو جاتا ہے، وضو اور کپڑے کی پاکی یا ناپاکی کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب قطرہ آئے تو کپڑا پاک کرکے وضو دوبارہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

۸/۹/۱۳۹۸ھ

(فتویٰ نمبر ۹۰۲/۲۸ ج)

''لیکوریا'' کے پانی کا حکم اور اس سے متعلق متعدد مسائل

سوال:- عورتوں کو لیکوریا کی بیماری ہوتی ہے، جس کی وجہ سے رحم سے سفید پانی رستا رہتا ہے۔

۱:- کیا یہ سفید پانی نجاستِ خفیفہ ہے یا کہ نجاستِ غلیظہ؟

۲:- اگر کسی عورت کو یہ بیماری ہو اور وہ نماز بھی پڑھتی ہو، چونکہ پانی رسنے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہوتا تو کیا اس پانی کی وجہ سے کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں؟

۳:- باوضو ہونے کی صورت میں یہ پانی نکلے تو کیا وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

۴:- اگر نماز کی ادائیگی کے دوران پانی نکل آئے تو کیا نماز ہو جاتی ہے؟

۵:- اگر نماز نہیں ہوتی تو اس سلسلے میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے کہ نماز ضائع نہ ہو؟

۶:- شرعاً کیا اس قسم کے مریض کو معذور سمجھا جائے گا؟

جواب ۱:- لیکوریا کی بیماری میں جو پانی خارج ہوتا ہے وہ چونکہ رحم سے خارج ہوتا ہے اس لئے وہ مذی کی طرح نجاستِ غلیظہ ہے، ولیس ھو فی حکم رطوبۃ الفرج الداخل کما فی امداد الفتاوی ج۱ ص ۶۵ و ۴۷۔[1]

۲:- اس سے کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں۔[2]

۳:- اس کے نکلنے سے وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔[3]

(۱ تا ۳) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۳۱۳ ای رطوبۃ الفرج فیکون مفرعا علی قولھما بنجاستھا، وقال ابن عابدین تحتہ ... ومن وراء باطن الفرج فانہ نجس قطعا ککل خارج من الباطن ... کالماء الخارج مع الولد او قبیلہ

۴- نماز نہیں ہوئی، الا یہ کہ معذوری کی وہ صورت ہو جائے جو نمبر ۵، ۶ کے جواب میں آرہی ہے۔

۵،۶- اگر یہ پانی ہر وقت بہتا رہتا ہے اور اتنا وقفہ بھی نہیں ملتا کہ اس میں چار رکعت نماز ادا کی جاسکے تو پھر یہ عورت "معذور" کے حکم میں ہے، ایسی عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ ہر نماز کا وقت داخل ہونے پر وضو کرے اور اس سے جتنی چاہے نمازیں نوافل وغیرہ پڑھتی رہے، جب تک اس نماز کا وقت رہے گا، اس کا وضو اس پانی کے نکلنے سے نہیں ٹوٹے گا، پھر جب دوسری نماز کا وقت آئے تو اس کے لئے نیا وضو کرے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۳/۲۸ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۳۰۵: وصاحب عذر من به سلس بول لا يمكنه امساكه أو استطلاق بطن أو انفلات ريح أو استحاضة ... إن استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة بأن لا يجد في جميع وقتها زمنا يتوضأ ويصلي فيه خاليا عن الحدث ... وحكمه الوضوء لكل فرض ... ثم يصلي به فيه فرضا أو نفلا، فإذا خرج الوقت بطل

فصل فی الاستنجاء

(استنجاء کے مسائل کا بیان)

کیا طہارت کے لئے ڈھیلا اور پانی دونوں استعمال کرنا ضروری ہے؟

سوال:- استنجاء کے لئے مجھے دو بار ڈھیلا اور پانی استعمال کرنا پڑتا ہے، پہلے ڈھیلا استعمال کرتا ہوں اور اس کے بعد پانی سے طہارت حاصل کرتا ہوں۔ میری سمجھ میں مجھ کو مکمل طہارت سے تب ایسا کرنا پڑتا ہے، لیکن اس وقت بڑی تکلیف ہوتی ہے جب جماعت نماز کے لئے تیار ہو رہی ہو اور اس وقت استنجاء میں صرف کرنا ہو یا بارش وغیرہ کے وقت طہارت کے لئے مٹی کا ڈھیلا دستیاب نہیں ہوتا، اسی طرح سفر میں بھی مٹی دستیاب نہیں ہوتی۔ نماز اور حج وغیرہ میں اس کا اہتمام کرنے سے ارکان بھی چھوٹ جاتے ہیں، آخر کیا کروں؟ رہنمائی فرمائیں۔

جواب:- افضل تو بے شک یہی ہے کہ ڈھیلا اور پانی دونوں استعمال کئے جائیں، لیکن ضرورت کے وقت صرف پانی سے استنجاء کر لینا بھی کافی ہے، اور اتنا دھویا جائے کہ نجاست باقی نہ رہے، زیادہ وہم میں پڑنا ٹھیک نہیں۔ ثم اعلم ان الجمع بین الماء والحجر افضل ویلیه فی الفضل الاقتصار علی الماء (شامی ج:۱ ص:۳۳۶)[۱]۔ والغسل بالماء الی ان یقع فی قلبه انه طهر ما لم یکن موسوسا. (درمختار ج:۱ ص:۲۲۵)[۲]۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۵۱۱/۲۹ ب)

پیشاب کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا مسنون ہے اور صرف پانی کا استعمال بھی کافی ہے

سوال:- پیشاب کے بعد استعمال کے لئے ڈھیلا اگر میسر نہ ہو تو کیا صورت اختیار کرنی چاہئے؟ جبکہ دیوار بھی سنگ مرمر کی ہو، اور ڈھیلا اور پانی کے استعمال کے بعد بھی کسی شخص کو قطرہ نکل

(۱) فتاوی شامیة ج ۱ ص ۳۳۸ (طبع ایچ ایم سعید) وفی الهندیة ج ۱ ص ۴۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) والأفضل ان یجمع بینهما کذا فی التبیین (۲) الدر المختار ج ۱ ص ۳۳۷

آتا ہے تو اس کے لئے پاکی کیا صورت ہوگی؟

جواب:- پیشاب کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا مسنون ہے، تاہم اگر ڈھیلا میسر نہ ہو تو صرف پانی بھی کافی ہے، لیکن صرف ڈھیلے پر اکتفاء نہیں کرنا چاہئے۔ ڈھیلے اور پانی دونوں کے استعمال کے بعد بھی اگر قطرہ آجائے تو استنجاء اور وضو دوبارہ کرلینا چاہئے اور کپڑا پاک کرلینا چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۱/۲/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۹۳ الف)

❁فصل فی المسح علی الخفین❁
(موزوں پر مسح سے متعلق مسائل کا بیان)

مروّجہ موزوں پر مسح کا مسئلہ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ان موزوں پر مسح کرنا درست ہے؟

الف:- جہاں تک چمڑے کے موزوں پر مسح کا تعلق ہے، اس کے جواز پر تقریباً تمام ہی علمائے کرام کا اتفاق ہے۔

البتہ اُونی، سوتی اور نائیلون وغیرہ کے موزوں پر مسح کے جائز ہونے کے بارے میں کچھ اختلاف ہے، بیشتر فقہاء اُونی اور سوتی موزوں پر مسح جائز ہونے کے بارے میں کچھ شرائط رکھتے ہیں۔ لیکن دورِ حاضر کے ایک مشہور صاحب فکر و بصیرت فرماتے ہیں کہ ہر قسم کے موزوں پر کسی قید کے بغیر مسح کرنا دُرست ہے۔

ب:- فقہائے کرام نے جو شرائط موزوں پر مسح کے جائز ہونے کی رکھی ہیں ان کے بارے میں مشہور مفکر فرماتے ہیں کہ:-

”میں نے اپنی امکانی حد تک یہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان شرائط کا ماخذ کیا ہے؟ مگر سنت میں کوئی ایسی چیز نہ مل سکی۔“

سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں اور جوتیوں پر مسح فرمایا ہے، نسائی کے سوا کتب سنن میں اور مسند احمد میں مغیرہ بن شعبہ کی روایت موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور (مسح علی الجوربین والنعلین) یعنی جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا۔ ابوداؤد کا بیان ہے کہ حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، براء بن عازب، انس بن مالک، ابوامامہ، سہیل بن سعد اور عمرو بن حریث رضی اللہ عنہم نے جرابوں پر مسح کیا، نیز حضرت عمر اور حضرت عباس سے بھی یہ فعل مروی ہے، بلکہ بیہقی نے ابن عباس اور انس بن مالک سے، طحاوی نے اوس بن اوس سے

روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف جوتوں پر مسح فرمایا، اس میں جرابوں کا ذکر نہیں ہے، اور یہی عمل حضرت علی سے بھی منقول ہے، ان مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جراب اور جرابیں پہنے ہوئے جوتے پر بھی مسح کرنا اسی طرح جائز ہے جس طرح چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا درست ہے، ان روایات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقہاء کی تجویز کردہ شرائط میں سے کوئی شرط بیان فرمائی ہو، اور نہ ہی یہ ذکر کسی جگہ ملتا ہے کہ جن جرابوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرامؓ نے مسح فرمایا وہ کس چیز کی تھیں؟

اس لئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ فقہاء کی عائد کردہ ان شرائط کا کوئی ماخذ نہیں، اور فقہاء چونکہ شارع نہیں اس لئے ان کی شرائط پر اگر کوئی عمل نہ کرے تو وہ گنہگار نہ ہوگا۔ اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر قسم کے موزوں پر اطمینان سے مسح کیا جا سکتا ہے چاہے وہ اونی ہوں یا سوتی، نائیلون کے ہوں یا کسی اور ریشے کے، چمڑے کے ہوں یا [illegible] اور ریگزین سے، حتیٰ کہ اگر پاؤں پر پٹا لپیٹ کر بھی مسح کر لیا جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

ان مفکرین کے علاوہ علامہ ابن تیمیہ نے بھی اپنے فتویٰ کی کتاب جلد دوم میں یہ فتویٰ دیا ہے، اور حافظ ابن قیمؒ اور علامہ ابن حزمؒ کا بھی یہی مسلک ہے کہ کسی قید کے بغیر ہر قسم کے موزے پر مسح کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں مستدعی ہوں کہ اپنے مصروف اوقات میں سے اس دینی مسئلے کو حل فرما کر مدلل فرمائیں، فتویٰ مدلل اور مفصل درکار ہے۔

آپ کے فتویٰ کا منتظر رہوں گا تاکہ اس اُلجھن سے نکل کر راہِ راست پا سکوں۔

منتظر الجواب
محمد طاہر غوری
[illegible]

الجواب وباللہ التوفیق

جس قسم کے سوتی، اُونی یا نائیلون کے موزے آج کل رائج ہیں، ان پر مسح کرنا ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک جائز نہیں، آپ کا خیال غلط ہے کہ اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے باریک موزوں کے بارے میں ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ ان پر مسح کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ ملک العلماء کاسانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:-

فان کانا رقیقین یشفان الماء لا یجوز المسح علیهما بالاجماع
(۱)
(بدائع الصنائع ج:۱ ص ۱۰)

پس اگر موزے اتنے باریک ہوں کہ ان میں سے پانی چھن سکتا ہو تو ان پر باجماع مسح جائز نہیں۔

اور علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

ولا یجوز المسح علی الجورب الرقیق من غزل أو شعر بلا خلاف، ولو کان ثخینا یمشی معه فرسخا فصاعدا .... فعلی الخلاف.
(۲)
(البحر الرائق ج ۱ ص ۱۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ جن موزوں میں "ثخین" کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں، یعنی ان میں پانی چھن جاتا ہو، یا وہ کسی چیز سے باندھے بغیر محض اپنی موٹائی کی بناء پر ٹھہر نہ سکتے ہوں، یا ان میں میل دو میل تک بغیر جوتے کے چلنا ممکن نہ ہو، ان پر مسح کرنا کسی بھی مجتہد کے مذہب میں جائز نہیں، ہاں! جن موزوں میں یہ تینوں شرائط پائی جاتی ہوں، ان پر مسح کے جواز و عدم جواز میں اختلاف ہے۔

جہاں تک جناب مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کا تعلق ہے، انہوں نے بہت سے مسائل میں جمہور امت سے الگ راستہ اختیار کیا ہے، یہ مسئلہ بھی ایسا ہی ہے جس میں انہوں نے جمہور فقہاء کی مخالفت کرکے سخت غلطی کی ہے، آپ نے ان کے جو دلائل ذکر کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے مسئلے کی اصل حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش ہی نہیں فرمائی۔ آپ کے اطمینان کے لئے مسئلے کی حقیقت مختصراً عرض کی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے سورۂ مائدہ میں وضو کا جو طریقہ بیان فرمایا ہے اس میں پوری وضاحت کے ساتھ پاؤں کو دھونے کا حکم دیا ہے، نہ کہ ان پر مسح کرنے کا۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ وضو میں ہمیشہ پاؤں دھوئے جائیں، اور ان پر مسح کسی صورت میں بھی جائز نہ ہو، یہاں تک کہ جب کسی شخص نے چمڑے کے موزے پہنے ہوئے ہوں اس وقت بھی مسح کی اجازت نہ ہو، لیکن چمڑے کے موزوں پر مسح کی جو اجازت باجماعِ اُمت دی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے موزوں پر مسح کرنا اور اس کی اجازت دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے تواتر کے ساتھ ثابت ہے جس کا انکار ممکن نہیں، اگر مسح علی الخفین کے جواز پر دو تین ہی حدیثیں ہوتیں تب بھی ان کی بناء پر قرآنِ کریم کے مذکورہ صریح حکم میں کوئی تقیید درست نہ ہوتی، کیونکہ اخبارِ آحاد سے قرآنِ کریم پر زیادتی یا اس کا نسخ

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) البحر الرائق باب المسح علی الخفین ج ص.۱۸۳ (طبع ایچ ایم سعید)

پاؤں کی تقیید جائز نہیں ہوتی، لیکن چونکہ مسح علی الخفین کی احادیث معنیً متواتر ہیں، اس لئے ان متواتر احادیث کی روشنی میں تمام امت کا اس پر اتفاق منعقد ہو گیا کہ قرآن کریم کی آیت میں پاؤں دھونے کا حکم اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے جب انسان نے ''خفین'' (یعنی چمڑے کے موزے) نہ پہن رکھے ہوں، چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ما قلت بالمسح حتی جاءنی فیہ مثل ضوء النہار (البحر الرائق ج۱ ص۱۷۳)[1]

میں مسح علی الخفین کا اس وقت تک قائل نہیں ہوا جب تک میرے پاس روز روشن کی طرح اس کے دلائل نہیں پہنچ گئے۔

چنانچہ ''مسح علی الخفین'' کا حکم اسّی (۸۰) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے روایت کیا ہے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں لکھتے ہیں:-

وقد صرح جمع من الحفاظ بان المسح علی الخفین متواتر وجمع بعضهم رواته فجاوزوا الثمانین منهم العشرة (۲) (نیل الاوطار ج۲ ص۱۷۲)

حفاظ کی ایک بڑی جماعت نے تصریح کی ہے کہ مسح علی الخفین کا حکم متواتر ہے، اور بعض حضرات نے اس کے راویوں کو جمع کیا ہے تو وہ اسّی (۸۰) سے متجاوز تھے جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔

اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ادرکت سبعین بدریا من الصحابة کلهم کانوا یرون المسح علی الخفین

(تلخیص الحبیر ج۱ ص۱۵۸ وبدائع ج۱ ص۷)[3]

اگر مسح علی الخفین کا حکم ایسے تواتر یا تلقی بالقبول سے ثابت نہ ہوتا تو قرآن کریم کے پاؤں دھونے کا جو حکم دیا ہے اس میں کسی تخصیص یا تقیید کی گنجائش نہیں تھی، چنانچہ امام ابویوسفؒ فرماتے تھے:-

انما یجوز نسخ القرآن بالسنة اذا وردت کورود المسح علی الخفین فی الاستفاضة. (۴) (احکام القرآن للجصاص ج۲ ص۴۲۵)

---

(۱) البحر الرائق باب المسح علی الخفین ج۱ ص ۱۶۵ (طبع ایچ ایم سعید) وكذا فی فتح القدیر ج ۱ ص ۱۲۶ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

(۲) نیل الأوطار للشوکانی أبواب المسح علی الخفین باب فی شرعیته ج ۱ ص ۱۵۵ (طبع مصطفی البابی، مصر)

(۳) وفی تلخیص الحبیر باب المسح علی الخفین ج ۱ ص ۲۴۸ (طبع مکتبة نزار مصطفی الباز، مکة المکرمة) عن الحسن البصری قال حدثنی سبعون من أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم انه كان یمسح علی الخفین وكذا فی نیل الاوطار للشوكانی أبواب المسح علی الخفین باب فی شرعیته ج۱ ص۱۵۵ (طبع قدیم، مصر) والبحر الرائق ج۱ ص۱۶۵ (طبع ایچ ایم سعید)

(۴) احکام القرآن للجصاص رحمہ اللہ ذکر الخلاف فی المسح علی الخفین ج ۲ ص ۳۶۱ طبع سہیل اکیڈمی لاہور

سنت نبویہ سے قرآن کریم کے کسی حکم کو منسوخ (بمعنی مقید) کرنا اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جب وہ سنت ایسے تواتر سے ثابت ہو جیسے مسح علی الخفین ثابت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وضو میں پاؤں دھونے کا قرآنی حکم ایسی چیز نہیں ہے جسے دو تین روایتوں کی بنیاد پر کسی خاص بات کے ساتھ مخصوص کردیا جائے، بلکہ اس کے لئے ایسا تواتر درکار ہے جیسے مسح علی الخفین کی احادیث کو حاصل ہے۔ اب "خفین" (چمڑے کے موزوں) کے بارے میں تو یہ تواتر موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مسح خود بھی فرمایا اور دوسروں کو بھی اس کی اجازت دی، لیکن "خفین" کے سوا کسی چیز پر مسح کرنے کے بارے میں ایسا تواتر موجود نہیں ہے۔ اور "خفین" چونکہ عربی زبان میں صرف چمڑے کے موزوں کو کہتے ہیں، کپڑے کے موزوں کو "خف" نہیں کہا جاتا، اس لئے یہ اجازت صرف چمڑے ہی کے موزوں کے ساتھ مخصوص رہے گی، دوسرے موزوں کے بارے میں قرآن کریم کا اصل حکم یعنی پاؤں دھونے پر ہی عمل ہوگا۔ ہاں! اگر چمڑے کے علاوہ موزے اتنے ثخین (موٹے) ہوں کہ وہ اپنی خصوصیات اور اوصاف میں چمڑے کے قائم مقام ہو گئے ہوں، یعنی نہ تو ان میں پانی چھنتا ہو، نہ انہیں کھڑا رکھنے کے لئے کسی بیرونی سہارے کی ضرورت ہو اور ان کو پہن کر تین میل چل سکتے ہوں تو ایسے موزوں کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے، بعض فقہاء نے فرمایا کہ چونکہ ایسے موزے چمڑے ہی کے معنی میں آگئے ہیں اس لئے ان پر بھی مسح جائز ہونا چاہئے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چونکہ مسح کرنا تواتر کے ساتھ صرف خفین (چمڑے کے موزوں) پر ہی ثابت ہے، اس لئے ان پر مسح کرنا درست نہیں، گویا موزے تین قسم کے ہوگئے:-

۱- چمڑے کے موزے جنہیں خفین کہا جاتا ہے، ان پر مسح بالاتفاق جائز ہے۔

۲- وہ باریک موزے جو نہ چمڑے کے ہوں، اور نہ ان میں چمڑے کے اوصاف پائے جاتے ہوں، جیسے آج کل سوتی، اونی یا نائلون کے موزے، ان کے بارے میں اجماع ہے کہ ان پر مسح جائز نہیں، کیونکہ ایسے موزوں پر مسح کرنا کسی ایسی دلیل سے ثابت نہیں جس کی بناء پر پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو چھوڑا جا سکے۔

۳- وہ موزے جو چمڑے کے تو نہیں ہیں، لیکن ان میں موٹے ہونے کی بناء پر اوصاف چمڑے ہی کے پائے جاتے ہیں، ان پر مسح کے جواز میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو موزے چمڑے جیسے نہ ہوں ان پر مسح کے عدم جواز میں مجتہدین امت کا کوئی اختلاف نہیں، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جاسکتا جب تک کہ مسح کا حکم ایسے تواتر سے ثابت نہ ہو جیسے تواتر سے مسح علی الخفین کا جواز

ثابت ہے۔ لہٰذا فقہائے کرام نے چمڑے کے موزوں پر مسح کے لئے جو شرطیں عائد کی ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں لگائیں، بلکہ ان موزوں میں چمڑے کے اوصاف کے تحقق کے لئے لگائی ہیں، اور اس میں بھی اختلاف رہا ہے کہ ان شرائط کے تحقق کے بعد بھی ان پر مسح جائز ہے یا نہیں؟

حقیقت مسئلہ کی وضاحت کے بعد اب ان روایات کو دیکھئے جن میں جوربین (جرابوں) پر مسح کا ذکر آیا ہے، ہمارے ذخیرہ حدیث میں یہ کل تین حدیثیں ہیں، ایک حضرت بلالؓ سے مروی ہے، ایک حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے، اور ایک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے۔ حضرت بلالؓ کی حدیث معجم صغیر طبرانی میں ہے، اور حضرت ابوموسیٰؓ کی ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ نے روایت کی ہے، لیکن حافظ زیلعیؒ نے ان دونوں کے بارے میں ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں سنداً ضعیف ہیں۔ (نصب الرایہ ج:۱ ص:۱۸۳، ۱۸۴)

اور حضرت ابوموسیٰؓ کی حدیث کے بارے میں تو امام ابوداؤدؒ نے بھی لکھا ہے کہ:

لیس بالمتصل ولا بالقوی. (بذل المجہود ج:۱ ص:۹۶)

لہٰذا یہ دونوں روایتیں تو خارج از بحث ہیں۔

اب صرف حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی حدیث رہ جاتی ہے، اس کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اگرچہ امام ترمذیؒ نے اسے "حسن صحیح" کہا ہے، لیکن دوسرے ائمہ حدیث نے ان کے اس قول پر سخت تنقید کی ہے، امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو روایت کرکے لکھتے ہیں:-

وکان عبدالرحمن بن مهدی لا یحدث بهذا الحدیث لأن المعروف عن المغیرة أن النبی صلی الله علیه وسلم مسح علی الخفین. (بذل المجہود ج:۱ ص:۹۶)

حضرت عبدالرحمن بن مہدیؒ یہ حدیث بیان نہیں کیا کرتے تھے کیونکہ حضرت مغیرہؓ سے جو معروف روایتیں ہیں وہ مسح علی الخفین کی ہیں (نہ کہ جوربین پر مسح کی)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ سنن کبریٰ میں لکھتے ہیں:-

لا نعلم أحدا تابع أبا قیس علی هذه الروایة، والصحیح عن المغیرة أنه علیه السلام مسح علی الخفین. (نصب الرایة ج:۱ ص:۱۸۳)

یہ روایت ابوقیس کے سوا کسی نے روایت نہیں کی، اور ہمارے علم میں کوئی اور راوی اس کی

---

(۱) (طبع مؤسسة الریان بیروت)
(۲) نیز بذل المجہود فی حل ابی داؤد ج:۲ ص:۳۳ طبع ندوة العلماء لکھنؤ، وکذا فی تعلیقه علی هامش فتح القدیر ج:۱ ص:۱۳۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)
(۳) حوالہ بالا۔
(۴) نصب الرایة لأحادیث الهدایة ج:۱ ص:۱۸۳ (طبع مؤسسة الریان بیروت)

تائید نہیں کرتا، اور حضرت مغیرہؓ سے صحیح روایت مسح علی الخفین ہی کی ہے۔

اس کے علاوہ امام مسلم، امام بیہقی، سفیان ثوری، امام احمد، یحییٰ بن معینؒ، علی بن مدینیؒ اور دوسرے محدثین نے اس روایت کو ابوقیس اور ہزیل بن شرحبیل دونوں کے ضعف کی بناء پر ضعیف قرار دیا ہے، اور علامہ نوویؒ شارح صحیح مسلم لکھتے ہیں:-

کل واحد من هؤلاء لو انفرد قدم علی الترمذی مع ان الجرح مقدم علی التعدیل. واتفق الحفاظ علی تضعیفه، ولا یقبل قول الترمذی أنه حسن صحیح (نصب الرایۃ ج:۱ ص:۱۸۴)

جن حضرات نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اگر ان میں سے ہر ایک تنہا ہوتا تب بھی وہ امام ترمذی پر مقدم ہوتا، اس کے علاوہ یہ قاعدہ ہے کہ جرح، تعدیل پر مقدم ہوتی ہے، اور حفاظ حدیث اس کی تضعیف پر متفق ہیں، لہٰذا ترمذی کا یہ قول کہ یہ ''حسن صحیح ہے'' قابل قبول نہیں۔

یہ ہے اس حدیث کی اسنادی حیثیت جسے مولانا مودودی صاحب نے اپنی دلیل میں پیش کیا ہے، آپ نے دیکھا کہ اکثر ناقدین حدیث کے نزدیک یہ حدیث ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔ دوسرے اگر بالفرض امام ترمذی کے قول کے مطابق اسے صحیح مان لیا جائے تو پورے ذخیرۂ حدیث میں تنہا یہ ایک روایت ہوئی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جوربین پر مسح کرنا مذکور ہے۔

اب آپ غور فرمائیے کہ قرآن کریم نے پاؤں دھونے کا جو صریح حکم دیا ہے، اسے صرف اس ایک روایت کی بناء پر کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ جبکہ ائمہ حدیث نے اس پر شدید تنقید بھی کی ہے۔ آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ مسح علی الخفین کا حکم اس وقت ثابت ہوا کہ جب اس کی احادیث تواتر کی حد تک پہنچ گئیں، امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر مسح علی الخفین کی احادیث اتنی کثرت کے ساتھ نہ ہوتیں تو پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو چھوڑنے کی گنجائش نہ تھی، لیکن مسح علی الجوربین کی احادیث متواتر تو کیا ہوتیں؟ پورے ذخیرۂ حدیث میں اس کی صرف تین روایتیں ہیں، ان میں سے دو تو بالاتفاق ضعیف ہیں، اور ایک کو اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے، صرف امام ترمذی اسے صحیح کہتے ہیں۔ ایسی روایت کی بناء پر قرآن کریم کے کسی حکم میں کوئی تخصیص یا تقیید پیدا نہیں کی جا سکتی، چنانچہ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں:-

والاصل فیه أنه قد ثبت ان مراد الآیة الغسل علی ما قدمنا، فلو لم ترد الآثار المتواترة عن النبی صلی الله علیه وسلم فی المسح علی الخفین لما جاز لنا المسح ولما لم ترد الآثار فی جواز المسح علی الجوربین فی وزن ورودها فی المسح علی الخفین أبقینا

(۱) نصب الرایۃ لأحادیث الهدایۃ ج:۱ ص:۱۸۴ (طبع مؤسسۃ الریان بیروت)

حکم الغسل علی مراد الآیۃ (احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۳۴۹)[1]

مسئلے کی حقیقت یہ ہے کہ آیت کی اصل مراد پاؤں دھونا ہے، جیسا کہ پیچھے گزر چکا، لہٰذا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسح علی الخفین کی متواتر احادیث ثابت نہ ہوتیں تو ہم بھی مسح علی الخفین کو جائز قرار نہ دیتے، اور چونکہ جوربین (کپڑے کے موزوں) پر مسح کی احادیث اس وزنی طریقے سے مروی نہیں ہیں جس وزنی طریقے سے مسح علی الخفین کی احادیث مروی ہیں اس لئے ہم نے وہاں آیتِ قرآنی کی اصل مراد یعنی پاؤں دھونے کے حکم کو برقرار رکھا ہے۔

اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جن حضرات صحابہ کرامؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے جوربین پر مسح کیا یا اس کی اجازت دی، تو ان کے اس عمل کی کیا وجہ تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے ان آثار میں کہیں بھی یہ صراحت نہیں ہے کہ جوربین کپڑے کے باریک موزے تھے، اور جب تک یہ صراحت نہ ہو اس وقت تک ان آثار سے باریک موزوں پر مسح کا جواز کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ چنانچہ مشہور اہل حدیث عالم علامہ شمس الحق صاحب عظیم آبادی لکھتے ہیں:

ان الجورب يتخذ من الاديم وكذا من الصوف وكذا من القطن ويقال لكل من هذا انه جورب ومن المعلوم ان هذه الرخصة بهذا العموم ... لا تثبت الا بعد ان يثبت ان الجوربين الذين مسح عليهما النبي صلى الله عليه وسلم كانا من صوف ... الخ

(عون المعبود ج ۱ ص ۶۲)[2]

یعنی جوربین کھال سے بھی ہوتے ہیں، اُون کے بھی اور رُوئی کے بھی، اور ہر ایک کو جورب کہا جاتا ہے، اور ہر قسم کے موزے پر مسح کی اجازت اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتی ہے جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جوربین پر مسح فرمایا، بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ثابت ہے کہ ان حضرات نے جن جوربین پر مسح فرمایا وہ زیادہ تر چمڑے کے تھے یا اپنی موٹائی کی وجہ سے چمڑے کے موزوں کی طرح تھے، اور ان میں چمڑے کے موزوں کی صفات پائی جاتی تھیں۔ چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں روایت ہے:-

حدثنا هشيم قال اخبرنا يونس عن الحسن وشعبة عن قتادة عن سعيد بن المسيب والحسن انهما قالا يمسح على الجوربين اذا كانا صفيقين (مصنف ابن ابی شیبۃ ج ۱ ص ۱۸۸)[3]

---

(۱) أحكام القرآن للجصاص رحمه الله ج ۲ ص ۳۵۰ (طبع سهيل اكيدمى لاهور)

(۲) عون المعبود باب المسح على الجوربين ج ۱ ص ۱۸۷ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

(۳) (طبع ادارة القرآن كراچی)

حضرت سعید بن مسیب اور حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ جوربین پر مسح جائز ہے بشرطیکہ وہ خوب موٹی ہوں۔ واضح رہے کہ ثوب صفیق اس کپڑے کو کہتے ہیں جو خوب مضبوط اور دبیز بنا ہوا ہو (قاموس اور مختار الصحاح وغیرہ)۔

حضرت حسن بصری اور حضرت سعید بن المسیب دونوں جلیل القدر تابعین میں سے ہیں، اور انہوں نے صحابہ کرام کا عمل دیکھ کر ہی یہ فتویٰ دیا ہے۔

ان حضرات کے عمل اور فتویٰ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جوربین اگر اتنے موٹے ہوں کہ ان پر چمڑے کے موزے کے اوصاف حاصل ہوں، ان پر مسح جائز ہے، اور ان اوصاف کی وضاحت کے لئے فقہاء نے وہ تین شرائط ذکر کی ہیں کہ ایک تو ان میں پانی نہ چھنے، دوسرے وہ کسی چیز سے باندھے بغیر اپنی موٹائی کی وجہ سے خود کھڑے رہیں، اور تیسرے یہ کہ ان کو پہن کر تین میل چلنا ممکن ہو۔ ایسے موزے چونکہ چمڑے کے اوصاف کے حامل ہوتے ہیں، اس لئے ان کو بھی فقہاء نے "مسح علی الخفین" کی احادیث کی روشنی میں اور مذکورہ آثار صحابہ کی بناء پر "خفین" کے حکم میں داخل رکھا، چنانچہ علامہ ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں:

لا شک ان المسح على الخف على خلاف القياس، فلا يصلح الحاق غيره به الا اذا كان بطريق الدلالة، وهو ان يكون في معناه، ومعناه الساتر لمحل الفرض الذي هو بصدد متابعة المشي فيه في السفر وغيره (فتح القدير ج ۱ ص ۱۰۹)[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسح علی الخفین کی مشروعیت خلاف قیاس ہوئی ہے، لہٰذا کسی دوسری چیز کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، الا یہ کہ وہ دلالۃ النص کے طریقے پر خفین کے معنی میں داخل ہو، اور خفین کے معنی ایسے موزے کے ہیں جنہوں نے پاؤں کو ٹخنوں تک ڈھانپ رکھا ہو، اور ان میں سفر وغیرہ کے دوران مسلسل چلنا ممکن ہو۔

لہٰذا فقہاء نے جوربین پر مسح کے لئے جو شرائط مقرر کی ہیں، ان کی یہ توجیہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ حدیث میں مسح علی الجوربین کی اجازت مطلق تھی، اور انہوں نے اپنی طرف سے شرائط عائد کر کے اسے مقید کر دیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اصولی اعتبار سے پاؤں دھونے کے فریضے کو چھوڑ کر مسح کرنے کا حکم اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس پر احادیث متواتر موجود نہ ہوں، خفین

---

(۱) فتح القدیر باب المسح علی الخفین ج ۱ ص ۱۰۹ طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔

میں چونکہ ایسی احادیث موجود تھیں، اس لئے وہاں مسح کی اجازت دے دی گئی، لیکن جوربین پر مسح کسی ایک حدیث سے بھی ثابت نہیں جو متفق علیہ طور پر صحیح ہو، لہٰذا ان پر مسح کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی، تا وقتیکہ وہ جوربین، خفین کی صفت کی حامل ہو کر خفین کے حکم میں بدلالۃ النص داخل ہوجائیں، اور چونکہ صحابہؓ و تابعینؒ سے ایسے ہی موزوں پر مسح ثابت تھا، اس لئے بیشتر فقہاء نے اس کی اجازت دی، اور "خفین" کی بنیادی صفات کو مذکورہ تین شرائط کے ذریعہ بیان کردیا، اور اس پر تمام ائمہ مجتہدین کا اجماع منعقد ہوگیا۔

جہاں تک علامہ ابن حزمؒ یا علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ کا تعلق ہے، ان کا مقام بلند اپنی جگہ ہے، لیکن انہوں نے بہت سے مسائل میں جمہور امت سے الگ راہ اختیار کی ہے، جسے امت نے بحیثیت مجموعی قبول نہیں کیا، بالخصوص اس مسئلے میں تو انہوں نے اپنے مسلک پر کوئی دلیل بھی نہیں دی، لہٰذا پوری امت کے فقہاء، محدثین اور مجتہدین کے مقابلے میں صرف ان تین حضرات کی رائے پر عمل کرکے پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو ترک کردینا ایک سنگین جسارت ہے۔ اور اس "اجتہاد" کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے کہ "اگر پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر بھی مسح کرلیا جائے تو اس پر بھی مسح جائز ہے۔" ساری امت کے تمام فقہاء، تمام محدثین اور تمام مجتہدین کے بارے میں تو یہ الزام ہے کہ ان کے اس قول کا کوئی ماخذ نہیں، حالانکہ ان کے ناقابل انکار دلائل آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں، اور دوسری طرف اپنا خود "اجتہاد" یہ ہے کہ بلاوجہ پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر اس پر بھی مسح کیا جاسکتا ہے۔ کیا اس ذہنی حرکت کی خاطر پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو ترک کرنے کا بھی کوئی ماخذ ہے؟

آپ نے جناب مولانا مودودی صاحب کی جو عبارت نقل فرمائی ہے، اس میں چونکہ جوتوں پر مسح کرنے کا بھی ذکر ہے، اس لئے اس کی حقیقت بھی آخر میں مختصراً عرض ہے۔

جوربین اگر موٹے ہوں تو ان پر مسح کرنے کے تو بعض فقہاء قائل بھی ہیں، لیکن جوتوں پر مسح کرنا تو کسی بھی امام کے مذہب میں جائز نہیں۔

لم یذهب أحد من الأئمة إلى جواز المسح على النعلین (معارف السنن ج۱ ص۳۴۴)[1]

ائمہ میں سے کوئی بھی جوتوں پر مسح کرنے کا قائل نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جوتوں پر مسح کرنا اس وقت ثابت ہے جبکہ

(۱) (طبع ایچ ایم سعید)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی سے باوضو ہوتے تھے، لیکن نئی نماز کے لئے تازہ وضو فرماتے تھے، ایسی حالت میں چونکہ وضو پہلے سے ہوتا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں دھونے کے بجائے اپنے جوتوں پر ہاتھ پھیر لیتے تھے، چنانچہ صحیح ابن خزیمہ میں روایت ہے:

عن علیؓ انه دعا بکوز من ماء ثم توضأ وضوءاً خفیفاً ومسح علی نعلیه، ثم قال: هکذا وضوء رسول الله صلی الله علیه وسلم للطاهر ما لم یحدث

(صحیح ابن خزیمۃ ج:۱ ص:۱۰۰ باب ۵۴ حدیث:۲۰۰)

حضرت علیؓ نے پانی کا ایک گلاس منگوایا، اور بہت مختصر وضو کیا اور اپنے جوتوں پر مسح کیا، پھر فرمایا "طہارت کی حالت میں جب تک وضو نہ ٹوٹا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح وضو فرمایا کرتے تھے۔"

اس وضاحت کے بعد "جوتوں پر مسح" ثابت کرنے والی روایت سے بے وضو آدمی کے لئے جوتوں پر مسح کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

لہٰذا

اُمت کے تمام مستند فقہاء و مجتہدین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ باریک موزے جن سے پانی چھن جاتا ہو یا وہ کسی چیز سے باندھے بغیر پنڈلی پر کھڑے نہ رہتے ہوں، یا ان میں تین میل مسلسل چلنا ممکن نہ ہو، ان پر مسح جائز نہیں، ورنہ جوتوں پر مسح درست ہے۔ اور چونکہ ہمارے زمانے میں جو سوتی، اونی، نائیلون کے موزے رائج ہیں وہ باریک ہوتے ہیں اور ان میں مذکورہ اوصاف نہیں پائے جاتے، اس لئے ان پر مسح کسی حال میں جائز نہیں ہے، اور جو شخص ایسا کرے گا تو امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، بلکہ کسی بھی مجتہد کے مسلک میں اس کا وضو صحیح نہیں ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
(از ماہنامہ "بلاغ"
جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ)

---

(۱) (طبع المکتب الاسلامی بیروت)

نائیلون کی مروّجہ جرابوں اور سوتی جرابوں پر مسح کا حکم

سوال:- موزوں پر مسح کرنا جائز ہے، ربڑ کے موزے کے علاوہ واٹر پروف موزے وغیرہ اور نائیلون کی جرابیں، سوتی جرابیں، ان پر مسح جائز ہے یا نہیں؟ واضح طور پر صحیح ثبوت کے ساتھ باحوالہ تحریر فرمائیں۔

جواب:- چمڑے یا ربڑ کے موزے اگر اتنے موٹے ہوں کہ محض اپنی موٹائی اور سختی کی وجہ سے یا بستک باندھے بغیر خود کھڑے رہیں تو ان پر مسح درست ہے، نائیلون کی مروجہ جرابیں پتلی ہوتی ہیں ان پر مسح درست نہیں۔( )

واللہ اعلم

۱۳۹۱/۲/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹۳ ۲۲ الف)

***

( ) دلائل اور تفصیل کے لئے پچھلا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

کتاب الصلوٰۃ

(مسائلِ نماز)

فصل فی مواقیت الصلوٰۃ
(اوقاتِ نماز سے متعلق مسائل کا بیان)

دارالعلوم کراچی کے نقشۂ اوقاتِ نماز میں صبحِ صادق کے وقت پر اعتراض اور اس کا جواب

سوال:- محترم و واجب الاحترام مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ نے تقریباً ایک مہینے سے دارالعلوم کے مفتیوں کے ساتھ صبح صادق اور صبح کاذب کے بارے میں گفت وشنید کی، جس سے معلوم ہوا کہ ان کو اس فن کا کوئی علم ہی نہیں سوائے اندھی تقلید کے۔ جناب مولانا اشرف صاحب ہیئت المکرم والے سے تین بار فون پر گفت وشنید کی، اور ان سے عرض کیا کہ ہمیں وقت دے دیں کہ ہم تین آدمی اس بارے میں ان سے گفتگو کریں۔ مشاہدات کے لئے میں محمد اشرف جنوبی وزیرستان، علم جدید کے لئے محمد یونس انجینئر، علم ہیئت قدیم کے لئے مفتی بلال صاحب، لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوئے، بالآخر تیسری بار یہ فرمایا کہ یہ نقشۂ اوقات نماز عباسی صاحب نے مرتب کیا ہے، غرضیکہ سوائے اندھی تقلید کے اور کوئی دلائل زیر افق اٹھارہ درجے پر صبح صادق ہونے کے نہیں تھے۔

آخر میں یہ فرمایا کہ آپ مفتی رفیع عثمانی صاحب اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب سے بات کریں۔

جناب محترم! آپ دونوں بھائیوں نے اور علماء حضرات کے ساتھ ملکر تین بار مشاہدات کئے ہیں، اور آپ صاحب نے اپنے قلم سے زیر افق اٹھارہ درجے صبح کاذب ثابت کیا ہے، پھر آپ نے اسی صبحِ کاذب کو صبح صادق کیسے ثابت کیا؟ غرضیکہ مشاہدات سے بھی اور حسابات سے بھی آپ دونوں بھائی زیر افق اٹھارہ درجے پر صبح کاذب کے قائل ہوگئے تھے، پھر بغیر مشاہدات اور حسابات کے زیر افق پندرہ درجے صبح صادق کی کیوں مخالفت شروع کی ہے؟

جناب محترم! مؤدبانہ التماس ہے کہ بندوں کو سیدھی راہ دکھانے کی خاطر آئندہ کے لئے

ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید چھوڑ دیں اور مسئلے کو صحیح حل فرمانے کی مہربانی فرمائیں، تاکہ عوام کی نماز فجر ضائع ہونے سے بچ جائے، اُمید واثق ہے کہ دارالعلوم سے شائع ہونے والے نقشۂ اوقات نماز کی اپنے لکھے ہوئے اصول کے مطابق شائع کرنے کی ہدایت جاری فرمائیں گے۔

یعنی انتہاءِ سحر پُرانے نقشوں کے مطابق، اذانِ فجر صبح صادق مفتی رشید احمد دامت برکاتہم نے مرتب کردہ حساب کے مطابق، صبح صادق زیرِ افق پندرہ درجے پر ہونے کو شائع کرنے کی ہدایت جاری فرمائیں۔

والسلام

بندہ محمد اشرف عفا اللہ عنہ

جنوبی وزیرستان

۲۲ شوال ۷ ۱۴ھ

(مذکورہ تحریر کے بعد سائل کی طرف سے ذیل کا استفتاء بھی آیا)

محترم المقام و اجب الاحترام مفتیانِ حضرات زید مجدہم، و مفتی تقی عثمانی صاحب

دارالعلوم کورنگی کراچی ۱۴

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حق کو نہ چھپاؤ، حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔ یہاں کراچی شہر میں صبح وانتہاءِ سحر و افطار کے نقشے چھپتے ہیں، ان نقشوں میں سحر کے وقت اور اذانِ فجر کے مابین کوئی فرق نہیں لکھا ہے، تعجب کی بات ہے کہ انتہاءِ سحر کے وقت لاؤڈ اسپیکروں پر اذانیں دینا بھی شروع کردیتے ہیں، ساتھ ہی لوگ انفرادی و اجتماعی طور پر فجر کی نماز ادا کرتے ہیں، لیکن بہت سے ایسے مفتیان و علمائے کرام جن کو معلوم ہے کہ مروّجہ جنتریوں میں جو صبحِ صادق کا وقت لکھا ہے وہ صبحِ کاذب کا ہے، لیکن پھر بھی وہ غلط نقشوں کی نشر واشاعت کررہے ہیں۔

اب بندہ اپنے پندرہ سال کے عینی مشاہدات لکھ رہا ہے، وہ یہ کہ زیرِ اُفق اٹھارہ درجے صبح کاذب کا وقت ہے، اور زیرِ افق پندرہ درجے صبح صادق کا وقت ہے۔ نیز پرانے نقشے جو برصغیر پاک و ہند میں چھپتے ہیں ان میں صبح و عشاء کا وقت غلط ہے۔ جو نقشہ صاحب احسن الفتاویٰ مفتی رشید احمد صاحب نے مرتب کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

کراچی شہر میں جتنے اوقات مدارس والے یا کوئی اور چھاپتے ہیں اس میں صبح صادق کا وقت غلط ہے، دارالعلوم کراچی کا نقشہ بھی غلط ہے، جو صبح کا وقت لکھا ہے وہ صبحِ کاذب ہے، اب آئندہ کے لئے اگر کراچی شہر کے مفتیوں اور علماء نے اس مروّجہ جنتری کے غلط ہونے کا فتویٰ نہیں دیا اور خود بھی عمل

نہیں گیا تو جن لوگوں کی نمازیں ضائع ہوئی ہیں ان کا وبال ان علماء پر پڑے گا۔

آپ کراچی شہر کے علماء سے درد مندانہ اپیل ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لئے جدوجہد شروع فرمائیں اور اس بارے میں عینی مشاہدات کریں، جس کی صورت یہ ہے کہ کراچی شہر سے باہر جا کر مہینے میں پانچ دن مشاہدات کئے جائیں، اس طرح آپ حضرات پر اپنی غلطی روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔

مفتیانِ کرام کی پانچ رکنی کمیٹی نے نقشہ مرتب کرنے کے جو دو اُصول مقرر فرمائے ہیں:-

۱:- سال بھر عینی مشاہدات کئے جائیں، اس کے بعد نقشہ مرتب کیا جائے۔

۲:- حسابات کے مطابق نقشہ مرتب کیا جائے، لیکن اس کے لئے بھی سال بھر مشاہدات کئے جائیں۔

دارالعلوم کا مرتب کردہ نقشہ ان دونوں اصولوں کے خلاف ہے، غرضیکہ پورے پاکستان میں شائع کئے جانے والے نقشوں میں صبح صادق کی جگہ صبح کاذب کا وقت لکھا ہے، جبکہ صبح صادق اور کاذب کے مابین بارہ سے بیس منٹ کا فرق ہے۔ دوبارہ التماس ہے کہ کراچی کے علماء اور مفتیان حضرات اس مسئلے کے حل کے لئے جدوجہد شروع کریں، میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ دنیا کا کوئی بھی شخص زیرِ افق اٹھارہ درجے پر صبح صادق ثابت نہیں کر سکتا اور نہ کر سکے گا، اگر کسی کو دعویٰ ہے تو وہ مشاہدے کے لئے آئے۔

بندہ محمد اشرف عفا اللہ عنہ

(سائل کو جواب میں ٹنڈو آدم کے مشاہدات کے نتیجے میں مرتب کردہ درج ذیل تحریر بھی بھیجی گئی اور ساتھ ہی حضرت والا دامت برکاتہم نے مستقل جواب بھی تحریر فرمایا، جو اس تحریر کے بعد درج ہے۔ از مرتب عفی عنہ)

صبح صادق

حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کے رسالہ صبح صادق کے دلائل پر غور و خوض کرنے کے لئے ۱۳ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ کو مجلس منعقد ہوئی، جس میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم، حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم اور حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے شرکت فرمائی، اس تحریر میں یہ تمام حضرات متفق تھے، اور اس میں سب حضرات کے دستخط بھی ثبت تھے، اور مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ اگرچہ اس مجلس میں موجود نہ تھے، مگر بعد میں حضرت نے اس تحریر سے اتفاق کیا اور اپنے تصدیقی دستخط ثبت فرمائے، یہاں وہ تحریر بعینہٖ نقل کی جارہی ہے۔

الحمدللہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد:

آج بتاریخ ۱۳ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ صبح صادق اور عشاء کے وقت کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے مجلس منعقد ہوئی، جس میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے:-

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب

حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی صاحب

احقر تقی عثمانی

اس مجلس میں مولانا رشید احمد صاحب کے رسالہ صبح صادق کے دلائل پر غور کیا گیا، اور متعلقہ کتب کی مراجعت کی گئی، نیز مسئلے کی تحقیق اور مشاہدات کے سلسلے میں چند آدمیوں کا تقرر کیا گیا، اس کے نتائج زیرِ غور آئے، بحث وتمحیص کے بعد مندرجہ ذیل باتیں پایۂ ثبوت کو پہنچیں:

۱- مروّجہ جنتریوں میں صبح صادق اور عشاء کا جو وقت لکھا ہوا ہے، وہ اس وقت کا ہے جب آفتاب افق سے اٹھارہ درجے نیچے ہوتا ہے، اس کی تصریح محکمہ موسمیات کے ہیڈ کوارٹر کے خطوط رسالہ صبح صادق ص ۶۵ تا ۲ وص:۶۷ میں موجود ہے، اور ناٹیکل المینک جو گرین وچ سے شائع ہوتی ہے اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

۲- اٹھارہ درجہ زیرِ افق قسیت کے جدید ماہرین کی تصریحات کے مطابق وہ وقت ہے کہ مشرق کی طرف صبح کو اس سے پہلے، اور مغرب کی طرف رات کو اس کے بعد کوئی ہلکی سی روشنی بھی افق پر نہیں ہوتی، آخر شب میں جو روشنی سب سے پہلے نمودار ہوتی ہے اسے وہ ٹیکل ٹوائیلائٹ کہتے ہیں۔

۳- ہیئت کی قدیم کتابوں سے بھی قولِ راجح و مشہور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ درجہ زیرِ افق صبح کاذب کا وقت ہے، نہ کہ صبح صادق کا، بعض کتب میں سترہ زیرِ افق، اور بعض میں انیس زیرِ افق کے اقوال بھی بصیغۂ تمریض موجود ہیں، لیکن وہ مرجوح ہیں۔

۴- اس مسئلے کے زیرِ غور آنے کے بعد متفرق ایام میں جتنے مشاہدات کئے گئے ان میں سے کسی میں بھی مروجہ جنتریوں کے مطابق صبح صادق نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد ہوئی، ان سب امور سے ثابت ہوتا ہے کہ مروجہ جنتریوں میں صبح صادق کے نام سے جو وقت لکھا گیا ہے وہ درحقیقت صبح کاذب کا ہے، اور غالباً روزے کے بارے میں احتیاط کے پیشِ نظر لکھا گیا ہوگا۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ پھر صبح صادق کا صحیح وقت کیا ہے؟ اس کا تعین دو طریقوں سے ممکن تھا، ایک مشاہدات سے، دوسرے حسابات سے۔ جہاں تک مشاہدات کا تعلق ہے ان کی بنیاد پر

کوئی جنتری اس وقت بنائی جا سکتی ہے جبکہ سالہا سال مکمل مشاہدات کئے جائیں، اور ظاہر ہے اس کے مواقع میسر نہیں، اور جو تھوڑے بہت مشاہدات کئے گئے ان سے اس جگہ کے لئے وقت کا تعین ممکن نہیں تھا۔ دوسرا طریقہ حسابات کا تھا، حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہ نے بعض ہیئت کی کتابوں کی تصریح کے مطابق پندرہ درجے زیر افق صبح صادق کا وقت قرار دے کر حسابات سے اس کا نقشہ بنایا ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ صبح صادق اور صبح کاذب کے درمیان تین درجات کا فرق ہے، اور جب مذکورہ بالا دلائل کی رو سے ثابت ہوا کہ صبح کاذب اٹھارہ درجے زیر افق پر ہوتی ہے تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ صبح صادق پندرہ درجے زیر افق پر ہوگی۔ اس بناء پر حضرت مفتی رشید احمد صاحب نے صبح صادق کے جو وقت نکالے ہیں ان کا مقابلہ مذکورہ بالا مشاہدات سے کیا گیا تو زیادہ سے زیادہ تین منٹ کا فرق نکلا، مگر یہ تین منٹ کا فرق صبح کاذب میں بھی تھا، اس لئے صبح کاذب اور صادق کے درمیان پر کوئی اثر نہیں پڑا، مفتی رشید احمد صاحب نے بارہ جون کو دہلی کے لئے چار بج کر تین منٹ صبح کاذب (اٹھارہ زیر افق) کا اور چار بج کر بیس منٹ صبح صادق (پندرہ درجہ زیر افق) کا وقت لکھا، مگر مشاہدے سے صبح کاذب پورے چار بجے اور صبح صادق چار بج کر سترہ منٹ پر نظر آئی، یہ تین منٹ کا فرق شبہے کی وجہ بن سکتا تھا، لیکن بقول حضرت مفتی صاحب مدظلہم طول و عرض نصف النہار کے پیش نظر اتنا فرق ہوسکتا ہے اس کے لئے مفتی صاحب کی رائے میں بھی پانچ منٹ کی احتیاط ضروری ہے اور بعد میں مفتی صاحب نے دوبارہ احتیاط کے ساتھ اس تاریخ اور اس طول و عرض کا حساب نکالا تو معلوم ہوا کہ فرق صرف ایک منٹ کا تھا اور پہلے حساب میں کچھ غلطی ہوگئی تھی۔

بہرکیف مذکورہ بالا تحقیق سے ہمیں بھی یہ ظن غالب ہوتا ہے کہ مولانا مفتی رشید احمد صاحب نے جو حسابی طریقے سے اوقات نکالے ہیں ان کے مطابق نقشے بنانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن معلوم ہوا کہ بعض دوسرے علماء کا اس پر اطمینان نہیں ہوسکا، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صبح صادق پندرہ درجے زیر افق سے پہلے ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ ہمارے ظن غالب کی بنیاد بھی حسابات ہیں نہ کہ ایسے مسلسل مشاہدات جو کہ دائمی جنتریوں کی بنیاد بن سکیں جبکہ شریعت میں اصل مدار مشاہدات پر ہے، اور حسابی جنتریوں پر اعتماد اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جبکہ مشاہدات سے متواتر تائید ہوئی ہو، اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نقشوں میں وقت فجر کے لئے دو خانے بنائے جائیں، ایک کا عنوان ہو احتیاطی منتہائے سحر اور اس کے تحت قدیم معمول کے مطابق قدیم جنتریوں کے اوقات لکھے جائیں، دوسرا عنوان ہو وقت اذان فجر اور اس میں حضرت مفتی رشید احمد کے نکالے ہوئے اوقات صبح صادق لکھے

جائیں، دونوں کے درمیانی وقت میں نہ سحری کھائی جائے، اور نہ نماز پڑھی جائے۔

احقر محمد تقی عثمانی
۱۴رذیقعدہ ۱۳۹۲ھ

محمد عاشق الٰہی

رشید احمد

العبد محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

اس سے اتفاق ہے اگرچہ میں حاضر مجلس نہ تھا
محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۔۔ ذیقعدہ ۱۳۹۲ ہجری
۔۔۔ ۱۴

بندہ عبد الرؤف سکھروی
۲ شعبان ۔۔۔

(مذکورہ بالا تحریر کے علاوہ حضرت والا دامت برکاتہم نے سائل کے استفتاء کے جواب میں باقاعدہ فتویٰ بھی تحریر فرمایا جو درج ذیل ہے۔ از مرتب عفی عنہ)

جواب:۔ محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، صبح صادق کے مسئلے پر حضرت والد صاحب اور حضرت مولانا بنوری صاحب قدس سرہ کے زمانے میں مہینوں تحقیق جاری رہی، جس میں مشاہدات بھی کئے گئے اور حسابی تحقیق بھی کی گئی، آپ نے ٹنڈو آدم کے جس مشاہدے کا ذکر فرمایا ہے وہ متعدد مشاہدات کا ایک مرحلہ تھا، کوئی حتمی مشاہدہ نہیں تھا، اس وقت یہ بات سب پر واضح تھی کہ مطلع گرد آلود ہونے کی بناء پر اس مشاہدے کو کسی حتمی فیصلے کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، اس کے بعد بھی متعدد مشاہدات کئے گئے، کتابی تحقیق بھی ہوئی، بالآخر حضرت والد صاحبؒ اور حضرت مولانا بنوری صاحبؒ دونوں نے حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کی تحقیق سے اختلاف اور اس پر عدم اطمینان کا اعلان فرمایا، اس کے بعد بھی حضرت کے حکم سے خود احقر نے ایک مفصل تحریر حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم العالی کی خدمت میں بھیجی جس میں ان بزرگوں کے فیصلے کی وجوہ عرض کی تھیں، حضرت مدظلہم کی طرف سے اس تحریر کا کوئی جواب بھی موصول نہیں ہوا، بہر صورت یہ مسئلہ مہینوں کی محنت اور تحقیق و مشاہدے کے بعد ہم پر اپنی حد تک واضح ہوگیا، افسوس ہے کہ اس کے باوجود ہر موقع پر ٹنڈو آدم کے اس نامکمل مشاہدے کی بنیاد پر بزرگوں کو مطعون کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور ان حضرات کی بعد کی تحریروں، مشاہدات اور زبانی گفتگو کا کوئی حوالہ نہیں دیا جاتا۔

بہرکیف! اگر کسی صاحب کو حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کی تحقیق پر ہی اعتماد ہے تو بے شک اس پر عمل فرمائیں، لیکن مذکورہ بزرگوں کے موقف کو اندازے یا تخمینے پر مبنی قرار دینا اور ان وفات

یہ فتنہ بزرگوں کے بارے میں زبان طعن دراز کرنے کی طرح مناسب نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۷/۱۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲/۲۶۰)

انتہاءِ زوال اور ابتداءِ ظہر میں فاصلے کی مقدار

سوال ۱:- انتہائے زوال اور ابتدائے ظہر میں کتنا فصل ہوتا ہے؟

۲:- زوال کی مدت کتنے منٹ ہوتی ہے؟

جواب ۱، ۲:- زوال ایک آنی چیز ہے جو ایک منٹ سے بھی کم وقت میں پورا ہو جاتا ہے، اور اس کے فوراً بعد ظہر کا وقت شروع ہو جاتا ہے، لہٰذا استواء شمس کے فوراً بعد نماز ظہر کا وقت آجاتا ہے، دونوں میں کوئی معتد بہ فاصلہ نہیں ہے، البتہ زوال کے تخمینہ کے لئے پانچ منٹ کا احتیاطاً انتظار کر لینا چاہئے۔

وقد وقع في عبارات الفقهاء أن الوقت المكروه هو عند انتصاف النهار إلى أن تزول الشمس ولا يخفى أن زوال الشمس إنما هو عقيب انتصاف النهار بلا فصل. شامي ج ۱ ص ۲۶۹۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۸/۲/۱۳۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۰/۲۸ الف)

حنبلی مسلک میں زوال سے پہلے جمعہ کا وقت اور اس کی بناء پر حنفی مقتدی کے لئے حکم

سوال:- کویت میں نماز کے اوقات کا ایک نقشہ جس کا نام "نتیجة تقويم البحري"

---

(۱) رد المحتار ج ۱ ص ۳۷۱ (طبع سعید) وفی فتح الملہم ج ۵ ص ۳۱۵ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
أن يزول فحسب أنها قد وقفت وهي سائرة لكن لا يظهر أثره ظهوره قبل الزوال وبعده انتهى

ہے، یہ نقشہ حکومت کی طرف سے مفت مہیا کیا جاتا ہے، اوقات کے روزانہ تغیر کے ساتھ ساتھ نماز کے وقت بھی بدلے جاتے ہیں، دو سال قبل جمعہ کی پہلی اذان ابتدائے ظہر پر دی جاتی تھی اور دو رکعت ادا کرنے کے بعد امام منبر پر تشریف لاتے اور خطبہ کی اذان کہی جاتی، اس مختصر وقفے میں ہم پاکستانی چار رکعت نماز ادا کرلیتے، لیکن دو سال سے حکم جاری ہے جس کی بناء پر جمعہ کی پہلی اذان ظہر سے آدھ گھنٹہ پہلے ہوتی ہے اور ابتدائے ظہر پر خطبہ کی اذان کہی جاتی ہے، کبھی خطیب دو منٹ پہلے ہی منبر پر تشریف لے آتے ہیں اور اذان بھی اسی وقت ہوجاتی ہے، ان حالات میں چار رکعت قبل جمعہ کا کیا حکم ہے؟

جواب:- وہ لوگ حنبلی مسلک کے ہوں گے، ان کے مسلک میں جمعہ کا وقت زوال سے پہلے ہوجاتا ہے۔ بہرحال اس صورت میں حنفی حضرات کو چاہئے کہ وہ خطیب صاحب سے اپنی مشکل بیان کرکے انہیں اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ زوال کے بعد چار رکعت کا وقت دیا کریں، امید ہے کہ وہ اسے قبول کریں گے، اور اگر بالفرض وہ قبول نہ کریں تو سنتیں جماعت کے بعد ادا کرلی جائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۲۶۰ الف)

ظہر کا وقت

سوال:- کیا ظہر کی نماز ایک بج کر ۵ منٹ پر ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ ہماری فیکٹری میں مستقل اسی وقت ظہر کی جماعت ادا کی جاتی ہے۔

جواب:- ظہر کا وقت زوالِ آفتاب کے فوراً بعد ہوجاتا ہے، اور زوالِ آفتاب کا وقت موسموں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، اس کے لئے اوقات کے مفصل نقشے چھپے ہوئے عام ملتے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں، چونکہ اکثر موسموں میں ایک بجے سے پہلے ہی ظہر کا وقت ہوجاتا ہے اس لئے آپ ایک بجے نماز پڑھ سکتے ہیں۔

والسلام
۳/۱/۱۳۹۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۷ ۳۰ الف)

کینیڈا میں عصر اور عشاء کا وقت

سوال ا:- یہاں امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق نمازوں کے اوقات کا چارٹ چھپا ہو

ہے، آپ عصر کی نماز کا وقت حنفی مسلک کے مطابق متعین فرمادیں۔

۲- یہاں کینیڈا میں غروب آفتاب کے بعد شفق احمر تو غائب ہوجاتا ہے، مگر شفق ابیض رات گیارہ بجے تک یا اس سے بھی دیر تک رہتا ہے، گیارہ بجے تک کا انتظار خاصا مشکل ہے، ورنہ نمازِ عشاء رہ جاتی ہے، یہ انتظار اس لئے بھی مشکل ہے کہ صبح جلدی اٹھنا پڑتا ہے۔ آپ فرمائیں کہ مغرب کے بعد جلد سے جلد عشاء کی نماز کا وقت کب شروع ہوجاتا ہے؟

جواب ۱- عصر کی نماز کا وقت حنفی مسلک میں اس وقت ہوتا ہے جب زمین پر ہر چیز کا سایہ (سایۂ اصلی کے علاوہ) دُگنا ہوجائے،[1] یہ وقت مختلف موسموں میں اور مختلف مقامات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے اور وہاں ماہرین سے رجوع کرکے معلوم کیا جاسکتا ہے، اور اگر وہاں مشکل ہو تو مولانا مفتی رشید احمد صاحب اشرف المدارس ناظم آباد کراچی ۳ کو لکھ کر ان سے پورا نقشہ بنوایا جائے، ان کو اس میں مہارت ہے، احقر کو مہارت نہیں۔

۲- صورتِ مسئولہ میں شفق احمر کے غروب ہوجانے کے بعد عشاء کی نماز ادا کرلینے کی گنجائش ہے، عملاً بقول الصاحبین فی موقع العذر۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۰/۳۰ د)

۱:- عصر میں اصفرارِ شمس تک تاخیر
۲:- عشاء کا وقت

سوال ۱:- احناف کے مسلک پر نمازِ عصر میں جو تاخیر افضل ہے تو اس افضلیت پر گفتگو

---

(۱) وفي جامع الترمذي باب ما جاء في تأخير الظهر في شدة الحر ج ۱ ص ۲۲، ۲۳ طبع دار... وفي كتب حديثه عن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا اشتد الحر فأبردوا عن الصلوة فإن شدة الحر من فيح جهنم. حدیث کا مطلب یہ ہے کہ گرمی کی شدت میں ظہر کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو۔ وفيه أيضاً ج ۱ ص ۲۳ عن أبي ذر أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان في سفر ومعه بلال فأراد أن يقيم فقال أبرد ثم أراد أن يقيم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم أبرد في الظهر قال حتى رأينا فيء التلول ثم أقام فصلى فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن شدة الحر من فيح جهنم فأبردوا عن الصلوة. وفي صحيح الإمام البخاري ج ۱ ص ۷۷ طبع قديمي كتب خانه حتى ساوى الظل التلول. اس طریق سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلوں کا سایہ ان کے مساوی ہونے کا حاصل یہ ہے کہ عام طور سے ٹیلے چونکہ منبسط ہوتے ہیں، اس لئے ان کا سایہ کافی دیر میں ظاہر ہوتا ہے اور ان کا سایہ اس وقت ایک مثل ہوتا ہے جبکہ دوسری چیزوں کا سایہ ایک مثل سے کافی زائد ہوچکا ہو، دیگر احادیث اور ان کی تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الملہم ج ۲ ص ۱۹۵، ۲۰۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی) اور درس ترمذی ج ۱ ص ۳۹۵۔

(۲) وفي علاء السنن ج ۲ ص ۱۰ طبع إدارة القرآن كراچي وفي البحر الشفق هو البياض عند الإمام ... فثبت أن قول الإمام هو الأصح ... ولا يعدل عنه إلى قولهما أو قول أحدهما أو غيرهما إلا لضرورة من ضعف دليل أو تعامل بخلافه كالمزارعة وإن صرح المشايخ بأن الفتوى على قولهما كما في هذه المسئلة وفي شرح ... وقولهما أوسع للناس وقول أبي حنيفة أحوط (محمد تقی عثمانی)

کے حساب سے عصر اور مغرب کے درمیان کتنا وقت ہونا چاہئے؟

۲:- مغرب کی نماز کے کتنے وقت بعد عشاء کا وقت داخل ہوتا ہے؟

جواب ۱:- حنفیہ کے نزدیک عصر کی نماز اصفرارِ شمس یعنی سورج کے زرد ہونے سے پہلے تک تاخیر کرنا افضل ہے، لیکن جماعت میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ نماز ختم کرنے کے بعد اصفرار سے پہلے اتنا وقت باقی رہے کہ اگر نماز کا اعادہ کرنا ہو تو وہ بھی اصفرار سے پہلے کیا جاسکے، یہ وقت موسموں اور شہروں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، اس لئے گھنٹہ منٹ کے حساب سے اس کی کوئی مقدار دائمی طور پر مقرر نہیں کی جاسکتی۔(۱)

۲:- جب شفق ابیض (یعنی مغربی اُفق پر سفیدی) غائب ہوجائے تو عشاء کا وقت داخل ہوجاتا ہے،(۲) اس کا مدار بھی شہر کے محلِ وقوع اور موسم پر ہوتا ہے، اس لئے گھنٹہ اور منٹ کے لحاظ سے اس کی بھی دائمی مقدار نہیں بتائی جاسکتی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۲ھ

نمازِ فجر میں اسفار افضل ہے

سوال:- یہاں دیہی علاقے میں لوگ نمازِ فجر کافی دیر کرکے پڑھتے ہیں، مثلاً ۳ ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ کو جامع مسجد جیمس آباد میں نمازِ فجر ۶:۱۵ (سوا چھ بجے پڑھی گئی) جبکہ نماز پڑھنے کی نسبت طلوع و غروب میں ۵ منٹ کا فرق ہے، براہ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب:- نمازِ فجر حنفیہ کے نزدیک اسفار یعنی اجالے میں پڑھنا افضل ہے، لیکن نماز طلوعِ آفتاب سے اتنے پہلے ختم ہوجانی چاہئے کہ اگر کسی وجہ سے نماز کا اعادہ کرنا پڑے تو طلوع سے قبل

---

(۱) وقت عصر سے متعلق دلائل [illegible]

(۲) فی الهداية ج ۱ ص ۸۲ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان) (مواقیت الصلوة) وأول وقت العشاء إذا غاب الشفق وآخر وقتها ما لم يطلع الفجر، وفي [illegible] ج [illegible] ص [illegible] [illegible] قال في الاختيار الشفق البياض وهو مذهب الصديق ومعاذ بن جبل وعائشة رضي الله عنه وعنهم قلت ورواه عبدالرزاق عن أبي هريرة وعن عمر بن عبد العزيز الى قوله قال العلامة قاسم فثبت أن قول الامام هو الأصح ومشى عليه في البحر [illegible] الخ وفي اعلاء السنن ج ۲ ص [illegible] وفي البحر الشفق هو البياض عند الامام [illegible] فثبت أن قول الامام هو الأصح وبهذا ظهر أنه لا يفتى ولا يعمل إلا بقول الامام الأعظم ولا يعدل عنه إلى قولهما أو قول أحدهما أو غيرهما إلا لضرورة من ضعف دليل أو تعامل بخلافه [illegible] وإن صرح المشايخ بأن الفتوى على قولهما كما في هذه المسئلة وفي شرح الوهاج فقولهما أوسع للناس وقول أبي حنيفة أحوط. (محمد زبیر)

کی قراءت کے ساتھ ادا ہو سکے اور پھر بھی کچھ وقت بچ رہے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۸/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۸۰/۲۷ و)

شرعی رات کی تحقیق

سوال: شامی کتاب الصوم ج ۲ ص ۸۸ میں ہے کہ النہار الشرعی صبح صادق سے غروب تک ہے، باقی رات ہے، بخلاف عرفی نہار کے۔ یہاں رات شرعی مراد ہے یا عرفی؟

جواب: غروب کے ساتھ ہی شرعی رات شروع ہو جاتی ہے، لقوله تعالى ﴿أتموا الصيام الى الليل﴾(۲) ولما في رد المحتار والمراد بالغروب زمان غيبوبة جرم الشمس بحيث تظهر الظلمة في جهة الشرق قال صلى الله عليه وسلم "إذا أقبل الليل من ههنا فقد أفطر الصائم" أي إذا وجدت الظلمة حسًا في جهة المشرق فقد ظهر وقت الفطر أو صار مفطرًا في الحكم، لأن الليل ليس ظرفًا للصوم۔ (شامی ج ۲ ص ۸۰ اول کتاب الصوم)(۳)۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۲۸ الف)

عشاء میں جلدی کا حکم

سوال: عشاء کی اذان اور نماز میں اکثر مسجدوں میں اتنی جلدی کرتے ہیں کہ مغرب کی اذان سے عشاء کی جماعت تک ڈیڑھ گھنٹہ بھی ٹھیک سے نہیں ہوتا، تو کیا ایسی صورت میں اذان اور نماز ہو جاتی ہے؟

جواب: ہر موسم میں مغرب اور عشاء کے درمیان فاصلہ الگ ہوتا ہے، اس کام کے لئے نقشے چھپے ہوئے ہیں، حافظ فرید الدین صاحب وکٹوریہ روڈ والے اوقات نماز کا جو نقشہ چھاپتے ہیں اس

---

(۱) في الكبيري شرح منية المصلي ص ۲۳۲ (طبع سهيل اكيدمي لاهور) ويستحب في صلاة الفجر الاسفار بها، أي الشروع في وقت ظهور النور وانكشاف الظلمة ولعل بحيث يرى الرامي موقع نبله عندنا خلافًا للثلاثة لقوله عليه السلام اسفروا بالفجر فإنه أعظم للأجر رواه الترمذي وفي مراقي في حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ج [illegible] ص ۲۵۲ (طبع مكتبة العلم لحديث دمشق) يستحب الاسفار وهو التأخير للإضاءة بالفجر بحيث لو ظهر فساد أعادها بقراءة مسنونة قبل طلوع الشمس لقوله عليه السلام اسفروا بالفجر فإنه أعظم للأجر وفيه أيضًا ج ص ۲۵۳ والاسفار بالفجر مستحب سفرًا وحضرًا وفي الدر المختار ج ۱ ص ۳۶۶ (طبع سعيد) والمستحب للرجل الابتداء في الفجر بإسفار والختم به هو المختار بحيث يرتل أربعين آية ثم يعيده بطهارة لو فسد [illegible] وفي الهداية ج ۱ ص ۸۲ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان) (باب المواقيت) ويستحب الاسفار بالفجر لقوله عليه السلام اسفروا بالفجر فإنه أعظم للأجر

(۲) سورة البقرة ۱۸۷

(۳) شامية ج ۲ ص ۳۷۰ (طبع ايچ ايم سعيد)۔ (محمد زبیر حق نواز)

کے مطابق عمل کریں۔[۱]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۰ھ

رمضان میں عشاء اور صبحِ صادق کا وقت

سوال:- رمضان المبارک میں عشاء کی نماز کا ابتدائی وقت (یعنی اذان کا وقت) کتنے بجے شروع ہوتا ہے؟ اور صبحِ صادق کا وقت کب تک رہتا ہے؟ اس مسئلے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ کئی مساجد میں اوقاتِ نماز کے دو مختلف نقشے آویزاں ہیں، ان میں تقریباً وقتِ صبحِ صادق اور وقتِ عشاء میں ۲۰-۲۵ منٹ کا فرق ہے، اور نقشے کے نیچے یہ درج ہے کہ اس میں وقتِ صبحِ صادق وعشاء کی تصحیح کی گئی ہے اس میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا بھی نام ہے، جبکہ عمل عموماً اس کے خلاف ہے، اب ہم کس نقشے کے مطابق اذانوں کا وقت متعین کریں؟ اور سحری کا وقت کس نقشے کے مطابق ہو؟ مفتی صاحب کا جس نقشے میں نام ہے اس میں اختتامِ سحری ۴ بج کر سولہ منٹ لکھا ہے، دوسرے نقشے میں وقتِ سحری چار بج کر بیالیس منٹ لکھا ہے۔

جواب:- حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو شروع میں وقتِ فجر وعشاء کے بارے میں کچھ تردد ہوگیا تھا، لیکن آخر میں ان کا فتویٰ یہی تھا کہ قدیم نقشے دُرست ہیں، چنانچہ گزشتہ رمضان میں خود انہوں نے جو نقشہ شائع کروایا وہ قدیم نقشوں کے مطابق تھا، اب آپ کو دیکھنا ہو تو دارالعلوم نانک واڑہ سے نقشہ حاصل کرلیجئے۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۴۳ ج)

سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نماز پڑھنا

سوال:- فجر کی اذان سحری ختم ہوتے ہی دے دی جائے تو جائز ہے؟ اور سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نماز پڑھنا دُرست ہے؟

جواب:- احتیاط اس میں ہے کہ جب موجودہ نقشوں کے مطابق سحری کا وقت ختم ہوجائے تو فوراً نمازِ فجر نہ پڑھیں، بلکہ دس پندرہ منٹ انتظار کرکے پڑھیں تاکہ صبحِ صادق بلا اختلاف ہوجائے، تاہم اگر کسی نے فوراً نماز پڑھ لی تو اس کی نماز ہوجائے گی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰ ۱۶۸۰ د)

---

(۲) اب وقتِ نماز کا ایک نقشہ خود حضرت [illegible]

صبحِ صادق کے وقت پر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ سے اختلاف کی تحقیق (عربی فتویٰ)

سوال:- قال مولانا مفتی رشید أحمد أدام الله حیاته فی أحسن الفتاوی أن الجداول لأوقات الصلوات فی عامة المساجد لیست بصحیحة وبقی جهده وجهد علماء عصره بهذا الصدد وذکر اسمکم بین هذه العلماء ونقل موافقتکم معه فی رأیه وذکر فی الآخر رجوعکم عن الموافقة المذکورة وأسف علی هذا شدیدًا وقال رجعوا بغیر دلیل واستدلال وبغیر قیل وقال.

جواب:- قد وقع تحقیق مسألة وقت الصبح الصادق فی زمن والدی الشیخ المفتی محمد شفیع والعلامة الشیخ البنوری رحمهما الله تعالی، وکانا فی أول الأمر قد مالا إلی رأی شیخنا المفتی رشید احمد حفظه الله تعالی ولکن بعد المشاهدات المتوالیة ومراجعة کتب الفقه والحساب عدلا عن رأیه.

المشاهدة التی ذکرها شیخنا المفتی رشید أحمد حفظه الله تعالی فهی "مشاهدة سندوآدم" وکانت إحدی المشاهدات ما بین عدة مشاهدات ولکن مطلع الشرق إذ ذاک مغبر، ولم یکن أحد یری أن هذه المشاهدة کافیة للوصول إلی نتیجة حاسمة فلا ینبغی التعویل علیها.

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۰۵/۵/۴ھ

عصر کی نماز کے لئے ساڑھے چار بجے کا وقت مقرر کرنا

سوال:- مشکوٰۃ شریف اور ترمذی کی ایک حدیث ہے جس میں امامت جبرئیل والی حدیث میں زوال کے فوراً بعد ظہر کی نماز ادا کرنے کا ذکر ہے، اور عصر کی نماز جب سایہ ایک مثل ہوگیا تو اس کے بعد عصر کی نماز ادا کرنے کا ذکر موجود ہے۔

نیز صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز سایہ کے ایک مثل ہوجانے کے بعد ادا فرمائی۔

اس حدیث کی روشنی میں، نیز چونکہ ہم سب کاروباری لوگ ہیں اور غرض یہ ہے کہ ہم سب جماعت کے ساتھ نماز ادا کرسکیں، اس کی بناء پر ہم نے مناسب یہ سمجھا کہ ساڑھے چار بجے عصر کی

جماعت کرائی جائے، یہ ٹائم ہم نے عصر کی جماعت کے لئے مقرر کیا ہے، ہمارا یہ وقت مقرر کرنا حدود جواز میں داخل ہے یا نہیں؟

جواب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چونکہ گھڑیاں نہیں تھیں اس لئے اوقات کا تعین گھنٹوں کی گھڑیوں کے حساب سے نہ تھا، بلکہ وقت کی مختلف علامتیں مقرر تھیں، ان علامتوں کا بیان مختلف احادیث میں آیا ہے اور اس بارے میں ایک دو نہیں، بہت سی احادیث مروی ہیں، امام ابوحنیفہؒ نے ان تمام احادیث کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عصر کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہر چیز کا سایہ اس سے دوگنا ہو جائے۔(۱) یہ وقت موسموں اور مقامات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے، کراچی میں عصر کا وقت کم سے کم چار بج کر آٹھ منٹ پر (۱۵ دسمبر کو) ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ پانچ بج کر تیئس (۱۵ جولائی کو) ہوتا ہے۔ آج یعنی (۱۴ مارچ کو) عصر کا وقت پانچ بج کر دو منٹ پر شروع ہوگا، اس سے پہلے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نماز پڑھنا درست نہیں۔ لہٰذا آپ نے آج کل ساڑھے چار بجے کا جو وقت مقرر کیا ہوا ہے وہ حنفی مسلک کے لحاظ سے درست نہیں ہے۔ آپ کو چاہئے کہ اوقات نماز کے جو طبع شدہ نقشے ملتے ہیں وہ اپنے پاس رکھیں اور اس میں روزانہ عصر کا وقت دیکھ کر اس کے مطابق جماعت کا وقت مقرر فرمائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۶/۴/۱۳۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۷/۲۹ الف)

---

(۱) وفي الدر المختار كتاب الصلوة ج ۱ ص ۳۵۹ و ۳۶۰ ووقت الظهر من زواله أي ميل ذكاء عن كبد السماء إلى بلوغ الظل مثليه. وفيه بعد أسطر ص ۳۶۰ ووقت العصر منه إلى قبيل الغروب وفي الشامية تحته (قوله منه) أي من بلوغ الظل مثليه ... الخ

﴿فصل فی الأذان﴾

(اذان سے متعلق مسائل کا بیان)

اذان میں تجوید کی غلطی کا حکم

سوال:- ایک شخص اذان دیتے ہوئے بہت غلطیاں کرتا ہے، تلاوت قرآن شریف بھی بہت غلط پڑھتا ہے، جیسے کہ لحن جلی کرتا ہے، "حی علی الصلوٰۃ" میں ح کو ہ پڑھتا ہے، ایسا شخص اس منصب کے قابل ہے یا نہیں؟ فتاویٰ رشیدیہ کا مسئلہ اس بارے میں درست ہے یا نہیں؟

جواب:- مؤذن کا تقرر کرتے وقت اس بات کا پورا لحاظ رکھنا چاہئے کہ مؤذن صحیح خواں ہو، اور کسی قسم کا لحن نہ کرتا ہو، پھر اگر وہ ایسی غلطی کرے جو معنی بگاڑ دے تو اذان ہی نہیں ہوتی، "حی علی الصلوٰۃ" کو "ھی علی الصلوٰۃ" پڑھنے سے معنی نہیں بگڑتے، البتہ اس غلطی کی اصلاح کے بغیر مؤذن کا تقرر نہ کرنا چاہئے، لیکن اگر تقرر کرلیا گیا ہو تو اذان ہو جائے گی، فتاویٰ رشیدیہ[1] کا مسئلہ بالکل درست ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

۱۳۸۷/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۹/۱۸ الف)

اذان سے پہلے درود وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ اذان سے پہلے بلند آواز سے درود وسلام پڑھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ براہِ کرم تفصیل سے بتلایئے۔

جواب:- اذان سے پہلے بلند آواز کے ساتھ درود وسلام پڑھنا کسی حدیث یا صحابہ کرامؓ

---

(۱) فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۵۹ (ادارۂ اسلامیات [illegible])

سے کسی عمل سے ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس کو زیادہ ثواب کا موجب سمجھ کر اس کی پابندی کرنا بدعت ہے، بعد اذان کے کلمات میں اپنی طرف سے کچھ کلمات کا اضافہ کرنا ہے جو باتفاقِ امت ناجائز ہے۔[1]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۴/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

جمعہ کی اذانِ ثانی کہاں دی جائے؟

سوال:- جمعہ کی اذانِ ثانی منبر اور خطیب کے سامنے دی جائے یا کہ مسجد سے باہر؟

جواب:- جمعہ کی اذانِ ثانی کا خطیب کے سامنے ہونا مسنون ہے، فی الدر المختار ویؤذن ثانیا بین یدیه ای الخطیب، وقال تحته ای علی سبیل السنیة کما یظهر من کلامهم، رملی۔ (شامی ج ۱ ص [illegible])[2]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۵۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفي [illegible] ... نعم بعد الأذان ... علی الکیفیة المعروفة، والصواب أنها بدعة مذمومة بهذه الکیفیة التي حدثت بها [illegible] ... واصحابه والسلف الصالح من ائمة المسلمين وليس لاحد بعدهم ذلك ... وفيه بعد أسطر: ومن ثم قال العلامة ابن حجر في فتاويه الكبرى [illegible] ...

(۲) فتاوی شامیة ج ۲ ص ۱۶۱ (طبع ایچ ایم سعید) وفي الهدایة ج۱ ص ۱۷۱ (مکتبه شرکت علمیه، ملتان) واذا صعد الامام المنبر جلس واذن المؤذنون بین یدی المنبر بذلک جری التوارث الخ
وفي الهندیة ج ۱ ص ۱۴۹ (مکتبه رشیدیه، کوئٹه) واذا جلس علی المنبر اذن بین یدیه و اقیم بعد تمام الخطبة بذلک جری التوارث کذا فی البحر الرائق وفي غنیة المتملی ص ۵۲ (طبع سهیل اکیدمی لاهور) واذا جلس الامام علی المنبر اذن المؤذن بین یدیه الأذان الثاني للتوارث (وفي طبع مکة علی الصفحة ۳۳۱). (محمد زبیر حق نواز عفی عنہ)

سیاسی مقاصد کے لئے اذان دینے کا حکم

سوال:- آج کل مساجد میں پانچ وقت کی اذانوں کے علاوہ جو اذانیں رات میں دی جارہی ہیں، شرعی طور پر اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:- قرآن وسنت اور فقہائے کرام کی تصریحات سے اذان کے جو مواقع ثابت ہیں، آج کل پانچ وقت کے علاوہ دی جانے والی اذانیں ان میں سے کسی میں داخل نہیں ہوتیں،(۱) البتہ مسلمانوں پر کوئی عام مصیبت آئی ہو تو اس کے ازالے کے لئے فجر کی نماز میں قنوت نازلہ ثابت ہے،(۲) اور ایسے مواقع پر اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۵۶۲)

---

(۱) نماز کے علاوہ دیگر مواقع اذان کی تفصیل کے لئے دیکھئے فتاوی شامیة مطلب فی المواضع التی یندب لها الأذان فی غیر الصلوة ج ۱ ص ۳۸۵ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) وفی الدر المختار ج ۲ ص [illegible] فیقنت الإمام فی الصلوة الجهریة [illegible] فی صلوة الفجر [illegible] فتاوی شامیة مطلب فی القنوت للنازلة ج ۲ ص [illegible]

﴿فصل فی شروط الصلوٰۃ وأرکانھا وواجباتھا وسننھا وآدابھا﴾

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کے بیان میں)

سمتِ قبلہ کا مطلب

سوال:- نماز پڑھتے وقت کعبہ کا تعین مغرب کی سمت میں کیا جاتا ہے، جبکہ ضروری نہیں کہ دُنیا کے ہر حصے کے لئے یہ اُصول دُرست ہو۔ اگر یہ اُصول محض اس لئے وضع کیا گیا تھا کہ تمام مسلمان ایک سمت کو سجدہ کریں تو نماز میں یہ کہنا کہاں تک دُرست ہے کہ "میرا رُخ کعبے شریف کی طرف ہے" جبکہ ہم کو یقین ہے کہ ہمارا منہ مغرب کی طرف ہے؟

جواب:- غالباً آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ تمام دُنیا کے مسلمان خواہ وہ کہیں آباد ہوں، نماز کے وقت مغرب کا رُخ کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ اصل میں ہمیں نماز کے اندر کعبہ مشرفہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ہندوستان اور پاکستان وغیرہ کے لحاظ سے چونکہ کعبہ مغرب کی سمت میں ہے، اس لئے یہاں کے باشندے مغرب کا رُخ کرتے ہیں، لیکن جو لوگ مغربی ممالک مثلاً یورپ اور امریکہ وغیرہ میں رہتے ہیں وہ نماز کے وقت مغرب کی بجائے مشرق کی طرف منہ کرتے ہیں، مدینہ طیبہ کے باشندے جنوب کی طرف رُخ کرتے ہیں، اور جنوبی افریقہ کے لوگ شمال کی طرف۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصل چیز کعبہ ہی کا استقبال ہے، وہ جس خطے کے لحاظ سے جس سمت میں ہو، اُدھر ہی کا رُخ کیا جائے گا۔

واللہ اعلم
۲۰ ربیع الاوّل ۱۳۸۷ھ (۱)

حالتِ اِحرام میں جاءِ نماز پر سجدہ کا حکم

سوال:- لوگوں کا خیال ہے کہ حالتِ احرام میں ناک اور چہرہ جاءِ نماز سے نہیں لگنا چاہئے، بلکہ اپنے دونوں ہاتھ ملاکر سجدہ اُن پر کرنا چاہئے، یہ کہاں تک صحیح ہے؟

---

(۱) یہ فتویٰ رجسٹر ... شوال ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

جواب:- حالتِ احرام میں جاءِ نماز پر سجدہ کرنا جائز ہے، دونوں ہاتھ ملا کر ان پر سجدہ کرنا درست نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۷/۱۲/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۷۷/۲۸ د)

ٹرین میں فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا

سوال:- سفر کے دوران عصر کی نماز کے لئے خانیوال اسٹیشن تجویز کیا کہ وہاں گاڑی تقریباً ۲۰ منٹ رکتی ہے، چونکہ گاڑی تاخیر سے چل رہی تھی، میں نے اس کشمکش میں رہا کہ کہیں وہاں پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت تنگ نہ ہو جائے یا اس وقت تک وضو ٹوٹ جائے، میں نے گاڑی ہی میں نماز پڑھ لی، لیکن جب گاڑی خانیوال پہنچی تو عصر کا وقت اچھا خاصا تھا، میں نے گاڑی میں نماز بیٹھ کر پڑھی تھی اور خانیوال پہنچ کر اس نماز کو نہیں دہرایا، کیا میری عصر کی نماز درست ہوگئی یا قضا لازم ہوگی؟

جواب:- فرض نماز شدید معذوری کے بغیر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں[1]، لہٰذا ریل گاڑی میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی بناء پر اب اس نماز کا لوٹانا لازم ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۸/۱۰/۱۳۹۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۴۰/۲۷ ج)

سجدے میں پیشانی کے ساتھ ناک رکھنے سے متعلق بہشتی زیور اور احسن الفتاویٰ میں تعارض کی تحقیق

سوال:- سجدے میں بہشتی زیور شبیری مکمل مدلل میں صفحہ نمبر ۸۹ پر تحقیقی عنوان سے ہے کہ پیشانی کے ساتھ ناک زمین پر رکھنا واجب نہیں ہے، صرف وضع جبہ علی الارض سے بھی نماز درست ہوں۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم نے اپنے احسن الفتاویٰ میں ناک رکھنا واجب لکھا ہے، اور اگر ناک نہ رکھے تو نماز واجب الاعادہ فرماتے ہیں۔ آپ حضرت اپنی تحقیق سے مطلع فرمائیں اور دلائل بھی تحریر فرمائیں۔ والسلام (حضرت مولانا) حکیم محمد اختر (صاحب مدظلہم)

جواب:- دراصل اس مسئلے میں بہشتی زیور اور احسن الفتاویٰ میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں کتبِ فقہ کے درمیان تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور سے کتبِ فقہ میں وہی مسئلہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص ۱۳۲ و ص ۴۴۴ (طبع سعید) من فرائضها ... ومنها القیام فی فرض لقادر علیه وفی الشامیة تحته، قوله (لقادر علیه)، فلو عجز عنه حقیقة وهو ظاهر أو حکما کما لو حصل له به ألم شدید او خاف زیادة المرض وکالمسائل الآتیة ... الخ

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۱ ص ۳۹۳ و ۳۹۴ سوال نمبر ۳۵۲ اور اس کا حاشیہ (محمد زبیر)

درج ہے جو بہشتی زیور میں منقول ہے، چنانچہ بدائع، تحفہ اور اختیار میں اقتصار علی الجبہ و بلا کراہت جائز قرار دیا ہے (كما في البحر ج ۱ ص ۳۳۶)[1]۔ اور اکثر کتب فقہ میں اس کو مطلقاً مکروہ لکھا ہے، چنانچہ عالمگیری میں ہے: وإن كان من غير عذر فإن وضع جبهته دون أنفه جاز اجماعاً، ويكره الخ۔ (ج ۱ ص ۷۰)[2]۔

پھر بعض فقہاء نے اس کو مکروہ تنزیہی پر محمول کیا، چنانچہ علامہ شامیؒ نے صاحب نہر کا قول نقل کیا ہے: لو حملت الكراهة في رأي من أثبتها على التنزيهية ومن نفاها على التحريمية لارتفع التنافي، وعبارته في السراج المستحب أن يضعهما۔ (منحة الخالق ج ۱ ص ۳۳۶)[3]۔

اور صاحب بحر نے کراہت تحریمی کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے: وكره أي الاقتصار على أحدهما سواء كان الجبهة أو الأنف وهي عند الإطلاق منصرفة إلى كراهة التحريم، وهكذا في المفيد والمزيد فالقول بعدم الكراهة ضعيف۔ (ج ۱ ص ۳۳۶)[4]۔

علامہ شامیؒ نے اس بنیاد پر صاحب حلیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کراہت تحریمیہ کا مقتضیٰ چونکہ وجوب ہوتا ہے اس سے بعض نے واجب ہونا، چنانچہ فرماتے ہیں: فالأشبه وجوب وضعهما معا وكراهة ترك وضع كل تحريمية، وإذا كان الدليل يقتضيه فلا بأس بالقول به انتهى۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۳۳۵)[5]۔

اسی عبارت کی بناء پر مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم نے احسن الفتاویٰ میں وجوب کے قول پر اعتماد کیا ہے[6]، لیکن خود علامہ شامی رحمہ اللہ نے البحر الرائق کے حاشیہ پر جو بحث کی ہے اس سے ان کا رجحان عدم وجوب کی طرف معلوم ہوتا ہے، وہاں ان کی پوری عبارت یہ ہے:-

قال في النهر: لو حملت الكراهة في رأى من أثبتها على التنزيهية ومن نفاها على التحريمية لارتفع التنافي. وعبارته في السراج المستحب أن يضعهما انتهى. لكن في الشيخ إسماعيل وفي عزو الأذكار الاقتصار على الجبهة يجوز بلا كراهة وإن لم يكن على الأنف عذرا اتفاقا. وكذلك في مجموع النوازل و [illegible]، وفي الاختيار وإن اقتصر على جبهته جاز بالإجماع ولا [illegible] بعد أن قال فإن اقتصر على الأنف جاز وقد أساء، وقد لا

---

(۱) البحر الرائق ج ۱ ص ۳۰۸ (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) عالمگیریة (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)
(۳) منحة الخالق على البحر الرائق ج ۱ ص ۳۱۸ (طبع سعید)
(۴) البحر الرائق ج ۱ ص ۳۰۸ (طبع ایچ ایم سعید)
(۵) فتاوی شامیہ ج ۱ ص ۴۹۹ (طبع ایچ ایم سعید)
(۶) احسن الفتاوی ج ۳ ص ۲

لا يجوز إلا من عذر. انتهى كلامه فتأمل. وبعد ما قاله في البحر قول المص وكره على أحدهما، فإنه لا يصح حمله على التنزيه نظرا إلى ترك السجود على الجبهة لكن يتأتى حمل الكراهة على طلب الكف طلبا غير جازم (منحة الخالق ج ۱ ص ۳۳۶)۔

اس عبارت کے آخری جملے میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ بنیاد مہیا فرمادی ہے جس کی مدد سے تمام اختلاف رفع ہو جاتا ہے، اور وہ یہ کہ مطلق کراہت کا اطلاق کراہت تحریمی پر ہوتا ہے جس کا ترک واجب ہے۔ منحة الخالق میں ان کے قول کا حاصل یہ ہے کہ کراہت کا اطلاق طلب الکف طلبا غیر جازم پر بھی ہوتا ہے، جو کراہت تنزیہی کو بھی شامل ہے۔

علامہ شامی کی اس رائے سے تطبیق زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، اور یہ اس سے بھی راجح معلوم ہوتی ہے کہ اول تو اس سے فقہاء کے مختلف اقوال میں تطبیق ہو جاتی ہے، دوسرے منحة الخالق رد المحتار کے بعد لکھی گئی ہے، لہٰذا یہ ان کا آخری مسلک ہے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ رد المحتار سے جو وجوب سمجھ میں آتا ہے، اس پر عمل زیادہ قرین احتیاط ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۱۲۳ ج)

امام کا تکبیر کے وقت بیٹھے رہنا اور "حی علی الفلاح" پر کھڑا ہونا

سوال:- جب تکبیر شروع ہوتی ہے تو امام صاحب بیٹھے رہتے ہیں اور "حی علی الفلاح" پر کھڑے ہوتے ہیں، یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- صحیح طریقہ یہ ہے کہ تکبیر کی ابتداء ہی میں تمام مقتدی کھڑے ہو کر صفیں درست کریں، اور بعض مقامات پر جو رواج ہو گیا ہے کہ امام اور مقتدی بیٹھے رہتے ہیں اور "حی علی الفلاح" سے پہلے کھڑے ہونے کو برا جانتے ہیں، یہ طرز عمل درست نہیں۔ فقہاء نے جو لکھا ہے کہ "حی علی الفلاح" پر کھڑا ہونا چاہئے اس کا مطلب یہ ہے کہ "حی علی الفلاح" کہنے کے بعد بیٹھنا درست نہیں، یہ مطلب نہیں کہ پہلے کھڑا ہونا ناجائز ہے۔ اس مسئلے کی پوری تفصیل جواہر الفقہ مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں موجود ہے۔ تفصیل کے لئے اس کی طرف رجوع فرمالیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۲۲۸ و)

---

(۱) منحة الخالق على البحر الرائق ج ۱ ص ۳۱۸ (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) ج ۱ ص ۳۰۹ تا ۳۲۲

تکبیر کے دوران نمازی کب کھڑے ہوں؟

سوال - ایک مولوی صاحب نے ایک طبع شدہ چارٹ لگایا جس میں قولِ نبویؐ، قولِ صحابہؓ اور مسلک بزرگانِ دین سے یہ ثابت کیا ہے کہ تکبیرِ اُولیٰ کے وقت بیٹھنا مستحب ہے، اور شروع میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، تو کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب - درحقیقت مسئلہ یہ ہے کہ مقتدیوں کے کھڑے ہونے کا تکبیر کے کسی لفظ کے ساتھ تعلق نہیں ہے، بلکہ جس وقت مقتدی امام کو آتا دیکھیں اس وقت سے لے کر مکبّر کے "حی علی الفلاح" کہنے تک کسی بھی وقت کھڑے ہوسکتے ہیں، ہاں اس کے بعد کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ "حی علی الفلاح" سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے، جو لوگ اس سے پہلے کھڑے ہوتے ہیں وہ کسی مکروہ عمل کا ارتکاب نہیں کرتے۔

مسند عبدالرزاق کی ایک حدیث میں ہے: عن ابن جريج عن ابن شهاب ان الناس كانوا ساعة يقول المؤذن الله اكبر يقومون الى الصلوة فلا يأتي النبي صلى الله عليه وسلم مقامه حتى تعتدل الصفوف (فتح الباری)۔[1] اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے: فأما إذا كان الامام خارج المسجد فإن دخل المسجد من قبل الصفوف فكلما جاوز صفا قام ذلك الصف، واليه مال شمس الأئمة الحلواني والسرخسي وشيخ الاسلام خواهر زاده، وإن كان الامام دخل المسجد من قدامهم يقومون كما رأوا الامام۔ (عالمگیری ج:۱ ص:۳۳)۔[2]

اور جن کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ "حی علی الفلاح" کہنے پر سب کھڑے ہوجائیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ "حی علی الفلاح" کہنے پر کوئی شخص بیٹھا نہ رہے، یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔[3]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی
۱۳۹۱/۴/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۲۲/۵۴۷ الف)

---

(۱) فتح الباری، کتاب الاذان، باب متی یقوم الناس اذا رأوا الامام عند الاقامۃ، ج ۲ ص ۱۲۰ (طبع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور)
(۲) فتاویٰ عالمگیریہ ج:۱ ص ۵۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)
(۳) تفصیل کے لئے ... ص ۳۰۹ تا ۳۲۳ ملاحظہ فرمائیں۔

تکبیر کے دوران مقتدی کب کھڑے ہوں؟

سوال:- تکبیر کے وقت مقتدیوں کو "حی علی الصلوۃ" تک بیٹھنا چاہئے یا اوّل تکبیر پر کھڑا ہونا چاہئے، اور اگر پیش امام بیٹھا ہے اور مقتدی بھی کافی تعداد میں یا ایک دو افراد کھڑے ہوں تو ان کو زبردستی بٹھلانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اوّل تکبیر پر کھڑا ہونا بہتر ہے، کوئی شخص "حی علی الفلاح" کہنے تک بھی کھڑا ہوجائے تو ٹھیک ہے، لیکن اس سے پہلے کھڑے ہونے کو برا سمجھنا اور اہتمام کرکے لوگوں کو بٹھانا جائز نہیں۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱/۱۳۸۸ھ

(فتویٰ نمبر ۷۷ ۱۹ الف)

نماز کے لئے کیسا لباس پہننا ضروری ہے؟
اور صرف ٹوپی پہن کر نماز پڑھانے کا حکم

سوال:- لباس مسنونہ کون سا لباس ہوسکتا ہے؟ کیا نماز میں امام اور مقتدی کا لباس ایک جیسا ہونا چاہئے؟ کیونکہ دونوں نمازی ہیں، یا الگ الگ ہیں جیسا کہ بعض لوگ امام کے لئے عمامہ ضروری تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مسنون ہے، تو پھر امام اور مقتدی دونوں کے لئے ہونا چاہئے۔ اور صرف ٹوپی پہن کر نماز پڑھانے سے لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ مولانا احتشام الحق صاحبؒ ٹوپی پہن کر نماز پڑھاتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- نماز کے صحیح ہونے کے لئے کسی خاص وضع کا لباس شرط نہیں ہے، بلکہ ہر اس لباس میں نماز ہوجاتی ہے جس سے ستر عورت پورا ہوجاتا ہو، البتہ جو پاجامہ ٹخنے سے نیچے لٹکا ہو ہو یا ایسا لباس ہو جس میں غیر مسلم قوم کی مشابہت ہے تو اس کے ساتھ نماز مکروہ ہے،[۲] فاسد پھر بھی نہیں ہوتی۔ اور عمامہ نہ امام کے لئے شرط ہے، نہ مقتدی کے لئے، کپڑے کی ٹوپی ہو یا کھال کی یا کسی اور چیز کی، ہر قسم کی ٹوپی سے نماز بلا کراہت جائز ہوجاتی ہے۔ جو لوگ عمامے کو امامت کے لئے شرط قرار

---

(۱) تفصیل کے لئے سابقہ فتویٰ اور جواہر الفقہ ج:۱ ص ۳۰۹ تا ۳۲۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی المشکوۃ ج ۱ ص ۷۵ قال علیه السلام ان الله لا یقبل صلاۃ رجل مسبل ازاره رواه الترمذی (فی ج ص ۸۷)، وقال الطحطاوی علی المراقی (فی المکروهات) ص ۱۸۹ وکذا ما هو عادۃ اهل الکبر

دیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، ہاں چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت عمامہ زیب سر فرماتے تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں عمامہ باندھنا اور عمامے سے نماز پڑھنا افضل اور زیادہ موجب ثواب ہے، لیکن اس کے بغیر بھی نماز بلا کراہت صحیح ہو جاتی ہے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم

۲؍رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۰۵/۲۸ ج)

ایک طرف سلام نہ پھیرنے سے نماز درست ہوگی یا نہیں؟

سوال - امام نے آخری قعدے میں بیٹھ کر دائیں جانب سلام پھیرنے کے بعد ایک مقتدی نے اللہ اکبر کہہ کر امام کو لقمہ دیا، جس کی آواز سے امام ٹھٹک گیا، بائیں طرف سلام نہ پھیرا اور کھڑے ہوکر سوال کیا کہ نماز پوری نہیں ہوئی؟ اکثر مقتدیوں نے کہا کہ نماز پوری ہوئی، لقمہ دینے والے نے غلطی کی۔ کیا بائیں طرف سلام نہ پھیرنے سے نماز تمام ہو جاتی ہے یا اعادہ ضروری ہے؟

جواب:- نماز کے اختتام پر دونوں طرف سلام پھیرنا اصح قول کی بناء پر واجب ہے، (اگرچہ بعض فقہاء نے دوسرے سلام کو سنت بھی کہا ہے) لہٰذا صورت مسئولہ میں امام نے ترک واجب کا ارتکاب کیا، جس کا حکم یہ ہے کہ نماز کی فرضیت تو ساقط ہوگئی لیکن وقت کے اندر اندر نماز کا اعادہ واجب تھا، اب جبکہ وقت بھی گزر چکا اور ان مصلیوں کا اجتماع نہ رہا تو نماز کراہت کے ساتھ ہوگئی، البتہ امام کو اس غلطی پر توبہ و استغفار کرنا چاہئے۔

قال في الدر المختار: ولفظ السلام مرتين، فالثاني واجب.(۲) وفي مراقي الفلاح (في بيان حكم الواجب في الصلوة)، واعادتها بتركه عمدا وسقوط الفرض ناقصا ان لم يسجد ولم يعد، وقال الطحطاوي تحت قوله وإعادتها بتركه عمدا، اي ما دام الوقت باقيا وكذا في السهو ان لم يسجد له وان لم يعدها حتى خرج الوقت تسقط مع النقصان وكراهة التحريم، ويكون فاسقا آثما، وكذا الحكم في كل صلوة أديت مع كراهة التحريم، والمختار ان المعادة

(۱) وفي عمدة الرعاية على هامش شرح الوقاية كتاب الصلوة ج:۱ ص ۹۹ (طبع سعيد) وقد ذكروا أن المستحب ان يصلي في قميص وازار وعمامة ولا يكره الاكتفاء بالقلنسوة ولا عبرة بما اشتهر بين العوام من كراهة ذلك وكذا ما اشتهر ان المؤتم لو كان معتما بعمامة والامام مكتفيا على القلنسوة يكره الخ

(۲) الدر المختار ج:۱ ص ۴۶۸ (طبع سعيد)

لترک واجب نقل جبر والعرض سقط بالأولی [illegible] الطحطاوی علی المراقی ص ۳۴ [illegible] فی فصل بیان [illegible] واجب۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۹/۲۱ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

نماز میں ثناء اور درود شریف پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟

سوال – نماز میں ثناء، درود شریف، دعا وغیرہ پڑھنا سنت مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟

جواب – نماز میں ثناء، درود شریف [illegible] سنن مؤکدہ میں سے ہے۔

لما فی الدر المختار وسننها [illegible] الثناء والتعوذ [illegible] والصلوٰة علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم والدعاء۔ اھ [illegible] وسننها کے تحت صاحب درمختار نے [illegible] ترک السنة لا یوجب فسادا ولا سهوا بل إساءة لو عامدًا غیر مستخف [illegible] [۱،۲] اور یہ تعریف سنت مؤکدہ کی ہے، كما يظهر من كلام الشامیؒ۔ (ج۱ ص۳۱۸ و۳۱۹)۔[۴]

اس کے علاوہ فقہاء جب نماز کی سنت مطلق بولتے ہیں تو اس سے مؤکدہ ہی مراد ہوتی ہے، سنن زوائد یعنی غیر مؤکدہ کو عموماً آداب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۷/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۷۹۴/۲۹ ب)

[illegible] ولنا ما روی عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ أنہ قال صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]

(۲،۳) الدر المختار ج ۱ ص:۴۷۳–۴۷۷ (طبع سعید)، وفی تبیین الحقائق ج ۱ ص ۲۸۹ (طبع سعید) [illegible] وتکبیرات الرکوع والسجود، وکذا فی البحر الرائق ج ۱ ص۳۰۳ (طبع سعید)

تسمیہ، سورۂ فاتحہ سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟

سوال:- تسمیہ، الحمد سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟

جواب:- ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہئے۔(۱) واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح
محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

باجماعت نماز ادا کرنا سنت ہے یا واجب؟

سوال:- نماز باجماعت ادا کرنا سنتِ مؤکدہ ہے یا واجب؟
نیز سفر کے دوران نمازِ باجماعت کا اہتمام ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- سنت مؤکدہ قریب بواجب ہے،(۲) اور سفر میں اگر جماعت سے نماز پڑھنا ممکن نہ ہو یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی صورت میں ساتھیوں سے بچھڑنے کا خطرہ ہو یا سواری کی روانگی کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں جماعت کے بغیر تنہا نماز پڑھنا جائز ہے۔ وفی بدائع الصنائع (ج۱ ص۱۵۳) وأما المسافرون فالأفضل لهم أن يؤذنوا ويقيموا ويصلوا بجماعة، لأن الأذان والاقامة من لوازم الجماعة المستحبة والسفر لم يسقط الجماعة فلا يسقط ما هو من لوازمها الخ۔(۳) تاہم حتی الامکان جماعت ہی سے نماز پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم

۵/۲/۱۴[illegible]ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵/۵۸)

---

(۱) وفي غنية المستملي ص ۳۰۲ طبع سهيل اكيدمي لاهور: ويسمي اي يقول بسم الله الرحمن الرحيم قبل الفاتحة في اول كل ركعة. وفي الهندية ج۱ ص ۷۴ طبع رشيديه كوئته: ويأتي بها في أول كل ركعة وهو قول أبي يوسف وفي الحجة وعليه الفتوى. وفي التنوير مع شرحه باب صفة الصلوٰة ج۱ ص ۴۹۰ طبع سعيد: وكما تعوذ سمى سرًا في أول كل ركعة.

(۲) وفي الدر المختار باب الامامة ج۱ ص ۵۵۲ طبع سعيد: والجماعة سنة مؤكدة للرجال قال الزاهدي أرادوا بالتأكيد الوجوب الا في جمعة وعيد فشرط. وفي رد المحتار تحت قوله قال الزاهدي [illegible] تسميته سنة ويقول بالوجوب [illegible] بالأجر لو ردها بوعيد شديد بترك الجماعة، وفي النهر عن المفيد الجماعة واجبة وسنة لوجوبها بالسنة ... الخ

(۳) وفي الدر المختار باب الامامة ج۱ ص ۵۵۵، ۵۵۶ فلا تجب الجماعة على مريض [illegible] ولا على مريض [illegible] وارادة سفر. وفي الشامية تحت قوله وارادة سفر [illegible]
نیز جماعت کے سنت مؤکدہ قریب بواجب ہونے سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے امداد الاحکام ج۱ ص ۵۳۳، ۵۳۵۔ محمد زبیر حق نواز

استقبالِ قبلہ شرط ہے، استقبالِ قبلہ کی نیت شرط نہیں

(نیت استقبالِ قبلہ کی مختلف صورتوں کا تفصیلی جائزہ اور ان کا حکم)

سوال:- زید استقبالِ خانہ کعبہ کی نیت سے نماز شروع کرتا ہے، آیا اس کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ علامہ شامیؒ نے تذبذب میں ڈال دیا ہے، کیونکہ ان کی مندرجہ ذیل عبارت ج۱ ص ۳۳۲ سے راجح وصحیح جواز معلوم ہوتا ہے:-

اما على القول الراجح من انه لا يشترط نيتها فلا تضره نية غيرها بعد وجود الاستقبال الذى هو الشرط فما ذكره الشارح تبعًا للبحر والخانية صحيح[1]

اور اس کے بعد عبارت نمبر۲ جو شرح منیہ سے نقل فرمائی ہے کہ:-

ان نية القبلة وان لم تشترط لكن عدم نية الاعراض عنها شرط وعليه فهو مفرع على الراجح[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ راجح قول عدم جواز کا ہے، لہٰذا براہ کرم محقق مفتیٰ بہ جواب عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

جواب:- بیشتر فقہاء نے مسئلہ یہی لکھا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے کہ نماز میں استقبالِ قبلہ شرط ہے، لیکن استقبالِ قبلہ کی نیت ضروری نہیں، بغیر نیت استقبال ہو جائے گا، تب بھی نماز درست ہوگی۔ خود شارح منیہ نے بھی یہ مسئلہ ذکر کر کے اسی کو صحیح قرار دیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں -

وقال صاحب الهداية فى التجنيس نية الكعبة ليست بشرط فى الصحيح من الجواب لأن استقبال القبلة شرط فلا يشترط فيه النية كالوضوء انتهى وهذا لأن الشروط يراعى وجودها تبعًا لا وجودها قصدًا لأنها وسائل ليست بمقصودة بالذات (كبرى شرح منية)[3]۔

البتہ آگے چل کر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ استقبالِ قبلہ کی نیت شرط نہیں لیکن عدم نية الاعراض عن القبلة شرط ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اعراض عن القبلة کی نیت کرے گا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ علامہ شامیؒ نے ان کا یہ قول مجمل طریقے سے نقل فرمایا ہے، اس لئے تردد ہوتا ہے، لیکن علامہ ابراہیم حلبیؒ شارح منیہ کی عبارتیں دیکھنے کے بعد ان کے قول کا جو منشا سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ مسئلے کی چند صورتیں ہیں:-

---

(۱، ۲) رد المحتار ج ۱ ص: ۴۲۵ (طبع سعید)
(۳) غنية المتملى ص ۲۰۸ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور)

۱- استقبالِ قبلہ بھی ہو اور اس کی نیت بھی ہو، یہ بالاتفاق درست ہے۔

۲- استقبالِ قبلہ ہو اور نیت کچھ نہ ہو، اس صورت میں راجح قول کی بناء پر نماز درست ہے، كما مر قول شارح المنية عن صاحب الهداية وهو الذي اختاره في تنوير الابصار و الدر المختار۔

۳- استقبالِ قبلہ ہو اور نیت غیر قبلہ کی ہو، اس معنی میں کہ وہ کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی بجائے اور چیز کو قبلہ سمجھ کر اس کا رُخ کرنا چاہتا ہو، یہ وہ صورت ہے جس میں شارح منیہ نے نماز کو فاسد کہا ہے۔

كمن توجه الى الركن اليماني ونوى الصلوة الى بيت المقدس فان نية القبلة وان لم يشترط الا ان عدم نية الاعراض عنها شرط. (کبیری ص ۲۲۳)[1]۔

اس پر قیاس کر کے انہوں نے یہ مسئلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ:-

ان نوى المصلي يعني وقت الشروع ان قبلته محراب مسجده لا يجوز صلوته لانه علامة على جهة القبلة. (بحوالہ مذکورہ)[2]۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ فسادِ صلوٰۃ کی صورت یہ ہے کہ محراب کی طرف اس خیال سے رُخ کرے کہ قبلہ یہی ہے۔ اس پر حضرت مفتی صاحب نے اس صورت کو بھی قیاس فرمایا ہے کہ کوئی شخص بناء علیہ کی نیت کرے تو اس کا بھی حکم یہی ہوتا۔ لیکن مقیس علیہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت ہے جب وہ عرصۂ کعبہ سے صرفِ نظر کر کے محض بناء و جدران کو قبلہ سمجھے، جس کی علامت یہ ہے کہ اس کا خیال یہ ہو کہ اگر یہ پتھر اس مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیئے جائیں تو وہی قبلہ ہوں گے اور انہی کا استقبال کیا جائے گا، تب اس کی نماز فاسد ہوگی، لیکن ظاہر ہے ایسا خیال کرنا بہت بعید ہے۔

۴- چوتھی صورت اس سے خود بخود نکل آئی اور وہ یہ کہ کوئی شخص کسی علامتِ قبلہ چیز کے استقبال کی نیت کرے، نہ اس اعتبار سے کہ وہ قبلہ ہے بلکہ اس لحاظ سے کہ وہ جہت قبلہ کی علامت ہے تو اس صورت میں نماز ہو جائے گی، مثلاً محراب کے استقبال کی نیت کرے، لیکن مقصد یہ نہ ہو کہ محراب قبلہ ہے، بلکہ یہ ہو کہ قبلہ کی علامت ہے۔ تو درحقیقت یہ استقبالِ محراب کی نیت نہیں ہوئی بلکہ اس کو استقبالِ قبلہ کی نیت ہی کہا جائے گا۔ اس لئے نماز جائز ہوگی۔

كما يفيده قوله ان نوى المصلي ان قبلته محراب مسجده ... الخ وقوله

(۱، ۲) غنية المتملي ص ۲۲۳ (طبع سهيل اكيڈمي لاهور)

لأن علامة على جهة القبلة .... الخ۔[1]

اسی طرح اگر کوئی شخص بناءِ کعبہ کی نیت کرے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ قبلہ ہے، بلکہ اس لئے کہ قبلہ کی علامت ہے تو بلاشبہ اس کی نماز درست ہوگی۔ اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ اگر کوئی شخص نماز میں کعبہ کا رخ کرنے کی نیت کرے تو اس کی نماز درست ہوگی، کیونکہ اس نیت کا مفہوم عرفی یہی ہے کہ مقصود استقبالِ قبلہ و کعبہ ہے، اور خانۂ کعبہ عرف میں لفظ کعبہ کے معنی ہوتے ہیں، نیز اگر اس سے بناءِ کعبہ ہی مراد ہو تب بھی اس نے استقبال کی نیت بوجہ علامت ہونے کے کی ہے، نہ کہ بوجہ قبلہ ہونے کے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اگر خانۂ کعبہ کے پتھر وہاں سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیئے جائیں تو یہ مصلی ان کا استقبال نہیں کرے گا، لہٰذا اس کی نماز درست ہے، ہاں اگر کوئی شخص ان پتھروں کو قبلہ سمجھے اور ان کے اپنی جگہ سے ازالے کے بعد انہی کی طرف رخ کرنے کا قائل ہو تو اس کی نماز درست نہیں ہوگی، وهذا لا يتصوّر في مسلم۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۹/۲۲ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

بیٹھ کر نماز پڑھنے کے دوران کھڑے ہوجانا

سوال:- نماز بیٹھ کر پڑھنے کے دوران ایک رکعت کے بعد طاقت محسوس کی تو اب کھڑے ہوجانا درست ہے یا نہیں؟ اور بیٹھے ہوئے پڑھنے میں حرج تو نہیں؟

جواب:- نفلوں میں اس طرح کرنا بہتر ہے، اور اگر فرض مجبور ہوکر بیٹھ کر پڑھ رہا تھا اور طاقت آگئی تو کھڑا ہونا فرض ہے۔[2]

فقط واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۲۷/ ۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد عاشق الٰہی بلند شہری

---

(۱) غنية المتملي ص: ۲۲۳ (طبع سهيل اكيدمي لاهور)

(۲) وفي مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج ص ۲۲۹ ولو افتتحها قاعدا بعذر ثم قدر على القيام بنى قائما عند الشيخين .... الخ

فصل فی الامامة والجماعة
(امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)

امامت کی نیت کا طریقہ

سوال:- اگر کسی کو امام بنا دیا جائے تو اس کو امامت کی نیت کس طرح کرنی چاہئے؟

جواب:- بس یہ نیت کرلیں کہ میں ان تمام لوگوں کی امامت کر رہا ہوں جو میری اقتداء کریں۔ نیت، زبان سے ہونی ضروری نہیں، دل میں یہ ارادہ کرلینا کافی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۲ الف)

امام کے شرعی اوصاف

سوال:- ایک امام جو تمام وقت کی نماز پڑھاتا ہو، اس کے شرعی اوصاف کیا ہونے چاہئیں؟ کیا اس میں جسمانی اعضاء کا بھی لحاظ ہے؟ مثلاً جس شخص کا ہاتھ پیدائشی طور پر مفلوج ہو، یا پیدائشی چھوٹا ہو اور وہ تکبیر کے وقت ہاتھ کانوں تک نہ لے جا سکتا ہو، کیا اس عذر کا شخص نماز پڑھانے کا اہل ہے؟

جواب:- سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ امام، بارگاہ خداوندی میں مسلمانوں کی درخواست پیش کرنے کے لئے ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتا ہے،[۱] اس لئے شریعت کی طرف سے اس کے کچھ مخصوص اوصاف مقرر کئے گئے ہیں، تاکہ یہ نمائندہ مسلمانوں کے شایانِ شان ان کی نمائندگی کر سکے۔ ان اوصاف میں سے بعض تو لازمی ہیں، اور جس شخص میں یہ اوصاف نہ پائے جاتے ہوں اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، اور بعض اوصاف ایسے ہیں کہ ان کے بغیر نماز ہو جاتی ہے، مگر مکروہ رہتی ہے، اور بعض اوصاف صرف مستحسن اور پسندیدہ ہیں، ان کے بغیر نماز میں کوئی کراہت نہیں آتی، مگر بہتر یہ ہے کہ امام اسی شخص کو بنایا جائے جس میں یہ اوصاف بھی موجود ہوں۔

---

(۱) دیکھئے الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۵۵۷ طبع سعید وعالمگیریہ ج:۱ ص:۸۵ طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

لازمی اوصاف جن کے بغیر مقتدیوں کی نماز ہی نہیں ہوسکتی، مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- امام مسلمان ہو، بالغ ہو، دیوانہ نہ ہو، نشے میں نہ ہو۔

۲:- نماز کا طریقہ جانتا ہو۔

۳:- نماز کی تمام شرائط وضو وغیرہ اس نے پوری کر رکھی ہوں۔

۴:- کسی ایسے مرض میں مبتلا نہ ہو، جس کی وجہ سے اس کا وضو قائم نہ رہتا ہو، مثلاً مسلسل نکسیر وغیرہ (ایسے شخص کو فقہاء معذور کہتے ہیں، ایسا شخص اپنے جیسے معذور کی امامت تو کرسکتا ہے، مگر تندرست لوگوں کا امام نہیں بن سکتا)۔

۵:- رکوع اور سجدے پر قادر ہو، اگر کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے وہ رکوع سجدے پر قادر نہ ہو تو تندرست لوگوں کی امامت نہیں کرسکتا۔

۶:- گونگا، توتلا یا ہکلا نہ ہو۔[۱]

اور دوسری قسم کے اوصاف جن کے بغیر نماز مکروہ رہتی ہے، مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- صالح ہو، یعنی کبیرہ گناہوں میں مبتلا نہ ہو۔

۲:- فاسد العقیدہ نہ ہو۔

۳:- نماز کے ضروری مسائل سے واقف ہو۔

۴:- قرآن کریم کی تلاوت صحیح طریقے سے کرسکتا ہو۔

۵:- کسی ایسے جسمانی عیب میں مبتلا نہ ہو جس کی وجہ سے اس کی پاکیزگی مشکوک ہو جائے، یا لوگ اس سے گھن یا اس کا استخفاف کرتے ہوں۔ اسی وجہ سے نابینا، مفلوج، برص وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھنے کو فقہاء نے خلاف اولیٰ قرار دیا ہے، لیکن یہ کراہت اسی وقت ہے جب اس سے بہتر دوسرا امام مل سکتا ہو، اگر اس سے بہتر نہ مل سکے تو کوئی کراہت نہیں ہے۔ (شامی ج ۱ ص ۵۲۳ تا ۵۲۵)[۲]

یہ تمام اوصاف تو قانونی انداز کے تھے، ان کے علاوہ چونکہ امام مسجد اپنے محلے کا دینی مرکز اور ایک طرح سے مربی بھی ہوتا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ مندرجہ ذیل مزید اوصاف اس میں پائے جاتے ہوں:-

حاضرین میں علم دین اور تلاوت قرآن کے اعتبار سے سب سے زیادہ بلند رتبہ ہو۔

خوش اخلاق، شریف النسب، باوقار اور وجیہ ہو۔

---

(۱) یہ تمام اوصاف رد المحتار لابن عابدین الشامیؒ ج ۱ ص ۵۵۷ تا ۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید) میں موجود ہیں۔

(۲) شامی ج ۱ ص ۵۲۰ - ۵۲۲ (طبع ایچ ایم سعید)

صفائی، ستھرائی، تقویٰ اور طہارت کا خیال رکھتا ہو۔

مستغنی طبیعت رکھنے والا اور سیر چشم ہو، اور محلے کی دینی تربیت کے لئے جتنے اوصاف کی ضرورت ہے، وہ اس میں پائے جاتے ہوں۔

محلے کی مسجد میں امام کا انتخاب کرتے وقت ان اوصاف کی رعایت کی جائے تو محلے میں ایک نہایت خوشگوار دینی ماحول پیدا ہوسکتا ہے۔ مذکورہ بالا تشریح کے بعد آپ کے تمام سوالات کا جواب خودبخود واضح ہوجاتا ہے۔ جس شخص کے ہاتھ اتنے چھوٹے ہوں کہ وہ کانوں تک نہ پہنچتے ہوں تو امر اس میں کوئی اور عیب نہیں ہے تو اس کے پیچھے بلاکراہت نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم

۲۵ محرم ۱۳۸۷ھ[1]

جس کا علم زیادہ ہو، اسے امام بنانا افضل ہے

سوال:- ایک مسجد میں دو استاذ بچوں اور بچیوں کو پڑھاتے ہیں، ایک استاذ مقامی ہیں، جو کہ صرف عالم ہی ہیں، دوسرے غیر مقامی ہیں جو کہ عالم، قاری اور حافظ بھی ہیں۔ مقامی استاذ صرف بچیوں کو پڑھاتے ہیں، دُوسرے استاذ بچوں کو سارا دن صبح شام پڑھاتے ہیں، جبکہ نماز پنجگانہ اور جمعہ کی نماز مقامی استاذ پڑھاتے ہیں۔ ان دونوں میں سے نماز اور جمعہ پڑھانے کا کون زیادہ مستحق ہے؟ اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ کوئی اختلاف ہے۔

جواب:- ان دونوں میں سے جن کا علم زیادہ ہو، خاص طور سے نماز کے مسائل سے جو صاحب زیادہ واقف ہوں اور جن سے علم و تقویٰ پر لوگ زیادہ اعتماد کرتے ہوں، ان کو امام بنانا زیادہ بہتر ہے،[2] ویسے جائز دونوں کی امامت ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۵/۶/۱۳۹۸ھ

(فتویٰ نمبر ۹ / ۲۹ ب)

شرعی مسئلے کو نہ ماننے والے کی امامت کا حکم

سوال:- زید کسی جامع مسجد میں امام ہے، اس میں مندرجہ ذیل عیوب موجود ہیں:

۱- جملہ مقتدی اس سے ناراض ہیں، ناراضگی دُنیوی کاموں پر ہے، سوائے متولّی کے جو کہ اس

(۱) یہ فتویٰ "البلاغ" کے شمارہ صفر ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

(۲) وفي الدر المختار (باب الإمامة ج ١ ص ٥٥٧): والأحق بالإمامة تقديماً بل نصباً الأعلم بأحكام الصلاة فقط صحة وفساداً بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة ... ثم الأورع ... الخ. وفي الهندية (الباب الخامس في الإمامة الفصل الثاني ج ١ ص ٨٣): الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلوة هكذا في المضمرات وهو الظاهر هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة ولم يطعن في دينه

سے مجبور ہے، اس ناراضگی کی وجہ سے محلے کے لوگوں نے اسے لکڑی بھی ماری، پھر بھی وہ پیش امام ہے۔

۲:- مقتدیوں پر بہتان اور ان کے عیوب کو افشاء کرنا اس پیش امام کی عادت ہے۔

۳- غرور سے اتنا بھرا ہوا ہے کہ اگر نماز میں کوئی غلطی واقع ہو، خود نہیں جانتا، اور اگر مقتدی کسی صاحبِ علم سے مسئلہ تحقیق کر کے بتائیں تو ان کی باتوں کو نہیں مانتا، اور غلط کہتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایسا امام امامت کا حق دار ہے یا اس کو مسجد سے نکال دیں؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات درست ہیں، یعنی امام خود عالم نہیں ہے اور علماء کے بتائے ہوئے مسئلے کو مانتا نہیں اور مسلمانوں پر بہتان لگاتا ہے تو اسے مقتدیوں کی امامت سے الگ ہو جانا چاہئے، کیونکہ حدیث میں ایسے شخص کی امامت پر اصرار کرنے پر وعید آئی ہے۔[۱] اگر وہ خود مستعفی نہ ہو تو متولیٔ مسجد کو بھی اختیار ہے کہ وہ اسے معزول کر دے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۷۰ ج)

بدکردار شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ۱- ایک شخص جو کچھ خفیہ اور اندرونی کوششوں کے ذریعے سے محکمہ اوقاف کو چل دے کر ایک جامع مسجد میں خطیب اور امام کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۲- اس شخص کو جس نے خود کو مصنوعی طور پر عالم اور قاری مشہور کر رکھا ہے، مسجد میں امام و پیش ایک سال کا عرصہ امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے ہوئے گزر چکا ہے۔ اس طویل عرصے میں متعدد نمازیوں کو اس شخص کے علم و فضل، رفتار و گفتار اور کردار و اخلاق کے بارے میں قابلِ اعتراض شہادتیں فراہم ہو چکی ہیں، بلکہ ایک کثیر تعداد نمازیوں کی اس شخص کی وجہ سے مسجد کو چھوڑنے پر مجبور ہوئی اور دور دراز جا کر فریضۂ نماز ادا کرنے کی زحمت اٹھا رہی ہے۔ ۳- یہ شخص تلاوتِ قرآن مجید کے دوران فاسد قسم کی غلطیاں کرتا ہے اور ارکانِ نماز پوری طرح ادا نہیں کرتا اور لوگوں کو غلط مسائل اور فتوے دیتا ہے۔ ۴- اس شخص کے کردار کے بارے میں بھی بہت سے سنجیدہ لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات موجود ہیں، اور بعض باتیں ایسی کہی جاتی ہیں کہ اگر ان کی تحقیق کر لی جائے تو اس شخص کا بدکردار ہونا ثابت ہو سکتا ہے۔ ۵- یہ شخص مفتی اور مفسر بھی ہے، اس نے مسجد کے مسلمانوں کی جماعت میں شدید

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص ۵۵۹ (طبع سعید) (ولو أمّ قوما وهم له كارهون ان) الكراهة لفساد فيه أو لأنهم أحق بالامامة منه كره له ذلك تحريماً لحديث أبي داؤد "لا يقبل الله صلاة من تقدم قوما وهم له كارهون" وفيه ايضاً ج:۱ ص ۵۵۷ والأحق بالامامة تقديماً بل نصباً مجمع الأنهر (الاعلم بأحكام الصلاة فقط صحة وفساداً بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة) وفي البحر الرائق ج ۱ ص ۳۴۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئته) واما الكراهة فمبنية على قلة رغبة الناس في الاقتداء بهؤلاء فيؤدي الى تقليل الجماعة المطلوب تكثيرها تكثيراً للأجر

قسم کا انتشار برپا کر دیتا ہے اور غلط باتوں کے ذریعہ آپس میں لڑا دیتا ہے۔ ۶- یہ شخص محمد [illegible] کے فرزند سے خفیہ ربط و تعلق رکھتا ہے اور ناجائز اثرات استعمال کر کے مسجد مذکورہ کے ایک مؤذن کو جو حافظ و عالم تھے، مختلف قسم کے غلط الزامات لگا کر اور سازش و شرارت کر کے علیحدہ کروا چکا ہے۔

۷- اب صورت حال یہ ہے کہ اس مسجد کے نمازی سخت تکلیف اور اذیت میں مبتلا ہیں، اور اس شخص سے خلاصی پانے کے لئے انہوں نے کچھ تحقیقات کی ہیں اور جن جن مساجد میں اس نے ملازمت کی ہے، وہاں جا کر دریافت حال کیا تو معلوم ہوا کہ یہ شخص شدید قسم کا بدکردار، اوباش، مفسد، بددیانت اور بے علم ہے، اور وہاں سے شدید نفرت کے ساتھ نکالا جا چکا ہے، اور یہ ایک مسجد سے دوسری مسجد بھاگتا ہے، اور وہاں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اس کے لئے کلمۂ خیر کہہ سکتا ہو، مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ غیر شادی شدہ ہے اور اپنے ساتھ ایک دوست کو رکھتا ہے جس سے لوگوں میں بدگمانی ہو رہی ہے، مندرجہ بالا واقعات پیش کر کے آپ سے دریافت کرنا ہے کہ یہ شخص قابل امامت ہے یا نہیں؟

جواب- امام کسی ایسے شخص کو بنانا چاہئے جو صحیح العقیدہ، متقی، پرہیزگار اور ضروری دینی مسائل سے کما حقہ باخبر ہو، نیز قراءت صحیح کرتا ہو، اور کم از کم نماز کے مسائل سے پوری طرح باخبر ہو۔(۱) سوال میں جو باتیں لکھی گئی ہیں اگر وہ درست ہیں تو ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے،(۲) اسے معزول کر کے کسی ایسے شخص کو امام بنانا چاہئے جس میں مذکورہ شرائط پائی جاتی ہوں، البتہ جب تک کسی دوسرے امام کا انتظام نہ ہو اس وقت تک اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور جو نمازیں اس طرح پڑھی جائیں گی وہ ادا ہو جائیں گی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۱/۱/۱۳۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۳۵/۲۷ و)

کسی ناجائز فعل سے منع کرنے پر امامت سے معزول کرنا

سوال- عرض یہ ہے کہ [illegible] امام مسجد [illegible] جدی طور سے پشت در پشت ۲۱۵ سال سے مسجد مذکور میں امامت چلی آرہی ہے، اور اب مسئلہ امامت [illegible]

---

(۱) وفي الدر المختار ج ۱ ص ۵۵۷ [illegible] والأحق بالإمامة [illegible] الأعلم بأحكام الصلاة فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة [illegible] ثم الأحسن تلاوة وتجويدا للقراءة [illegible] لأن الناس لا يرغبون في الاقتداء به وفي البحر الرائق ج ۱ ص ۳۴۸ وأما الكراهة فمبنية على قلة رغبة الناس في الاقتداء بهؤلاء فيؤدي إلى تقليل الجماعة المطلوب تكثيرها تكثيرا للأجر.

(۲) وفي الدر المختار ج ۱ ص ۵۵۹ [illegible] كره) له ذلك تحريما. وفيه أيضا ج ۱ ص ۵۵۹ و ۵۶۰ ويكره امامة عبد [illegible] وفاسق [illegible] الخ

کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔

سائل مستند عالمِ دین فارغ التحصیل از مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی ہے۔ مورخہ ۲۲/۹/۱۹۸۳ء کو دیہہ مذکورہ کے زرین وغیرہ مسجد شریف کا جنریٹر (بجلی) بدون اجازت سینہ زوری سے اپنے مال و دولت کے نشے میں اپنے عبدالستار کی شادی میں لے گئے تھے۔ ان کے اس فعل مجرمانہ پر میں نے بحیثیت امام کے ان کو آگاہ کیا، اور خدا کا خوف دلایا، کیونکہ جنریٹر بجلی مسجد شریف کی ملکیت کا استعمال ان لوگوں نے ناچ گانے والی عورتوں کے تماشے پر صرف کیا۔ ان ملزموں کو ان کے اس فعل سے باز رکھنے کے لئے جب میں نے وعظ ونصیحت کی تو الٹا انہوں نے میرے گھر پر پتھراؤ کیا، گالی گلوچ کی اور مجھ پر حملہ آور ہوئے، اور مجھے امامت سے برطرف کردیا۔ ملزموں نے مجھے امامت سے اس لئے برطرف کیا ہے کہ میں نے انہیں مضمون جاری کیا اور یہ کہ میں نے انہیں مسجد شریف کی ملکیت جنریٹر ناچ گانوں میں استعمال کرنے سے کیوں منع کیا، اور اس منع کرنے پر ان کی توہین ہوئی، لہٰذا اس کی سزا یہ ہے کہ مسجد شریف کی امامت سے مجھے برطرف کردیا گیا۔ لہٰذا آپ بحیثیت مفتی وشرعی جج ہونے کے فیصلہ صادر فرمادیں کہ سائل یہاں امامت وخطابت کا اہل وحق دار ہے یا نہیں؟

۱:- سائل بفضلہ تعالیٰ مستند عالم ہے۔

۲ باشرع ہے، صاحب اولاد ہے، چھ بچوں کا باپ ہے، کسی قسم کا کوئی عیب شرعی نہیں ہے۔

جواب:- اگر واقعات مندرجہ سوال درست ہیں اور سائل میں کوئی شرعی نقص نہیں ہے تو ان کے پیچھے نماز بلاشبہ ہوجاتی ہے، اور ایک بری بات سے منع کرنے کی بناء پر ان کو معزول کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ جہاں تک معزولی کے شرعاً معتبر ہونے کا تعلق ہے وہ یہ جاننے پر موقوف ہے کہ شرائطِ ملازمت کیا تھیں؟

واللہ اعلم

۵/۸/۱۴۰۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۴ /۰۳۸)

جس امام سے مقتدی راضی نہ ہوں، اس کی امامت کا حکم

سوال:- ایک صاحب گزشتہ پندرہ سال سے ایک مسجد میں امامت کراتے ہیں، مگر کسی قابلیت کے مالک نہیں، جمعہ کی تقریر کے لئے دوسرے مولانا صاحب آتے ہیں جو مستند عالم ہیں۔ قراءۃ بھی تجوید کے مطابق ہے، لیکن یہ فقط تقریر کرتے ہیں اور نمازِ جمعہ پیش امام مسجد پڑھاتے ہیں، جبکہ لوگوں کی خواہش ہے کہ مقرر ہی نمازِ جمعہ پڑھائیں، لیکن مذکورہ امام اس وجہ سے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ کہیں خطیب صاحب قابض نہ ہوجائیں، جبکہ خطیب صاحب اس کا اقرار کرتے ہیں کہ میرا

مقصدان کی جگہ پر قبضہ کرنا نہیں۔ کئی لوگ مذکورہ امام کے پیچھے کئی وجوہ سے نماز نہیں پڑھتے:-

۱:- امام صاحب قرآن وحدیث کا علم نہیں رکھتے۔ ۲:- قراءۃِ قرآن مجہول ہے۔ ۳:- خطبہ بھی غلط پڑھتے ہیں۔ ۴:- ذرا سی بات بھی خلافِ طبع ہو جائے تو فحش گالیاں دیتے ہیں۔ ۵:- لوگ ان کے طرزِ عمل پر انہیں غور کرنے کو کہتے ہیں تو وہ لوگوں کو نماز پڑھنے سے منع فرما دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی اقتداء صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جبکہ مقتدی ان امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھنے سے خوش نہیں ہیں اور ان سے زیادہ علم رکھنے والا امام موجود ہے تو ان امام صاحب کا اپنی امامت پر اصرار کرنا مکروہ تحریمی ہے، لیکن جو لوگ مذکورہ وجوہات کی بناء پر ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے بجائے گھر میں اکیلے نماز پڑھتے ہوں وہ بھی غلطی پر ہیں، انہیں چاہئے کہ ان کی جگہ افضل امام کو مقرر کرنے کی کوشش فتنہ برپا کئے بغیر جاری رکھیں اور جب تک دوسرے امام کا انتظام نہ ہو اس وقت تک انہی امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں، کیونکہ ان کے پیچھے نماز بہرحال ہو جائے گی، اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا اکیلے پڑھنے سے بہتر ہے۔

فی الدر المختار: ولو ام قوما وهم له كارهون ان الكراهة لفساد فيه او لانهم أحق بالامامة منه كره له ذلك تحريمًا (ج:۱ ص:۳۷۶)۔[1]

وفی رد المحتار تحت قوله: "صلى خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعة" أفاد ان الصلاة خلفهما اولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع لحديث من صلى خلف عالم تقي فكانما صلى خلف نبي۔ (شامی ج:۱ ص:۳۷۷)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۷۶۹/۲۷ و)

علمائے دیوبند کے عقائد سے جزوی اختلاف رکھنے والے ایک امام کی امامت سے متعلق تفصیلی فتویٰ

(ژوب بلوچستان سے بعض حضرات نے اپنے ایک مقامی امام کے عقائد اور نماز میں اس کی اقتداء سے متعلق تنازعے کے تصفیے کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے پاس آئے تھے، حضرت والا دامت برکاتہم نے فریقین کو ایک متفقہ استفتاء مرتب کرنے کی ہدایت فرمائی جس کا حضرت والا

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹ (طبع ایچ ایم سعید) وفی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸ ومن یکرہ فسببه علی قلة رغبة الناس فی الاقتداء بهؤلاء فيؤدي الى تقليل الجماعة المطلوب تكثيرها تكثيرا للأجر

(۲) فتاوی شامیة ج:۱ ص:۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید)

دامت برکاتہم نے تفصیلی جواب تحریر فرمایا، اور اس سے پہلے ریکارڈ میں وضاحت اور یادداشت کے لئے ایک تحریر بھی مرتب فرمائی، ریکارڈ سے یہ وضاحتی تحریر، اس کے بعد فریقین کا متفقہ استفتاء اور حضرت والا دامت برکاتہم کی جانب سے اس کا جواب درج ذیل ہے۔ حضرت والا دامت برکاتہم کے اس جواب پر بعض حضرات کی طرف سے دوبارہ استفتاء کیا گیا وہ استفتاء اور اس کا جواب بھی آخر میں درج ہے۔) (محمد زبیر عفی عنہ)

حضرتِ والا دامت برکاتہم کی وضاحتی تحریر

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ۔ عرض گزار ہے کہ علاقہ ژوب بلوچستان کے دو فریق احقر کے پاس اپنے ایک تنازعے کے سلسلے میں تحکیم کے لئے تشریف لائے۔ ان میں سے ایک فریق مولانا محمد شیرانی صاحب اپنے چند رفقاء کے ہمراہ پہلے تشریف لائے، پھر دوسرے فریق یعنی مولانا صبغت اللہ صاحب اپنے چند رفقاء کے ہمراہ اگلے روز تشریف لائے۔ دونوں نے احقر سے الگ بھی باتیں کیں اور اجتماعی طور پر بھی، دونوں کی خواہش یہ تھی کہ احقر ان کے درمیان حکم بن کر ان کے تنازعے کا فیصلہ کرے، لیکن چونکہ احقر کے لئے واقعات کی چھان بین اور تفتیش ممکن نہیں تھی، اس لئے احقر نے تحکیم سے معذوری ظاہر کی، اور یہ عرض کیا کہ اگر دونوں فریق کوئی متفقہ استفتاء مرتب فرمالیں تو احقر اس کا جواب لکھ کر دیدے گا۔

تنازعہ اس بات پر تھا کہ مولانا صبغت اللہ صاحب اپنے عقائد و نظریات کے لحاظ سے مستحق امامت ہیں یا نہیں؟ اس لئے احقر نے تجویز پیش کی کہ ان کے متنازعہ عقائد لکھ کر متفقہ طور پر استفتاء کرلیا جائے، اس پر مولانا شیرانی صاحب کو اعتراض یہ تھا کہ اس وقت مولانا صبغت اللہ صاحب جو عقائد و نظریات لکھ کر دیں گے وہ ان کے حقیقی عقائد و نظریات سے بہت کم اور اخف ہوں گے جو وہ حلقے میں بیان کرتے رہتے ہیں، اس لئے استفتاء سے صحیح صورت حال واضح نہیں ہوگی۔ لیکن بالآخر انہوں نے اس شرط پر متفقہ استفتاء مرتب کرنے کو قبول کرلیا کہ وہ کم سے کم امور جن کا انہوں نے اعتراف کیا ہو، اس استفتاء میں درج کئے جائیں گے، اور دوسرے امور چونکہ متفقہ استفتاء میں درج نہیں ہوسکتے، اس لئے یہاں ان کو درج نہیں کیا جارہا، ان کے بارے میں ہم اپنا حق استفتاء الگ محفوظ رکھیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد متفقہ استفتاء مرتب کیا گیا اور اس پر دونوں فریقوں نے دستخط کردیئے۔ یہ استفتاء اور اس پر احقر کا جواب اس تحریر کے ساتھ منسلک ہے۔

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۲/۸/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۱۰۳)

فریقین کی طرف سے پیش کیا گیا استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک صاحب کے عقائد کے بارے میں یہ تنازعہ ہے کہ ان کے عقائد جمہور اہل سنت والجماعت بالخصوص مسلک علمائے دیوبند کے مطابق ہیں یا نہیں؟ نیز ان کے عقائد کے پیش نظر انہیں امام بنانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اور جو نمازیں ان کے پیچھے ادا کی گئیں ان کا کیا حکم ہے؟ چنانچہ ان صاحب سے ان کے عقائد کے سلسلے میں کچھ سوالات کئے گئے جن کا جواب انہوں نے تحریری شکل میں دیا ہے۔

آپ ان جوابات(۱) کا بغور مطالعہ فرما کر یہ تحریر فرمائیں کہ مسلک علمائے دیوبند کے مطابق یہ جوابات کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ اور مذکورہ صاحب کی امامت کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ استفتاء کے ساتھ سات ورق میں منسلک ہیں۔

جواب:- استفتاء کے ساتھ منسلک مولانا صبغت اللہ صاحب کے لکھے ہوئے چودہ سوالات کے جوابات(۲) کا احقر نے بغور مطالعہ کیا، اور بعض اُمور میں مولانا موصوف سے زبانی وضاحتیں بھی طلب کیں، ان میں سے بعض اُمور میں بعض جوابات واضح طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق ہیں، مثلاً اوقاتِ مکروہہ ومنہیہ میں تحیۃ المسجد کا ممنوع ہونا، یا سوال نمبر۶ کے جواب میں ذکر کئے وقت فی الجملہ رفع یدین کو موافق سنت کہنا، لیکن بعض جوابات مجمل ہیں، مثلاً شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور علامہ ابن تیمیہ کے بارے میں انہوں نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ جن مسائل میں علمائے دیوبند کو ان حضرات سے اختلاف ہے ان مسائل میں مولانا موصوف کا موقف کیا ہے؟ نیز سوال نمبر۴ کے جواب میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ تین دن کے بعد میت کے گھر جاکر تعزیت کرنے کو مولانا موصوف علی الاطلاق بدعت وناجائز کہتے ہیں یا اس کی کسی خاص ہیئت کو؟

لیکن مولانا موصوف کے جوابات میں چار اُمور ایسے ہیں جو صراحۃً علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہیں، اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- مولانا نے حدیث مبارک "لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد" کی اس تشریح کی طرف اپنا رُجحان ظاہر کیا ہے جو علامہ ابن تیمیہ سے منقول ہے، چنانچہ وہ زیارتِ قبور کے لئے سفر کو حدیث مذکور کی نہی میں شامل سمجھتے ہیں یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی

---

(۲) امام صاحب کی طرف سے اپنے عقائد سے متعلق دیئے گئے ان وضاحتی جوابات کی تحریر ریکارڈ میں موجود نہیں ہے، تاہم آگے حضرت والا دامت برکاتہم کی طرف سے دیئے گئے فتوی میں چونکہ ان کے عقائد کا جائزہ لیا گیا ہے جن سے امام صاحب کے عقائد بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

زیارت کی نیت سے سفر کرنے کو بھی درست نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے نزدیک سفر کا مقصد مسجد نبوی کی زیارت ہونا چاہئے، اور ضمناً روضۂ اقدس کی زیارت بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ انہوں نے احقر سے زبانی یہ بیان کیا کہ اب تک مجھے چونکہ کوئی نقلی دلیل زیارت روضۂ اقدس کے استحباب کی نہیں ملی، اس لئے میرا عمل یہ ہے کہ میں نے مسجد نبوی کے قصد سے مدینہ طیبہ کا سفر کیا اور وہاں پہنچ کر روضۂ اقدس کی زیارت بھی ہوگئی، اور آئندہ بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔

مولانا کا یہ نظریہ علمائے دیوبند کے مسلک کے صریحاً مخالف ہے، اس بارے میں بہت سی تحریریں موجود ہیں، لیکن خاص طور سے "المهند علی المفند" جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہٗ کی مرتب فرمودہ کتاب ہے، اور جس پر اس وقت کے تمام اکابر علمائے دیوبند کے دستخط ہیں، اس کی عبارت یہ ہے کہ:

''ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک زیارت قبر سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجے کی قربت اور نہایت ثواب اور سبب حصول نصیب ہے، اور سفر کے وقت آپ کی زیارت کی نیت کرے اور ساتھ میں مسجد نبوی اور دیگر مقامات و زیارت گاہ ہائے متبرکہ کی بھی نیت کرے، پھر جب وہاں حاضر ہوگا تو مسجد نبوی کی بھی زیارت ہو جائے گی.....

رہا وہابیہ کا یہ کہنا کہ مدینہ منورہ کی جانب سفر کرنے والے کو صرف مسجد نبوی کی نیت کرنی چاہئے اور اس قول پر حدیث کو دلیل لانا کہ کجاوے نہ کسے جاویں مگر تین مسجدوں کی جانب، سو یہ قول مردود ہے.....الخ'' (عقائد علمائے دیوبند ص:۶۰)

۲- اسی طرح مولانا نے اپنے جواب میں تعویذ کی ہر قسم کو کم از کم مکروہ بتایا ہے۔ جہاں تک ایسے تعویذات کا تعلق ہے جن میں استمداد بغیر اللہ ہو یا جو غیر معلوم المعنی ہوں تو ان کے حرام ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں، لیکن جن نقوش اور ہندسوں کے معنی معلوم ہوں انہیں حرام کہنا، یا آیت قرآنی اور اسمائے حسنیٰ کے ذریعے تعویذ کو مکروہ قرار دینا علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہے، جس کی تصریحات علمائے دیوبند کے فتاویٰ میں موجود ہیں، مثلاً ملاحظہ ہو فتاویٰ رشیدیہ صفحہ ۲۱۸، وعزیز الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۵۲۔ تمام علمائے دیوبند کا عمل بھی اس پر رہا ہے اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ایک مستقل کتاب ''اعمال قرآنی'' اسی مقصد کے تحت تالیف ہوئی ہے، لہٰذا اس عمل کو مکروہ کہنا مسلکِ علمائے دیوبند کے بالکل خلاف ہے۔(۱)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: [illegible] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۹۲، مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص ۳۸۹ طبع قدیمی کتب خانہ، شامیہ ج ۶ ص ۳۶۳ طبع ایچ ایم سعید، وتکملۃ فتح الملہم ج ۴ ص [illegible]

۳- فرض نمازوں کے بعد بہ ہیئت اجتماعی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا استحباب کتب فقہ میں مصرح ہے، اور اگر اسے مستحب سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے تو علماء دیوبند کے مسلک کے مطابق درست ہے، لیکن مولانا نے اپنے جواب نمبر ۱ میں جس شدت اور عموم کے ساتھ اس پر نکیر کی ہے اور اسے بدعت اور واجب الترک بتایا ہے، وہ علماء دیوبند کے مسلک کے خلاف ہے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا ایک پورا رسالہ اسی موضوع پر ہے، اس میں وہ حدیث و فقہ کے مفصل دلائل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

"یہ روایات فقہیہ ہیں جن سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ فرض نماز کے بعد امام اور مقتدی سب مل کر دعا مانگیں اور دعا سے فارغ ہو کر ہاتھ منہ پر پھیریں۔"[1] (کفایت المفتی ج:۳ ص:۲۹۷)

اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اعلاء السنن میں اس مسئلے پر تین صفحات میں بحث کی ہے، اور آخر میں لکھا ہے: فثبت أن الدعاء مستحب بعد كل صلاة مكتوبة متصلا بها برفع اليدين كما هو شائع في ديارنا وديار المسلمين قاطبة۔ (اعلاء السنن ج ۳ ص ۲۱۲،۲۱۱)[2]۔ اسی طرح حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے معارف السنن میں اس مسئلے پر مفصل بحث کرنے کے بعد لکھا ہے: فهذه وما شاكلها من الروايات في الباب تكاد تكفي حجة لما اعتاده الناس في البلاد من الدعوات الاجتماعية دبر الصلوات، ولذا ذكره فقهاؤنا أيضا كما في نور الإيضاح۔ (معارف السنن ج ۳ ص ۴۲۳، باب ما يقول إذا سلم)۔ اور العرف الشذی کی نقل اس کے مقابلے میں موثوق نہیں ہے، بہرصورت علماء دیوبند کے مسلک میں فرض کے بعد دعا مع رفع الیدین مستحب ہے، بدعت نہیں ہے۔

۴- مولانا نے نماز کی نیت کے تلفظ کو بھی بدعت قرار دیا ہے، حالانکہ اگر استحضار نیت کے خیال سے اس کو سنتِ نبوی یا واجب سمجھے بغیر تلفظ نیت کیا جائے تو وہ علماء دیوبند کے نزدیک بدعت نہیں ہے۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں: وأباحه بعض لما فيه من تحقيق عمل القلب وقطع الوسوسة، وما روي عن عمر أنه أدب من فعله فهو محمول على أنه إنما زجر من جهر به (فأما المخافتة به) فلا بأس بها، فمن قال من مشايخنا إن التلفظ بالنية سنة لم يرد بها سنة النبي صلى الله عليه وسلم بل سنة المشايخ لاختلاف الزمان وكثرة الشواغل على

---

(۱) کفایت المفتی ج:۳ ص ۳۴۵، ۳۴۶ (جدید ایڈیشن ۲۰۰۱ء، دارالاشاعت)

(۲) اعلاء السنن باب الانحراف بعد السلام وكيفيته وسنة الدعاء والذكر بعد الصلوة ج ۳ ص ۲۰۴ طبع ادارۃ القرآن کراچی)

القلوب .... الخ۔ (اعلاء السنن ج:۳ ص:۱۳۴)۔[1]

بہرکیف! مذکورہ چار مسائل میں مولانا صبغت اللہ صاحب نے اپنا جو موقف بیان فرمایا ہے وہ علمائے دیوبند کے موقف سے مختلف ہے، اور مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا موصوف، علمائے دیوبند کے مسلک کے کلی طور پر پابند نہیں ہیں بلکہ بعض مسائل میں ان کی اپنی تحقیقات ہیں جو زیادہ تر علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کی تحقیقات پر مبنی ہیں۔ لہٰذا جس مقام پر مقتدی حضرات علمائے دیوبند سے وابستہ ہوں وہاں ایسے شخص کو امام مقرر کرنا چاہئے جو کلی طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کا قائل ہو، اور اگر وہاں کوئی ایسا شخص امامت کے لئے موجود ہو تو ایسے مقام پر مولانا موصوف مستحق امامت نہیں، تاہم جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئی ہیں وہ ادا ہوگئیں، ھذا ما عندی!

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۰/۸/۱۶ھ

(فتوی نمبر ۱۳۹۱/۳۱ د)

مذکورہ جواب کے چند اُمور کی مزید وضاحت کے لئے

دُوسرا استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- حضرت علامہ محمد تقی عثمانی صاحب

السلام علیکم! گزارش کی جاتی ہے کہ جناب والا نے جو حکم دربارہ فیصلہ بین الفریقین یعنی مولوی محمد خان و رفقاؤہ و صبغت اللہ و رفقاؤہ دیا تھا، اس میں آپ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ”جہاں پر مقتدی حضرات علمائے دیوبند سے وابستہ ہوں وہاں ایسے شخص کو مقرر کرنا چاہئے جو کلی طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کا قائل ہو، اور وہاں کوئی ایسا شخص امامت کے لئے موجود ہو تو ایسے مقام پر مولانا موصوف مستحق امامت نہیں ہیں۔“

اس میں سخت اجمال ہے، کیونکہ اس کا یہ مطلب بھی لیا جاسکتا ہے کہ کس وجہ سے مستحق نہیں کہ دائرۂ اسلام میں نہیں، اور یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ اہل سنت والجماعت سے خارج ہے۔ پھر سوال پیدا ہوگا کہ ان مذکورہ فی الفتوی چار مسائل کا قائل کیا اہل سنت والجماعت میں نہیں رہتا؟

اور یہ امکان بھی رکھتا ہے کہ ان مسائل والا متبع مذہب حنفی نہیں سمجھا جاتا تو پھر یہ شبہ پیدا ہوگا

---

(۱) اعلاء السنن ج ۲ ص ۱۳۹ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) اس مسئلے سے متعلق مزید تفصیل کے لئے دیکھئے الدر المختار مع رد المحتار ج ۱ ص ۵۱۵ (طبع ایچ ایم سعید) اور فتاوی عالمگیریہ ج ۱ ص ۸۵ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) اور فتاوی دار العلوم دیوبند ج ۳ ص ۱۶۷۔

کہ کیا مذاہب اربعہ جو سب اہل سنت والجماعت ہیں ان کی ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں صحیح نہیں، فاسد ہیں؟ حالانکہ یہ کہنا کتنے خراب نتائج پیدا کرے گا، بہرحال یہ اجمال محتاج ازالہ ہے۔ وضاحت کرکے مطمئن فرمایا جائے، کیونکہ جب موصوف مستحق امامت نہیں ہے تو پھر کوئی بھی کہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہ جانے گا بلکہ نہ اس سے تعلیم حاصل کرے گا، نہ اس کے وعظ و نصیحت کو کوئی سننے کو تیار ہوگا۔ حاصل یہ کہ اس پر اور اس کے ہم خیال لوگوں پر دین کی خدمت کے تمام راستے بند ہوجائیں گے اور اس کی ساری زندگی اُلجھن میں رہے گی، خویش واقارب واغیار ہمیشہ اس کو شک و شتباہ کی نظروں سے دیکھیں گے۔ اگر وہ واقعی اس کا از روئے دلیل مستحق ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ اس کا عذر خدا کے نزدیک بن جائے گا اور مخالفین کے ساتھ خدا کا حساب کیسے ہوگا۔ براہِ مہربانی اصل حقیقت سے واضح الفاظ میں آگاہ فرمادیں، خداتعالیٰ جزائے خیر دیں۔

جواب:- جس استفتاء اور اس کے جواب کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس میں مولانا صبغت اللہ صاحب کو اس محلے میں غیر مستحق امامت قرار دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ معاذ اللہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں یا ان کے پیچھے نماز فاسد ہوتی ہے، بلکہ اس کی بنیاد اس بات پر تھی کہ ان کو اپنی بعض ایسی تحقیقات پر اصرار ہے جو علمائے دیوبند کے عام مسلک سے مختلف ہیں، اس لئے جہاں علمائے دیوبند سے وابستہ حضرات آباد ہوں، وہاں ان کی امامت موجب فتنہ بن سکتی ہے۔ اسی طرح جن چار نظریات کی بناء پر مذکورہ فتویٰ دیا گیا تھا وہ نظریات علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہیں، لیکن محض ان چار نظریات کی وجہ سے نہ کوئی شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہوسکتا ہے اور نہ اسے اہل سنت و جماعت سے خارج کیا جاسکتا ہے، اور نہ اس کے پیچھے نماز فاسد ہوتی ہے۔ چنانچہ مذکورہ فتویٰ ہی میں یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئی ہیں وہ ادا ہوگئیں۔ البتہ اس فتویٰ کا حاصل صرف یہ ہے کہ جہاں ایسا امام دستیاب ہو جو کلی طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق ہو، وہاں ایسے متفرد نظریات کا حامل مستحقِ امامت نہیں۔ لہٰذا اس فتویٰ کی بنیاد پر مولانا موصوف کو دائرۂ اسلام سے یا اہل سنت و جماعت سے خارج سمجھ کر ان سے کافروں یا غیر اہل سنت جیسا برتاؤ کرنا ہرگز درست نہیں ہوگا۔ آخر میں عرض ہے کہ خدارا ہر فریق اپنی آخرت کی فکر کرے، ایک دوسرے پر طعن و تشدد سے گریز کرے اور مسلمانوں کو ہر قیمت پر فتنے سے بچائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۲۱رشعبان سنہ ۱۴۰۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۳۶/ ۳۱ د)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر ناظر ماننے والے کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- اپنے محلہ کی مسجد میں عرصہ دو مہینے سے مسجد کمیٹی نے ایک پمفلٹ دیا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر ناظر ہونے کا بیان ہے۔ ایسے امام کے پیچھے جس کا یہ عقیدہ ہو، نماز جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نبی یا ولی کے لئے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو ایسے شخص کو امام بنانا درست نہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۶۲/۲۷ ء)

داڑھی منڈانے والے کو امام بنانا

سوال:- جو شخص داڑھی منڈاتا یا کترتا ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور تراویح میں ایسے شخص کو امام بنایا جاسکتا ہے؟

جواب:- ایسے شخص کو باختیار خود امام بنانا جائز نہیں[1]، اور صالح و متدین امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی کوشش ضروری ہے، تاہم اس کی اقتداء نہ کرنے کی صورت میں جماعت بالکل فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا انفراداً نماز پڑھنے سے بہتر ہے[2]۔ اور تراویح میں بھی ایسے شخص کو امام بنانا جائز نہیں، اگر اور کوئی مہیا نہ ہو تو "الم تر کیف" سے پڑھ لینا بہتر ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۶/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۹۷۵/۳۰ ج)

داڑھی مونڈنے والے کو امام بنانے کا حکم

سوال:- اگر بالغ شخص جو داڑھی، مونچھ مونڈتا ہے، کیا وہ امامت کرسکتا ہے؟

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج ۱ ص ۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامۃ عبد ... وفاسق. وفی رد المحتار قولہ وفاسق من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر ... وفی المعراج قال اصحابنا لا ینبغی ان یقتدی بالفاسق ... الخ وفیہ ایضا واما الفاسق فقد عللوا کراھۃ تقدیمہ بانہ لا یھتم لامر دینہ وبان فی تقدیمہ للامامۃ تعظیمہ وقد وجب علیھم اھانتہ شرعا. وکذا فی مراقی الفلاح ص ۱۶۵ وفی البحر الرائق ج ۱ ص ۳۴۹. وفی الدر المختار ج ۲ ص ۴۱۸ واما الاخذ منھا وھی دون ذلک کما فعلہ بعض المغاربۃ ومخنثۃ الرجال فلم یبحہ احد واخذ کلھا فعل یھود الھنود ومجوس الاعاجم. وفیہ ایضا ج ۱ ص ۵۶۲ صلی خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعۃ. وقال الشامی تحتہ (قولہ نال فضل الجماعۃ) افاد ان الصلوٰۃ خلفھما اولیٰ من الانفراد لکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع. وکذا فی کتاب الفقہ ج ۳ ص ۹۰ و ۹۹ طبع دار الاشاعت وفتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۳ ص ۲۲۶ و ۲۴۰

جواب:- داڑھی مونڈنا موجبِ فسق ہے، اور ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے،[1] تاہم جو نماز اس کے پیچھے پڑھ لی گئی وہ ہوگئی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۷/ ۲۸ ب)

ایک مشت سے کم داڑھی والے کی امامت کا حکم

سوال:- ہمارا امام کچھ جدّت پسند ہے، ویسے تو دین دار آدمی ہے، مگر داڑھی ایک مشت سے کم رکھتا ہے، نیز وہ بعض فلموں کو جائز سمجھتا ہے، جیسے جن فلموں میں حج وغیرہ دکھایا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے نماز کا کیا حکم ہے؟

جواب:- ایک مشت سے کم داڑھی کو کٹوانا ناجائز ہے، اور جو شخص اس پر اصرار کرے اس کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی ہے۔[2]

واللہ اعلم بالصواب
۱۳۸۷/۱۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۸۷/ ۱۱۸ الف)

ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے شخص کے پیچھے نماز پڑھنی چاہئے یا نہیں؟

جواب:- قبضہ سے کم داڑھی کتروانا گناہ ہے،[3] ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے، لیکن اگر ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ لی گئی تو نماز ہوگئی، اور اگر کوئی متشرع امام نہ ملے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا پڑھنے سے بہرحال بہتر ہے۔[4]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۵/۷ھ

ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- ایک بریلوی نے کسی آدمی کی نمازِ جنازہ پڑھائی، اس کی داڑھی قبضہ سے بالکل کم ہے، بندہ نے کہا کہ ایسے آدمی کے پیچھے نمازِ جنازہ بالکل نہیں ہوسکتی، بندہ کا کہنا صحیح ہے یا غلط؟

جواب:- داڑھی کو قبضہ سے اُوپر کٹوانا ناجائز ہے،[1] اور جو شخص اس ناجائز کام کا مرتکب ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے،[2] لیکن اگر کوئی نماز اس کے پیچھے پڑھ لی گئی تو نماز کراہت کے ساتھ ہوگئی، اس کا اعادہ بھی واجب نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۲۵/ ۲۷ د)

(۱تا۴) دیکھئے پچھلے صفحہ کا حاشیہ۔

عرش پر اللہ تعالیٰ کے جسمانی قیام کا عقیدہ رکھنے والے شخص کی امامت کا حکم

سوال:- ہم سب اہلِ محلہ حنفی المسلک ہیں اور ہمارے جو پیش امام تھے وہ بھی حنفی المسلک کے دعویدار تھے، لیکن دو سال ہوئے ہیں وہ سعودی عرب گئے وہاں تقریباً ایک سال سے زائد عرصہ گزار اور وہاں مبلغ بھی رہ چکے ہیں، واپسی پر جب آئے ہیں تو ان سے ایسے افعال اور اقوال صادر ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مقلد ہیں، بلکہ حنفی المسلک بالکل نہیں ہیں، کیونکہ وہ صاف الفاظ میں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں جب حدیث نبوی ملتی ہے تو ہم کسی شخص کی تابعداری نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ صبح کی سنتیں اور فرض کے درمیان تحیۃ المسجد پڑھنا اور اوقات مکروہہ میں نماز درست کہنا بلکہ فرض نمازوں کے بعد دعا کو بدعت کہنا، کھانا کھانے کے بعد میزبان کو دعائے خیر کرنا، مردے کے گھر جاکر دو رشاء میت کو دعا کرنا بدعت سمجھتا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے قصد پر جانا حرام اور ناجائز سمجھتا ہے، اور حدیث "لا تشد الرحال ...... الخ" سے دلیل پیش کرتا ہے، اللہ جل شانہ کے لئے عرش پر مکان اور قیام کا قائل ہے۔

مندرجہ بالا افعال و اقوال کے بعد اس شخص کو امام رکھنا ٹھیک ہے یا کہ سبکدوش کیا جائے؟ جبکہ ہمارے سب علماء نے بھی سبکدوشی کا مشورہ دیا ہے، لیکن مولوی موصوف شرعی حکم کے بغیر سبکدوش نہیں ہوتا، جبکہ مسجد میں ایک دو دفعہ جھگڑا بھی ہوا ہے، اور گورنمنٹ سے موصوف نے عدم مداخلت فی المسجد کی ضمانت بھی لی ہے۔ کیا اہلِ محلّہ مولوی صاحب کو سبکدوش کرنے کا حق رکھتے ہیں یا نہیں؟ اور تمام اہلِ محلّہ اس کی امامت پر ناراض ہیں، کیا حکم ہے؟

جواب:- سوال میں امام صاحب موصوف کی طرف جو خیالات منسوب کئے گئے ہیں اگر واقعۃً ان امام صاحب کے عقائد و خیالات یہی ہیں تو انہیں حنفی مقتدیوں کا امام مقرر کرنا درست نہیں، خاص طور سے اگر وہ باری تعالیٰ کے لئے عرش پر جسمانی قیام کا عقیدہ رکھتے ہیں تو یہ اہلِ سنت والجماعت کے عقائد کے قطعی خلاف ہے، ایسے عقیدے والے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے،[1] ان کے بجائے کوئی صحیح العقیدہ امام متعین کیا جائے۔

والله اعلم

۶/۸/۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۹/۳۱ ج)

---

[1] [illegible] حلبی کبیر شرح لمنیة ص [illegible] [illegible]

ویکره تقديم المبتدع أيضًا، لأنه فاسق من حيث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حيث العمل

معراجِ جسمانی کے قائل کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- ایک شخص کہتا ہے کہ صحیح مذہب یہ ہے کہ معراج جسمانی ہے، اور وہ کہتا ہے کہ جو لوگ معراج رُوحانی کے قائل گزرے ہیں ان کی وہ شخص تکفیر نہیں کرتا، ایسے شخص سے کیسا برتاؤ کرنا چاہئے؟ امامت کا حق دار ہوسکتا ہے؟ اپنے کو حنفی دیوبندی کہلاتا ہے۔

جواب:- جمہور اہل سنت کا عقیدہ یہی ہے کہ معراج جسمانی ہے،[۱] جو شخص معراج جسمانی کا منکر ہو وہ فاسق اور مبتدع ہے، لیکن اگر اسراءِ جسمانی کا قائل ہے تو کافر نہیں،[۲] لہٰذا مذکورہ بالا صاحب کا عقیدہ دُرست ہے اور ان کے پیچھے نماز دُرست ہے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۳/۲/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۳۸۶ الف)

الجواب صحیح، قرآن میں مسجد اقصیٰ تک بھی ایک رات میں سیر کرانے کی تصریح ہے، اور یہ لفظ ''عبدہٗ'' کے ساتھ ہے جو جسمانی طور پر سیر کرانے کے لئے بالکل واضح اور صریح ہے، لہٰذا مسجد اقصیٰ تک کی جسمانی سیر کا منکر کافر ہوگا۔ ملّا علی قاری شرح فقہ اکبر ص ۱۳۵ پر لکھتے ہیں من انکر المعراج ینظر ان انکر الاسراء من مکۃ الی بیت المقدس فھو کافر۔[۳] اور علامہ تفتازانی شرح عقائد میں لکھتے ہیں وقولہ الی السماء اشارۃ الی الرد علی من زعم ان المعراج فی الیقظۃ لم یکن الا الی بیت المقدس علی ما نطق بہ الکتاب۔[۴] بندہ محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

---

(۱) وفي شرح المسلم للنووي ج:۱ ص:۹۱ (طبع قديمي كتب خانه) والحق الذي عليه أكثر الناس ومعظم السلف وعامة المتأخرين من الفقهاء والمحدثين والمتكلمين أنه أسري بجسده صلى الله عليه وسلم والآثار تدل عليه. وفي تفسير المظهري سورة الاسرى ج ۵ ص ۳۰ والأكثرون على أن الله تعالى أسرى بعبده محمد صلى الله عليه وسلم ليلة المعراج بجسده في اليقظة وتواترت الأخبار الصحيحة بذلك وعليه انعقد الاجماع ولو كان المعراج في المنام لما أنكر عليه قريش اذ لا استبعاد في الرؤيا ... الخ وفي أيسر التفاسير ج ۲ ص ۵۸۱ تحت الآية "سُبْحٰنَ الَّذِي أَسْرٰى بِعَبْدِهِ" الآية. تقرير عقيدة الاسراء والمعراج بالنبي صلى الله عليه وسلم بالروح والجسد معًا من المسجد الحرام الى المسجد الأقصى ثم الى السموات العلى. مزید تفصیل کے لئے دیکھئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا رسالہ تنویر السراج فی لیلۃ المعراج، از تفسیر معارف القرآن ج ۵ ص ۴۲۶۔

(۲) مسجد بیت المقدس تک جسمانی معراج کا منکر کافر ہے، اور بیت المقدس سے آگے تک معراج جسمانی کا منکر کافر نہیں، فاسق و مبتدع ہے، چونکہ سوال مذکور میں امام صاحب معراج جسمانی کے منکر کی تکفیر نہیں کرتے البتہ یہ درست ہے کیونکہ معراج جسمانی کا منکر کافر نہیں فاسق ہے۔ البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) میں ہے: ومن انکر الاسراء من مکۃ الی بیت المقدس فھو کافر، ومن أنکر المعراج من بیت المقدس فلیس بکافر

(۳) الفقه الأكبر ص ۱۰۰ (طبع دار الكتب العربية الكبرى)

(۴) شرح عقائد ص ۱۳۵ (طبع قديمي كتب خانه)

شیعہ کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال:- ہمارے محلے میں شیعہ اور سنی آبادی ملی جلی ہے، اگر ہم الگ جماعت کرتے ہیں تو آپس میں لڑائی جھگڑے کا خطرہ ہے، اگر ہم مصلحت کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز پڑھ لیں تو جائز ہے یا نہیں؟ یا فرداً فرداً نماز ادا کریں؟

جواب:- شیعہ حضرات کے پیچھے نماز جائز نہیں،(۱) ان کے عقائد سے قطع نظر بھی کرلی جائے تو نماز کے احکام اتنے مختلف ہیں کہ اہلِ سنت کے ساتھ نماز کے اتحاد کی کوئی شکل نہیں۔ لہٰذا کوشش کی جائے کہ اہلِ سنت حضرات اپنی مسجد الگ بنائیں اور اس میں باجماعت نماز ادا کریں، اور جب تک یہ ممکن نہ ہو کسی کے گھر میں جماعت کرلی جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۱۹ الف)

شیعہ سے اپنی بیٹی کا نکاح کرانے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- گزارش یہ ہے کہ سنی عقیدہ سے منسلک آدمی نے اپنی بیٹی کا نکاح باوجود عوام و خواص و اعزّہ کے روکنے کے، ایک شیعہ آدمی سے کردیا، اور اپنے لڑکوں کا نکاح شیعہ لڑکیوں سے کردیا، حالانکہ داماد اور بہوؤں کا شیعہ ہونا ظاہر اور مشہور ہے۔ اس شیعہ داماد کا شیعہ مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنا واضح ہے، نیز شیعہ مسلک سے منسلک مدرسہ کا اہتمام بھی اس کے پاس ہے، شیعوں سے چندے لیتا ہے، شیعوں سے قریبی روابط ہیں، شیعوں کا امام اور خطیب نیز ذاکر بھی ہے۔

جواب طلب امر یہ ہے کہ اہلِ سنت والجماعت کے علمائے کرام کے فتاویٰ کے مطابق اثناء عشری شیعہ، امامت، عصمت ائمۂ کرام، تحریفِ قرآن وغیرہ جیسے امور کی وجہ سے کافر ہیں اور مرتد ہیں، ان کے ساتھ معاملات مرتد جیسے ہونے چاہئیں۔

---

(۱) وفی الکفایة شرح الهدایة ج: ص ۳۰۵ ویکره الاقتداء بصاحب الهوی والبدعة واختلفوا فی کل من کان من اهل قبلتنا ولم یغل فی هواه حتی لم یحکم بکفره تجوز الصلاة مع الکراهة خلفه، حنفه، وان کان هوی یکفر اهلها کالجهمی والقدری الذی قال بخلق القرآن والرافضی الغالی الذی ینکر خلافة ابی بکرٌ لا تجوز.

وفی البحر الرائق (ج:۱ ص ۳۴۸ الامامة) وکره امامة العبد والاعرابی والفاسق والمبتدع وفیه ایضاً ج: ص: ۳۴۹ (المبتدع) بأن لا تکون بدعته تکفره، فان کانت تکفره فالصلوة خلفه لا تجوز.

وفی البحر الرائق ایضاً ج ص ۳۴۹ والرافضی ان فضل علیاً علی غیره فهو مبتدع وفی الهدایة ج ۱ ص ۸۴ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) قال المرغینانی تجوز الصلاة خلف هوی وبدعة ولا تجوز خلف الرافضی والجهمی الخ وفی الکبیری شرح المنیة ص ۵۱۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) ویکره تقدیم المبتدع ایضاً لأنه فاسق من حیث الاعتقاد وهو اشد من الفسق من حیث العمل

ترکِ نماز مع الجماعت سے بچنے کے لئے اس کی امامت میں کبھی کبھی نماز جائز ہوسکتی ہے؟ جبکہ یہ آدمی اپنے آپ کو سنی کہتا ہے اور شیعہ کو اپنی زبانی غلط سمجھتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میرا داماد پیسوں کی وجہ سے شیعہ ہے۔ کیا حکم ہے؟ (از مقامی علمائے کرام موضع سلطانی ضلع رحیم یار خان)

جواب:- شیعہ خواہ کافرانہ عقیدے رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، دونوں صورتوں میں کسی سنی کے لئے ان سے نکاح کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، اور پہلی صورت میں نکاح منعقد بھی نہیں ہوتا۔ اب جس شخص کو دین یا عقائد دین کی اہمیت کا اتنا بھی احساس نہیں ہے وہ شخص امام بنانے کے لائق نہیں ہے۔(۱) تاہم اگر کسی وقت ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ لی گئی تو کراہت کے ساتھ نماز ہوجائے گی، اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

۱۰/۱۱/۱۳۹۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۹/۳۱ ج)

لواطت کے مرتکب کی امامت کا حکم

سوال:- ایک پیش امام نے جو شادی شدہ بھی ہے، ایک لڑکے سے لواطت کی اور اس پر دو عادل نمازیوں نے گواہی دی، یہ تمام ماجرا بستی کے مولوی صاحب سے (جو پیش امام کے علاوہ ہے) بیان کیا، مولوی صاحب نے پیش امام سے اس بارے میں معلومات حاصل کیں تو پیش امام نے اقرارِ جرم کرلیا، بعد ازاں پیش امام مذکور کو اپنے عہدے سے الگ کردیا گیا، اور تمام لوگوں میں اس بات کی تشہیر کردی گئی، اس کے بعد اس پیش امام نے ایک دفعہ نماز پڑھائی ہے، کیا کوئی صورت ہے کہ امام مذکور کو واپس اپنے منصب پر لایا جائے؟

جواب:- لواطت کا مرتکب فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے،(۲) لیکن اگر نماز پڑھ لی جائے تو ہوجاتی ہے، اور جب تک وہ شخص توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں، البتہ اگر وہ صدقِ دل سے توبہ کرے تو اسے امام بنایا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۷/۱۱/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۷۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح، لیکن ایک مسلمان کے گناہ کی تشہیر کرنا ٹھیک نہیں، صرف اتنا کافی تھا کہ ان کو امامت سے معزول کردے۔

محمد عاشق الٰہی

---

(۲) وفی الدر المختار ج ص ۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامۃ عبد ... وفاسق وفی الشامیۃ قولہ وفاسق من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی ... الخ وراجع ایضاً البحر الرائق ج ۱ ص: ۳۴۸، والھندیۃ ج ص ۸۴۔

گالی دینے والے کو امام بنانے کا حکم

سوال:- ایک امام بدگو، جلد مشتعل ہوجانے والا اور غصے میں آپے سے باہر ہوجانے والا ہے، نیز غیبت و دروغ گوئی کا بھی عادی ہے، ایسے امام کی اقتداء میں نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟ ایک امام جس کے پیچھے اس کی اخلاقی پستیوں کی بناء پر نماز پڑھنے کی طرف دل مائل نہ ہو اور دوسری مسجد بھی نزدیک نہ ہو، تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز باجماعت پڑھنے سے نماز ادا ہوجائے گی؟

جواب:- سب وشتم کا عادی، جھوٹ بولنے اور غیبت کرنے والا فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے،[1] تاوقتیکہ وہ ان گناہوں سے توبہ نہ کرے، البتہ جو نمازیں اس کے پیچھے پڑھ لی گئی ہوں وہ ادا ہوجاتی ہیں، ان کا لوٹانا ضروری نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۷/۱۱/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۷۳ /۱۸ الف)

امام کی بُرائی کرنے والے کا اسی امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا

سوال:- ایک شخص امام کے پیچھے ہر وقت بُرائی کرتا ہے اور پھر اس کے پیچھے نماز بھی پڑھتا ہے، یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- پیش امام لائقِ احترام ہے، اس کی بے عزتی کرنا جائز نہیں، بُرائی کرنا تو ہر مسلمان کا بُرا ہے، خاص طور سے پیش امام کی بُرائی کرنا اور بھی قبیح ہے، لیکن اس سے اس پیش امام کے پیچھے بُرائی کرنے والے کی نماز فاسد نہیں ہوتی۔

سوال:- ایک شخص پیش امام کے مارنے کے لئے ہاتھ اُٹھالیتا ہے اور پھر بھی وہ اس کے پیچھے نماز پڑھتا ہے، جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- سابق میں ملاحظہ فرمائیں۔

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۱/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۷۷/۱۹ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰: ويكره امامة عبد ... وفاسق ... الخ
وفی الدر المختار أيضا ج:۱ ص:۵۶۲: صلی خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعة. وقال الشامي تحته (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما اولى من الانفراد لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع ... وكذا في البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸، ۳۴۹، والهندية ج:۱ ص:۸۴.

فسقیہ افعال کے مرتکب کو امام بنانا

سوال:- ایک پیش امام جو عورتوں کو گنڈا تعویذ دیتا ہو اور اکثر و بیشتر وقت عورتوں کے جھرمٹ میں گزارتا ہو، غیر شادی شدہ ہو نا ظاہر کر کے شادی کی خواہش رکھتا ہو، اور لڑکیوں کی فوٹو منگوا کر بھی دیکھتا ہو، اور جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے کی عادت ہو تو کیا ایسے پیش امام کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے؟

جواب:- جو شخص جھوٹ بولنے، دھوکا دینے اور نامحرم عورتوں سے آزادانہ میل جول رکھنے کا مرتکب ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے،(۱) تاوقتیکہ وہ اپنے ان گناہوں سے توبہ نہ کرے۔

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۸/۱۹ الف)

گالی گلوچ کرنے والے شخص کو امام بنانے کا حکم

سوال:- ایک مستفتی نے کافی طویل خط لکھا جس میں اصل سوال کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱- ایک امام گالی گلوچ، جھوٹ بیانی اور ہر وقت لڑائی جھگڑے کا مرتکب رہتا ہے، اس کے ان افعال سے تنگ آ کر مستفتی نے الگ مسجد بنائی ہے، کیا اس مسجد میں نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ ۲- ایسے افعال والے امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- مستفتی نے جو علیحدہ مسجد بنائی ہے، اگر اس میں تمام لوگوں کو آنے کی اجازت عام ہو تو اس میں جمعہ کی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ ۲- جو شخص گالی گلوچ، دروغ بیانی اور لڑائی جھگڑے کا مرتکب ہو وہ فاسق ہے، جب تک وہ اپنے ان افعال سے اعلانیہ توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں۔(۲) مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اسے نرمی سے سمجھائیں، اور اگر وہ باز نہ آئے تو اس سے بیزاری کا اظہار کریں۔

(آپ کے اتنے طویل خط سے یہی دو معقول سوال سمجھ میں آتے ہیں جن کا جواب لکھ دیا گیا)۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۱/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۶/۱۹ الف)

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج ۱ ص ۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامۃ عبد ... وفاسق، وفی الشامیۃ (قولہ وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی وکذا فی البحر الرائق ج ۱ ص ۳۴۸، والھندیۃ ج ۱ ص ۸۶

کس مسجد کے امام کے پیچھے نماز پڑھنا اَولیٰ ہے؟

سوال:- ایک مسجد نئی بن رہی ہے، لوگوں کا عقیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے کا اور کھڑے ہوکر سلام پڑھنے کا ہے، وہ لوگ مجھے اس مسجد میں نماز پڑھنے کی دعوت دے رہے ہیں کہ قرآنی آیات اور حدیث پڑھنے، سننے کو کوئی منع نہیں کرسکتا، جبکہ میں پہلے سے ایک مسجد میں نماز پڑھ رہا ہوں، میرے لئے کیا حکم ہے؟

جواب:- جس مسجد کا امام صحیح العقیدہ اور عملی اعتبار سے زیادہ متقی پرہیزگار ہو اس میں نماز پڑھیے۔( )

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۳/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۵۱ ۲۸ ب)

تصویر کھینچنے اور کھنچوانے والے کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- عرض اینکہ ماہ رمضان المبارک میں ایک مسجد کے اندر ایک حافظ قرآن صاحب جو مسجد میں تراویح کی نماز پڑھاتے ہیں، اسی مسجد میں پیش امام اور مسجد کے مدرسہ تعلیم القرآن میں مدرّس بھی ہیں۔ حافظ صاحب کی اعانت کے لئے ایک نائب مدرّس بھی ہے جو انہی حافظ صاحب کا شاگرد ہے۔ ۲۷ رمضان کی رات ختم قرآن کی مجلس میں جن بچوں نے اس سال قرآن شریف ختم کیا تھا اور جو بچے مائک پہ آکر تلاوت کر رہے تھے، ان بچوں کو خطیب مسجد کے ہاتھ سے انعام دیا جا رہا تھا، اس وقت نائب مدرّس نے تصویر کھینچنا شروع کردی، جس پر ایک شخص نے فوراً تصویر کشی سے منع کردیا اور خطیب صاحب سے مخاطب ہوکر کہا کہ یہ تصویر کھینچی مسجد میں جارہی ہے! خطیب صاحب نے کہا مکروہ ہے۔ اس کے بعد وہ نائب مدرّس ان صاحب (جنھوں نے منع کیا تھا) کے پاس آیا اور کہا کہ حافظ صاحب کی اجازت سے کیمرہ میں ریل بھری گئی ہے میں تصویر کھینچوں گا۔ حالانکہ ان سے کہا گیا کہ دوبارہ حافظ صاحب سے پوچھ لو مگر اس نے ضد کی اور جب حافظ صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوگئے تو ان کی کئی جانب سے تصویر کھینچی، حافظ صاحب نے اس کو منع نہیں کیا۔ بعد میں دوسرے روز حافظ صاحب نے قرآن پاک ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ میں نے نہ اجازت دی ہے، نہ ریل بھروائی ہے۔ کیا مسجد میں تصویر کشی جائز ہے؟ ایسے امام کی اقتداء میں جس نے قسم کھا کر اپنی صفائی پیش کردی

وفي الدر المختار ج ۱ ص ۵۵۵ (طبع ایچ ایم سعید) والأحق بالإمامة تقديمًا بل نصبًا مجمع الأنهر الأعلم بأحكام الصلوة فقط صحة وفسادًا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة وفي الشامية قوله بشرط اجتنابه للفواحش الأعلم بالسنة أولى إلا أن يطعن عليه في دينه الخ

ہو، نماز پڑھنا جائز ہے؟

جواب:- تصویر کھینچنا اور کھنچوانا مسجد سے باہر بھی ناجائز ہے، خاص طور پر مسجد والا ناجائز فعل ہے، کوئی کرے تو اور بھی گناہ ہے، اور قاضی کی اجازت سے ریل بنائی گئی تھی اور انہوں نے تصویر کھنچتے دیکھ کر قدرت کے باوجود منع نہیں کیا، اس کے باوجود قسم کھائی کہ میری اجازت سے تصویر نہیں کھینچی گئی تو انہوں نے سخت گناہ کا ارتکاب کیا، اگر وہ اس گناہ پر اعلانیہ طور سے توبہ کریں تو ٹھیک ورنہ گناہ پر اصرار کریں تو انہیں اپنے عہدے سے علیحدہ ہو جانا چاہئے، تاہم جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئیں وہ ادا ہو گئیں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۲۰/ ۳۹ ج)

جھوٹ بولنے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- جو امام جھوٹ بولے یا جھوٹی قسم کھائے تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی سزا کیا ہونی چاہئے؟

جواب:- جو شخص جھوٹ بولتا ہو یا جھوٹی قسم کھاتا ہو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے اور فاسق ہے، جب تک ان گناہوں سے توبہ نہ کرے، اس وقت تک اسے امام بنانا جائز نہیں۔[۲] شرعی سزاؤں کو نافذ کرنے کا اختیار صرف اسلامی حکومت کو ہے، عوام کو نہیں۔[۳] واللہ اعلم بالصواب

۱۳۸۷/۱۱/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۷/ ۱۸ الف)

بدعتی اور مجہول پڑھنے والے کی اقتداء کا حکم

سوال:- ایک شخص ہمیشہ ترک صلوٰۃ جماعت کرتا ہے، بدعتی ہے، قرآن مجید غلط پڑھتا ہے، ایسا غلط کہ معنی غلط ہو جاتے ہیں، حرام و حلال جانتا ہے، پردہ و عورتوں سے بے غیرتی کرتا ہے، مسلمانوں کے ہاتھ بیچتا ہے، پڑوس والوں سے جھگڑتا ہے، ایک شخص کی شادی میں ناچ ...

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج: ۱ ص ۵۵۹، ۵۶۰ (طبع ایچ ایم سعید) ویکرہ امامۃ عبد ... وفاسق. وفی الشامیۃ ... [illegible] ... وبان فی تقدیمه للامامة تعظیمه وقد وجب علیهم اهانته شرعًا. وفی الهدایة ج: ۱ ص ۱۲۲ ویکرہ تقدیم العبد ... والفاسق لأنه لا یهتم لأمر دینه ... فإن تقدموا جاز لقوله علیه السلام صلوا خلف کل بر وفاجر ... الخ

(۳) دیکھئے الدر المختار مع رد المحتار ج: ۲ ص ۵۶۹ (طبع سعید)

مجلس لگائی ہوئی تھی، لوگوں نے کہا کہ ہم تیری دعوت کا کھانا نہیں کھاتے اس لئے کہ تم نے بدعت کا کام کیا ہے، یعنی مجلس ہوائی ہے، لیکن یہ شخص مذکور شریک ہوا اور کہتا ہے کہ کھانا جائز ہے۔ اب اس کی امامت کی وجہ سے لوگوں میں جھگڑا پیدا ہونے کا خطرہ ہے، اس نے اپنے چچا کو بھی دیوث کہا ہے، یہ شخص نے قسم کھا کر کہا کہ اس نے واطت بھی کی ہے، قبر میں نور نامہ رکھنا جائز قرار دیتا ہے، ایسے شخص کی اقتداء کیسی ہے؟

جواب:- مذکورہ شخص کے بارے میں جو باتیں سوال میں درج ہیں اگر وہ درست ہیں تو ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے اور ایسے شخص کو امام بنانا درست نہیں، کیونکہ مذکورہ باتوں میں سے بہت سی موجب فسق ہیں۔(۱) لہٰذا ایسے امام کو بدلنا چاہئے، البتہ جب تک کسی دوسرے نیک صحیح العقیدہ امام کا انتظام نہ ہو اس وقت تک جو نمازیں اس کے پیچھے پڑھی جائیں گی وہ ہو جائیں گی، اور اگر دوسرے امام کے پیچھے نماز پڑھنا ممکن نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔(۲)

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۶۹/۲۸ ب)

جماعتِ اسلامی کے رکن کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- چند مہینوں سے یہ مہم چل رہی ہے کہ جماعت اسلامی اور اس کے اہل کاروں کے پیچھے نماز کی اقتداء جائز نہیں، اور جیسا کہ جناب کو معلوم ہے کہ یہ فتویٰ بنارسی گروپ نے صادر کیا ہے، کیا یہ فتویٰ صحیح ہے یا غلط؟

جواب:- امیر جماعت اسلامی کے بعض نظریات جمہور اہل سنت کے خلاف ہیں، خاص طور سے بعض انبیاءؑ و صحابہؓ پر جو تنقیص آمیز تنقید انہوں نے کی ہے اس سے اہل سنت کے متفقہ عقائد مجروح ہوتے ہیں، لہٰذا جو شخص ان کے ان خیالات سے متفق ہو اسے امام بنانے سے احتراز کرنا چاہئے اور کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو امام بنانے کی کوشش کرنی چاہئے، البتہ اگر کسی وقت ایسا امام میسر نہ ہو اور امیر

(۱) وفی الدر المختار ج۱ ص۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامة عبد ... وفاسق وفی رد المحتار قولہ (وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر ... وفی المعراج قال أصحابنا لا ینبغی أن یقتدی بالفاسق ... الخ

(۲) وفی الدر المختار ج۱ ص۵۶۲ صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة، وقال الشامیؒ تحتہ (قولہ نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفھما أولی من الانفراد لکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع

جماعت اسلامی کے خیالات کے کسی شخص نے نماز پڑھادی تو نماز ہو جائے گی، کیونکہ نماز ہر مسلمان کے پیچھے ہو جاتی ہے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۹/۱۲/۱۳۹۰ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۸۸/۱۸ الف)

لڑکی کو بیچنے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی مسمی محمد دین جو ایک گاؤں کا پیش امام بھی ہے، پچیس آدمیوں کے روبرو قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرتا ہے کہ میں نے اپنی زمین فلاں شخص کو اتنے روپیہ پر فروخت کر دی ہے، کچھ رقم نقد بھی وصول کر لی ہے اور باقی بوقت بیع نامہ وصول کروں گا۔ وعدہ کے بعد مسمی مذکور اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا کہ میں زمین نہیں دیتا ہوں۔ مسمی مذکور نے اپنی دختر فروخت کر دی تھی جس کا عوام کو ابھی تک علم نہیں ہوا ہے، اور رقم لے کر ہضم کر چکا ہے، جو کہ ایک زندہ خاوند کی بیوی تھی، اور بدستور امامت بھی کرتا ہے۔ کیا ایسے شخص کی اقتداء درست ہے؟

جواب:- یہ شخص جو وعدہ خلافی اور لڑکی کو بیچنے اور دوسروں کی رقم ناجائز طور سے کھانے کا مرتکب ہو، فاسق ہے، اور جب تک وہ ان گناہوں سے علانیہ توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں،(۲) لیکن اگر کسی وجہ سے کوئی نماز پڑھ لی تو نماز ہو جائے گی، واجب الاعادہ نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۳/ /۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۵۶۲ [illegible] وفی [illegible] فصل الجماعة [illegible] لاخرد [illegible] رحمہ اللہ کی کتاب [illegible] ص: ۲ [illegible]

(۲) وفی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص: ۱۸۰ مطبع مصطفی البابی، مصر: [illegible] کره امامة الفاسق لعدم اهتمامه بالدین فتجب اهانته شرعا فلا یعظم بتقدیمه للامامة. قال الطحطاوی: فتجب اهانته شرعا فلا یعظم بتقدیمه للامامة تبع فیه الزیلعی ومفاده کون الکراهة فی الفاسق تحریمیة. وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۵۵۹، ۵۶۰ (ویکره امامة عبد [illegible] وفاسق) وفی رد المحتار (وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من یرتکب الکبائر [illegible] وفیه نظر [illegible] واما الفاسق فقد عللوا کراهة تقدیمه بانه لا یهتم لامر دینه وبان فی تقدیمه للامامة تعظیمه وقد وجب علیهم اهانته شرعا. وکذا فی فتاوی دار العلوم دیوبند ج: ۳ ص: ۳۲

خائن شخص کو امام بنانے کا حکم

سوال:- ایک شخص میں مندرجہ ذیل عیوب موجود ہیں:-

۱- جھوٹ بولنے کا عادی ہے۔ ۲- نائب مدرس ہے طلباء اور یتیموں کے نام سے زکوٰۃ، فطرہ، صدقہ، خیرات، قربانی کی کھالیں اور عشر وغیرہ وصول کر کے ناجائز طور پر اپنے مصرف میں لاتا ہے، حالانکہ تنخواہ اس کے علاوہ وصول کرتا ہے۔ یہ باتیں عام لوگوں کو معلوم ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کا اعتماد اس سے اُٹھ گیا ہے۔ ۳- اپنے عیوب چھپانے کے لئے دوسروں پر بیباکانہ طور پر اتہام لگاتا ہے۔ کیا اس کے پیچھے نماز صحیح ہے؟

جواب:- اگر واقعۃً کسی شخص میں مذکورہ بالا عیوب پائے جاتے ہوں تو اسے امام بنانا جائز نہیں۔(۱)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۰/۱۰/۲۲ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹۲/۲۱ الف)

ماموں سے ناراض شخص کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال:- ایک شخص نے اپنے ماموں سے قرآن شریف پڑھا ہے، اب اس کا ماموں اس سے سخت ناراض ہے اور اپنے حقوق اس کو نہیں بخشتا، کیا اب اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے جبکہ اس کو ماموں اپنے رشتہ داری کے حق حقوق بھی نہیں بخشتا؟

جواب:- اگر ماموں کسی معقول اور شرعی وجہ سے ناراض ہے تو اس پر واجب ہے کہ ان کو راضی کرنے کی کوشش کرے، اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا مسئلہ اس پر موقوف ہے کہ ماموں کی ناراضگی کی وجہ معلوم ہو۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۵/۹ الف)

بے خبری میں بریلوی امام کی اقتداء میں نماز پڑھ لی تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک شخص ایک مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے گیا، اسے معلوم نہ تھا کہ یہ مسجد کس مسلک

---

(۱) پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

کے لوگوں کی ہے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ امام صاحب بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنی چاہئے یا نہیں؟ اگر پڑھ لی گئی تو ادا ہوگی یا نہیں؟

جواب:- نماز پڑھنے کے لئے ایسا امام منتخب کرنا چاہئے جو صحیح العقیدہ ہو، تاہم اگر بریلوی مسلک کے کسی امام کے پیچھے نماز بے خبری میں پڑھ لی گئی یا اس کے علاوہ کہیں اور جماعت ملنا ممکن نہ تھا اس حالت میں پڑھ لی گئی تو نماز ہوگئی۔ (۱)

واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲ ج)

جرگے کا فیصلہ مقدم ہے یا باجماعت نماز؟

شور جھگڑے کی بناء پر جماعت کی نماز توڑنا

سوال ۱:- نماز کا وقت ہو گیا تھا اور مولوی صاحب مسجد کے سامنے جرگے میں بیٹھے تھے، مولوی صاحب کو دو بار آواز دی گئی کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے لوگ انتظار کر رہے ہیں، اس پر مولوی صاحب نے کہا کہ فرض نماز سے پہلے جرگے کا فیصلہ اہمیت رکھتا ہے۔ آئندہ ایسے مولوی صاحب کی اقتداء جائز ہے یا نہیں؟

۲:- عصر کی نماز کی جماعت کھڑی تھی، مولوی صاحب خود جماعت کرا رہے تھے، محلے میں شور جھگڑا ہوگیا، مولوی صاحب نماز فوراً توڑ کر مسجد سے باہر بھاگ گئے۔ ایسے مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب ۱:- جرگے کا فیصلہ کرنے کے لئے جماعت ترک کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ معاملہ ایسا ہو کہ اس وقت فیصلہ بیچ میں چھوڑ دینے سے کسی بڑے فتنے فساد کا اندیشہ ہو، لہٰذا مسئلے کا جواب اس فیصلے کی صحیح نوعیت پر موقوف ہے۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں نماز توڑنا جائز نہیں تھا، اگر امام صاحب نے ایسا کیا تھا تو انہیں اپنے اس عمل پر توبہ و استغفار کرنا چاہئے، اور وہ ایسا کریں تو ان کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۳۶/۲۷ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید) صلی خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعة وقال الشامی تحته قوله نال فضل الجماعة افاد ان الصلوة خلفهما اولی من الانفراد ... الخ

سیاسی اختلاف کی بناء پر امامت سے معزول کرنا

سوال :- زید اپنے باپ دادا کے وقتوں سے ایک محلے میں امام چلا آرہا ہے، اچھا عالم ہے، بچوں کو خوب قرآن پڑھاتا ہے، محلے کے دو تین افراد جو اثر و رسوخ والے ہیں اور پیپلز پارٹی والے ہیں، امام صاحب کے مخالف ہیں، امام صاحب کے حامی عوام غریب ہیں اور ان دو تین افراد کے سامنے کچھ بول نہیں سکتے۔ بھٹو صاحب کے آخری دور میں سیاسی اختلاف کی بناء پر امام صاحب کو نکال کر دُوسرا امام لائے، اب دُوسرے امام کے پیچھے شرعاً نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب :- جب پہلے امام میں کوئی خرابی نہیں تھی تو ان کو محض سیاسی اختلاف کی بناء پر معزول کرنا کسی طرح درست نہیں تھا، لیکن اب جبکہ دوسرے امام صاحب کا تقرر کر دیا گیا ہے تو اگر ان میں کوئی بات موجبِ کراہت نہیں ہے تو ان کے پیچھے بھی نماز جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۸/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۹۷۷/۲۸ ج)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ”عالم الغیب“ اور ”حاضر و ناظر“ ماننے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال :- اگر کوئی مولوی صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوں یا ان کو عالم الغیب سمجھتے ہوں، نیز یہ بھی کہتا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی علم ہے کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ بارش کب ہوگی؟ کوئی کب مرے گا؟ یا ان کو ذرہ ذرہ کا عالم مانتا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب :- جس امام کے بارے میں یہ تحقیق ہو کہ وہ مذکورہ عقائد کا قائل ہے اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔[1]

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۵/۵/۱۳۹۵ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۸۶/۲۲ ب)

---

(۱) وفي الكبيري شرح المنية ص: ۵۱۴ (طبع سهيل اكيڈمي لاهور) ويكره تقديم المبتدع أيضًا لأنه فاسق من حيث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حيث العمل. وفي تنوير الأبصار مع شرحه ج:۱ ص ۵۵۹-۵۶۱ يكره امامة عبد ... ومبتدع أي صاحب بدعة وهي اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول صلى الله عليه وسلم لا بمعاندة بل بنوع شبهة ... لا يكفر بها، وإن كفر بها فلا يصح الاقتداء به أصلا ... الخ. وفي غنية المستملي ص ۵۱۴ (طبع سهيل اكيڈمي لاهور) [illegible] والاقتداء به مع الكراهة إذا لم يكن ما يعتقده يؤدي إلى الكفر عند أهل السنة، أما لو كان مؤديا إلى الكفر فلا يجوز أصلا. نیز دیکھئے فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۳ ص ۱۲۰۔

مسجد کی دوسری منزل پر جماعت کرانے کا حکم

سوال:- دو منزلہ مسجد کی دوسری منزل پر نماز باجماعت پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ منزل اول بالکل خالی ہو اور امام اور مقتدی سب دوسری منزل پر نماز ادا کرتے ہوں۔

جواب:- ویکرہ تحریما الوطئ فوقه والبول والتغوط، لانه مسجد الی عنان السماء (درمختار مع شامی ج۱ ص ۶۵۶)۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد آسمان تک مسجد ہی مسجد ہوتی ہے اور اوپر کی منزل بھی مسجد ہی ہے۔ لہٰذا اس میں جماعت کرنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ بلا ضرورت ایسا نہ کیا جائے، کیونکہ یہ تقلیل جماعت کا سبب بن سکتا ہے۔[2]

واللہ اعلم

۱۹/۱۲/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۴۵ ۱۸ الف)

امام اگر سائبان کے نیچے کھڑا ہو اور مقتدی پیچھے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ہماری مسجد میں صحن میں سائبان پڑا ہوا ہے، جس کے بعد صحن شروع ہوجاتا ہے، امام صاحب سائبان کے نیچے کھڑے ہوتے ہیں۔ اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ اس طرح نماز ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ چند دوستوں کا کہنا ہے کہ ایک صف امام کے ساتھ سائبان کے نیچے ہونا ضروری ہے، اگر ایسا نہیں ہوا تو نماز نہیں ہوگی، اگر ہوگی تو مکروہ ہوگی۔

جواب:- صورت مسئولہ میں نماز دُرست ہے، اور اس میں کوئی کراہت بھی منقول نہیں ملی، البتہ بہتر یہ ہے کہ امام سائبان سے ذرا پیچھے کھڑا ہو جائے، اس طرح کہ اس کے قدم سائبان سے باہر ہوں، سجدہ خواہ سائبان کے نیچے ہو جائے، أخذ مما في الدر المختار وقيام الامام في المحراب لا سجوده فيه (أي يكره ذلك)۔[3]

واللہ اعلم

۲۹/۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر [illegible])

کیا امام، امامت سے اُستاذ بن جاتا ہے؟

سوال:- چند مسائل درپیش ہیں، جن کا جواب درکار ہے۔

۱:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین دریں مسئلہ کہ کسی شخص کے پیچھے نماز پڑھنے سے

---

(۱) الدر المختار ج ۱ ص ۶۵۶ (طبع ایچ ایم سعید)۔

(۲) اس مسئلے سے متعلق مزید تفصیل کے لئے امداد الاحکام ج ۱ ص ۵۵۹ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) الدر المختار ج ۱ ص ۶۴۵ (طبع ایچ ایم سعید)

وہ استاذ بنتا ہے یا نہیں؟ اور اگر وہ اُستاذ بن جاتا ہے تو کیا اس کا احترام بھی اسی طرح ضروری ہے جیسا کہ عام مروجہ اُستاذوں کا احترام کیا جاتا ہے؟

۲- عام عرف میں امام کو استاذ کہا جاتا ہے، کیا یہ استاذیت، امامت کی خصوصیت ہے یا مطلق نماز پڑھنے کی؟

۳- ایک حافظ قرآن دوسرے حافظ قرآن کی منزل سنتا ہے، کیا یہ منزل سننا تعلیم میں شمار ہوتا ہے یا کہ تذکرہ میں؟ اور یہ بھی بتائیں کہ اُستاذ کب اور کیسے بنتا ہے؟ ذرا تفصیل کے ساتھ بیان فرمائیں۔

جواب ۱:- محض امامت سے استاذ نہیں بنتا، مگر امام کی بھی تعظیم کرنی چاہئے۔

۲- یہ عرف صحیح نہیں ہے، ہاں اگر امام سے کوئی دین کی بات سیکھی ہو تو وہ استاذ ہو گیا۔

۳- شرعاً اس سے استاذ نہیں بنتا، مگر چونکہ قرآن یاد کرنے میں ایک دوسرے کی مدد ہوئی، اس لئے ایک دُوسرے کی عزت کرنی چاہئے۔

واللہ اعلم

۸/ ۲/ ۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸/۵۶)

ریڈیو سننے والے کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک شخص ایک حد تک بڑا پابند شریعت ہے، صرف ایک بات اس میں پائی جاتی ہے کہ وہ ریڈیو سنتا ہے، ریڈیو میں صرف تلاوت قرآن مجید اور ترجمہ اور کوئی مسائل دینی اگر نشر ہوں تو سنتا ہے اور خبریں بھی، باقی فلمی ریکارڈ وغیرہ نہیں سنتا، اور لوگوں کا امام ہے۔ نماز اس کے پیچھے جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر ساز و موسیقی اور دوسری ناجائز چیزیں سننے سے اجتناب کیا جائے تو ریڈیو سننا بالکل جائز ہے اور اس کی وجہ سے نماز میں کوئی خلل نہیں آتا، چنانچہ شخص مذکور کے پیچھے نماز درست ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۳۲۲ / ۱۹ الف)

بلا ثبوت، زنا کی تہمت لگانے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- ایک شخص کسی پر بلا ثبوت، زنا کی تہمت لگاتا ہے، ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟ اور اس

کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے؟

جواب:- کسی شخص پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا گناہِ کبیرہ ہے، اگر ایسا کرنے والا توبہ نہ کرے تو فاسق ہے، اور اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، لیکن اگر نماز پڑھ لی گئی تو ادا ہو جائے گی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۲ ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۵۹۶/ ۲۲ ب)

امام کا امامت برقرار رکھنے کے لئے چند شرائط لگانے کا حکم

سوال ۱:- ایک مولانا صاحب ہندوستان سے فارغ ہیں، یہاں ایک جامع مسجد میں پیش امام ہیں، اور اپنے مقتدیوں کو یوں تقریر کرتے ہیں کہ اگر امامت کو برقرار رکھنا ہے تو میری نصیحت پر عمل کرو۔

۲- تم لوگوں پر میری ماہوار تنخواہ کا جو حصہ لگایا جائے گا اس کو ہر مہینے میں دینا ہوگا۔

۳- پورے مہینے امام کو عمدہ کھانا کھلانا ہوگا۔

۴- مسجد کی موقوفہ زمین امام کے نام پر رجسٹری وقف کرنا ہوگی۔

۵- میں مر جاؤں تو کسی اور کو امام بناؤں گا۔

۶- جو مقتدی مذکورہ شرائط پر عمل نہ کرے گا، امام اس مقتدی کے کسی دینی دنیوی کام میں شرکت نہ کرے گا، یعنی میت کی جنازہ وغیرہ۔

۷:- اور یہی وصیت اپنے خلیفہ کو بھی کرتا ہے۔

جواب:- امام صاحب کی لگائی ہوئی شرائط میں سے نمبر ۲، ۳، ۶ شریعت کے مطابق نہیں، انہیں چاہئے کہ یہ شرائط عائد نہ کریں، لیکن ان شرائط کے عائد کرنے کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۱/۲۲ ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۰/ ۱۹ الف)

کشفِ قبور کے قائل کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- جو شخص کشفِ قبور کا قائل ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

تفصیل کے لئے دیکھئے ... معارف القرآن ج ۲ ص ۳۵۳۔

جواب - کشف قبور کوئی امر محال نہیں، بعض اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف سے یہ ملکہ دے دیا جاتا ہے، اگر کوئی اس کا قائل ہو تو وہ فاسق نہیں، البتہ کشف قبور کے ذریعے کسی خلاف شریعت بات پر استدلال کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ جو شخص کشف قبور کے ذریعے کسی ناجائز بات پر استدلال کرے وہ مرتکب بدعت ہے، اس کو امام بنانے سے پرہیز کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی صحیح العقیدہ امام نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، نماز ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۵/۱/۱۳۹۱ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۱۹ الف)

جھوٹ بولنے والے اور مسجد کا سامان اپنے گھر میں استعمال کرنے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ یہاں سعودی گورنمنٹ بلا تابعیہ مسجد بننے نہیں دیتی، اس لئے مولوی صدیق تابعیہ والے کے نام سے ہمارے محلہ کی مسجد کو تعمیر کرنا پڑا، مولوی موصوف چونکہ تابعیہ والا ہے اس لئے مولوی موصوف کو متولی مسجد بنا کر ہم نے تقریباً پندرہ سولہ سال تک مسجد کو چلایا ہے، آج تقریباً تین سال سے مولوی موصوف نے ایک مولوی صاحب کو ہماری مسجد کا امام بنایا ہے، مولوی موصوف نے امام مسجد کو خادم کہہ کر اقامہ بھی بنادیا ہے، مولوی موصوف خود امام کا کفیل بھی ہے، جس پاسپورٹ پر اقامہ بنادیا ہے وہ پاسپورٹ چونکہ جعلی تھا، گزشتہ سال جب جعلی پاسپورٹ والوں کی یہاں حکومت کی طرف سے پکڑ دھکڑ اور تلاش ہو رہی تھی تو امام صاحب نے اپنا پاسپورٹ چھپایا، پھر حکومت میں پاسپورٹ گم ہونے کا اعلان کرکے درخواست دے دی، پھر سفارت خانے سے نیا پاسپورٹ حاصل کیا، اس پر پھر اقامہ بنایا۔ امام صاحب نے پاسپورٹ گم ہونے کا جو اعلان کیا ہے وہ بالکل جھوٹ اور کذب ہے، اس میں توریہ وتعریض بھی نہیں کیا، حالانکہ پہلا پاسپورٹ امام کے پاس موجود ہے۔ اس بات پر مقتدیوں نے امام سے ناراض ہوکر اس کے خلف میں اقتداء کرنا چھوڑ دیا، مقتدیوں نے دوسری مسجد میں جاکر نماز پڑھنا شروع کردیا ہے۔ یہ تو ساری پہلی بات تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس امام صاحب نے مسجد کا سامان گھر میں استعمال کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ایک آدمی نے مسجد کے لئے پانی دیا تھا تاکہ اس سے لوگ وضو کریں، امام صاحب نے یہ پانی بجائے مسجد کے مدرسہ میں اور مسجد کے کرایہ کے مکانوں میں خرچ کیا، جب

محلے کے لوگوں نے امام صاحب سے یہ سب باتیں پوچھیں تو امام صاحب سختی سے پیش آئے، جھگڑا فساد کیا ہے، ان کی وجہ سے محلے کے اکثر لوگوں نے ناراض ہو کر ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا چھوڑ دیا، دوسری مسجد میں نماز پڑھنا شروع کر دیا۔ مولوی صدیق صاحب نے مذکورہ امام کو معزول کرنے کی اور دوسرا امام رکھنے کی اجازت تو دی ہے مگر موجودہ امام متولیٔ مسجد رہے گا اور سب کا سرپرست ہوگا۔ یہ بات محلے والوں پر مشکل گزری۔ خلاصہ یہ ہے کہ اولاً امام صاحب نے اقامہ اور پاسپورٹ کی وجہ سے صریح جھوٹ بولا، ثانیاً مسجد کے فرش، مسجد کے ایئر کنڈیشن اور مسجد کے پانی میں ناجائز تصرف کیا، ثالثاً امام صاحب مقتدیوں سے سختی سے پیش آیا، جھگڑا فساد کیا، رابعاً امام صاحب کو معزول کرنے کی طاقت بھی مقتدیوں کو نہیں ہے، اور امام صاحب کے ساتھ اختلاف کی صورت میں فتنہ وفساد کا قوی اندیشہ ہے، شرعی حکم سے آگاہ کریں، ان وجوہات کی بنا پر جو لوگ دوسری مسجد میں نماز پڑھتے ہیں یا وہ لوگ غلطی پر ہیں؟

جواب – جھوٹ بولنا اور مسجد کا سامان گھر میں استعمال کرنا حرام ہے، جو اس حرام کا مرتکب ہو جب تک وہ اس سے توبہ نہ کرے فاسق کے حکم میں ہے، اسے باختیار خود امام بنانا یا کسی صالح امام کے ہوتے ہوئے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ تاہم جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئیں وہ ادا ہوگئیں، اعادے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر یہ امور محلہ والوں سے ثابت ہوں اور توبہ بھی نہ کریں تو منتظمین مسجد پر واجب ہے کہ وہ کسی صالح امام کا انتظام کریں۔ واللہ اعلم

۲۵ ۔ ۱۳۹۹ھ
(فتوی نمبر ۱۳۹۹/۳۹ و)

اپنے اُوپر عائد شدہ مختلف الزامات کے دُرست جوابات دینے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ ایک امام صاحب کو مسجد کے احاطے کے اندر رہنے میں ایک مکان بنا کر دیا ہوا ہے، اور تقریباً ۱۴-۱۵ سال سے وہ اس مسجد کی امامت کر رہے ہیں اور اسی کے احاطے کے اندر ایک مدرسہ ہے، اس مدرسے کے مہتمم بھی امام صاحب ہیں، مسجد ومدرسہ دونوں کی طرف سے امام کو مبلغ ۲۰۰ روپے ماہانہ ملتے ہیں، مسجد ومدرسہ کی کمیٹی کے کچھ نئے عہدیداران کی طرف سے امام ومہتمم صاحب پر مندرجہ ذیل شکایات لگائی گئی ہیں، کمیٹی کی یہ شکایات اور امام صاحب کے جوابات ذیل میں درج ہیں، آپ اپنے شرعی فیصلے سے مطلع فرما کر مشکور فرمادیں۔

(کمیٹی کی طرف سے امام صاحب سے کئے گئے سوالات اور امام صاحب کے جوابات)

سوال - آپ کو جو مکان مسجد کی طرف سے ملا ہے، اس کی چھت پر مرغیوں کے پالنے کی جگہ کس کی اجازت سے بنائی ہے؟

جواب - (تقریباً ایک سال ہوا جب بنائی تھی)۔ صدر کمیٹی صاحب سے پوچھ کر بنائی تھی، بنانے سے قبل میں صدر صاحب کے گھر گیا اور ان سے کہا کہ جناب تنخواہ کم ہے، عیال دار ہوں، خیال ہے کہ جس مکان میں رہ رہا ہوں اس کی چھت پر چند مرغیوں کی جگہ اپنے خرچ سے بنالوں، آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمانے لگے اچھا روزگار ہے، کم سے کم صدقہ کے ثواب کریں۔ مگر اب تقریباً ایک سال کے بعد یہ مسئلہ اٹھا تو صدر صاحب انکار کرتے ہیں کہ میں نے کوئی اجازت نہیں دی تھی۔

جناب صدر صاحب قسم کھانے کو تیار ہیں اور امام صاحب بھی قسم کھانے کو تیار ہیں اور کہتے ہیں کہ صدر صاحب کو وہ اجازت یاد نہیں ہے۔

(نوٹ - مذکورہ مرغیوں کی جگہ کو اس کے اسباب کے، امام صاحب نے ذاتی خرچ سے کیا تھا، مسجد کے نام وقف کردیا ہے تاکہ تمام اعتراض ختم ہوں)

سوال - مسجد کمیٹی نے آپ کو ذاتی مصرف کے لئے جو بجلی دے رکھی تھی وہ مرغیوں میں آپ نے کس کی اجازت سے جلائی؟

جواب - مکان کی چھت پر ایک بلب پہلے کا لگا ہوا تھا اور تقریباً ہر روز بیکار رات تک ہم اپنے مصرف کی روشنی کے لئے جلاتے تھے، اس بلب سے مرغیوں کی جگہ اور بلب کا کام لیتا رہا اور ایک دن تک یہ بلب اسی طرح جلتا رہا، ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس طرح کرنا بھی اچھا نہیں ہے۔ اب جبکہ اس سال تین بلب جلانے کی نوبت آگئی ہے تو آپ حضرات کے اعتراض کرنے سے پہلے ہی میں حساب کررہا تھا کہ ایک بلب ۲۰ واٹ کا اگر روزانہ اتنا جلے تو مہینے میں کتنی بجلی خرچ ہوتی ہے تاکہ رقم میں مسجد میں جمع کروادوں، مگر اس سے قبل کہ میں حساب کرکے جمع کرواتا آپ حضرات کی طرف سے سوال ہوگیا، گزشتہ سال جو ایک بلب جلتا رہا کمیٹی چاہے تو چھوڑ دے، اور چاہے تو اس کا سارا حساب کرکے مجھ سے رقم وصول کرلے۔

سوال - تیس کی پکی ہوئی اینٹیں کسی صاحب نے مدرسہ کو دی تھیں، آپ نے اپنی مرغیوں کی جگہ پر کیوں لگائیں؟

جواب - مدرسہ کے مدرس کے لئے ایک کمرہ میری نگرانی میں بنایا گیا جب اس کی بنیاد

کھودی تو شومیٔ قسمت سے مستری کے منہ سے نکل گیا کہ کنکر یٹ میں جو پڑی ہیں بنیادوں میں لگ جائیں تو اس کمرہ کی بنیاد مضبوط رہے، وہ کنکر یٹیں میں نے اپنی مرغیوں کی جگہ بنانے کے لئے منگوائی تھیں، میں نے اس وقت مدرسہ کا فائدہ مدنظر رکھ کر مستری سے کہا کہ میری اینٹوں سے یہ کنکریٹ بنیادوں میں لگادو اور مدرسہ کی اینٹوں کی اتنی تعداد میری اینٹوں میں ڈال دو، اس وقت مدرسہ کا فائدہ ذہن میں تھا، مسئلہ کی حقیقت ذہن میں نہیں آئی کہ میں اس طریقے سے مدرسہ کے لئے نہ اپنی اینٹیں دے سکتا ہوں اور نہ اس طرح لے سکتا ہوں، جب اعتراض اٹھا تب یہ حقیقت کھلی کہ میں غلط قدم اُٹھا چکا ہوں مگر میرے اس طرح کرنے سے مدرسہ کو فائدہ ہوا، کچھ نقصان نہیں ہوا۔

سوال:- مدرسہ کی تعمیر کے سلسلے میں جو لوہا، ریتی، سیمنٹ وغیرہ آیا ہوا ہے اس کو آپ اپنی مرغیوں کی جگہ کے مصرف میں کیوں لائے؟ اور اس کی اجازت کس سے لی؟

جواب:- اینٹیں میں نے خود اپنی رقم سے مدرسہ کے آرڈر کے ساتھ منگوائیں رسید میرے پاس ہے (جو دکھائی گئی)، سیمنٹ اس کام کے لئے میں نے خود خریدا اس کی رسید بھی میرے پاس ہے (جو دکھائی گئی)، البتہ میرے مزدوروں اور مستری سے ایک موقع پر یہ غلطی ہوئی وہ یہ کہ میں وہاں موجود نہیں تھا اور کام کرتے ہوئے سیمنٹ ختم ہوگیا تو مستری اور مزدور اپنی یومیہ مزدوری کے خوف سے مدرسہ کا سیمنٹ اُٹھا کر لے گئے کہ یہ کام بھی امام صاحب کروا رہے ہیں اور مدرسہ کا کام بھی امام صاحب ہی کروا رہے ہیں وہ ادا کردیں گے، میں شام کو جب واپس آیا تو مجھے انہوں نے بتایا جس پر میں ان پر خفا ہوا، اس سیمنٹ کی جتنی قیمت بنتی تھی اس وقت کے نرخ کے حساب سے وہ رقم مدرسہ کے فنڈ میں جمع کرواکر رسید کاٹ دی وہ رقم کی رسید اور جن مزدوروں نے سیمنٹ اُٹھایا تھا ان کا حلفیہ بیان میرے پاس موجود ہے (جو دکھایا گیا)۔

مدرسہ کے ردی کاغذ جو بکتے تھے، موذن کو میں کہہ دیتا تھا کہ کوئی ردی والا آئے تو اسے دے دیا کرو، ایک موقع پر تھوڑے سے مجھے ضرورت پڑے، میں نے لے لئے اور اندازے سے ان کی قیمت ادا کردی (مگر غلطی یہ ہوئی کہ تول کر نہیں لئے)۔

سوال:- مدرسہ میں جو رقم زکوٰۃ فطرہ اور چرم قربانی کی وصول ہوئی وہ مدرسہ کے اکاؤنٹ میں اب نہیں ہے، وہ مدرسہ کے کس مصرف میں استعمال کی؟

جواب:- مدرسہ کی رقم بینک میں جمع تھی، میں تو تعمیری اخراجات کا بل بناکر صدر صاحب کے حوالے کردیتا تھا، صدر صاحب اس کو پاس کرتے تھے اور خازن صاحب کے پاس چیک بک تھی وہ چیک بناتے تھے، جس پر صدر صاحب اور دیگر تین آدمیوں میں سے دو کے دستخط ضروری تھے، میں نہ خود

تو ایک پائی بھی بینک سے نہیں نکال سکتا تھا، یہ سوال تو ان لوگوں سے پوچھنا چاہئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں نے خیال نہیں کیا کہ جن کی ذمہ داری تھی اور نہ میں بینک سے معلوم کر سکا اور بظاہر اب وہ رقم بھی تعمیری رقم کے ساتھ مدرسہ کی تعمیر میں خرچ ہوگئی، اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اب مدرسہ کی تعمیر کے لئے جو رقم آئے گی اس میں سے مذکورہ رقم نکال کر اس فنڈ کو پورا کر دینا۔

مذکورہ بالا سوالات و جوابات کو ملاحظہ فرما کر شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب سے مطلع فرمائیں کہ مذکورہ الزامات کے جوابات پڑھنے کے بعد امام صاحب کس قدر مجرم ہیں؟ آیا ان کو امام رکھنا چاہئے یا نہیں؟ اور ان کے پیچھے نماز صحیح ہوتی ہے یا نہیں؟

نوٹ – چھت پر مرغیوں کے لئے جگہ بنانے کے سلسلے میں جو خرچ اٹھا اس پر کل . . روپے امام صاحب کے خرچ ہوئے، وہ سارا تعمیری سامان مع تعمیر کے امام صاحب نے مسجد و مدرسہ کو وقف کر دیا ہے، اور کمیٹی نے ایک سال ہوا اس پر رضامند ہو کر متفقہ فیصلہ کر دیا تھا۔ مگر اب پھر فتویٰ نمبر ۱ کے چار سوالوں کے ساتھ گزشتہ دو برس کے الزاموں کو شامل کر کے حقیقت میں مفتی صاحب کے سامنے امام صاحب کے جرموں کو سنگین شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ فقط والسلام

جواب:– مذکورہ سوالات کے جو جواب امام صاحب نے دیئے ہیں، اگر وہ درست ہیں تو امام صاحب بالکل بری الذمہ ہیں اور ان پر کوئی اعتراض واقع نہیں ہوتا۔ جہاں تک پہلے دو سوال کا تعلق ہے وہ تو سوال ہی نامعقول اور غیر منصفانہ ہیں، جو مکان امام صاحب کو رہنے کے لئے دیا گیا ہے اگر وہ اس میں اپنے معاش کے لئے کوئی کام کریں تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے، اسی طرح بجلی کا استعمال اپنی ضرورت کے لئے کر سکتے ہیں، کمیٹی والوں نے اس بارے میں جواب طلبی کر کے زیادتی کی ہے، باقی سوالات تو درست ہیں، لیکن جوابات بھی معقول ہیں، اور اگر ان کی صحت ثابت ہو جائے تو امام صاحب پر اعتراض کسی طرح درست نہیں۔

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۱۴/۳۰ د)

ایک امام کی امامت سے متعلق تفصیلی استفتاء اور اس کا جواب

سوال:– کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں، کہ ہماری مسجد میں جو امام صاحب ہیں اور جو کہ مسجد سے متعلق دار العلوم کے مہتمم بھی ہیں، موصوف کو کمیٹی کی طرف سے دو تنخواہیں ملتی ہیں، ۲۳۵ روپے مسجد کی امامت کے، اور ۱۲۵ روپے مہتمم ہونے کے، جملہ ۳۶۰ روپے تنخواہ ملتی ہے، گزشتہ مہینے انتظامیہ کی طرف سے امام صاحب کو ایک اظہار وجوہ کا نوٹس

ملا ہے جس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے اور نمبروار جوابات بھی درج ہیں۔

(سوالات از کمیٹی)

۱- گزشتہ تین ماہ سے اہل محلہ کی مسلسل درخواستیں آرہی ہیں کہ آپ کسی نہ کسی نماز میں روزانہ ضرور غیر حاضر رہتے ہیں، نمازی انتظار کرتے ہیں، پھر کوئی دوسرا نماز پڑھا دیتا ہے، اس پر آپ کو متوجہ کیا گیا، ہنوز اثر نہ ہوا۔

۲- باوجود منع کرنے کے آپ نے مسجد کی سیڑھی کرائے پر دی اور رقم وصول کی، نوٹس ملنے پر غلط بیانی تحریر کی۔

۳- آپ کو معلم مدرسہ کی غیر موجودگی میں صرف تھوڑا وقت پڑھانے کو کہا گیا، مگر آپ نے صاف انکار کردیا۔

۴- باوجود صدر کمیٹی کے منع کرنے کے آپ نے اپنے مکان (مسجد کی ملکیت جو امام صاحب کو ملا ہوا ہے) پر پاخانہ بنوایا۔

(جوابات از امام صاحب)

۱- گزشتہ دو ماہ یعنی اپریل و مئی میں کچھ وقتوں کی نمازوں میں غیر حاضری کی وجہ یہ ہے کہ اپریل ۱۹۷۸ء میں دو روزہ ختم نبوت کانفرنس ہوئی (چونکہ میں یہاں حیدرآباد کی مجلس ختم نبوت کا ضلعی ناظم ہوں) اس کے انتظام کے سلسلے میں مجھے کافی بھاگ دوڑ کرنی پڑی، جس کی وجہ سے اکثر نمازوں میں غیر حاضر ہوجاتا تھا (مگر اپنی جگہ قائم مقام مقرر کرجاتا تھا، ان شاء اللہ) مگر صدر منتظم صاحب کو میں نے زبانی کہہ دیا تھا کہ کانفرنس کے انتظامات کے سلسلے میں اکثر نمازوں میں میری غیر حاضریاں ہوں گی، میری غیر موجودگی میں مدرس قرآن قاری صاحب یا مؤذن مسجد صاحب نمازیں پڑھائیں گے، صدر صاحب نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، فکر نہ کریں۔ اور ایک دن کے لئے اپنے ایک ضروری کام کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا، اس کی اطلاع بھی جناب صدر صاحب کو زبانی کر گیا۔ کسی کی شادی میں ایک گھریلو جھگڑے کو نمٹانے ایک دن پھر کراچی جانا پڑا، اس کی اطلاع بھی جناب صدر صاحب کو زبانی کر کے گیا اور صدر نے اجازت دی، اور پھر اس مہینے ہمارے حضرت مولانا غلام حبیب صاحب حوالی چونکہ کراچی تشریف لائے ان سے ملاقات کے لئے کراچی جانا پڑا، اور جب حضرت مولانا حیدرآباد تشریف لائے اور پھر دو روز حضرت کا قیام رہا، میں بھی ساتھ رہا، مگر صدر موصوف سے پوچھ کر گیا۔ علاوہ مذکورہ وجوہ کے، ہفتے میں یوں بھی ایک دو غیر حاضریاں ہوجاتی ہیں کہ لطیف آباد سے شہر گیا واپسی میں وقت پر آنا تو چاہتا ہوں مگر سواری نہیں ملتی یا راستے میں سواری خراب ہوجاتی ہے، کسی شادی و غمی میں جانا پڑتا ہے، بچوں کے علاج و معالجے کے لئے ڈاکٹر کے پاس ہسپتال گیا، وہاں ڈاکٹر کی

مصروفیت کی وجہ سے دیر ہوگئی، وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی غیر حاضریاں کوئی جان بوجھ کر نہیں کی جاتیں، بلکہ ہر امام مسجد سے اس قسم کی غیر حاضریاں ہوتی جاتی ہیں، آئندہ کے لئے وعدہ کرتا ہوں کہ عمداً کوئی غیر حاضری نہیں کروں گا، مگر مذکورہ دُوسری قسم کی غیر حاضری تو ہو ہی جاتی ہے۔

۲- جب سے مجھے منع کیا گیا ہے میں نے خود کسی کو مدرسہ یا مسجد کی سیڑھی کرایہ پر نہیں دی اور بچوں کو بھی منع کردیا کہ کسی کو نہ دیں، مگر اس آٹھ نو ماہ کے عرصے میں پھر بھی تین دفعہ میری عدم موجودگی میں لوگ سیڑھی لے گئے اور بچوں سے کذب بیانی کرکے لے گئے، اور یہ نکال لے جانا اور چھوڑ جانا میری غیر موجودگی میں رہا، مجھے اس کا کوئی کرایہ وغیرہ نہیں ملا، نام ان کے لکھے دیتا ہوں فلاں فلاں ہیں، ایک مرتبہ کا کرایہ میری غیر موجودگی میں ایک آدمی میرے گھر دے کر گیا، اس کو میں نے جمع کرادیا، مدرسہ کی رسیدوں میں دیکھ سکتے ہیں، سیڑھی ہر وقت مسجد میں رہتی ہے کوئی لے جائے یا لے آئے، مجھے کیسے پتہ چل سکتا ہے؟ آپ لوگ ذرا ذرا سی بات پر اپنے امام پر بدگمانی کرتے ہیں اور پیچھے نمازیں بھی پڑھتے ہیں، تعجب ہے!

۳- اس کا جواب میں نے جناب سیکریٹری کی جناب ڈاکٹر صاحب کو زبانی دے دیا اور انہوں نے اس وقت میرا عذر قبول کرلیا تھا۔ وہ عذر یہ تھا کہ میرے ذمہ آٹھ دس آدمی اہل خانہ کی کفالت کا بوجھ ہے، اس دور میں مہنگائی میں آٹھ نو سو روپے ماہانہ خرچ ہو جاتے ہیں، جبکہ مسجد اور مدرسہ سے بحیثیت امام و مہتمم مجھے کل ۳۱۰ روپے ماہانہ ملتے ہیں، بقیہ اخراجات اس طرح پورا کرتا ہوں کہ صبح ایک اسکول میں جاتا ہوں، ۲۵۰ روپے وہاں سے ملتے ہیں، اور شام بعد نماز ظہر تھوڑا سا آرام کرکے اسکول کے بورڈنگ میں قراءت پڑھانے جاتا ہوں، ۲۰۰ روپے وہاں سے ملتے ہیں، تو اس طرح گھر کا خرچ پورا کرتا ہوں۔

صبح کو بچوں کو پڑھاؤں تو اسکول سے چھٹی ہوتی ہے، اور شام کو بورڈنگ جانا بند کروں تو یہ ٹیوشن جاتی ہے۔ آپ میرا یہ عذر قبول کرتے ہوئے مجھے معاف کریں تو احسان ہوگا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کچھ وقت نکال لیتے تو اچھا ہوتا، خیر کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا ابھی کوئی عارضی مدرس رکھ لیں۔ اصل مدرس کی میں بھی تلاش کرتا ہوں، آپ بھی کریں، تو اس بات ہونے کے بعد میں مطمئن ہوگیا کہ ڈاکٹر موصوف صاحب نے میرا عذر قبول کرلیا ہے۔

۴- مسجد کے جس مکان میں رہ رہا ہوں اس کے فرش وغیرہ کی اور چھت پر بیت الخلاء کی جس قدر مرمت وغیرہ کی گئی صدر کمیٹی سے اجازت لے کر کرائی ہے، اپنی مرضی سے ایک اینٹ بھی نہیں لگوائی۔ اس مرمت اور چھت پر بیت الخلاء وغیرہ بنانے کا جس کا بھی صدر صاحب انکار کردیں

میں اس کام کا چندہ دینے کو تیار ہوں۔

مذکورہ سوالات وجوابات میں سے سوال نمبر ایک کے سلسلے میں صدر صاحب نے فرمایا کہ مجھ سے باقاعدہ چھٹیاں نہیں دی گئیں صرف زبانی کلامی مجھ سے کبھی کبھی پوچھ لیا جاتا رہا ہے۔

سوال ۳ کے سلسلے میں جنرل سیکریٹری صاحب نے فرمایا کہ میں بالکل مطمئن نہیں ہوں کیونکہ مدرسہ کا مہتمم ہوتے ہوئے مدرسین کی تنخواہ دیتے ہوئے مہتمم کا یہ فرض ہوتا ہے جب کوئی مدرس غیر حاضر ہو، یا اس کو کمیٹی نکال دے تو اس کی جگہ وہ بچوں کو قرآن مجید وغیرہ پڑھائے، لہٰذا مہتمم نے اپنے فرض میں کوتاہی کی ہے، ان کو نکال دینا چاہئے۔

سوال ۴ کے سلسلے میں صدر صاحب نے فرمایا کہ فرش کی مرمت کی میں نے اجازت دی تھی، مگر بیت الخلاء کی اجازت نہیں دی، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جب بار بار مجھے مجبور کیا گیا تو میں مجبور ہو کر نہ کرتا تو کیا کرتا؟ جبکہ بیت الخلاء بنانے میں کل ۱۵۰ (ایک سو پچاس) روپے خرچ ہوئے۔

اب مذکورہ سوالات وجوابات غور وفکر سے پڑھ کر شریعت مطہرہ کی روشنی میں جوابات سے جلد مشکور فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ فقط

۱:- مذکورہ امام صاحب امامت کے قابل ہیں اور ان کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ یا ان کو غیر ذمہ دار سمجھ کر ان کو امامت سے برطرف کر دینا چاہئے۔ (جبکہ پنج وقتہ نمازیوں نے ۹۵ فیصد اپنے دستخط سے ایک یادداشت کمیٹی کے نام بھیجی ہے کہ ہم اپنے امام صاحب پر رضامند ہیں اور ان کے خلاف فیصلہ کرنا ہمارے جذبات مجروح کرنا ہوگا)۔

۲- مہتمم ہوتے ہوئے مہتمم نے بچوں کی پڑھائی سے انکار کیا، اس صورت میں ان کو مہتممی سے الگ کر دینا چاہئے یا نہیں؟

۳- صدر صاحب نے انکار پر یا کسی اور کی بات پر امام صاحب کو جھوٹا اور خائن سمجھ کر نکالنا جائز ہے؟ یا صدر صاحب کی بھول سمجھ کر امام صاحب سے کوئی تعرض نہیں کرنا چاہئے؟

جواب:- صورت مسئولہ میں امام صاحب نے اپنے اوپر عائد کردہ الزامات کا جو جواب دیا ہے، اگر وہ واقعہ کے مطابق ہے تو امام صاحب پر اس بارے میں کوئی اعتراض لازم نہیں آتا، اور ان الزامات کی بناء پر انہیں امامت یا مدرسہ کے اہتمام سے سبکدوش کرنا درست نہیں۔ کمیٹی کے افراد کو چاہئے کہ وہ امام صاحب کی مناسب عزت کریں اور اس قسم کے الزامات عائد کر کے انہیں پریشان نہ کریں، اور امام صاحب کا فرض ہے کہ وہ اپنے مفوضہ فرائض دیانت داری سے ادا کریں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۹ھ

فصل فی المسبوق واللاحق
(مسبوق اور لاحق کے مسائل کا بیان)

مسبوق، سجدۂ سہو کے لئے امام کے سلام میں شرکت نہ کرے

سوال:- مسبوق، امام کے سجدہ سہو کے سلام میں شرکت کرے یا نہیں؟

جواب:- جس شخص کی کچھ رکعتیں امام کے ساتھ رہ گئی ہوں اسے سجدہ سہو کے وقت سلام نہ کرنا چاہئے، البتہ امام کے ساتھ سجدہ کرنا ضروری ہے، کذا فی رد المحتار۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۲۵/۱۱۸ الف)

مسبوق کی نماز کا طریقہ

سوال:- ایک آدمی نے چار رکعت والی نماز میں دوسری یا تیسری رکعت میں امام کے ساتھ شرکت کی، باقی نماز کس طرح ادا کرے؟ ایک صاحب نے بتایا ہے کہ باقی رکعتوں میں صرف فاتحہ پر اکتفاء کرنا چاہئے۔ مغرب میں اگر ایک رکعت ہو تو باقیوں میں سورۃ ملائی جائے یا صرف فاتحہ پر اکتفاء کیا جائے؟ اس نماز کے بارے میں بھی ان صاحب نے بتایا کہ ایک میں تو سورۃ ملادے، باقی دوسری رکعت میں فاتحہ پر اکتفاء کیا جائے۔

جواب:- جس شخص کی ایک یا دو رکعت چھوٹ گئی ہو اسے مسبوق کہتے ہیں، قراءت کے بارے میں اس کا حکم یہ ہے کہ جب امام کے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی نماز پوری کرے گا تو قراءت کے لحاظ سے یہ اس کی پہلی رکعت سمجھی جائے گی، لہٰذا اس رکعت میں وہ سورہ فاتحہ کے ساتھ قرآن کریم

وفی بدائع الصنائع [illegible]
[illegible]
[illegible]
وفی الشامیة (قوله والمسبوق یسجد مع امامه) قید بالسجود لانه لا یتابعه فی السلام
وفی [illegible] ثم المسبوق [illegible] فی السلام فیسجد معه ویتشهد ... الخ وکذا فی الهندیة ج ۱ ص ۹۲ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه)

کی دوسری آیت بھی پڑھے گا۔ اگر اس کی دو رکعتیں چھوٹی ہیں تو دوسری رکعت میں بھی سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی اور سورت پڑھنا اس پر ضروری ہے، اور اگر تین یا چار رکعتیں چھوٹی ہیں تو پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھے گا مگر اس کے بعد والی رکعتوں میں نہیں پڑھے گا۔(۱)

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۹ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۴۴/۹ الف)

مسبوق اپنی نماز کس طرح پوری کرے؟

سوال — چار رکعتوں میں جس کی ایک رکعت چھوٹ گئی ہو وہ اپنی بقیہ نماز کس طرح پوری کرے؟

جواب:— امام کی نماز ختم ہونے کے بعد اپنی چھوٹی ہوئی رکعت پوری کرے اور اس میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۃ پڑھنا بھی ضروری ہے۔(۲)

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۲-۳-۱۳۸۷ھ

الجواب صحیح
محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۲۰۰/۱۸ الف)

مسبوق کی ثناء سے متعلق شرح وقایہ کی ایک عبارت کی تحقیق

سوال:— شرح وقایہ باب صفۃ الصلوٰۃ کی عبارت یہ ہے "ان المسبوق یقرأ ولا یثنی فیتعوذ" اس عبارت میں "ولا یثنی" کا کیا مطلب ہے؟ یا لفظ "لا" غلط ہے، کیونکہ تعوذ پڑھنا اور ثناء ترک کرنا کسی کتاب میں نظر نہیں آتا؟

جواب:— شرح وقایہ کے مکتوب نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے(۳) اور اس پر آپ کا اعتراض

(۱، ۲) فی الدر المختار ج ۱ ص ۵۹۶ (باب الامامة) (والمسبوق من سبقه الامام بها أو ببعضها وهو منفرد) حتى يثني ويتعوذ ويقرأ وإن قرأ مع الإمام لعدم الاعتداد بها لكراهتها مفتاح السعادة (فيما يقضيه) أي بعد متابعته لإمامه فلو قبلها فالأظهر الفساد ويقضي أول صلاته في حق قراءة وآخرها في حق تشهد فمدرك ركعة من غير فجر يأتي بركعتين بفاتحة وسورة وتشهد بينهما وبرابعة الرباعي بفاتحة فقط ولا يقعد قبلها وفي رد المحتار (قوله حتى يثني الخ) تفريع على قوله منفرد فيما يقضيه بعد فراغ إمامه فيأتي بالثناء والتعوذ لأنه للقراءة ويقرأ لأنه يقضي أول صلاته في حق القراءة كما يأتي وكذا في الفتاوى الهندية ج ۱ ص ۹۱، ۹۲ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه)
نیز دیکھئے فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۳ ص [illegible] ج ۱ ص ۲۳۵۔
(۳) شرح الوقاية ج [illegible] ص [illegible] طبع ایچ ایم سعید (محمد زبیر حق نواز)

درست ہے، مسئلہ یہی ہے کہ مسبوق کو ثناء پڑھنی چاہئے، تمام متون معتبرہ میں مسئلہ یوں ہی لکھا ہے۔

قال فی غنیة المتملی والمسبوق یأتی بالثناء اذا أدرک الامام حالة المخافتة ثم اذا قام الی قضاء ما سبق یأتی به أیضًا، کذا ذکره فی الملتقط، ووجهه أن القیام الی قضاء ما سبق کتحریمة أخری للخروج به من حکم الاقتداء الی حکم الانفراد.

(۱)
(کبیری ص:۲۹۷، فصل صفة الصلوٰة)

وقال فی الدر المختار: وهو (أی المسبوق) منفرد حتی یثنی ویتعوذ ویقرأ.

(۲)
(شامیة ج۱ ص:۱۰۴۰ أواخر باب الامامة)

اس سے معلوم ہوا کہ مسبوق جب جماعت میں شامل ہو (اور امام قراءت نہ کر رہا ہو) اس وقت بھی ثناء پڑھے، اور جب اپنی نماز پوری کرنے کے لئے کھڑا ہو اس وقت بھی، البتہ پہلے موقع پر امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے قول کے مطابق تعوذ نہیں پڑھے گا کیونکہ ان کے نزدیک تعوذ قراءۃ کے تابع ہے، اور امام ابو یوسف کے نزدیک دونوں مرتبہ تعوذ بھی پڑھے گا کیونکہ ان کے نزدیک تعوذ ثناء کے تابع ہے، اور فتویٰ امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے قول پر ہے لما فی رد المحتار لکن مختار قاضی خان والهدایة وشروحها والکافی والاختیار واکثر الکتب هو قولهما انه تبع للقراءة وبه یأخذ

(۳)
(شامی ج۱ ص ۳۲۹ باب صفة الصلوٰة)

بہرحال! شرح وقایہ میں ثناء کی نفی متون کے خلاف ہے، لہٰذا یا تو کتابت کی غلطی سے لفظ "لا" بڑھ گیا ہے یا مصنف شرح وقایہ سے تسامح ہوا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۳/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۲۵ الف)

امام کے سلام کی صورت میں مسبوق تشہد پورا کرے گا یا نہیں؟

(عالمگیری اور شامی و امداد الفتاویٰ میں تعارض کی تحقیق)

سوال:- اگر کوئی مسبوق قعدۂ اخیرہ میں شریک ہوا اور تشہد پورا کرنے سے قبل امام نے سلام پھیر دیا تو وہ مسبوق اپنا تشہد پورا کئے بغیر اپنی نماز پوری کرنے کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے یا تشہد پورا کرنا ضروری ہے؟ عالمگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا کرنا ضروری نہیں ہے، اور امداد الفتاویٰ سے بحوالہ شامی

---

(۱) غنیة المتملی ص:۳۰۴ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور)
(۲) فتاوی شامیة ج۱ ص ۵۹۶ (طبع ایچ ایم سعید)
(۳) شامیة ج۱ ص ۴۹۰ (طبع ایچ ایم سعید)

معلوم ہوتا ہے کہ پورا کرنا ضروری ہے، جواب سے مطمئن فرمایا جاوے۔

جواب:- عالمگیری، شامی اور امداد الفتاوی میں کوئی تعارض نہیں ہے، سب کا منشا یہی ہے کہ مسبوق کے لئے تشہد کو پورا کرنا محض افضل ہے، لیکن اگر وہ پورا کئے بغیر اُٹھ جائے تو نماز سب کے نزدیک بلا کراہت ہو جاتی ہے۔ علامہ شامی اس مسئلے کو نقل کرکے لکھتے ہیں: ومقتضاه انه يتم التشهد ثم يقوم ولم أره صريحا ثم رأيته في الذخيرة ناقلا عن ابي الليث المختار عندي انه يتم التشهد وان لم يفعل أجزأه. ولله الحمد. (جلد اوّل باب صفة الصلوة بيان الرّكوع)۔(۱)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۲ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) فتاوی شامية ج ۱ ص ۴۹۶ وفتاوی عالمگيرية الفصل السادس فيما يتابع الامام وفيما لا يتابعه ج ۱ ص ۹۰ (طبع مكتبه رشيديه كوئته)، امداد الفتاوی ج ۱ ص ۳۳۹ وكذا في امداد الأحكام ج ۱ ص ۵۵ وعزيز الفتاوی ص ۲۲۵، وفتاوی دار العلوم ديوبند ج ۳ ص ۳۷۹

فصل فیما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیھا

(نماز کے مفسدات اور مکروہات کا بیان)

پہلی صف میں نابالغ بچے کا کھڑا کرنا

سوال:- اگر نابالغ بچے پہلی صف میں کھڑے ہوجائیں تو نماز درست ہوجاتی ہے یا مکروہ؟

جواب:- نماز تو ہوجاتی ہے، مگر ایسا کرنا مکروہ ہے۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۵ ۲۸ ج)

آدھی آستین والی قمیص میں نماز پڑھنا

سوال:- آدھی آستین والی قمیص پہن کر یا آدھی آستین چڑھا کر نماز پڑھنے سے نماز درست ہوتی ہے یا نہیں، بغیر کسی مجبوری کے؟

جواب:- مکروہ ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۳۲ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار ج ۱ ص ۵۷۱ (طبع ایچ ایم سعید) (ویصف) الرجال ظاهره یعم العبد ثم الصبیان ثم الخناثی ثم النساء، وفی الشامیة تحته (قوله ظاهره یعم العبید) أشار به الی ان الجنوع مقدم علی الحریة لقوله صلی الله علیه وسلم لیلینی منکم أولوا الأحلام والنهی وفی الدر المختار أیضاً ج ۱ ص ۶۵۶، ۶۵۷ (طبع ایچ ایم سعید) ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسهم والا فیکره وفی الشامیة والمراد بالحرمة کراهة التحریم ولا فیکره ای تنزیها.

(۲) [illegible]

[illegible]

جواب [illegible] مرفقین [illegible]

[illegible] وفی الدر المختار ج [illegible] ص [illegible] طبع ایچ ایم سعید وکره کفه ای رفعه ولو لتراب کمشمر کم او ذیل وفی الشامیة وقید الکراهة فی الخلاصة والمنیة بان یکون رافعًا کمیه الی المرفقین وظاهره أنه لا یکره الی ما دونهما [illegible]

تصویر والے کمرے میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- جس کمرے میں کسی مرد یا عورت کا فوٹو آویزاں ہو تو اس جگہ نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- جس مکان میں کسی ذی روح کی تصویر لگی یا لٹکی ہو اس میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اور سب سے زیادہ کراہت اس تصویر میں ہے جو نمازی کے سامنے جانب قبلہ میں ہو، پھر وہ جو نمازی کے سر پر معلق ہو، پھر وہ جو اس کے داہنے ہو، پھر وہ جو بائیں جانب ہو، اور سب سے کم کراہت اس میں ہے کہ نمازی کے پیچھے کی دیوار وغیرہ میں ہو، اور اگر تصویر قدموں کے نیچے ہو تو اس وقت بھی بعض فقہاء کے نزدیک کراہت ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے، لہٰذا پرہیز اس سے بھی کرنا چاہئے۔

کذا فی رد المحتار ج:۱ ص ۴۳۵، باب ما یفسد الصلوٰۃ ویکرہ فیھا۔(۱) واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۹۲/۲۷ و)

محاذات کی دو صورتوں کی تفصیل اور حکم

سوال:- [illegible] نمبر ۵ [illegible] ۳۵ محررہ مفتی محمد [illegible] صاحب مدظلہم بتاریخ ۲۲/۲ ۱۳۹۸ھ میں آنجناب نے جواب نمبر۲ میں تحریر فرمایا ہے کہ [illegible] سے [illegible] نماز پڑھتے اور [illegible] ٹخنے اور پنڈلی سے اپنے پائنچے [illegible] پیچھے [illegible] کی ہو تو کسی کی نماز فاسد نہیں ہوتی، [illegible]

[illegible] ڈاڑھی پر بنی ہوئی قسم والی [illegible] ... [illegible]
پر بھی منطبق ہوتی ہے، وفی [illegible] یکرہ [illegible] ان یکون رافعا کمہ الی المرفقین وصحوہ [illegible]
یکرہ الی ما دونھما قال فی البحر والظاھر الاطلاق لصدق کف الثوب علی الکل ونحوہ فی الحلبۃ وکذا فی
شرح المنیۃ الکبیر ان التقیید بالمرفقین اتفاقی قال وھذا لو شمرھما خارج الصلوٰۃ ثم شرع فیھا کذلک وراجع أیضا
خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص ۵۸ [illegible] کفایت المفتی ج ۳ ص ۴۲۸ (طبع جدید دار الاشاعت) و امداد الاحکام
ج ۱ ص ۵۶۱ و ۵۶۳، و امداد المفتین ص ۳۴۱، ۳۴۲۔

[illegible] احتیاط اسی میں ہے کہ [illegible] آستین [illegible] چڑھائی ہوئی ہوں تو بہتر یہ ہے کہ عمل قلیل سے نماز میں آستین [illegible]
نیچے کرلے۔

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۱۴۲۳/۷/۲۵ھ	۱۴۲۳/۷/۲۳ھ	[illegible] ۱۴۲۳	[illegible] ۱۴۲۳

(۱) فی التنویر وشرحہ الدر المختار ج ۱ ص ۶۴۸ و (کرہ) أن یکون فوق رأسہ أو بین یدیہ أو بحذائہ یمنۃ أو یسرۃ أو محل سجودہ (تمثال) [illegible] ولو [illegible] فیما اذا کان التمثال خلفہ، و لاظھر الکراھۃ وفی الشامیۃ (الاظھر الکراھۃ) لکنھا فیہ أیسر، لأنہ لا تعظیم فیہ ولا تشبہ معراج وفی الدر المختار أیضا ج ۱ ص ۶۵۲ (لا یکرہ صلوٰۃ) علی بساط فیہ تماثیل أن لم یسجد علیھا لما مرّ وفی الشامیۃ تحتہ (قولہ لما مر) علۃ لعدم الکراھۃ وھو کونھا مھانۃ [illegible]

گی، لیکن بہشتی زیور میں یہ لکھا ہے کہ اگر بیوی میاں کے پیچھے نماز پڑھے تو بالکل پیچھے (ایک صف کے فاصلے پر) کھڑی ہو ورنہ اس کی نماز نہیں ہوگی اور مرد کی نماز بھی برباد ہوگی۔

دونوں صورتوں کی الگ الگ کیا نوعیت ہے کہ پہلی صورت میں عورت (ایک مقتدی کی طرح) صرف مرد کے ٹخنے اور پنڈلی سے ذرا پیچھے ہوکر نماز پڑھ سکتی ہے، اور بہشتی زیور کی رُو سے اسے کم از کم ایک صف کا فاصلہ چھوڑ کر کھڑا ہونا چاہئے؟

جواب - محاذات کی صحیح تفسیر یہی ہے کہ عورت کا ٹخنہ اور پنڈلی مرد کے کسی عضو کے برابر ہو، چنانچہ اگر کوئی عورت مرد سے اتنے پیچھے کھڑی ہو کہ دونوں کے ٹخنے اور پنڈلی بالکل برابر میں نہیں رہتے، خواہ عورت کے پاؤں کا کوئی حصہ مرد کے پاؤں کے کسی حصے کے برابر میں ہو تو اصح قول کی بناء پر نماز فاسد نہیں ہوگی جس کی صورت یہ ہے:- عورت　مرد

یہ صورت اصح قول کی بناء پر مفسد نہیں ہے، البتہ بعض فقہاء نے ٹخنے اور پنڈلی کے بجائے پورے قدم کی محاذات کا اعتبار کیا ہے، لہٰذا ان کے نزدیک مذکورہ صورت مفسد ہے، اور جواز کی صورت ان کے نزدیک یہ ہے:- .... عورت　مرد

بہشتی زیور میں احتیاطاً اس آخری قول کو اختیار کرکے بالکل پیچھے کھڑے ہونے کا کہا گیا ہے، جس کا مطلب ایک صف پیچھے کھڑا ہونا نہیں ہے بلکہ اتنے پیچھے کھڑا ہونا ہے کہ عورت کے قدم کا کوئی حصہ مرد کے قدم کے کسی حصے کے برابر نہ ہو۔

قال الشامی عن الزیلعی: المعتبر فی المحاذاۃ الساق والکعب فی الأصح، وبعضهم اعتبر القدم اھ. فعلی قول البعض لو تأخرت عن الرجل ببعض القدم تفسد وان کان ساقها وکعبها متأخرا عن ساقه وکعبه، وعلی الأصح لا تفسد وان کان بعض قدمها محاذیا لبعض قدمه بان کان أصابع قدمیها عند کعبه مثلا تأمل. (ثم قال بعد اسطر) المانع لیس محاذاۃ أی عضو منها لأی عضو منه، ولا محاذاۃ قدمه لأی عضو منها بل المانع محاذاۃ قدمها فقط لأی عضو منه.[1]

احتیاط بہرحال بہشتی زیور کے قول پر عمل کرنے میں ہے تاکہ بالاتفاق نماز درست ہو جائے، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا بہشتی زیور کے قول پر عمل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت ایک صف پیچھے کھڑی ہو، بلکہ اس کا مطلب اتنے پیچھے کھڑا ہونا ہے کہ اس کے قدم کا کوئی حصہ مرد کے کسی عضو کے مقابل میں نہ آئے۔ المرأۃ اذا صلت مع زوجها فی البیت ان کان قدمها بحذاء قدم الزوج لا

(۱) فتاوی شامیة ج ۱ ص ۵۷۲، وکذا فی التاتارخانیة ج ۱ ص ۶۲۲، ۶۲۳

سجود صلاتها بالجماعة، وإن كان قدماها خلف قدم الزوج إلا أنها طويلة تقع رأس المرأة في السجود قبل رأس الزوج جازت صلاتهما لأن العبرة للقدم۔ (شامی ج:۱ ص:۵۳۵)۔[1]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۷/۱۹ الف)

برآمدے میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہت نہیں

سوال:- ہماری مسجد بڑی چھوٹی ہے، چنانچہ برآمدے میں گرمی کے دنوں میں امام صاحب باجماعت نماز پڑھاتے ہیں اور سردی کے موسم میں محراب میں اندرونی مسجد میں پڑھاتے ہیں، کیا اس میں کوئی کراہت ہے یا نہیں؟

جواب:- کوئی کراہت نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۶/۱۹ الف)

بغیر سترہ کے نمازی کے آگے سے گزرنے کی تفصیل

سوال:- نمازی کے سامنے سے گزرنے کی جیسا کہ حدیث شریف میں سخت ممانعت آئی ہے، حسب ذیل صورتوں میں گزرنے والے کے لئے کیا حکم ہے؟

الف:- اگر نمازی بحالت قیام یا قومہ سجدہ گاہ پر نظر کئے ہوئے ہے تو ضرورت مند کتنا فاصلہ چھوڑ کر گزرے؟

ب:- اور اس کی حرکات مذکورہ سجدہ گاہ سے آگے پڑتی ہوں؟

ج:- اور نمازی رکوع یا سجدے میں ہے؟

د:- اس مسئلے میں چھوٹی اور بڑی مسجد کا ایک الگ کیا حکم ہے؟ اور کم از کم کتنی بڑی مسجد کو "مسجد کبیر" کہا جائے گا؟

جواب:- الف:- اگر مسجد چھوٹی ہے تو نمازی کے آگے سے بغیر سترہ کے بالکل نہیں

(۱) فتاوی شامیۃ ج: ۱ ص: ۵۷۲ (طبع ایچ ایم سعید)

گزرنا چاہئے، اور اگر مسجد بڑی ہے یا

ب، ج:- کھلی جگہ میں نماز پڑھ رہا ہے تو اتنے آگے سے گزرنا جائز ہے کہ اگر نماز پڑھنے والا سجدے کی جگہ نظر رکھے تو اسے گزرنے والا نظر نہ آتا ہو، جو تقریباً سجدے کی جگہ سے دو گز کے فاصلے تک ہوتا ہے۔ رکوع، سجدہ، قیام، قومہ سب کا ایک ہی حکم ہے۔ اور قیام کی حالت میں اگر نماز پڑھنے والا سجدے کی جگہ سے آگے دیکھ رہا ہو تب بھی گزرنے کے لئے فاصلہ اتنا ہی معتبر ہوگا جو اوپر بیان کیا گیا۔ لما فی رد المحتار: ومشى عليه في التحفة وصححه السرخسي وصاحب البدائع واختاره فخر الاسلام ورجحه في النهاية والفتح أنه قدر ما يقع بصره على المار لو صلى بخشوع أي راميا ببصره الى موضع سجوده۔ (شامی)۔[1]

د:- تقریباً چالیس ہاتھ سے کم رقبے کی مسجد "چھوٹی" کہلاتی ہے، اور اس سے زائد بڑی۔

قال الشامیؒ: قوله ومسجد صغير هو أقل من ستين ذراعا، وقيل من أربعين، وهو المختار كما أشار اليه في الجواهر (قهستاني، شامي)۔[2]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

کندھوں تک بال بڑھا کر رکھنے والوں کی نماز ہوتی ہے یا نہیں؟

سوال:- جن لوگوں نے بال کندھوں تک بڑھا کر رکھے ہوئے ہیں تو کیا ان لوگوں کی نماز ہو جاتی ہے؟

جواب:- نماز تو ہو جاتی ہے، مگر ایسے بال رکھنا جس سے غیر مسلموں یا فساق سے مشابہت پیدا ہو، جائز نہیں۔[3]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۸/۲۸ الف)

(۱، ۲) رد المحتار باب ما یفسد الصلوٰة ... الخ ج:۱ ص:۶۳۴ (طبع سعید)۔
(۳) وفی سنن ابی داؤد، باب فی لبس الشهرة ج:۲ ص:۲۰۳ (طبع ایچ ایم سعید) عن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم۔ (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی القراءۃ ومسائل زلۃ القاری﴾

(نماز میں قراءت اور پڑھنے والے کی غلطیوں سے متعلق مسائل کا بیان)

سورۂ فاتحہ کے بعد "ربّ اغفر لی" کہنا

سوال:- "وَلَا الضَّآلِّیْنَ" کے بعد "رَبِّ اغْفِرْ لِیْ" کہنا کیسا ہے؟

جواب:- "ولا الضالین" کے بعد "آمین" کے سوا کوئی جملہ حدیث سے ثابت نہیں، اس لئے "آمین" کے سوا کوئی جملہ نہ کہنا چاہئے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲-۲-۱۳۹۶ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۷/۱۸ الف)

بیماری کی وجہ سے نماز میں الفاظ ادا نہ کر سکے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- اگر کسی شخص کو ایسی بیماری یا کمزوری کی حالت ہو کہ بیٹھ کر نماز تو ادا کر سکے لیکن زبان سے الفاظ ادا کرنے سے سینے میں درد ہوتا ہو تو ایسی حالت میں وہ کس طرح الفاظ ادا کرے؟

جواب:- نماز کے لئے تو یہ ضروری ہے کہ جب تک ہونٹوں اور زبان کو حرکت دینے پر قدرت ہے، ان سے الفاظ ادا کئے جائیں خواہ معذوری کی وجہ سے اتنے آہستہ ہوں کہ خود بھی نہ سن سکے(۲) اور اتنے آہستہ پڑھنے سے امید ہے کہ کوئی معتد بہ تکلیف بھی نہیں ہوگی، معمولی درد برداشت کرنا

---

(۱) وفي الصحيح للامام مسلم ج ۱ ص ۱۷۶ باب التسميع والتحميد والتأمين (طبع قديمي كتب خانه) عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال إذا أمن الإمام فأمنوا فإنه من وافق تأمينه تأمين الملائكة غفر له ما تقدم من ذنبه قال ابن شهاب كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول آمين.

(۲) وفي مجمع الأنهر ج ۱ ص ۱۵۷ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وأدنى المخافتة إسماع نفسه فقط وهو قول الهندواني وعليه أكثر المشائخ (في الصحيح) احتراز عما قيل إن أدنى الجهر إسماع نفسه وأدنى المخافتة تصحيح الحروف، وهو قول الكرخي، وصححه في البدائع ... الخ وفي الدر المختار ج ۱ ص ۵۳۴ وأدنى المخافتة إسماع نفسه في الشامية فشرط الهندواني والفضلي لوجودها خروج صوت يصل إلى أذنه وبه قال الشافعي وشرط بشر المريسي وأحمد خروج الصوت من الفم وإن لم يصل إلى أذنه لكن بشرط كونه مسموعا في الجملة حتى لو أدنى أحد صماخه فيه يسمع ولم يشترط الكرخي وأبو بكر البلخي السماع واكتفيا بتصحيح الحروف [illegible] واختار في الفتح أن قول الهندواني وبشر متحدان بناءً على أن الظاهر سماعه [illegible]

چونکہ ابتداءً عموماً زیادہ تر واقف کار لوگ ہی ان کے پاس جاتے ہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱۲/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۳ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

فاتحہ خلف الامام کا حکم

سوال: کیا امام کے پیچھے الحمد پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی؟

جواب: حنفی مسلک میں امام کے پیچھے کسی قسم کی قراءت کرنا خواہ وہ سورۂ فاتحہ ہو یا بعد کی سورت، جائز نہیں ہے، لیکن اگر غلطی سے کوئی شخص پڑھ لے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے، فاسد نہیں ہوتی۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۶۳ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ضؔ کا مخرج

سوال: حرف ضاد کو بعض لوگ مشابہ بدال پڑھتے ہیں اور بعض مشابہ بظاء اور بعض ذال پڑھتے ہیں، تحقیق کون سا ہے؟

جواب: ضاد ایک مستقل حرف ہے، اس کا مخرج دال، ذال یا ظاء سب سے علیحدہ ہے،

[illegible] بعد وجود شرائط [illegible] وذكر في كلام قولي الجهندوي والكرخي مصححين [illegible] فيه الجهندوي صحح ورجح [illegible] وفي البحر الرائق ج [illegible] ص ۳۳۶ طبع [illegible] مذهب الكرخي [illegible] وفي [illegible] تصحيح [illegible] الكرخي [illegible] وصحح [illegible] على مذهب البحر الرائق ج [illegible] ص ۳۳۶ [illegible]
ص ۵۵۔

(۱) اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے درج ذیل [illegible]
۱ – امام الكلام في القراءة خلف الامام، از [illegible]
۲ – الدليل المحكم في ترك القراءة للمؤتم، از حضرت [illegible] قدس سرہ۔
۳ – هداية المعتدي في قراءة المقتدي (تالیفات رشیدیہ، ادارۂ اسلامیات)، از حضرت گنگوہی رحمہ اللہ۔
۴ – الدليل القوي على ترك القراءة للمقتدي، از محدث احمد علی سہارنپوری قدس سرہ۔
۵ – فاتحة الكلام في القراءة خلف الامام، از حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہ۔
۶ – احسن الكلام في ترك القراءة خلف الامام، از حضرت مولانا سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم۔　(محمد زبیر)

جو شخص ضاد کو اپنے اصلی مخرج سے ادا کرنے پر قادر ہو اس کے لئے اسے دال، ذال، یا ظاء پڑھنا جائز نہیں، اور جو شخص اس پر قادر نہ ہو اسے کسی ماہر قاری سے مشق کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اور جب تک اس کوشش میں کامیاب نہ ہو اسے ظاء کے مشابہ پڑھنا دال کے مشابہ پڑھنے سے بہتر ہے، لیکن نماز دونوں صورتوں میں ہو جائے گی۔

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱/۱۸ الف)

ضؔ کا مخرج

سوال:- "وَلَا الضَّآلِّیْنَ" جس کا مخرج زبان کا کنارہ ہے، ڈاڑھوں کے ساتھ ہے، کیا "ولا الظالین" کے مشابہ پڑھ سکتے ہیں یا "ولا الدالین" موڑ کر کے پڑھ سکتے ہیں؟

جواب:- ضاد کا مخرج، دال اور ظاء دونوں سے الگ ہے، اور وہ یہ کہ زبان کا کنارہ اوپر کی بائیں دونوں ڈاڑھوں کو چھوئے، اس کی آواز بھی دال اور ظاء سے الگ ہے، لیکن ظاء کے ساتھ اس کی مشابہت دال کی بہ نسبت زیادہ ہے۔[۲]

واللہ اعلم
۱۳۹۹
(فتویٰ نمبر ۲۹۰/۳۰ ج)

"وَلَا الْمُشْرِكِیْنَ" کے بجائے "وَالْمُشْرِكِیْنَ" پڑھنے کا حکم

سوال:- زید نے نماز میں قراءت کی، دورِ قراءت میں آیت: "مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ" (پارہ نمبر ۱، آیت نمبر ۱۰۵، سورۂ بقرہ) میں زید نے "وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ" کی جگہ "وَالْمُشْرِكِيْنَ" پڑھ دیا، کیا اس سے نماز ادا ہوگئی یا نہیں؟

جواب:- مذکورہ صورت میں نماز ہوگئی،[۳] دہرانے کی ضرورت نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۳/۲۸ ب)

---

(۲) وفي الهندية ج ۱ ص ۷۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئته) وإن كان لا يمكن الفصل بين الحرفين إلا بمشقة كالظاء مع الضاد [illegible] فأكثرهم لا تفسد صلاته، هكذا في فتاوى قاضي خان وكثير من المشائخ أفتوا به۔ [illegible] حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا رسالہ "رفع التضاد عن حکم الضاد" [illegible] ص ۳۲۵ [illegible]۔

(۳) وفي الهندية ج ۱ ص ۷۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئته) ومنها حذف حرف، إن كان الحذف على سبيل الإيجاز والترخيم فإن وجد شرائطه [illegible] لا تفسد صلاته، وإن لم يكن على وجه الإيجاز والترخيم فإن كان لا يغيّر المعنى لا تفسد صلاته ... الخ

تین چھوٹی آیات کے برابر آدھی آیت پڑھنے سے نماز ہوجائے گی

سوال:- نماز میں قرآن کی ایک بڑی آدھی آیت جو چھوٹی تین آیتوں کے برابر ہو، اسے پڑھنے سے نماز ہوگئی یا نہیں؟ اگر نہیں ہوئی تو کیا اعادہ کرنا ہوگا؟

جواب:- صورت مسئولہ میں نماز ہوگئی، اعادے کی ضرورت نہیں۔ لان نصف الآية لطولها، كان يزيد على ثلاث آيات قصار يصح على قولهما، فعلى قول ابى حنيفة المكتفى بالآية أولى، كذا في رد المحتار۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۶ھ
(فتوی نمبر ۹۹۵/۲۸ ج)

نماز میں مجہول قراءت کرنا

سوال ا:- اور بالی کی جامع مسجد کا امام مجہول پڑھتا ہے، اس لئے کسی کی نماز نہیں ہوتی، شرعاً کیا حکم ہے؟ ۲- ض کی جگہ ڈ پڑھتا ہے، اس کا حکم کیا ہے؟ ۳- اور اس مسئلے میں اگر کسی امام صاحب نے غلط مسئلہ بتایا ہو تو اس کے پیچھے نماز جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب ۱- مجہول پڑھنا غلط ہے، اس کی اصلاح کی کوشش ضروری ہے، مگر اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، اگر کوئی اور حافظ نہ ملتا ہو تو مجبوراً اسی کے پیچھے پڑھ لیں۔

۲- ض کو صحیح مخرج سے ادا کرنے کی کوشش بھی واجب ہے، تاہم جس شخص سے کوشش کے باوجود صحیح مخرج سے نہ نکلے اس کی نماز صحیح قول کی بناء پر ہوجاتی ہے، لیکن امام صاحب نے اس کے خلاف مسئلہ بتایا انہوں نے غلط کہا، لیکن محض اس بناء پر ان کے پیچھے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۱/۹/۱۸ھ
(فتوی نمبر ۹۶۹/۲۸ ج)

---

(۱) رد المحتار ج:۱ ص:۵۳۷ (طبع سعید) وفي الشامية أيضاً ج:۱ ص:۵۳۸ ولو قرأ آية طويلة في الركعتين [illegible] آية الكرسي [illegible] في ركعة [illegible] في ركعة [illegible] ابي حنيفة [illegible] لانه [illegible] في كل ركعة وعامتهم على أنه يجوز وكذا في الهندية ج:۱ ص:۷۸ (طبع رشیدیہ کوئٹہ)
[illegible] ج:۱ ص:۵۹۰۔

(۲) وفي غنية المستملي شرح المنية ص [illegible] ولو لم يكن [illegible] كلها مع [illegible] والصد مع [illegible] مع [illegible] على [illegible] وكذا في الهندية ج [illegible] ص [illegible] ص:۳۲۵ [illegible]

بیچ میں چھوٹی سورت چھوڑ کر قراءت کرنا

سوال:- امام صاحب وتروں میں رمضان المبارک کے اندر پہلی رکعت میں "قُلْ يٰاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ"، دوسری میں "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ" اور تیسری میں سورۂ اخلاص پڑھتے ہیں، اور "تَبَّتْ يَدَآ" چھوڑ دیتے ہیں، یہ کہاں تک درست ہے؟

جواب:- اس طرح بیچ میں کوئی سورت چھوڑ کر قراءت کرنا مکروہ ہے، بشرطیکہ قصداً ایسا کیا گیا ہو، اور سہواً ہو تو کراہت بھی نہیں ہے، اور نماز ہر صورت میں ہوگئی، نہ سجدۂ سہو واجب ہے، نہ اعادہ۔

لما فی الدر المختار: ویکرہ الفصل بسورۃ قصیرۃ[1]

وفی رد المحتار: الفصل بالقصیرۃ انما یکرہ اذا کان عن قصد، فلو سہوا فلا، کما فی شرح المنیۃ (شامی قبیل باب الامامۃ ج:۱ ص:۳۶۷)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۶۹/۲۷ ب)

۱:- فجر کی پہلی رکعت کو دُوسری رکعت سے طویل کرنا
۲:- قراءت میں متعدد غلطیوں کا حکم

سوال ۱:- امام مسجد نے فجر کی جماعت میں پہلی رکعت میں سورۂ مزمل کی "يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ" سے "فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا" پڑھیں، دوسری رکعت میں دوسرا رکوع سورۂ مذکور کا جو ایک لمبی آیت ہے پڑھ کر سجدہ کیا، کیا نماز ہوئی؟ لوگ کہتے ہیں کہ پہلی رکعت سے دُوسری رکعت میں لمبی سورت نہیں پڑھنی چاہئے، کیا اس کی کیا حقیقت ہے؟

۲:- امام صاحب نے پہلی رکعت میں سورۂ والعصر پڑھتے ہوئے "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کی جگہ "فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ" پڑھا، جب ختم آیت "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ" پڑھنا شروع کردیا، پھر دُوسری رکعت میں سورۂ قریش کی تلاوت کی، سجدۂ سہو کرکے نماز ختم کرلی، یہ نماز دُرست ہوئی یا نہیں؟

جواب ۱:- فجر کی نماز میں پہلی رکعت کو دوسری رکعت سے زیادہ طویل کرنا مستحب ہے اور اس کے برعکس مکروہ تنزیہی ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جو امام صاحب نے پہلی رکعت میں مختصر اور

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۱۳۲ (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) شامیۃ ج:۱ ص:۵۴۷ (طبع سعید)

دوسری رکعت میں اس کے مقابلے میں طویل قراءت کی اس سے مکروہِ تنزیہی کا ارتکاب ہوا، لیکن نماز صحیح ہوگئی۔

لما في الدر المختار: (وتطال أولى الفجر على ثانيتها) (واطالة الثانية على الأولى يكره) تنزيها (اجماعا ان بثلاث آيات) ان تقاربت طولا وقصرا، والا اعتبر الحروف والكلمات، واعتبر الحلبي فحش الطول لا عدد الآيات۔ (شامی ج ۱ ص ۳۶۴)۔[1]

۲- نماز تو صحیح ہوگئی، لیکن امام صاحب نے چند غلطیاں کیں، ایک تو جب نہیں یاد آیا تھا تو سورۂ عصر ہی کی تکمیل کرنی چاہئے تھی انہوں نے اس کو ادھورا چھوڑ دیا، دوسرے سورۂ عصر کے بعد سورۂ فیل شروع کردی، اور اس طرح ایک سورت یعنی سورہ ہمزہ کو بیچ میں چھوڑ کر قراءت کی، یہ بھی مکروہ ہے۔

أما في ركعة فيكره الجمع بين سورتين بينهما سور أو سورة۔ (شامی ج ۱ ص:۳۶۷)۔[2]

تیسرے ان غلطیوں پر سجدۂ سہو کیا، حالانکہ ان صورتوں میں سجدۂ سہو نہیں ہے، بہرحال نماز ہوگئی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۲/۲۸ ج)

---

(۱) الدر المختار ج ۱ ص ۵۴۰، ۵۴۱ طبع ایچ ایم سعید، وفي ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر ج ۱ ص ۹۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وتطال الأولى على الثانية في الفجر فقط، وعند محمد في الكل وفي مجمع الأنهر تحته: بيان السنة، وهذا يعني اطالة القراءة في الركعة الأولى على الثانية في الفجر متفق عليه للتوارث، ... وفي الهندية ج ۱ ص ۷۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) واطالة القراءة في الركعة الأولى على الثانية من الفجر مسنونة بالاجماع

(۲) شامية ج ۱ ص ۵۴۶ طبع ایچ ایم سعید، وفي مراقي الفلاح ج ۱ ص ... طبع مكتبة علم الحديث دمشق) ويكره تكرار السورة في ركعة واحدة من الفرض ... والجمع بين سورتين بينهما سور أو سورة وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح (قوله والجمع بين سورتين ... الخ) اى في ركعة واحدة لما فيه من شبهة التفضيل والهجر قوله لا يكره هذا في النوافل، يعني القراءة منكوسا والفصل والجمع وهذا كله في الفرائض (ص ۲۱۲) وفي الهندية ج ۱ ص ۷۸ (مكتبه رشيديه، كوئٹه) واذا جمع بين سورتين بينهما سور أو سورة واحدة في ركعة واحدة يكره ... الخ.

﴿فصل فی السنن والنوافل﴾
(سنن اور نوافل نمازوں کے بیان میں)

نمازِ اشراق وچاشت دو، دو رکعت کر کے پڑھ سکتے ہیں

سوال:- نماز اشراق وچاشت، دو رکعت کر کے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- پڑھ سکتے ہیں، البتہ چاشت کی نماز چار رکعت پڑھنا بہتر ہے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲/۷ ۱۹ الف)

تحیۃ المسجد واجب ہے یا مستحب؟

سوال:- بخاری شریف کی ایک حدیث کا حوالہ دے کر تحیۃ المسجد کی دو رکعت نماز، بیٹھنے سے پہلے ادا کرنے کے لئے زور دے کر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ نہ ادا کرنے پر تحت گناہ کا مرتکب قرار پائے گا، یعنی تقریباً واجب کا درجہ دیا جاتا ہے، اہل السنۃ والجماعت کا اس پر کیا عمل اور فتویٰ ہے؟

جواب:- "تحیۃ المسجد" پڑھنا مستحب ہے، اس کے چھوڑنے والے کو گنہگار نہیں کہا جاسکتا، حدیث کا مطلب صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے؟ اور صحابہ رضی اللہ عنہم تحیۃ المسجد کو واجب نہیں سمجھتے تھے۔ بخاری شریف کی حدیث میں امر استحباب کے لئے ہے۔ قال ابن بطال: اتفق أئمة الفتوى على أنه محمول على الندب، والإرشاد مع استحبابهم الركوع لكل من دخل المسجد لما روى أن كبار أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يدخلون المسجد ثم يخرجون ولا يصلون۔ (حاشیہ بخاری ج ۱ ص ۶۳)۔[1] واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹۵/۱۹ الف)

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانہ)۔ وفي التنوير مع شرحه باب الوتر مطلب تحية المسجد ج ۲ ص ۱۸ (طبع ایچ ایم سعید) (وسن تحية) رب المسجد وهي ركعتان الخ وفي الشامية والحاصل أن المطلوب من داخل المسجد أن يصلي فيه ليكون ذلك تحية لربه تعالى ..... الخ

سنتِ مؤکدہ کا ترک

سوال:- سنت نمازوں میں سنتِ مؤکدہ کے جان بوجھ کر نہ ادا کرنے پر عذاب و سزا سے متعلق احادیث یا ان کا حوالہ لکھ دیں۔

جواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر مداومت فرمانا، اس کے ترک کے ناجائز ہونے کی کافی دلیل ہے، اور ترکِ سنت پر جو وعیدیں حدیث میں آئی ہیں وہ سب اس کی دلیل ہیں۔[1]

واللہ اعلم

الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ	۱۳۸۹/۲/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹۵/ ۱۹ الف)

جمعہ کی سنتوں کی تعداد

سوال:- ظہر اور جمعہ کی کل کتنی رکعتیں ہیں؟ کیا ان کی تعداد میں ائمہ کا اختلاف ہے؟

جواب:- جہاں تک فرض نماز کی رکعتوں کا تعلق ہے، ان کی تعداد میں کوئی اختلاف نہیں ہے، سب کے نزدیک ظہر کی چار رکعتیں اور جمعہ کی دو رکعتیں ہوتی ہیں۔ ظہر کی سنتوں کے بارے میں بھی حنفیہ کے نزدیک اتنی بات متفق علیہ ہے کہ ان کی تعداد چھ ہے، چار فرضوں سے پہلے اور دو فرضوں کے بعد۔

اب جمعہ کا معاملہ رہ جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کا مشہور مذہب اس معاملے میں یہ ہے کہ جمعہ میں چار رکعتیں فرض نماز سے پہلے اور چار رکعتیں فرض نماز کے بعد سنتِ مؤکدہ ہیں۔[2] ابنِ ماجہ وغیرہ کی

(۱) وفی جامع الترمذی باب ما جاء فیمن صلی فی یوم ولیلة ثنتی عشرة رکعة من السنة ج ۱ ص ۹۴ (طبع ایچ ایم سعید) عن عائشة رضی اللہ عنها قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من ثابر علی ثنتی عشر رکعة من السنة بنی اللہ له بیتًا فی الجنة، أربع رکعات قبل الظهر ورکعتین بعدها ورکعتین بعد المغرب ورکعتین بعد العشاء ورکعتین قبل الفجر. وفی الشامیة کتاب الطهارة مطلب فی السنة وتعریفها ج ۱ ص ۱۰۴ (طبع ایچ ایم سعید) الذی یظهر من کلام أهل المذهب أن الاثم منوط بترک الواجب أو السنة المؤکدة علی الصحیح لتصریحهم بأن من ترک سنن الصلوات الخمس قیل لا یأثم والصحیح أنه یأثم. وفی البحر الرائق ج ۲ ص ۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) رجل ترک سنن الصلوات الخمس ان لم یر السنن حقا فقد کفر لأنه ترک استخفافا وان رأی حقا منهم من قال لا یأثم والصحیح انه یأثم لأنه جاء الوعید بالترک اھ۔ نیز دیکھئے امداد الاحکام ج ۱ ص ۲۰۹۔

(۲) عن سهیل عن أبیه عن أبی هریرة قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اذا صلّی أحدکم الجمعة فلیصل بعدها أربعا رواہ مسلم ج ۱ ص ۲۸۸. وفی الجامع للامام الترمذی وروی عن عبداللہ بن مسعودؓ انه کان یصلی قبل الجمعة أربعًا وبعدها أربعًا. الخ ج ۱ ص ۶۹. وفی الشرح الکبیر ص ۳۸۸ السنة قبل الجمعة أربع وبعدها أربع، اما الأربع بعدها فلما روی مسلم عن أبی هریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اذا صلیتم بعد الجمعة فصلوا أربعا. وفی روایة للجماعة الا البخاری اذا صلی أحدکم الجمعة فلیصل بعدها أربعا. وفی البحر الرائق ج ۲ ص ۴۹ باب النوافل والدلیل علی سنیة الأربع قبل الجمعة ما رواہ مسلم مرفوعا

(باقی اگلے صفحے پر)

بعض احادیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے (رد المحتار ج:۱ ص:۶۳۰، سنتوں)[1]۔ لیکن حنفیہ ہی کے بعض مشائخ کا یہ کہنا ہے کہ فرضوں کے بعد ظہر کی طرح صرف دو رکعتیں مسنون ہیں (فتح القدیر ج:۱ ص:۳۱۶)[2]۔

امام ابویوسفؒ جمعہ کے بعد چھ رکعتوں کو سنت قرار دیتے ہیں[3]، حضرت علیؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے[4]۔ اسی وجہ سے متأخرین علماء نے اس پر فتویٰ دیا ہے کہ جمعہ کے بعد چھ رکعتیں پڑھنی چاہئیں، پہلے چار، پھر دو، تاکہ تمام فقہاء کے مذہب کے مطابق سنت ادا ہو جائے۔ شیخ ابراہیم حلبی "شرح منیہ" میں فرماتے ہیں: "والافضل ان یصلی اربعا ثم رکعتین للخروج عن الخلاف"

افضل یہ ہے کہ پہلے چار رکعتیں پڑھی جائیں، پھر دو رکعتیں، تاکہ اختلاف باقی نہ رہے۔

(غنیۃ المتملی ص:۳۴۷، مجتبائی ۱۳۲۳ھ)[5]۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۵ ربیع الاول ۱۳۸۷ھ[6]

---

(۱) (تحت قوله) ..... من كان مصليًا قبل الجمعة فليصل أربعًا، مع ما رواه ابن ماجة عن ابن عباسؓ قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يركع من قبل الجمعة أربعًا لا يفصل في شيء منهن، وعلى سنان الأربع بعدها ما في صحيح مسلم عن أبي هريرة مرفوعًا: إذا صلى أحدكم الجمعة فليصل بعدها أربعًا، وفي رواية: إذا صليتم بعد الجمعة فصلوا أربعًا.
وفي بدائع الصنائع ج: ۱ ص: ۲۸۵ (الصلوة المسنونة) وأما السنة قبل الجمعة وبعدها فقد ذكر في الأصل وأربع قبل الجمعة وأربع بعدها.

(۲) فتاویٰ شامیہ ج: ۲ ص: ۱۳ طبع ایچ ایم سعید، (۳) فتح القدیر ج: ۱ ص: ۳۱۶ مکتبہ رشیدیہ

(۳) وفي غنية المتملي ص: ۳۹۹ طبع سهيل اكيدمي لاهور، وعند أبي يوسف السنة بعد الجمعة ست ركعات وهو مروي عن عليؓ. وفي البحر الرائق ج: ۲ ص: ۴۹ باب النوافل وعن أبي يوسف أنه ينبغي أن يصلي أربعًا ثم ركعتين. وفي منحة الخالق على هامش البحر الرائق ج: ۲ ص: ۴۹ قوله وعن أبي يوسف، قال في الخزائن وعن علي رضي الله عنه يصلي ست ركعات ثم أربعًا، وعنه رواية أخرى أنه يصلي بعدها ستًا أربعًا ثم ركعتين وبه أخذ أبو يوسف والطحاوي ... الخ
وفي فتح القدير ج: ۲ ص: ۳۹ قبيل باب صلاة العيدين .. أن السنة بعدها ست وهو قول أبي يوسف ... الخ

(۴) عن أبي عبد الرحمن عن علي رضي الله عنه أنه قال من كان مصليًا بعد الجمعة فليصل ستًا. أخرجه الطحاوي (كتاب الصلوة، باب التطوع بعد الجمعة ج: ۱ ص: ۲۳۳) وفيه أيضًا وعن أبي عبد الرحمن قال علّمنا ابن مسعود أن نصلي بعد الجمعة أربعًا فلما جاء علي بن أبي طالب رضي الله عنه علّمنا أن نصلي ستًا اهـ. وفي الجامع للإمام الترمذي ج: ۱ ص: ۹۹ وروي عن عبد الله بن مسعود أنه كان يصلي قبل الجمعة أربعًا وبعدها أربعًا، وروي عن علي بن أبي طالب أنه أمر أن يصلي بعد الجمعة ركعتين ثم أربعًا، وعن أبي عبد الرحمن السلمي قال قدم علينا عبد الله رضي الله عنه فكان يصلي بعد الجمعة أربعًا فقدم بعده علي رضي الله عنه فكان إذا صلى الجمعة صلى بعدها ركعتين وأربعًا فأعجبنا فعل علي رضي الله عنه فاخترناه. رواه الطحاوي باب التطوع بعد الجمعة ج: ۱ ص: ۲۳۳، وفي آثار السنن إسناده صحيح ص: ۳۰۳

(۵) وفي غنية المستملي ص: ۳۱۶ طبع سهيل اكيدمي لاهور، والأفضل أن يصلي أربعًا ثم ركعتين للخروج عن الخلاف. وفي البحر الرائق ج: ۲ ص: ۴۹ باب النوافل، وفي الخزانة والتجنيس وكثير من المشايخ على قول أبي يوسف وفي منية المصلي والأفضل عندنا أن يصلي أربعًا ثم ركعتين. وفي منحة الخالق على هامش البحر الرائق ج: ۲ ص: ۴۹ (قوله وعن أبي يوسف)، قال في الخزانة وعن علي أنه يصلي ستًا، ركعتين ثم أربعًا، وعنه رواية أخرى أنه يصلي بعدها ستًا أربعًا ثم ركعتين وبه أخذ أبو يوسف والطحاوي وكثير من المشايخ رحمهم الله تعالى، وعلى هذا قال شمس الأئمة الحلواني الأصل أن يصلي أربعًا ثم ركعتين فقد أشار إلى أنه مخير بين تقديم الأربع وبين تقديم المثنى ولكن الأفضل تقديم الأربع كيلا يصير متطوعًا بعد الفرض مثله. وفي فتح القدير ج: ۲ ص: ۳۹ قبيل باب صلوة العيدين ..... فهذا البحث يفيد أن السنة بعدها ست وهو قول أبي يوسف وقيل قولهما

(۶) یہ فتویٰ .... ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

۱:- جمعہ کی سنتوں کی تعداد

۲:- سنتِ غیر مؤکدہ پڑھنے کا طریقہ

سوال ۱:- جمعہ کے بعد کتنی سنتیں پڑھنی چاہئیں؟

۲:- سنت غیر مؤکدہ کس طرح پڑھنی چاہئے؟ اور اس میں کیا پڑھیں؟

جواب ۱:- جمعہ کے بعد چھ رکعت مسنون ہیں،[۱] پہلے چار، پھر دو پڑھیں تو بہتر ہے،[۲] اور اس کے برعکس بھی جائز ہے۔

۲:- سنتِ غیر مؤکدہ کا کوئی الگ طریقہ نہیں، نہ کوئی خاص قراءت مقرر ہے، بلکہ اور نمازوں ہی کی طرح پڑھی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۲/۲۸ الف)

صبحِ صادق اور فجر کے بعد نوافل پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک صاحب کہتے ہیں کہ صبح صادق کے بعد سے فجر کی سنتیں اور فرض پڑھنے تک وقفے میں کوئی نماز نفل وغیرہ نہیں پڑھی جا سکتی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد طلوعِ آفتاب تک اور عصر و مغرب کے درمیان یا سورج نکلتے وقت تک، اور نصف النہار کے وقت نماز جائز نہیں ہے، باقی اوقات میں جائز ہے۔

جواب:- ان صاحب نے درست کہا ہے، فجر کی نماز کے بعد تو نوافل پڑھنا ناجائز ہے، صبح صادق کے بعد بھی سوائے فجر کی دو سنتوں کے کوئی اور نفل پڑھنا جائز نہیں۔

کما فی الدر المختار وکذا الحکم من کراھۃ نفل وواجب لغیرہ لا فرض وواجب لعینہ بعد طلوع فجر سوی سنتہ لشغل الوقت بہ تقدیرا (شامی ج ۱ ص ۳۵۱)۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۱ھ

سنتِ مؤکدہ کو بلا عذر ترک کرنا

سوال:- عمر کہتا ہے کہ دن کی پانچ نمازوں کے فرائض پورے کرنے جائیں تو یہی کافی

(۱، ۲) تفصیل کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔
(۳) الدر المختار، کتاب الصلوٰۃ ج ۱ ص ۳۷۵، طبع ایچ ایم سعید [illegible] کفایت المفتی ج ۳ ص ۳۳۲ (جدید ایڈیشن دار الاشاعت)۔ (مرتب عفی عنہ)

ہے، باقی سنت مؤکدہ وغیرہ ادا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیا عمر کا یہ خیال درست ہے؟

جواب:- عمر کا کہنا غلط ہے، سنت مؤکدہ کو مستقل طور پر چھوڑے رکھنا سخت گناہ ہے۔[۱]

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۴/۴۰ الف)

زوال سے پہلے جمعہ کی سنتیں پڑھنا

سوال:- مسئلہ مسئولہ فتویٰ نمبر ۲۶۰ جلد ۲۸ الف سے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر حنفی مسلک والے ابتدائے زوال سے قبل چار رکعت جمعہ پڑھ لیں کہ کبھی پڑھتے ہیں تو کیا ان کی سنتیں ادا ہو جائیں گی؟ دوسری بات یہ بھی واضح کریں کہ اگر ان سنتوں کو بعد میں ادا کیا جائے تو فرضوں سے متصل[۱] کیا جائے یا بقیہ نماز کی ترتیب قائم رکھتے ہوئے یہ بعد میں ادا کی جائیں؟

جواب:- زوال سے پہلے جمعہ کی سنتیں ادا نہ ہوں گی، فرض کے بعد ادا ہو جائیں گی[۲]، اور اس میں بہتر یہ ہے کہ پہلے جمعہ کے بعد والی چھ سنتیں پڑھیں، اس کے بعد پہلے والی سنتیں ادا کی جائیں[۳]، لیکن اگر برعکس کر لیا تو بھی جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۶ھ

صلوٰۃ التسبیح کی جماعت کا حکم

سوال:- صلوٰۃ التسبیح شعبان کی پندرھویں کو باجماعت پڑھنے کا ہمارا ارادہ ہو رہا ہے، یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- صلوٰۃ التسبیح نفلی نماز ہے، اور اس کی جماعت حنفیہ کے مسلک میں مکروہ تحریمی ہے،

---

(۱) في الهندية ج ۱ ص ۳۰۱ رجل ترك سنن الصلاة إن لم ير السنن حقا فقد كفر، لأنه تركها استخفافا وإن رآها حقا فالصحيح أنه يأثم، لأنه جاء الوعيد بالترك، كذا في محيط السرخسي. وفي البحر الرائق ج ۲ ص ۴۹ (طبع ايج ايم سعيد) رجل ترك سنن الصلوات الخمس إن لم ير السنن حقا فقد كفر، لأنه ترك استخفافا، وإن رأى حقا منهم من قال لا يأثم والصحيح أنه يأثم لأنه جاء الوعيد بالترك. وكذا في الشامية ج ۲ ص ۴۰ (طبع ايج ايم سعيد)

(۲) في الدر المختار، باب إدراك الفريضة ج ۲ ص ۵۸ (طبع سعيد) بخلاف سنة الظهر، وكذا الجمعة فإنه إن خاف فوت ركعة يتركها ويقتدي ثم يأتي بها على أنها سنة في وقته، أي الظهر قبل شفعه عند محمد، وبه يفتى

(۳) وفي الشامية، باب إدراك الفريضة ج ۲ ص ۵۹ (طبع سعيد) أقول وعليه المتون لكن رجح في الفتح تقديم الركعتين، قال في الإمداد وفي فتاوى العتابي المختار وفي مبسوط شيخ الإسلام أنه الأصح لحديث عائشة أنه عليه الصلوة والسلام كان إذا فاته الأربع قبل الظهر يصليهن بعد الركعتين، وهو قول أبي حنيفة وكذا في جامع قاضي خان. وكذا في غنية المستملي ص ۳۹۸ (طبع سهيل اكيڈمي لاهور)

لہٰذا یہ نماز تنہا پڑھنی چاہئے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۵/۱۰/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۰۸/۳۰ د)

تہجد کی نیت کس طرح کریں؟

سوال:- تہجد کی نیت نفل کی ہوگی یا سنت کی؟

جواب:- نماز تہجد میں نفل کی نیت کی جائے گی۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۷۶۲/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ

شبِ قدر کی نوافل کا طریقہ

سوال:- مؤدبانہ گزارش ہے کہ ہم آپ سے ایک مسئلے کے بارے میں فتویٰ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس درخواست کے ساتھ جو پرچہ منسلک ہے اس میں لیلۃ القدر کے نوافل کے بارے میں ہماری مسجد (مسجد رحمانیہ) کے امام صاحب نے بتایا ہے کہ یہ طریقۂ نوافل غلط ہے، اور کہیں حدیث میں لیلۃ القدر کے نوافل کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ لہٰذا ہم آپ سے التماس کرتے ہیں کہ آپ ہم کو شریعت کی رُو سے صحیح طریقے سے آگاہ فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

جواب:- منسلکہ اشتہار[۲] میں شبِ قدر کی نوافل کا جو طریقہ لکھا ہے وہ فقہ و حدیث کی مستند و معروف کتابوں میں کہیں نظر سے نہیں گزرا، اشتہار میں بھی کوئی حوالہ کسی مستند کتاب حدیث کا نہیں دیا گیا کہ اس سے تحقیق کی جاسکتی۔ صحیح احادیث میں شبِ قدر کے بارے میں مطلق نوافل کی فضیلت وارد ہے، کسی خاص طریقے کی نہیں۔[۳]

واللہ اعلم
۱۴۰۰/۹/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۷۸/۳۱ د)

---

(۱) فی الدر المختار ج ۲ ص ۴۸ (قبیل باب ادراک الفریضۃ) ولا یصلی الوتر ولا التطوع بجماعۃ خارج رمضان أی یکرہ ذلک علی سبیل التداعی بأن یقتدی أربعۃ بواحد کما فی الدرر الخ وفی غنیۃ المتملی ص ۴۳۲ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) اعلم أن النفل بالجماعۃ علی سبیل التداعی مکروہ علی ما تقدم ما عدا التراویح نیز دیکھئے: فتاوی دار العلوم دیوبند ج ۴ ص:۲۳۳۔

(۲) یہ اشتہار، ریکارڈ میں موجود نہیں ہے، تاہم اس اشتہار میں جماعت کے ساتھ نفل کا کوئی مخصوص طریقہ لکھا گیا تھا۔

(۳) وفی غنیۃ المتملی النوافل ج ص ۴۳۲ واعلم أن النفل بالجماعۃ علی سبیل التداعی مکروہ علی ما تقدم ما عدا التراویح وصلوۃ الکسوف والاستسقاء، فعلم أن کلا من صلوۃ الرغائب لیلۃ أول جمعۃ من رجب وصلوۃ البراءۃ لیلۃ النصف من شعبان وصلوۃ القدر لیلۃ السابع والعشرین من رمضان بالجماعۃ بدعۃ مکروھۃ نیز دیکھئے فتاوی دار العلوم دیوبند ج ۴ ص:۲۲۴۔ ......(باقی اگلے صفحے پر)

سنن ونوافل گھر میں پڑھنی چاہئیں یا مسجد میں؟

سوال:- ملفوظات حکیم الامت اشرفیہ ص ۱۵۶ ملفوظ نمبر ۶۵۹ میں ہے ایک شخص نے دریافت کیا کہ نماز سنت فجر مکان میں پڑھ کر مسجد جاتا ہوں، اس وقت نماز تحیۃ مسجد پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟ فرمایا کہ "اس وقت نہ تحیۃ المسجد ہے، نہ تحیۃ الوضوء، نیز ان سنتوں کا مسجد میں پڑھنا افضل ہے، بلکہ جمیع سنن مؤکدہ کا، تاکہ اتہام بتشبہ اہل بدعت سے محفوظ رہے، جو کہ تارکین سنت ہیں۔" اور ہم نے یہ سنا ہے کہ مکان میں فجر کی سنتیں پڑھنا مسنون ہے، اس کی تطبیق کیا ہے؟

جواب:- فی الدر المختار: والأفضل فی النفل غیر التراویح المنزل الا لخوف شغل عنها، والأصح أفضلیة ما کان أخشع وأخلص. وقال الشامی: وحیث کان هذا أفضل یراعی ما لم یلزم منه خوف شغل عنها لو ذهب لبیته، أو کان فی بیته ما یشغل باله ویقلل خشوعه فیصلیها حینئذٍ فی المسجد. (شامی ج:۱ ص:۴۵۸)[1]

اس سے معلوم ہوا کہ اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ تمام سنن ونوافل کا گھر میں پڑھنا افضل ہے، لیکن کسی عارض کی بناء پر یہ افضلیت منتقل ہوسکتی ہے، اور عوارض مختلف ہوسکتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں چونکہ سنتوں کو گھر کے لئے چھوڑنے سے خطرہ یہ رہتا ہے کہ کہیں بالکل ہی رہ نہ جائیں، اس لئے متأخرین نے سنن مؤکدہ کو مسجد میں پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت تھانویؒ کا مذکورہ فتویٰ بھی اسی قسم کی عارض پر مبنی ہے، اور اس کے ساتھ تہمت بتشبہ اہل بدعت کی علت مزید شامل کردی ہے، اور حضرت تھانویؒ کا یہ فتویٰ امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۸۸[2] میں بھی موجود ہے۔　　واللہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۵۷ /۲۸ ب)

فجر کی سنتیں چھوٹ جائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- فجر کی سنتیں چھوٹ جانے کے بعد کیا کرنا چاہئے؟ کیا اس کی قضا کی جاسکتی ہے؟

جواب:- طلوع آفتاب کے بعد زوال سے پہلے امام محمدؒ کے نزدیک سنتوں کی قضا کی

(گذشتہ پیوستہ) ...... وفی الدر المختار ج ۲ ص ۲۵، ۲۶ (طبع ایچ ایم سعید) ومن المندوبات ... احیاء لیلة العیدین، والنصف من شعبان، والعشر الأخیر من رمضان، والأول من ذی الحجة. وفی الشامیة تحته علی الصفحة ۲۶: وفی الامداد ویحصل القیام بالصلوة نفلا فرادی من غیر عدد مخصوص، وبقراءة القرآن والأحادیث ... بتمة الشر ... فرادی الی ما ذکره بعد فی متن من قوله ویکره الاجتماع علی احیاء لیلة من هذه اللیالی فی المساجد ... ومن روی من الصلوات فی هذه الأوقات یصلی فرادی غیر التراویح

(۱) فتاوی شامیہ باب الوتر والنوافل ج ۲ ص ۲۲ طبع ایچ ایم سعید

(۲) امداد الفتاوی ج ۱ ص ۳۰۹ و ص ۳۰۵ طبع مکتبہ دار العلوم کراچی، نیز دیکھئے فتاوی دار العلوم دیوبند ج ۴ ص ۲۲۶۔

جاسکتی ہے، البتہ شیخینؒ کے نزدیک تنہا سنتوں کی قضا نہیں، ہاں! اگر فرض نماز بھی قضا ہوگئی ہو تو زوال سے پہلے فرض اور سنت دونوں کی قضا کرنی چاہئے۔ [1]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح
محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۳۰۰/۱۸ الف)

فجر کے فرض شروع ہونے کے بعد سنتیں کس وقت تک ادا کی جاسکتی ہیں؟

سوال:- فجر کے وقت جب مسجد میں داخل ہوا تو امام صاحب نماز پڑھا رہے تھے، میں سنتیں پڑھے بغیر جماعت میں شریک ہوا، بعد ازاں سورج نکلنے کے بعد سنتیں ادا کیں، تو میرا یہ عمل دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- فجر کی سنتوں کے بارے میں سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ گھر میں ادا کرکے مسجد جائیں۔ [2] اور اگر گھر میں پڑھے بغیر مسجد پہنچ جائیں تو جب تک جماعت کی رکعت، بلکہ تشہد مل سکتا ہو، فجر کی سنتیں دُور ہٹ کر کسی مقام پر پڑھ لینا جائز ہے، خواہ جماعت شروع ہوچکی ہو، لیکن اگر کوئی شخص جماعت میں شریک ہوگیا تو پھر امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق تنہا سنتوں کی قضا نہیں ہے، آپ نے جو سورج نکلنے کے بعد دو رکعتیں پڑھیں وہ آپ کی طرف سے نفل ہوگئیں۔

فی الدر المختار باب ادراک الفریضۃ واذا خاف فوت رکعتی الفجر لاشتغاله بسنتها ترکها لکون الجماعة اکمل والا بأن رجا ادراک رکعة فی ظاهر المذهب وقیل التشهد واعتمده المصنف والشرنبلالی تبعًا للبحر لکن ضعفه فی النهر وقال الشامی تحته لأن المدار هنا علی ادراک فضل الجماعة وقد اتفقوا علی ادراکه بادراک التشهد فیأتی بالسنة اتفاقًا کما اوضحه فی الشرنبلالیة أیضًا وأقره فی شرح المنیة وشرح نظم الکنز (شامی ج ۱ ص ۴۴۹) [3]

وفی رد المحتار أیضا قوله ولا یقضیها الا بطریق التبعیة أی لا یقضی سنة الفجر الا اذا فاتت

---

(۱) وفی رد المحتار ج ۲ ص ۵۷ (طبع سعید) اذا فاتت وحدها فلا تقضی قبل طلوع الشمس بالاجماع لکراهة النفل بعد الصبح، وأما بعد طلوع الشمس فکذلک عندهما وقال محمد أحب الی أن یقضیها الی الزوال کما فی الدرر قیل هذا قریب من الاتفاق .... الخ

(۲) وفی غنیة المستملی ص ۳۹۹ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) ثم السنة فی سنة الفجر [illegible] أن یأتی بها فی بیته وهو الأفضل [illegible] وعند باب المسجد [illegible] مکة ذلک [illegible] الخ نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۲۴۰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱۔

(۳) الدر المختار مع رد المحتار ج ۲ ص ۵۶ (طبع سعید)

مع الفجر فیقضیها تبعًا لقضائه لو قبل الزوال۔ (أیضًا ج ۱ ص ۷۵۰)۔[1] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۲۵ھ

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۹۳ الف)

سننِ مؤکدہ کو بلاعذر بیٹھ کر پڑھنا

سوال:- سننِ مؤکدہ کا قیام فرض ہے یا سنت یا مستحب؟

جواب:- سننِ مؤکدہ کو کھڑے ہوکر پڑھنا افضل اور مستحب ہے، اور بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے، لما فی مراقی الفلاح (یجوز النفل) انما عبر به لیشمل السنن المؤکدة وغیرها فتصح اذا صلاها (قاعدًا مع القدرة علی القیام) وقد حکی فیه اجماع العلماء ... الخ. وقال الطحطاویؒ قوله (یجوز النفل قاعدًا) مطلقًا من غیر کراهة کما فی مجمع الأنهر. (طحطاوی علی مراقی الفلاح باب النوافل ص ۲۲۰)۔[2]

البتہ فقہاءؒ کی ایک جماعت نے سنتِ فجر کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے، یعنی ان کے نزدیک ان کو بلاعذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے اور ان میں قیام فرض ہے (وخالفه الطحطاوی)۔[3] اور بعض حضرات نے تراویح کا بھی یہی حکم بتایا ہے، اگرچہ تراویح کے بارے میں قاضی خانؒ اور علامہ شامیؒ وغیرہ کا رُجحان اس طرف ہے کہ وہ سننِ فجر کے حکم میں نہیں، لیکن احتیاطاً حتی الامکان انہیں بھی کھڑے ہوکر پڑھنا چاہئے۔ لما فی الدر المختار ومنها (أی فرائض الصلوة) القیام فی فرض وملحق به کنذر وسنة فجر فی الأصح، وقال الشامیؒ ناقلًا عن الحلیة: وسنة الفجر لا تجوز قاعدًا من غیر عذر باجماعهم کما هو روایة الحسن عن أبی حنیفة کما صرح به الخلاصة فکذا التراویح وقیل یجوز .... قال قاضی خان وهو الصحیح. (شامی باب صفة الصلوة ج ۱ ص ۲۹۹)،[4] (ومثله فی شرح المنیة الکبیر ص:۲۶۷)۔[5]

بہرحال! فجر اور تراویح کے علاوہ دُوسری سننِ مؤکدہ میں فقہائے حنفیہ کا اتفاق ہے کہ قیام

---

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۵۷ (طبع سعید).
(۲) (طبع قدیمی کتب خانہ)
(۳) طحطاوی علی المراقی ص:۲۲۰ (طبع مذکور).
(۴) الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۴۴۴، ۴۴۵ (طبع سعید).
(۵) غنیة المتملی ص:۲۷۰ و ص:۲۱ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور)

فرض نہیں، مستحب ہے،[1] البتہ چونکہ سلف کا تعامل سنن مؤکدہ کو کھڑے ہوکر ہی پڑھنے کا رہا ہے اس لئے حتی الوسع اس تعامل کو ترک نہ کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۹۴/۲۹ ب)

توڑی ہوئی نفل نماز اور طواف ونذر کی نماز میں قیام کا حکم

سوال:- وہ نفل نماز جس کو شروع کرکے توڑ دیا ہو، اس کی قضا، نماز نذر اور نماز طواف میں قیام فرض ہے یا مستحب؟

جواب:- قیام یوں تو ہر فرض وواجب نماز میں فرض ہے، اور اس میں صلوۃ منذور اور صلوٰۃ بعد الطواف بھی داخل ہے۔ کما مرّ فی عبارۃ الدر المختار فی الجواب الثانی۔[2] لیکن توڑی ہوئی نفل نماز کے بارے میں بالکل صریح جزئیہ تو نہیں ملا۔ علامہ شامیؒ نے طحطاویؒ اور رحمتیؒ کے بارے میں صرف اتنا نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس مسئلے میں توقف کیا ہے،[3] (ج ۱ ص ۲۹۹ صفۃ الصلوۃ)، اور طحطاویؒ نے مراقی کی عبارت سے وجوب مستنبط کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: قولہ والواجبات ظاھرہ شمول قضاء النفل الذی أفسدہ (ص ۱۲۲، طبع قدیمی کتب خانہ)، لیکن اس کے مشابہ ایک مسئلے سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ توڑی ہوئی نفل نماز کی قضاء میں قیام، صاحبینؒ کے نزدیک واجب ہوگا اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب نہیں ہوگا۔

وذلک لما فی شرح المنیۃ: اما القعود بغیر عذر بعد الافتتاح قائمًا فیجوز عند أبی حنیفۃ لکن مع الکراھۃ علی ما اختارہ صاحب الھدایۃ وبلا کراھۃ علی ما اختارہ فخر الاسلام

---

(۱) وفی فتح باب العنایۃ بشرح النقایۃ ج ۱ ص ۳۳۷، ۳۳۸ (طبع بیروت) (ویتنفّل راکبًا وقاعدًا مع قدرۃ قیامہ) وفیہ تحتہ والسنن الرواتب نوافل وقال تحت قولہ (مع قدرۃ قیامہ) بما روی الجماعۃ الا مسلمًا عن عمران بن حصینؓ قال: سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن صلوۃ الرجل قاعدًا فقال: من صلّی قائمًا فھو أفضل ومن صلّی قاعدًا فلہ نصف أجر القائم، ومن صلّی نائمًا أو مضطجعًا فلہ نصف أجر القاعد وھذا فی صلوۃ النفل، لأن صلوۃ الفرض لا یجوز فیھا القعود مع القدرۃ علی القیام بالاجماع. وفی مجمع الأنھر شرح ملتقی الأبحر ج ۱ ص ۲۰۰ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) (وصح النفل قاعدًا مع القدرۃ علی القیام) بلا کراھۃ لما روی أنہ علیہ السلام کان یصلّی رکعتین قاعدًا بغیر عذر وفیہ اشارۃ الی أنہ لا تجوز المکتوبۃ والواجبۃ والمنذورۃ وسنۃ الفجر والتراویح بلا عذر والصحیح أن التراویح تجوز الخ. وفی المبسوط للسرخسی ج ۲ ص ۳۷ (طبع دار المعرفۃ بیروت) (الفصل السابع فی أدائھا (التراویح) قاعدًا من غیر عذر) اختلفوا فیہ قال بعضھم لا یجوز عن التراویح علی قیاس ما روی الحسن عن أبی حنیفۃ رحمھما اللہ تعالی فی رکعتی الفجر انہ لو أداھما قاعدًا من غیر عذر لم یجزہ عن السنۃ وعلیہ الاعتماد فکذا ھذا لأنھا مثلہ والصحیح انھا تجوز والفرق ظاھر فان رکعتی الفجر اکد واشھر وھذا الفرق ظاھر یوافق روایۃ أبی سلیمان عن أبی حنیفۃ وأبی یوسف ومحمد ومع الفرق فانہ لا یستحب لما فیہ من مخالفۃ السنۃ والسلف.

(۲) اس سے سابقہ فتویٰ مراد ہے۔

(۳) رد المحتار ج: ۱ ص: ۴۴۴ (طبع سعید)

وأما عندهما فلا يجوز اتمامها مع القعود بلا عذر بعد الافتتاح قائما أصلا لأن الشروع معتبر بالنذر ومن نذر صلوة ركعتين قائما لا يجوز له أن يصليهما قاعدا من غير عذر فكذا اذا شرع فيهما ولأبي حنيفة ان اللزوم بالشروع لضرورة صيانة المؤدى عن البطلان وصيانته عنه ليست موقوفة على القيام لصحته بدونه والضرورة تتقدر بقدرها ... ولذا اتفقوا على أنه لو نذر الحج ماشيا لزمه بصفة المشي ولو شرع فيه ماشيًا لا يلزمه (كبيری شرح منیۃ ص ۲۲۱ بعد فرائض الصلوة)۔[1]

اس میں امام ابوحنیفہؒ کی تعلیل صورت مسئولہ پر بھی پوری طرح منطبق ہے، لہٰذا امام صاحب کے قول کے قیاس پر صورت مسئولہ میں قیام واجب نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۹/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۶۹۲/۲۹ ب)

نوافل کی جماعت میں لوگوں کی شرکت کا اہتمام کرنا

سوال:- ایک آدمی چار، پانچ سال سے یکم محرم سے ۱۰ محرم تک نوافل باجماعت کا اہتمام کرتا ہے، اور ان دس راتوں میں قرآن کریم ختم کرتا ہے، جس میں لاؤڈ اسپیکر کا انتظام ہوتا ہے۔ کیا یہ جائز ہے یا بدعت؟ ایسے شخص کی اقتداء میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب:- لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کا اہتمام کرنا اور لوگوں کو شرکت کی دعوت دینا ''تداعی'' ہے، اور تداعی کے ساتھ نوافل کی جماعت مکروہ تحریمی ہے،[2] جو شخص اسے باعث ثواب سمجھے وہ مرتکب بدعت ہے، اس کو امام بنانے سے پرہیز کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی صحیح العقیدہ امام نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، نماز ہو جائے گی۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۱/۵ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۱۹/۲۲ الف)

---

(۱) تحفة المستملي ص ۴۰۲ طبع سهيل اكيدمي لاهور، وفي فتح باب العناية ج ۱ ص ۳۳۹ طبع بيروت: ويكره التنفل قاعدا بعد أن يشرع قائما ثم يقعد وقال أبو يوسف ومحمد لا يجوز لأن الشروع معتبر بالنذر فكما لو نذر أن يصلي على صفة شرع فيها. وكمال صفة قيامه... ولأبي حنيفة أن البقاء أسهل من الابتداء وقد جاز ترك القيام في ابتداء النفل فيجوز في أثنائه ... الخ. وفي مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج ... ص ... (ولو قعد بعدما افتتحه قائما جاز) عند الإمام استحسانا لأنه أسهل من الابتداء ويكره لو بلا عذر عنده وقالا لا يجوز إلا بعذر قياسا لأن الشروع ملزم كالنذر ولو نذر أن يصلي قائمًا لم يجز أن يصلي قاعدًا فكذا هذا ... الخ.

(۲) وفي الهندية ج ۱ ص ۸۳ طبع مكتبه حبيبيه: التطوع بالجماعة اذا كان على سبيل التداعي يكره

رمضان میں نفل کی جماعت

(۱۹۵۹ء میں ایک صاحب "محمود حسن" نے رمضان المبارک میں نفل کی جماعت سے متعلق ایک استفتاء حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا، اور استفتاء کے ساتھ اسی مسئلے سے متعلق حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تحریر کردہ جواب بھی ارسال کیا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استفتاء جواب کے لئے اپنے فرزند ارجمند حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے سپرد کیا، جو اس وقت دورۂ حدیث میں داخلہ لینے والے تھے، گویا کہ اس وقت ان کا ضابطے کا طالب علمانہ دور بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ حضرت مولانا مدظلہم نے اپنے والد محترم کے ایماء پر اس استفتاء کا تحقیقی جواب تحریر فرمایا، جو پیش خدمت ہے۔ یہ تفصیلی فتویٰ پہلے "فقہی مقالات" کی جلد دوم میں بھی شائع ہو چکا ہے، اب حضرت والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کے اس مجموعے میں دیگر فتاویٰ کے ساتھ یہ فتویٰ بھی متداول نسخوں کی تخریج کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ مرتب عفی عنہ)

استفتاء

در خدمت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سوال:- حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فتویٰ "الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر" میں شائع ہوا ہے، جس میں رمضان میں تہجد کی نماز تداعی کے ساتھ بھی افضل ہونا درج ہے، اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ نے فتاویٰ رشیدیہ میں رمضان میں تہجد کی جماعت کو اگر بالتداعی ہو، مکروہ تحریمی بتلایا ہے، اس کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے قول مرجوح پر مبنی قرار دیا ہے۔ میں نے بہت سارے حضرات کو لکھا کسی کے یہاں سے فیصلہ کن جواب موصول نہیں ہوا، بجز حضرت والا کے اس وقت اس کے متعلق کہیں سے مجھے اس کی توقع بھی نہیں ہے، بڑے بڑے کام کے مفتی حضرات چل بسے۔ مسئلہ زیر بحث بہت اہم ہے، اس کی وجہ سے ایک نیا باب بدعت کا کھل جانے کا اندیشہ ہے، خود مجھے بھی تردد پیدا ہوگیا۔ یہاں گزشتہ رمضان میں پچاس، ساٹھ، کبھی کبھی سو سے زائد آدمی تہجد کی نماز جماعت سے ادا کرنے لگے، اس کا اہتمام ہونے لگا، میں نہ شریک ہوا، نہ کسی کو شریک ہونے کو کہا، نہ کسی کو منع کیا، البتہ اپنے احباب خود ہی دریافت کرتے تو ان سے کہہ دیتا تھا کہ فقہاء تو مطلق طور پر تداعی کو نوافل میں مکروہ ہی لکھتے ہیں۔ ہمارے اکابر میں سے کسی کا عمل بھی مجھے اس کے متعلق سننے میں نہیں آیا۔

حضرت والا ذرا مفصل طور پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل کے متعلق کچھ تحریر فرما دیں۔ اگرچہ حضرت والا کو تکلیف ہوگی، لیکن کیا کیا جائے؟ کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب منسلک ہے۔　　کمترین بندہ محمود حسن عفی عنہ، کراچی

جواب از حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

(منقول از "شیخ الاسلام نمبر" صفحہ:۵۴ روزنامہ الجمعیۃ، دہلی)

جواب سوال از جماعت نوافل در رمضان غیر تراویح۔ (منقول از مکتوبات مخطوطہ)

فتح القدیر ج اوّل، باب الاستسقاء ص۴۳۸ میں ہے[1] وقد صرح الحاکم أیضًا فی باب صلوۃ الکسوف من الکافی بقوله "ویکره صلوة التطوع جماعة ما خلا قیام رمضان وصلوة الکسوف، وهذا خلاف ما ذکر شیخ الاسلام"۔

اور رد المحتار ج ۱ ص۵۲۳ پر ہے[2] قلت ویؤیده أیضًا ما فی البدائع من قوله أن الجماعة فی التطوع لیست بسنة الا فی قیام رمضان اهـ وفیه والنفل بالجماعة غیر مستحب، لأنه لم تفعله الصحابة فی غیر رمضان اهـ۔

مذکورہ بالا نصوص میں قیام رمضان کی تصریح فرمائی گئی ہے، اس کی تخصیص تراویح کے ساتھ نہیں کی گئی، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تیسری شب تک اور صحابہ کرامؓ سے آخری شب تک نوافل باجماعت پڑھنا منقول ہے، جیسا کہ مؤطا امام مالک میں بکثرت مروی ہے، اس لئے تمام وہ نوافل جو رمضان کی راتوں میں پڑھے جائیں، خواہ تراویح ہوں یا تہجد، اوائل شب میں ہوں یا اواخر شب میں، جماعت کی اجازت ہوگی۔

مؤطا امام مالک صفحہ:۱۱۱ میں ہے[3]:-

قال محمد وبهذا كله نأخذ لا بأس بالصلاة في شهر رمضان أن يصلي الناس تطوعا بامام لأن المسلمين قد اجمعوا على ذلك اهـ۔

فتح الباری ج رابع صفحہ ۲۱۵ باب "فصل من قام رمضان" میں ہے[4] -

أی قیام لیالیه مصلیا، والمراد من قیام اللیل ما یحصل به مطلق القیام، کما قدمناه فی التهجد سواء (کان قلیلا أو کثیرا)، وذکر النووی أن المراد بقیام رمضان صلوة التراویح،

---

(۱) فتح القدیر ج۲ ص:۵۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

(۲) رد المحتار ج:۲ ص:۴۸، ۴۹ (طبع ایچ ایم سعید).

(۳) مؤطا امام مالک ص:۱۴۳ (طبع بیرون بوہڑ گیٹ ملتان).

(۴) فتح الباری ج:۴ ص:۲۵۱ (طبع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور).

یعنی أنه یحصل بها المطلوب من القیام، لا أن قیام رمضان لا یکون الا بها، واعرب الکرمانی فقال: اتفقوا علی أن المراد بقیام رمضان صلوة التراویح اھ. قلت. قال النووی: المراد بقیام رمضان صلوة التراویح، ولکن اتفاق من أین أخذه بل المراد من قیام اللیل ما یحصل به مطلق القیام، سواء کان قلیلا أو کثیرا، اھ. وقال العینی فی الجزء الأول صفحة: ۲۸۱[1] من کتاب الایمان من عمدة القاری ما نصه، ومعنی من قام رمضان من قام بالطاعة فی لیالی رمضان ویقال یرید صلوة التراویح، وقال بعضهم لا یختص ذلک بصلوة التراویح، بل فی أی وقت صلی تطوعا حصل له ذلک الفضل. اھ.

نصوصِ مذکورہ بالا سے مندرجہ ذیل اُمور معلوم ہوتے ہیں:-

۱:- ہر نفل نماز باجماعت مطلقاً مکروہ نہیں ہے، بلکہ اس سے کچھ مستثنیات بھی ہیں۔

۲:- مستثنیات میں لفظ قیامِ رمضان اور کسوف کو ذکر کیا ہے۔

۳:- امام محمد اور حاکم اور صاحبِ بدائع وغیرہ متقدمین (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے فقط قیامِ رمضان ذکر فرمایا ہے، جو کہ مخصوص بالتراویح نہیں ہے۔

۴:- قیامِ رمضان کو مخصوص بالتراویح کرنا قولِ مرجوح ہے، جو کہ علامہ کرمانی اور علامہ نووی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے، اس کے خلاف حافظ ابنِ حجر عسقلانی اور امام عینی رحمہما اللہ تعالیٰ قیامِ رمضان سے تمام نوافل مراد لے رہے ہیں، خواہ تراویح ہو یا تہجد ہو، یا دیگر نوافل۔ اور امام نوویؒ کے قول کو مؤوّل قرار دیتے ہوئے اپنے قول کی طرف لوٹاتے ہیں، اور کرمانی کے قول کو غریب اور مخدوش فرمادیتے ہیں، اور یہی اَمر مدلول مطابقی بھی ہے۔

بنابریں فتاویٰ رشیدیہ کی تصریح جلدِ ثانی صفحہ:۵۹ اور جلد اوّل صفحہ:۴۹ جس میں مستثنیات کو منحصر تراویح کے ساتھ کیا گیا ہے، قولِ مرجوح پر مبنی ہے۔ پس رمضان کی جملہ نوافل کی جماعت، خواہ بالتداعی ہو یا بلاتداعی، سب مأذون فیہ بلکہ مستحب ہوں گی، اور "من قام رمضان" کے تحت داخل ہوں گی، اس پر نکیر کرنا غیر صحیح ہوگا، بلکہ جملہ طاعات، طوافِ نفل یا عمرۂ نافلہ وغیرہ اسی میں محسوب اور مرغوب فیہ قرار دیئے جائیں گے، کما ذکر العینی رحمه الله تعالیٰ۔

ہم نے حضرت قطب العالم حاجی امداداللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا عمل بھی مکہ معظمہ

---

(۱) عمدة القاری باب تطوع قیام رمضان من الایمان ج:۱ ص:۲۳۳ (طبع دار الفکر)

میں اسی پر پایا ہے، اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا بھی یہی معمول تھا۔ اور حرمین شریفین میں قدیم سے عمل سنتِ عشریہ وغیرہ کا جو کہ بخصوص شوافع، اور چالیس رکعت کا عمل جو کہ موالک کا معمول بہ تھا، اور اہلِ مکہ کا قدیمی عمل ہر ترویحہ پر اسبوعِ طواف کا اسی کا مؤید ہے۔

واللہ اعلم

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہ

دار العلوم دیوبند

۱۹/ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ

خط کا جواب از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مکرم بندہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ معاملہ نفس مسئلہ کی حیثیت سے تو کچھ اہم نہ تھا، لیکن حضرت مولانا مدنیؒ کے فتوی پر تنقید کی حیثیت نے اس کو اتنا مہم بنادیا کہ اس میں کافی بحث و تحقیق کے بغیر قلم اُٹھانا مشکل تھا، رمضان میں مجھ سے بالکل یہ کام نہیں ہوتا، اس لئے اپنے چھوٹے لڑکے محمد تقی سلمہ کو جو اس سال دورۂ حدیث میں شریک ہونے والا ہے، یہ مسئلہ حوالے کیا، خیال یہ تھا کہ اس کو مشق ہوگی اور کتابوں کے حوالے یہ نکال کر پیش کردے گا تو پھر میں لکھوں گا، مگر ماشاء اللہ یہ لڑکا ذہین ہے، اس نے تمام کتابوں کے حوالے بھی بغیر میری کسی امداد کے نکالے، پھر ان کے اقتباسات لے کر خود ہی ایک تحریر لکھ دی، اب جو تحریر دیکھی تو میری نظر میں بالکل کافی وافی تھی، اس لئے اسی پر تصدیق لکھ دی، وہ بھیج رہا ہوں۔ والسلام

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۴/شوال ۱۳۷۸ھ

جواب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

تراویح، استسقاء اور کسوف کے علاوہ دوسری نفلوں کی جماعت اگر بالتداعی ہو تو بہر صورت مکروہِ تحریمی ہے، خواہ وہ نفلیں رمضان میں پڑھی جائیں یا غیر رمضان میں، یہی مسلک عام فقہاء محدثین کا ہے، اور اسی پر سلف صالحین کا فتویٰ اور تعامل رہا ہے۔

۱:- بدائع الصنائع میں ہے:-

اذا صلوا التراويح ثم أرادوا أن يصلوها ثانيًا يصلون فرادى لا بجماعة، لأن الثانية

تطوع مطلق والتطوع المطلق بجماعة مكروه (بدائع ج ۱ ص ۲۹۰)[۱]

علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں -

ولو صلّوا التراويح، ثم أرادوا أن يصلّوا ثانيًا يصلّون فرادى. اهـ.

(البحر الرائق ج:۲ ص:۷۴)[۲]

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

ولو صلّوا التراويح ثم أرادوا أن يصلّوا ثانيا يصلّون فرادى كذا في التتارخانية

(عالمگیریہ ج:۱ ص:۱۲۳)[۳]

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:-

صلّوا بجماعة، ثم أرادوا أعادتها بالجماعة يكره لأن النفل بجماعة على التداعي يكره إلا بالنص. اهـ (بزازية على هامش الهندية ج:۴ ص:۳۱)[۴]

مذکورہ بالا نصوص سے معلوم ہوا کہ تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ جائز نہیں، اور بدائع و فتاویٰ بزازیہ میں اس کی علت کی تصریح بھی فرمادی گئی کہ دوسری مرتبہ پڑھی جانے والی تراویح نفل مطلق (یعنی وہ نفل جس کے اندر جماعت کی نص نہیں ملتی) ہو جائے گی، اور نفل مطلق جماعت کے ساتھ مکروہ (تحریمی) ہے، تو معلوم ہوا کہ حضرات فقہاء کے نزدیک نفل کی جماعت (علی التداعی) بہر صورت مکروہ ہے۔ خواہ رمضان میں ہو یا غیر رمضان میں، کیونکہ اگر رمضان کی نفلیں علی الاطلاق اس حکم سے مستثنیٰ ہوتیں تو تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ ناجائز نہ ہوتا، کما هو ظاهر۔

۲ – علامہ طاہر بن عبدالرشید بخاری خلاصۃ الفتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں –

ولو زاد على العشرين بالجماعة يكره عندنا بناء على أن صلوة التطوع بالجماعة مكروه. (خلاصة الفتاوى ج:۱ ص:۶۳)[۵]

اگر رمضان کی نفلیں جماعت کے ساتھ علی الاطلاق جائز ہوتیں تو بیس سے زیادہ رکعتیں بالجماعۃ مکروہ نہ ہوتیں۔

۳:- درمختار میں ہے:-

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) البحر الرائق ج ۲ ص ۶۸ (طبع ایچ ایم سعید)
(۳) الفتاوى الهندية فصل في التراويح ج ۱ ص:۱۱۶ (طبع مکتبہ حقانیہ پشاور)
(۴) الفتاوى البزازية على هامش الهندية، فصل في التراويح ج ۴ ص ۴۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)
(۵) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

ولا يصلى الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان اي يكره ذلك على سبيل التداعي بأن يقتدي أربعة بواحد، كما في الدرر. (1)
(شامی ج:۱ ص:۶۶۳)

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

والنفل بالجماعة غير مستحب، لأنه لم تفعله الصحابة في غير رمضان. (2)
(رد المحتار ج:۱ ص:۶۶۳)

علامہ کاسانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:-

الجماعة في التطوع ليست بسنة إلا في قيام رمضان وفي الفرض واجبة او سنة مؤكدة. (3)
(بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۹۸)

محقق ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

وقد صرح الحاكم الشهيد في باب صلوة الكسوف من الكافي بقوله: ويكره صلوة التطوع جماعة ما خلا قيام رمضان وصلوة الكسوف. (4) (فتح القدير ج:۱ ص:[illegible])

نصوص مذکورہ بالا میں صلوۃ النفل بالجماعۃ کی کراہت سے قیام رمضان کو مستثنیٰ کیا ہے، اور تراویح کے بجائے قیام رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے عموم سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ حکم صرف غیر رمضان کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن دراصل یہ قیام رمضان کا لفظ (عرف فقہاء کے اعتبار سے بالخصوص مسئلہ جماعت میں) عام نہیں، بلکہ تراویح کے ساتھ مخصوص ہے، جیسا کہ ان شاء اللہ ہم عنقریب بالتفصیل بیان کریں گے، واللہ الموفق۔

۴- حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب شرح موطا میں فرماتے ہیں کہ:-

قال الزرقاني رحمه الله ظاهره (اي حديث افضل الصلوة صلوتكم في بيوتكم إلا المكتوبة) يشمل كل نفل لكنه محمول على ما لا يشرع له التجميع كالتراويح والعيدين اهـ (5)
(اوجز المسالك ج:۲ ص:۷)

حضرت الشیخ مولانا خلیل احمد سہارنپوری شرح ابو داؤد میں لکھتے ہیں

قال ابن حجر صلاة المرء وهذا عام لجميع النوافل والسنة الا النوافل التي من شعائر الاسلام كالعيد والكسوف والاستسقاء، قيل وهذا يدل على ان صلوة التراويح في البيت افضل، والجواب عن ذلك فلولا انفصلها في المسجد جماعة لان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ذلك لخوف الافتراض، فلما زال الخوف بوفاته عليه السلام ارتفع المانع وصار

---

(۱) الدر المختار ج ۲ ص ۴۸ (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) رد المحتار ج ۲ ص ۴۹ (طبع ایچ ایم سعید)
(۳) (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۴) فتح القدير باب الاستسقاء ج ۲ ص ۵۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)
(۵) (طبع مکتبہ حقانیہ ملتان)

فعله في المسجد أفضل ... فاشبه صلاة العيد (بذل المجهود ج ٢ ص ٣٣١)[1]

ان نصوص میں لفظ تراویح استعمال کیا گیا ہے، قیام رمضان نہیں کہ اس کے عموم سے عموم حکم کا شبہ ہو۔

۵:- عنایہ شرح ہدایہ میں ہے:-

(فصل في قيام شهر رمضان) ذكر التراويح في فصل على حدة لاختصاصها بما ليس لمطلق النوافل. (عناية على هامش الفتح ج ١ ص ٣٣٣)[2]

البحر الرائق میں ہے:-

(تحت قول الكنز "وسن في رمضان عشرون ركعة" الخ) بين لصلوة التراويح، وانما لم يذكرها مع السنن المؤكدة قبل النوافل المطلقة لكثرة شعبها ولاختصاصها بحكم من بين سائر السنن والنوافل وهو الأداء بجماعة (بحر رائق ج ٢ ص ٦٦)[3]

اس سے معلوم ہوا کہ تراویح کا جماعت سے ادا کیا جانا تمام سنن ونوافل کے مقابلے میں اس کی خصوصیت ہے۔

۶:- فتاویٰ قاضی خان میں ہے:-

ويستحب اداءها (اي التراويح) بالجماعة، وقال مالك والشافعي رحمهما الله تعالى في القديم: الانفراد أفضل كسائر السنن انتهى وفيه بعد ذلك والصحيح ان اداءها بالجماعة في المسجد أفضل، لأن فيه تكثير الجماعة، وكذلك في المكتوبات[4]
(خانية على هامش الهندية ج:١ ص:٢١٣)

پہلی نص میں اشارہ فرمایا گیا کہ تراویح اور چند اور مخصوص سنن کے علاوہ تمام سنن میں ہم بھی شوافع وغیرہم کے قدیم قول سے متفق ہیں کہ اس میں انفراد افضل ہے۔ دوسری نص میں فرمایا گیا کہ تراویح اس حکم میں مکتوبات کی شریک ہے۔ اگر رمضان کی بقیہ سنتوں میں بھی جماعت جائز ہوتی تو تصریح کردی جاتی۔

۷:- حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں

”جماعت نوافل کی سوائے ان مواقع کے جو حدیث سے ثابت ہیں، مکروہ تحریمی ہے، فقہ میں لکھا ہے کہ اگر تداعی ہو اور مراد تداعی سے چار آدمی کا ہونا ہے، پس جماعت صلوۃ کسوف، استسقاء، تراویح کی درست اور باقی سب مکروہ ہیں، کذا فی کتب الفقہ۔“ (فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۹۹)[5]

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ تشبیہ کے مفاسد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

(۱) (طبع معهد الخليل الاسلامي كراچي)
(۲) عناية على هامش فتح القدير ج:١ ص ٣٠٢ (طبع مكتبه رشيديه كوئته)
(۳) البحر الرائق ج ٢ ص ٦٦ (طبع ايچ ايم سعيد)
(۴) الفتاوى الخانية على هامش الهندية باب التراويح ج:١ ص:٢٣٣ (طبع مكتبه حقانيه پشاور)
(۵) تالیفات رشیدیہ مع فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۹۶ (ادارۂ اسلامیات لاہور)

"مثلاً اگر تراویح کے بعد یہ عمل ہو تو نفل کی جماعت مجمع کثیر کے ساتھ ہونا جو کہ مکروہ ہے۔"[1]
(امداد الفتاویٰ ج۱ ص ۳۰۰)

ان حضرت نے بالکل تصریح اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا کہ نفل کی جماعت (تراویح کے سوا) رمضان میں بھی اسی طرح ناجائز ہے جس طرح غیر رمضان میں۔

۸- ان روایت کے علاوہ درایت بھی اسی کی مقتضی ہے کہ نفل باجماعت رمضان میں بھی جائز نہ ہو، اس لئے کہ تراویح کی جماعت خلاف قیاس ہے، کیونکہ تراویح تطوعات میں سے ہے اور تطوعات میں اخفاء مطلوب ہے بخلاف فرض کے، اسی لئے تطوعات کو نہ صرف باجماعت، بلکہ گھر میں پڑھنا افضل ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا۔

"صلوة المرء في بيته افضل من صلوته في مسجدي هذا الا المكتوبة"[2]

تو ثابت ہوا کہ تراویح کی جماعت خلاف قیاس ہے۔ اور یہ اصول فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ "امر خلاف قیاس اپنے مورد پر منحصر رہتا ہے" اس پر قیاس کر کے کسی دوسرے مسئلے کو اسی کے حکم میں کر دینا جائز نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نوافل میں جماعت کا مورد کیا ہیں؟ نوافل میں جماعت کا مورد صلوٰۃ کسوف، صلوٰۃ الاستسقاء اور صلوٰۃ عیدین (علی قول من عدهما من النوافل) اور صلوٰۃ تراویح ہیں، رمضان کی کسی اور نفل مثلاً تہجد وغیرہ میں تداعی کے ساتھ جماعت منقول نہیں۔ البتہ ایک دو روایتیں اس قسم کی ملتی ہیں، لیکن وہاں پر جماعت بلا تداعی تھی، جو بالاتفاق بہرصورت جائز ہے، مثلاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا وہ مشہور واقعہ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں مشغول تھے، تو میں آپ کے بائیں پہلو میں جا کھڑا ہو گیا تو حضور نے مجھے (ایک روایت کے مطابق ہاتھ سے) پکڑ کر دائیں جانب گھمادیا۔ اس میں مقتدی صرف حضرت ابن عباسؓ ہیں، چنانچہ حضرت شیخ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تقریر ترمذی میں ہے کہ:-

وليس التراويح والتهجد في عهده عليه السلام لم يكن فرق في الركعات بل في الوقت والصفة أى التراويح تكون بالجماعة في المسجد بخلاف التهجد. العرف الشذى ج ص ۲۲۰

اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

"اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کو ہمیشہ منفرد پڑھتے تھے، کبھی بہ تداعی جماعت نہیں فرمائی، اگر کوئی شخص کھڑا ہو تو منع نہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس خود ایک دفعہ آپ کے پیچھے جا کھڑے ہوئے تھے، بخلاف تراویح کے کہ اس کو چند بار تداعی کے ساتھ جماعت کرکے ادا کیا۔"
(فتاویٰ رشیدیہ ص ۳۰۰)

---

(۱) امداد الفتاوی ج ۱ ص ۳۲۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)
(۲) سنن أبي داؤد باب صلوة الرجل التطوع في بيته حديث رقم ۱۰۴۴ ج ۱ ص ۴۷۰ (طبع دار الفكر)

جب یہ معلوم ہو گیا کہ نفل کی جماعت صرف تراویح، کسوف، استسقاء اور عیدین میں مشروع ہے تو بحکم مقدمہ ثانیہ دوسری نوافل مثلاً تہجد وغیرہ میں اس حکم کو متعدی نہ کیا جائے گا کیونکہ اس میں جماعت منقول و ماثور نہیں، لہذا منصوصہ نوافل کے علاوہ تمام نوافل میں خواہ وہ رمضان میں ہوں یا غیر رمضان میں، جماعت بالتداعی مکروہِ تحریمی ہوگی۔

قیامِ رمضان کی تحقیق

حضرت شیخ مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استدلال میں وہ نصوص پیش فرمائی ہیں جو نمبر۳ میں اوپر گزریں، اور اس کے علاوہ مولانا عبدالحئی کی ایک عبارت پیش فرمائی ہے۔ ان سب میں مستثنیات میں "قیام رمضان" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد علامہ عینی اور علامہ قسطلانی کی عبارتیں پیش کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قیام رمضان سے مراد صرف تراویح نہیں، بلکہ "ما یحصل به القیام" مطلقاً مراد ہے، اور پھر نتیجہ دونوں کو ملا کر یہ نکالا ہے کہ فقہاء نے قیام رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، اور عینی و قسطلانی کی عبارتوں سے اس کا عموم معلوم ہوتا ہے، لہذا رمضان کی ہر نفل میں جماعت جائز ہے۔ لیکن قیام رمضان کا لفظ لغوی اعتبار سے تو بے شک عام ہے، مگر عرف عام فقہاء اور عام محدثین کا یہ ہے کہ اس کو صرف تراویح میں خاص کرتے ہیں۔ اور تراویح کے لئے قیام رمضان کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ ہدایہ کی شرح میں علامہ بابرتی نے یوں نقل کی ہے۔

وترجم بقيام رمضان اتباعا للفظ الحديث قال صلى الله عليه وسلم ان الله تعالى فرض عليكم صيامه وسننت لكم قيامه (۱) عناية على هامش فتح ج ص ۳۳۳

اور فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا مطلب (کہ قیام رمضان کے علاوہ دوسری نوافل کی جماعت مکروہ ہے) عمدۃ القاری اور فتح الباری سے اخذ کرنے کے بجائے بہتر اور مناسب یہ ہے کہ خود فقہاء کی عبارتوں سے اخذ کیا جائے، جو مسئلہ زیر بحث میں نص کا درجہ رکھتی ہیں، بخلاف عمدۃ القاری اور فتح الباری کے کہ ان کے پیش نظر اس مقام میں جماعت کی بحث نہیں، بلکہ حدیث "من قام رمضان ایمانا" کی تشریح ہے، اس لئے ہم یہاں فقہاء کی وہ چند عبارتیں پیش کرتے ہیں جو مسئلہ جماعت میں نص ہیں، اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مسئلہ جماعت میں قیام رمضان سے مراد تراویح ہی ہے۔

الف - علامہ مرغینانی نے ہدایہ میں "فصل في التراويح" کی جگہ "فصل في قيام رمضان" کا عنوان قائم کر کے تراویح کے مسائل ذکر فرمائے ہیں، اور شارحین ہدایہ مثلاً محقق ابن الہمام نے اس عنوان کے تحت قیام رمضان کی تشریح کرنے کے بجائے تراویح کی تشریح شروع کردی۔

"(فصل في قيام رمضان) التراويح جمع ترويحة" (۲)
(فتح القدير ج:۱ ص:۳۳۳)

---

(۱) عناية على هامش فتح القدير فصل في قيام شهر رمضان ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه)
(۲) فتح القدير فصل في قيام رمضان ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه)

اور علامہ بابرتی نے بھی متون کا ذکر تراویح کو سنن ونوافل سے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ بیان کرنی شروع کردی (جیسا کہ اوپر نمبر ۵ میں گزرا)۔ (عنایہ بحوالہ مذکور)

ب - ملک العلماء علامہ کاسانی نے بدائع میں جہاں قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، وہیں آگے چل کر خود اس کی تشریح فرمادی ہے، کہ مراد تراویح ہے، آپ نے فرض ونوافل کے درمیان مابہ الفرق امتیازات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:-

ومنها ان الجماعة في التطوع ليست بسنة الا في قيام رمضان، وفي الفرض واجبة أو سنة مؤكدة.

پھر دو ہی سطروں کے بعد اس فرق کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

وانما عرفنا الجماعة سنة في التراويح بفعل رسول الله صلى الله عليه وسلم واجماع الصحابة. (۱) (بدائع الصنائع ج۱ ص۲۹۰)

اس کے علاوہ وہ مسئلہ کہ تراویح کا علاوہ جماعت کے ساتھ جائز ہے، اس سے بھی ثابت یہ ہوتا ہے کہ صاحب بدائع نے قیامِ رمضان سے مراد تراویح لی ہے، ورنہ وہ جماعت نفل کو رمضان و غیرِ رمضان دونوں میں ناجائز قرار دیتے ہیں، وھو ظاہر۔

ج:- علامہ شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:-

الفصل الخامس في كيفية النية واختلفوا فيه، والصحيح أن ينوي التراويح أو السنة أو قيام الليل. (۲) (مبسوط للسرخسي ج۲ ص۱۴۵)

د - فتاویٰ قاضی خان میں ہے -

ان نوى التراويح او سنة الوقت أو قيام الليل في رمضان جاز.

(۳) (حاشية على هامش عالمگيرية ج۱ ص۲۱۰)

گویا ''قیام اللیل فی رمضان'' اور ''تراویح'' دونوں ہم معنی لفظ ہیں، تراویح کی نیت کرتے وقت ''تراویح'' کا لفظ استعمال کرلو یا ''قیامِ رمضان'' کا، برابر ہے۔

(جواب نمبر۲) حدیث وآثار میں بھی جہاں ''قیامِ رمضان'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں پر اس سے ''تراویح'' ہی مراد لی جاسکتی ہے، اس کے علاوہ نہیں، مثلاً:-

الف - عن سلمان الفارسي رضي الله عنه قال خطبنا رسول الله صلى الله عليه وسلم

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید) (۲) (طبع دار المعرفة بيروت)
(۳) الفتاوى الخانية على هامش الهندية فصل في نية التراويح ج۱ ص۲۳۶ (طبع مكتبه حقانيه پشاور)

فی آخر یوم من شعبان، فقال: یا ایها الناس! قد اظلکم شهر عظیم، شهر مبارک، شهر فیه لیلة خیر من الف شهر، جعل الله صیامه فریضة وقیامه تطوعا (۱) (مشکوٰة بحواله بیهقی ص ۱۷۳)

اور سنن نسائی کی روایت میں ہے کہ "افترض الله علیکم صیامه وسننت لکم قیامه" یہاں پر "قیام" سے مراد "تراویح" ہے، وہ تہجد نہیں ہو سکتی، کیونکہ قیام سے اگر تہجد مراد لیا جائے گا تو "قیامه تطوعا" کا یہ جملہ بیکار ہو جائے گا، اس لئے کہ تہجد کے تطوع ہونے میں رمضان کی کیا تخصیص ہے؟ وہ تو غیر رمضان میں بھی تطوع ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں "قیام" سے مراد تراویح ہی ہے، اور اس "قیام" سے تراویح ہی مراد لینے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ اس حدیث کو تراویح کے اثبات میں نقل فرماتے ہیں:-

(کما فی الفتح ج: ۱ ص: ۳۳۳(۲) والبزازیة ص: ۳۱(۳) ومراقی الفلاح علی ہامش الطحطاوی علی المراقی ص: ۲۲۴(۴))۔

ب – عن السائب بن یزید الصحابی قال: کانوا یقومون علی عهد عمر رضی الله عنه بعشرین رکعة وعلی عهد عثمان وعلی رضی الله عنهما مثله.

(۵)
(عمدة القاری بحواله بیهقی ج ۵ ص:۲۶۷)

اس حدیث کا سیاق و سباق واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں قیام سے مراد تراویح ہے، اور حنفیہ رحمہم اللہ اس حدیث کو تراویح کی بیس رکعت ہونے پر استدلال میں پیش کرتے ہیں، کما فی العمدة۔

۳ – عام طور پر شراحِ حدیث بھی "قیام رمضان" سے مراد "تراویح" ہی لیتے ہیں، چنانچہ –

الف – صحیح مسلم میں اس طرح عنوان قائم فرمایا گیا ہے، (اگرچہ وہ تراجم امام مسلم کے قائم کردہ نہیں ہیں، تاہم یہ تراجم مستند محدثین نے لگائے ہیں)۔

(۶)
باب الترغیب فی قیام رمضان وهو التراویح   (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۵۹)

ب – حضرت شیخ مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہ اپنی تقریر ترمذی میں لکھتے ہیں –

(۱) (طبع قدیمی کتب خانه)
(۲) فتح القدیر ج ۱ ص ۳۳۳ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه)
(۳) البزازیة علی هامش الهندیة ج ۴ ص ۳۱ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه)
(۴) حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص: ۲۲۴، ۲۲۵ (طبع نور محمد کتب خانه)
(۵) عمدة القاری (طبع دار الفکر)
(۶) (طبع قدیمی کتب خانه)

باب ما جاء في قيام شهر رمضان أي التراويح. (العرف الشذي ج:۱ ص:۳۲۹)[۱]

ج - حضرت شیخ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تقریر ترمذی میں تحریر فرماتے ہیں -

باب في قيام رمضان، هذا القيام كان عاما ثم اختص بالتراويح، فمطلقه يراد به التراويح. (الكوكب الدري ج:۱ ص:۲۶۷)[۲]

د - موطا امام محمدؒ کی وہ عبارت جو حضرت شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں تحریر کی گئی ہے، اس کے سیاق و سباق سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر جو امام محمدؒ نے ”قیام شہر رمضان“ کا لفظ استعمال کیا ہے، اس سے مراد تراویح ہی ہے، عبارت یہ ہے:-

قال محمد وبهذا كله نأخذ، لا بأس بالصلوة في شهر رمضان أن يصلي الناس تطوعا بإمام، لأن المسلمين قد اجمعوا على ذلك.[۳]

اس میں جو دلیل پیش کی گئی ہے (یعنی مسلمانوں کا اجماع) وہ صرف تراویح ہی پر صادق آتی ہے، غیر تراویح پر نہیں، کیونکہ غیر تراویح میں جماعت پر اجماع تو درکنار، اس کا نفس ثبوت بھی منقول نہیں، اس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے اور رمضان میں کہیں غیر تراویح میں باقاعدہ جماعت نفل کا ثبوت نہیں ملتا۔

بہرکیف! ان تمام نصوص سے جو ہم نے اس سلسلے میں اب تک پیش کی ہیں، یہ لازمی بات تو بہرصورت ثابت ہوجاتی ہے کہ جہاں فقہاء وغیرہ نے قیام رمضان کو کراہت جماعت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، وہاں پر تراویح ہی مراد لیا ہے۔ اگرچہ فی نفسہ ”قیام رمضان“ کا لفظ جو حدیث ”من قام رمضان ... الخ“ میں مذکور ہے، وہ ہر نماز اور فعلِ طاعت کو عام اور شامل ہے۔

مسئلہ زیر بحث اور علامہ عینیؒ

مندرجہ بالا عبارتیں وغیرہ تو اس بارے میں تھیں کہ ”قیام اللیل فی رمضان“ جس میں جماعت کو جائز قرار دیا گیا ہے، اس سے مراد تراویح ہی ہے، لیکن چند شراح حدیث نے قیام رمضان کو عام قرار دیا ہے، جیسا کہ شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ جن کی عبارت کا حوالہ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ ”قیام اللیل فی رمضان“ عام ہے تراویح وغیر تراویح سب کو، لما یحصل

(۱) العرف الشذي على جامع الترمذي ص:۳۰۸ (طبع قديم، مكتبه رحيميه سهارنبور)
(۲) (طبع ايچ ايم سعيد)
(۳) المؤطا للامام محمد رحمه الله ص:۱۳۳ (طبع قديمي كتب خانه)

نة القيام مطلقاً" کے تحت قیام رمضان میں داخل ہو جائے گا، لیکن ذرا غور کیا جائے تو وضاحت کے ساتھ یہ بات سامنے آ جائے گی کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول حدیث "من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفر له" کی تشریح کے تحت آیا ہے، اس سے ان کا حاصل یہ ہے کہ قیام رمضان پر جو ثواب اس حدیث میں موجود ہے، وہ صرف تراویح ہی پر نہیں، بلکہ مطلق ہر نماز پر جو رمضان کی رات میں ادا کی جائے، ثواب حاصل ہوگا۔ اس جگہ اس بحث سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ جماعت سے ادا کی جائے یا بلا جماعت، یہی وجہ ہے کہ یہاں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ جماعت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، بلکہ اس مسئلہ کا ذکر علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے "باب صلوة الليل" میں کیا ہے، اس میں ان کی عبارت یہ ہے:-

(حدیث "صلوا أيها الناس في بيوتكم، فان أفضل الصلوة صلوة المرء في بيته" کے تحت فرماتے ہیں:)

واستثنى من عموم الحديث عدة من النوافل ففعلها في غير البيت أكمل، وهي ما تشرع فيه الجماعة، كالعيدين، والاستسقاء والكسوف.

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں:-

قال الامام حميد الدين الضرير: نفس التراويح سنة، اما اداؤها بالجماعة فمستحب.

پھر ایک سطر کے بعد ہے:-

وفي جوامع الفقه: التراويح سنة مؤكدة، والجماعة فيها واجبة، وفي الروضة لأصحابنا ان الجماعة فضيلة، وفي الذخيرة لأصحابنا عن أكثر المشائخ أن اقامتها بالجماعة سنة على الكفاية. (عمدة القاري ج ۵ ص:۲۶۷)[1]

خلاصہ یہ ہے کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں قیام رمضان کے عموم کو ذکر کیا ہے، وہاں مسئلہ جماعت ذکر نہیں کیا، اور جہاں مسئلہ جماعت بیان فرمایا ہے وہاں مستثنیات میں قیام رمضان کو ذکر نہیں کیا، بلکہ بلفظ "تراویح" ذکر فرمایا ہے، لہٰذا ان کے قول سے کہ یہ قیام شہر رمضان کا لفظ عام ہے، تراویح کے سوا دوسری نوافل رمضان کی جماعت جائز ہونے پر استدلال غیر صحیح ہے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس بحث میں درحقیقت فقہاء علیہم الرحمۃ میں کوئی اختلاف نہیں، سب کے نزدیک جماعت صرف تراویح کی جائز ہے، البتہ کلام اس میں ہے کہ حدیث "من قام رمضان ایمانا" میں جو فضیلت موجود ہے، وہ صرف تراویح کے لئے مخصوص ہے یا مطلق صلوٰۃ

---

(۱) و فی مطبوعة عمدة القاری (طبع دار احیاء التراث بیروت) ج ۵ ص ۲۶۷ [illegible]

پر وہ فضیلت حاصل ہوگی؟ اس میں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے عموم کا قول اختیار فرمایا ہے، اور علامہ نووی اور علامہ کرمانی رحمہما اللہ نے دوسرا (علی ما ذکرہ العینی)۔ اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو جماعت دیوبند میں ابوحنیفۂ عصر کا لقب رکھتے تھے، ان کا فتویٰ جمہور علماء وفقہاء کی تحقیق کے عین مطابق ہے، اس وقت مرجوح پر عمل قرار دینا فہم عاجز سے بالاتر ہے۔

رہا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہ العزیز کا عمل، تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عمل تو معلوم نہیں، البتہ حضرت شیخ الہند کے متعلق اتنی بات یقین کے درجے میں معلوم ہے کہ آپ نے شروع میں تہجد کی جماعت ابتدائی ایک دو افراد کے ساتھ کی تھی، لیکن بعد میں جب لوگ زیادہ آنے لگے تو اس کی اجازت کی بنا پر آپ نے ساری رات تراویح کا معمول بنا لیا تھا، عموماً آٹھ دس پارے تراویح میں جماعت سے پڑھے جاتے تھے اور تراویح ہی سحری کے وقت ختم ہو جاتی تھی، جس کے شاہد دیوبند میں آج بھی سینکڑوں حضرات ہوں گے، واللہ أعلم بحقیقۃ الحال۔

ایک ضروری گزارش

آخر میں گزارش ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی عظمت شان، جلالت قدر اور علمی تبحر کے پیش نظر تو اس مسئلہ پر قلم اٹھانے کی جرأت کی بھی ہمت نہیں ہونی چاہئے، چہ جائیکہ مجھ جیسا شخص مناقشہ کی جرأت کرے، لیکن اللہ تعالیٰ جماعت دیوبند کی خصوصیت اور اپنے بزرگوں کی تعلیم و تلقین نے ہمیں یہ صراطِ مستقیم بتائی کہ مسائلِ شرعیہ میں اختلاف کا اظہار ترکِ ادب نہیں، بلکہ شاگردوں کا اختلاف بھی بزرگوں کا معنوی فیض ہوتا ہے۔ اس لئے بندہ نے اپنی ناقص تحقیق میں جو مجھے واضح ہوا وہ عرض کردیا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ بزرگوں کی شان میں ادنیٰ ترکِ ادب سے بھی مجھے محفوظ رکھیں، آمین۔

اللّٰهم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه، وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین

احقر العباد
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
متعلم دار العلوم کراچی نمبر ۱۴
۳ شوال ۱۳۷۸ھ - ۱۳ اپریل ۱۹۵۹ء

ما ذکره المجيب حسن عجيب فيما أجاب وأجاد فيما أفاد، مع ملاحظة كتب الأكابر، وفقه الله تعالى لما يحب ويرضى.

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
صدر دار العلوم کراچی نمبر ۱۴
۸ شوال ۱۳۷۸ھ

﴿فصل فی التراویح﴾
(تراویح اور شبینہ سے متعلق مسائل)

چار تراویح کے بعد وقفے میں کیا پڑھنا چاہئے؟

سوال:- تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد کیا آیت پڑھی جاتی ہے؟ یہ سنت ہے یا واجب یا مستحب؟ اور یہ آیت صرف امام صاحب پڑھیں یا مقتدی بھی؟ زبانی یاد نہ ہو تو دیکھ کر پڑھ سکتے ہیں؟

جواب:- تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد چار رکعتوں کی مقدار بیٹھنا مستحب ہے، اس وقفے میں کوئی خاص ذکر واجب یا مسنون نہیں ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اس میں چاہے کچھ تسبیحات پڑھ لے، چاہے الگ نفلیں پڑھے اور چاہے تو خاموش رہے۔[1] اور مشائخ کا معمول یہ ہے کہ اس میں یہ تسبیح پڑھتے ہیں "سبحان ذی الملک والملکوت، سبحان ذی العزة والعظمة والقدرة والکبریاء والجبروت، سبحان الملک الحی الذی لا یموت، سبوح قدوس رب الملائکة والروح، لا اله الّا الله نستغفر الله نسألک الجنة ونعوذ بک من النار" کذا فی رد المحتار من القهستانی)۔[2] اور یہ تسبیح آہستہ پڑھنی چاہئے امام کو بھی اور مقتدی کو بھی۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲ھ

تراویح پر اُجرت کا مسئلہ

سوال:- میں زیادہ تر باہر رہتا ہوں اور پاکستان میں کبھی کبھی آتا ہوں، اس سال یہاں نماز تراویح پڑھنے کا اتفاق ہوا، سوال یہ ہے کہ ایک نوجوان حافظ جس کی عمر ۲۵ سال کے قریب ہے، مستند حافظ ہے، قراءت بھی قابلِ اعتراض نہیں ہے، خود اپنی تجارت کرتے ہیں بلکہ خود اکثر و بیشتر مسجد کی مدد کرتے ہیں، اور مسجد سے کسی قسم کی اجرت نہیں لیتے، لیکن کچھ لوگ اس سے خوش نہیں ہیں، اور باہر سے رمضان کے لئے حافظ لانا چاہتے ہیں، اور ان کو ختم قرآن پر رقم بھی دینی پڑے گی، کیا یہ جائز ہے؟

---

(۱) وفی الدر المختار ج ۲ ص ۴۶۰ یجلس ندبا بین کل أربعة بقدرها ... ویخیرون بین تسبیح وقراءة وسکوت وصلوة فرادی

(۲) وفی الشامیة ج ۲ ص ۴۶۰ (طبع ایچ ایم سعید) (قوله بین تسبیح) قال القهستانی فیقال ثلاث مرات "سبحان ذی الملک والملکوت ... الخ"

جواب:- اُجرت پر تراویح پڑھانے کے لئے کسی حافظ سے معاہدہ کرنا قطعاً ناجائز ہے[۱]، اور جب مسجد کے حافظ صاحب بلا اُجرت نماز پڑھاتے ہیں اور لوگ بھی ان سے خوش ہیں تو خواہ مخواہ باہر سے اُجرت پر حافظ بلوانا بالکل نادرست ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۸/۲۸ ج)

تراویح پر اُجرت لینا

سوال:- رمضان میں حافظِ قرآن کے لئے لوگ چندہ جمع کرتے ہیں، اس کو کپڑے وغیرہ دیتے ہیں، یا پہلے سے پیسے مقرر کر کے حافظ کو لاتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- تراویح پڑھانے کے لئے اُجرت مقرر کرنا بالکل ناجائز ہے[۲]، اگر بغیر اُجرت کے حافظ نہ ملتا ہو تو "الم تر کیف ... الخ" سے تراویح پڑھی جائے۔ ہاں! اگر کسی اُجرت کے بغیر کسی حافظ نے تراویح پڑھائی اور کوئی شخص اپنی خوشی سے بطور ہدیہ اس کو کچھ پیش کرے تو اس کا لینا دینا جائز ہے، لیکن اوّل تو آج کل اس کا اتنا التزام کیا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک طرح سے طے شدہ اُجرت بن جاتی ہے، ایسے التزام سے پرہیز لازم ہے۔ دُوسرے اس غرض کے لئے چندہ کرنے میں بہت سے مفاسد ہیں، اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۲۱/۱۰/۱۴۰۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۰۰/۳۲ ج)

تراویح پر اُجرت لینے کا حکم

سوال ۱:- احقر قرآن مجید حفظ کرلینے کے بعد اپنے ملکی رواج کے مطابق تراویح میں قرآن مجید سنا کر رقم لیتا رہا، چند سالوں سے توبہ کی ہے اور رقم لینا چھوڑ دیا، لی ہوئی رقم حقوق العباد میں داخل تو نہیں؟ کیا صرف ندامت سے توبہ کافی ہے؟ واضح رہے کہ احقر اس دوران میں صاحبِ نصاب نہ تھا، نیز ختم والی رات سے پہلے اشرافِ نفس بھی ہوتا تھا۔

۲- امسال رمضان مبارک میں ختم والی رات رقم لینے سے انکار کر دیا، لیکن اس کے بعد کچھ

---

(۱) وفي الشامية ج ۶ ص ۵۶: ويمنع القاري للدنيا، والآخذ والمعطي آثمان. فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز، لأن فيه الأمر بالقراءة وإعطاء الثواب للآمر والقراءة لأجل المال، فإذا لم يكن للقاري ثواب لعدم النية الصحيحة فأين يصل الثواب إلى المستأجر، ولولا الأجرة ما قرأ أحد لأحد في هذا الزمان، بل جعلوا القرآن العظيم مكسبًا ووسيلة إلى جمع الدنيا، إنا لله وإنا إليه راجعون. نیز دیکھئے امداد المفتین ص ۳۱۵، و فتاوی دارالعلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۶۲ و ۲۹۸، و امداد الاحکام ج ۱ ص:۶۵۴۔

(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ۔

آدمی مخفی طور پر احقر کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کی خدمت اس لئے نہیں کرتے کہ آپ نے قرآن مجید سنایا، بلکہ صاحبِ علم جان کر بطور ہدیہ یا صدقہ کے دیتے ہیں، تو احقر نے ان کے اصرار پر کچھ رقم قبول کی، کیونکہ اس سے پہلے احقر کو کسی قسم کا اشراف وانتظار اس رقم کا نہ تھا۔

۲۔ رقم میرے لئے حرام تو نہیں تھی؟ اگر حرام تھی تو اس سے خلاصی کی کیا صورت ہے؟

جواب ۱ - تراویح سنانے پر اجرت لینا ناجائز ہے،(۱) لہٰذا یہ رقم اس کے اصل مالکوں کو واپس کرنا ضروری ہے، جن جن لوگوں تک پہنچنا ممکن ہو ان کو پہنچایا جائے یا ان سے معاف کرایا جائے، اور جہاں پہنچنا ممکن نہ ہو وہاں کے لئے توبہ واستغفار کیا جائے۔

۲ - صورتِ مسئولہ میں جو رقم دی گئی وہ اجرت نہیں، ہدیہ ہے جس کا وصول کرنا جائز ہے۔

واللہ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۳۷/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

شبینہ کا حکم

سوال: - ایک شخص شبینہ کا انتظام کرتا ہے، یعنی متعدد حفاظ قرآن کو دعوت دے کر ایک ہی رات میں قرآن ختم کیا جاتا ہے، بعض نوافل میں تلاوت کرتے ہیں اور دیگر ان کی اقتداء کرتے ہیں، اور بعض بلا اقتداء تلاوت کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب: - جس قسم کے شبینہ کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے اس کا اہتمام مکروہ ہے، کیونکہ وہ نوافل کی جماعت اور ایک رات میں قرآن کریم ختم کرنے پر مشتمل ہے، اور یہ دونوں مکروہ ہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۹/۲/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۹/۱۲ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص ۳۶۰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱۔

۱:- تراویح پر اُجرت کا مسئلہ
۲:- جماعت کے ساتھ فرض نہ پڑھنے والا تراویح میں امام بن سکتا ہے یا نہیں؟

سوال ۱:- تراویح کے لئے پیسے طے کرنا حرام ہے، مگر مولانا تھانویؒ وغیرہ چند حضرات کہتے ہیں اگر طے نہ کیا جائے، اور خوشی سے دے دیں تب بھی جائز نہیں، جس کے بعض حضرات ٹال دیتے ہیں، مگر وہ حافظ جو طے نہیں کرتے خوشی سے جو دیتے ہیں، لے لیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہدیہ ہے جو لینا سنت ہے، تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا حافظ پیسے، جوڑا، جوتا خوشی سے دیا ہوا لے سکتا ہے یا ناجائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟

۲:- کوئی حافظ گھر سے دیر میں پہنچا، مسجد میں جماعت ہو چکی، اس نے انفرادی نماز پڑھی تو کیا تراویح یا وتر پڑھا سکتا ہے؟

جواب ۱:- تراویح پر اجرت لینا طے کر کے بھی حرام ہے، اور اگر زبانی طور پر طے نہ کیا جائے لیکن عرف و رواج یہ ہو کہ زبانی طے کئے بغیر بھی لینا دینا طے سمجھا جاتا ہو تو اس صورت میں بھی ناجائز ہے۔[۲] البتہ اگر نہ زبانی طے کیا ہو، نہ عرفاً طے سمجھا جاتا ہو، نہ حافظ کے دل میں تراویح پڑھانے کا محرک یہ ہو کہ کچھ ملے گا، اس کے بعد اگر مسجد والے اپنی خوشی سے کچھ دے دیں تو لینے کی گنجائش ہے۔

۲:- پڑھا سکتا ہے۔[۳]

واللہ اعلم
۱۰ [illegible] ۱۳۹۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۰ / ۳۰ ب)

۲۳ ویں رات میں سورۂ عنکبوت اور روم پڑھنا

سوال:- ہمارے یہاں رمضان کی تیئیسویں رات کو تراویح کے بعد سورۂ عنکبوت اور سورۂ روم نمبر ۲۰، نمبر ۲۱ پڑھنے کا رواج ہے، کیا ان سورتوں کے پڑھنے کا ثبوت ہے یا نہیں؟

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ۔

(۲) وفی الشامیۃ ج:۳ ص ۱۳۰ (طبع سعید) المعروف کالمشروط

(۳) وفی الشامیۃ مبحث التراویح ج ۲ ص [illegible] (طبع سعید) لو صلی جماعۃ الفرض وکان رجل قد صلی الفرض وحدہ لہ أن یصلیہا مع ذلک الامام لأن جماعتہم مشروعۃ، فلہ الدخول فیہا معہم لعدم المحذور.
وفی الھندیۃ ج [illegible] ص [illegible] اذا صلی العشاء وحدہ فلہ ان یصلی التراویح مع الامام [illegible] وفی غنیۃ المستملی ص [illegible] (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) اذا صلی العشاء وحدہ فلہ ان یصلی التراویح مع الامام وھو الصحیح [illegible]
نیز دیکھئے کفایت المفتی ج ۳ ص ۳۹۳ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت)۔

جواب:- ہمارے علم میں اس کا کوئی ثبوت نہیں، نہ اس کی پابندی کی کوئی شرعی بنیاد ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱۲/۱۰ھ

شبینہ کا حکم

سوال:- رمضان المبارک میں شبینہ سننا یا سنانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- قرآن شریف جتنا زیادہ سے زیادہ تلاوت کیا جائے اتنا ہی موجب ثواب وخیر وبرکت ہے، خواہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں، نماز میں اور زیادہ ثواب ہے، لیکن نفل نماز کی جماعت دو تین آدمیوں سے زیادہ کی مکروہ ہے، لہٰذا بغیر جماعت کے تنہا، یا دو تین آدمیوں کی جماعت میں پورا قرآن شریف تین یا زیادہ راتوں میں ختم کرنا بہت بڑا ثواب کا کام ہے، لیکن جس طرح کے شبینے اب رائج ہوگئے ہیں کہ نفل جماعت کے لئے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے اور جماعت بھی تین سے زیادہ آدمیوں کی ہوتی ہے، جو لوگ نماز میں شامل نہیں ہوتے وہ باتیں کرتے رہتے ہیں، یا مٹھائی وغیرہ کے انتظام میں لگے رہتے ہیں، قرآن شریف سننے کی طرف دھیان نہیں کرتے، یہ ناجائز ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱۲/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۴۹ ج)

شبینہ کا حکم

سوال ۱:- شعبان کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ کو شبینہ کیا جاتا ہے، اس میں حفاظ پارے پڑھتے ہیں، ایسے شبینہ میں نیت باندھ کر امام کی اقتداء میں قرآن سننے کا کیا حکم ہے؟ یا اس طرح قرآن سننا جائز ہے؟ ۲- شبینہ میں قرآن پڑھنا اور اس میں حصہ لینا کیا حکم رکھتا ہے؟ ۳- اس مسجد میں حاضر رہنا اور شبینہ کے کاموں میں تعاون وامداد کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱ تا ۳:- حنفی مسلک میں نوافل کی جماعت مکروہ تحریمی ہے۔[۱][۲] لہٰذا مذکورہ شبینہ

---

(۱) وفي غنية المستملي ج ... ص ... واعلم ان النفل بالجماعة على سبيل التداعي مكروه على ما تقدم ما عدا التراويح ... الخ وفي الدر المختار ج ۲ ص ۴۹ ... فلو ترك اهل ... ولا يصلي الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان اي يكره ذلك على سبيل التداعي بان يقتدي اربعة بواحد كما في الدرر. وكذا في فتاوى دارالعلوم ديوبند ج:۴ ص ۲۲۳ و ص ۲۲۸۔

(۲) وفي الدر المختار ج ۲ ص ۴۹ (طبع سعيد) فلو ترك اهل ... ولا يصلي الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان اي يكره ذلك على سبيل التداعي بان يقتدي اربعة بواحد. وفي غنية المستملي ص ۴۳۲ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور) واعلم ان النفل بالجماعة على سبيل التداعي مكروه على ما تقدم ما عدا التراويح ... الخ

(محمد زبیر حق نواز)

جائز نہیں۔ ایسے شبینہ کا انتظام و اہتمام، اس میں امامت یا اقتداء یا اس میں لوگوں کو دعوت دینا یہ تمام باتیں شرعاً جائز نہیں۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۶۰ ۲۸ ج)

شبینہ کا حکم، جائز شبینہ کس طرح ہوسکتا ہے؟

سوال ۱:- آج کل جو رمضان شریف میں شبینہ ہوتے ہیں، اکثر حفاظ نوافل میں پڑھتے ہیں اور بعض نابالغ بچوں سے پڑھواتے ہیں جبکہ مقتدی بالغ ہوتے ہیں، اور لاؤڈ اسپیکر بھی استعمال ہوتا ہے جس سے اہل محلہ کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں، نیز سننے والے چند شخص ہوتے ہیں، اکثر چائے پانی میں مشغول ہوتے ہیں، اور شور و شغب کا بازار گرم رہتا ہے، نیز ان شبینوں کی بے پردگی عام طور پر بھی کرتے دیکھا ہے، کیا مروجہ شبینہ جائز ہے؟ ۲- شبینہ کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ ۳- کیا جہری نماز میں لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا زیادہ ثواب ہے جبکہ آواز دُور دُور تک جاتی ہے؟

جواب ۱:- جس قسم کے شبینے کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، وہ بلاشبہ مکروہ تحریمی ہے اور اس میں ثواب کے بجائے اُلٹا گناہ ہے، اوّل تو نوافل کی جماعت مکروہ تحریمی ہے،[1] پھر نابالغ کی اقتداء،[2] بلاضرورت لاؤڈ اسپیکر کا استعمال اور شور و شغب کے ذریعے قرآن کریم کی بے ادبی، یہ سب امور سخت منکرات ہیں اور ان سے پرہیز لازم ہے۔

۲- جائز شبینہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ تراویح کی جماعت رات بھر جاری رہے، اس میں امام بالغ اور متشرع ہو، تین دن سے کم میں قرآن کریم ختم نہ کیا جائے، تمام لوگ ذوق و شوق اور خشوع و خضوع کے ساتھ قرآن کریم سنتے ہوں، زائد روشنی اور چراغاں سے پرہیز کیا جائے، بلاضرورت لاؤڈ اسپیکر کا استعمال نہ ہو اور نام و نمود سے کلی اجتناب کیا جائے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۳ ۲۸ ج)

شبینہ کے جواز کی شرائط

سوال:- مسجد میں رمضان المبارک میں شبینہ ہوتا ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، بعض جائز۔ شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟ شبینہ کے جواز کی شرائط براہِ کرم بتادیں۔

---

(۱) دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۲) وفي الدر المختار ج ۱ ص [illegible] ولا يصح اقتداء رجل بامرأة وخنثى وصبي مطلقا ولو في جنازة ونفل على الأصح، وفي الشامية تحته والمختار أنه لا يجوز في الصلوات كلها. الخ

جواب:- شبینہ تراویح میں ہو، نفلوں میں نہ ہو۔ فضول خرچی، شور، شغب اور نام و نمود سے احتراز کیا جائے، اور اس کی فرائض و واجبات کی طرح پابندی نہ کی جائے تو جائز ہے، اور ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو ناجائز ہے۔[1] واللہ اعلم

۱۳۹۸/۹/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۲۰۰۱ ج)

تراویح میں تین بار سورۂ اخلاص پڑھنا

سوال ۱:- کسی مسجد کے امام صاحب فرماتے ہیں کہ تراویح میں آخری پارہ میں سورۂ اخلاص تین مرتبہ پڑھنا درست ہے، جبکہ زید کہتا ہے کہ سورۂ اخلاص کا تین مرتبہ پڑھنا بدعت ہے۔ (سند بہشتی زیور جلد گیارہ)۔

۲- امام نے تراویح کی دو رکعت کی نیت باندھی، لیکن دوسری رکعت میں التحیات پڑھے بغیر کھڑا ہو گیا، تقریباً پانچ سیکنڈ کے بعد امام صاحب پھر بیٹھ گئے، اور حسب معمول دونوں رکعتیں پوری کر کے سلام پھیر دیا۔ زید کا یہ اعتراض ہے کہ امام صاحب کے گھٹنے اور کمر سیدھی ہو گئی، لہٰذا چار رکعت پوری کر کے سجدۂ سہو کر کے چار پوری کرنی چاہئے تھی۔ صحیح مسئلہ کیا ہے؟

جواب ۱:- جماعت کی نماز میں کسی آیت یا سورت کو بار بار پڑھنا فقہاء نے مکروہ لکھا ہے،[2] اور آج کل تراویح میں سورۂ اخلاص کو تین بار پڑھنے کا جو التزام کر لیا گیا ہے کہ اسے سنت سمجھتے ہیں، اس سے اس کے بدعت ہونے کا بھی اندیشہ ہے، لہٰذا اس عمل سے پرہیز ہی کرنا چاہئے۔ بہشتی گوہر میں مسئلہ صحیح ہے اور امداد الفتاویٰ ج اول ص ۳۰۴ میں بھی اسی پر فتویٰ ہے۔[3]

۲- امام صاحب نے جو عمل کیا وہ درست ہے، دو رکعت کی فرض نماز میں اور سنن و نوافل میں پوری طرح کھڑے ہونے کے بعد بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ زید نے جو مسئلہ بیان کیا وہ چار رکعت کی فرض نماز کے قعدہ اولیٰ سے متعلق ہے، صورت مسئولہ سے اس کا تعلق نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۲۸ ج)

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص ۴۶۳ حاشیہ نمبر ا۔

(۲) وفي الهندية ج ۱ ص ۱۰۷ (طبع مكتبه رشيديه كوئته): ذكر السورة في ركعة واحدة مرارا ... في الصلوة المفروضة فهو مكروه في حالة الاختيار وأما في حالة العذر والنسيان فلا بأس هكذا في المحيط وكذا في غنية المستملي ص ۴۹۴ (طبع سهيل اكيدمي لاهور) نیز دیکھئے امداد الاحکام ج ۱ ص ۲۲۵ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

(۳) امداد الفتاوی ج ۱ ص ۳۲۸،۳۲۷ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

تراویح میں قرآن پڑھے جانے کے باوجود الگ سے "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ" سے تراویح پڑھنا

سوال:- ایک مسجد میں تراویح میں باقاعدہ ختمِ قرآن ہوتا ہے اور بلا اجرت، لیکن اسی مسجد میں کچھ لوگ "الم تر کیف" سے تراویح پڑھتے ہیں، یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جب مسجد میں ایک حافظ صاحب قاعدے میں تراویح میں قرآن کریم سنا رہے ہیں تو ان کی تراویح کی موجودگی میں "الم تر کیف ... الخ" سے الگ تراویح بلا عذر نہ پڑھنی چاہئے، ہاں! اگر کوئی عذر ہو تو اسے بالتفصیل لکھ کر مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۶-۹-۱۳۹۶ھ

تراویح کو ضروری نہ سمجھنا اور بلا عذر تراویح ترک کرنا

سوال:- ایک صاحب کہتے ہیں کہ تراویح سنت ہے، پڑھے یا نہ پڑھے کوئی گناہ نہیں۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعتِ مطہرہ میں کیا حکم ہے؟

جواب:- تراویح سنتِ مؤکدہ ہے، اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ پڑھے یا نہ پڑھے کوئی گناہ نہیں، بالکل غلط ہے۔ جو صاحب ایسا کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۳/۱۱/۱۳۹۶ھ

تراویح میں ایک مرتبہ ختمِ قرآن سنت ہے

سوال:- ایک مسجد میں دو جگہ تراویح ایک وقت ہوتی ہے، ان دونوں کی قراءتیں مخلوط ہوکر سہو کی موجب بن جاتی ہیں۔ ان دو اماموں میں سے ایک امام ایسا ہے جو "الم تر کیف" سے مختصر کے ساتھ پڑھتا ہے، قوم کی اکثریت امام اول کے ساتھ ہے، اور دوسرا حافظِ قرآن ہے، وہ ختم کرتا ہے، اپنے عزیز و اقارب کو سمجھا کر شریک کرتا ہے، اور قوم کو یہ کہتا ہے کہ یہ مختصر تراویح نہیں ہوتی۔ امام اول کہتا ہے کہ جب قوم پر ختمِ قرآن ثقیل ہو تو اس کا ترک افضل ہے۔ الأفضل في زماننا قدر ما لا يثقل علی القوم۔ اور کہتا ہے کہ ختمِ قرآن ضرورتِ دین سے نہیں ہے، اور جب ضروریاتِ دین سے نہ ہوا تو اس کو ترک کیا جاسکتا ہے۔

---

(١) في الهندية ج ... ص ... ومن ترك سنن الصلوات الخمس إن لم ير السنن حقاً فقد كفر لأنه ترك استخفافاً وإن رآها حقاً فالصحيح أنه يأثم لأنه جاء الوعيد بالترك. وفي البحر الرائق ج ٢ ص ٦٩ طبع ايچ ايم سعيد رجل ترك سنن الصلوات الخمس إن لم ير السنن حقاً فقد كفر لأنه ترك استخفافاً وإن رأى حقاً منهم من قال لا يأثم والصحيح أنه يأثم، لأنه جاء الوعيد بالترك اهـ وراجع أيضاً الشامية ج ١ ص ١٠٣ (محمد زبیر)

جواب:- قال فی الدر: والختم مرۃ سنۃ ومرتین فضیلۃ وثلاثا أفضل، ولا یترک الختم لکسل القوم لکن فی الاختیار الأفضل فی زماننا قدر ما لا یثقل علیھم، وأقرہ المصنف وغیرہ، وفی المجتبی عن الامام لو قرأ ثلاث قصارا أو اٰیۃ طویلۃ فی الفرض فقد أحسن ولم یسیئ فما ظنک بالتراویح؟ (الی) من لم یکن عالما بأھل زمانہ فھو جاھل، وأقرہ الشامی ج:۱ ص:۴۷۵۔[1]

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ تراویح میں ایک مرتبہ قرآن کریم ختم کرنا سنت ہے، اور یہ جو فقہاء نے لکھا ہے کہ جب مقتدیوں پر طویل قراءت ثقیل ہو اس وقت چھوٹی سورتوں سے تراویح پڑھنی چاہئے، یہ بالکل مجبوری کی صورت میں ہے، یہ مجبوری ہمارے زمانے میں ایسی نہیں ہے کہ اس کی بناء پر مسجدوں میں اس سنت کو ترک کردیا جائے، بلکہ تمام مساجد میں قرآن کریم ختم ہوتا ہے اور مقتدی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، لہٰذا اس سنت کو مساجد میں بغیر مجبوری کے ترک نہ کرنا چاہئے، بالخصوص جبکہ قرآن کریم سننے کے لئے حافظ موجود ہے تو امام کو چاہئے کہ تراویح اس سے پڑھوائے اور خود ''الم تر کیف'' سے پڑھنے پر اصرار نہ کرے، مسجد دین کا ہے اس میں خواہ مخواہ انتشار پیدا کرنا دُرست نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹۹۷/۲۷ ہ)

تراویح سے متعلق متعدّد مسائل

۱:- پہلے سے طے کئے بغیر تراویح کے اختتام پر کچھ دینا
۲:- بچے کو سامع بنانا
۳:- حافظ صاحب کا لقمہ قبول نہ کرنا
۴:- اختتام پر پہلی رکعت میں سورۂ ناس اور دُوسری رکعت میں سورۂ بقرہ کا ابتدائی حصہ پڑھنا

سوال ۱:- رمضان میں تراویح جو حافظ پڑھاتے ہیں، وہ رقم مقرر کرکے پڑھتے ہیں تو کیا نماز جائز ہوگی؟ اگر رقم مقرر نہ کی ہو اور تراویح کے خاتمے پر کچھ رقم دے دی جائے تو وہ نماز جائز ہوگی یا نہیں؟

(۱) الدر المختار ج ۲ ص ۴۷ (طبع ایچ ایم سعید)

۲- حافظ صاحب کا سامع ساتھ میں جو ایک بچہ ہو، وہ تراویح میں سوچے یا ایسی حرکتیں کرے جس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور لقمہ بھی نہ دے، تو ان حافظ صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟

۳- اگر حافظ صاحب لقمہ قبول نہ کریں اور متکبرانہ الفاظ استعمال کریں کہ میں ٹھیک پڑھتا ہوں، اگر وہ غلط بھی پڑھیں تو لقمہ نہ دیں، تو کیا یہ نماز جائز ہوگی؟

۴- اگر سورۂ ناس پہلی رکعت میں پڑھی جائے اور سورۂ بقرہ دُوسری رکعت میں تو اس سے نماز ٹھیک ہوگی یا نہیں؟

۵- اگر پیش امام، نماز میں لقمہ قبول نہ کرے تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے؟ جبکہ وہ بار بار غلطیاں کرتا ہو۔

جواب ۱:- اُجرت طے کرکے تراویح سنانا بالکل ناجائز ہے،[1] اس سے بہتر ہے کہ لوگ عام امام کے پیچھے "الم تر کیف" سے تراویح پڑھ لیں۔ جو حافظ اُجرت لے کر تراویح سناتا ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، البتہ جو نماز اس کے پیچھے پڑھ لی وہ ہوگئی، اعادہ واجب نہیں۔

پہلے سے طے کئے بغیر تراویح کے اختتام پر کچھ دے دینا جائز ہے، بشرطیکہ یہ بات اتنی معروف و مشہور نہ ہوگئی ہو کہ طے کئے بغیر بھی طے سمجھی جاتی ہو۔

۲:- بچے کو سامع بنا کر پہلی صف میں کھڑا کرنے کی ضرورۃً گنجائش ہے، اس بچے سے اگر کبھی غلطی ہوجائے تو درگزر کرنا اور فہمائش کرنا چاہئے، محض اس بناء پر امام یا حافظ کے خلاف فتنہ کھڑا کرنا درست نہیں۔

۳- حافظ صاحب کو صحیح لقمہ قبول کرنا چاہئے اور اس کو ذاتی عزّت و وقار کا مسئلہ نہیں بنانا چاہئے، البتہ اس سے نماز میں خلل نہیں آتا، تاوقتیکہ حافظ صاحب نے کوئی مفسدِ صلوٰۃ غلطی نہ کی ہو۔

۴- ٹھیک ہوگئی، اس میں کوئی گناہ نہیں، البتہ ختمِ قرآن کے علاوہ دُوسری نمازوں میں بہتر یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ ناس نہ پڑھے۔[2]

۵- نماز کا صحیح ہونا یا نہ ہونا غلطیوں کی نوعیت پر منحصر ہے، بعض غلطیوں سے نماز فاسد ہوجاتی

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص ۴۶۰ حاشیہ نمبر ۔

(۲) وفی غنیۃ المستملی شرح لمنیۃ ص ۴۹۴ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) وفی الولو الجیۃ من یختم القرآن فی الصلاۃ اذا فرغ من المعوذتین فی الرکعۃ الاولی یرکع ثم یقرأ فی الرکعۃ الثانیۃ بفاتحۃ الکتاب وشیء من سورۃ البقرۃ، لأن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال خیر الناس الحال المرتحل، أی الخاتم المفتتح

ہے اور بعض سے نہیں ہوتی، لہٰذا ہر غلطی کا حکم الگ پوچھنا چاہئے، اور جو حافظ صاحب کثرت سے غلطیاں کرتے ہوں اور صحیح لقمہ بھی قبول نہ کرتے ہوں ان کے بجائے کوئی اچھے حافظ صاحب تلاش کرنے چاہئیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بعض غلطیاں مفسد نماز کر جائیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

۹/۱۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۶۷ ج)

داڑھی منڈانے والے کی اقتداء میں تراویح پڑھنا

سوال:- رمضان میں اکثر حافظ جو مسجد میں قرآن شریف سناتے ہیں، داڑھی نہیں رکھتے یا ان کی شرعی داڑھی نہیں ہوتی، تو کیا اس قسم کے حفاظ کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے؟ فرض نماز اور نماز تراویح دونوں کے لئے ازروئے فقہ حنفی کیا حکم ہے؟

جواب:- جو شخص داڑھی منڈاتا ہو یا شرعی مقدار سے کم داڑھی رکھتا ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔[1] تراویح اور فرض نمازوں کا ایک ہی حکم ہے، البتہ جو نماز ایسے شخص کے پیچھے پڑھ لی گئی وہ ادا ہوگئی۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳/۱۰/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۳۸/۲۹ ہ)

کھڑے ہوکر تراویح پڑھنے کے بعد عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھنا

سوال:- سنا ہے چاہے کوئی بوڑھا ہو یا جوان اگر وہ نماز تراویح شروع ہی سے کھڑے ہوکر پڑھنی شروع کردے تو تمام نماز تراویح کھڑے کھڑے ہی ادا کرنا ہوگا، کسی بھی حالت میں بیٹھ کر پوری کرنا جائز نہیں، جبکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں، اگر عذر ہو تو بیٹھ سکتے ہیں۔

---

(۱) وفي الدر المختار ج ۱ ص ۵۵۹ و ۵۶۰ طبع ایچ ایم سعید: ویکره امامة عبد ... وفاسق، وفي الشامية قوله وفاسق من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة ولعل المراد به من يرتكب الكبائر ... وكذا في البحر الرائق ج ۱ ص ۳۶۸ وفي الدر المختار ج ۲ ص ۴۱۸ وأما الأخذ منها وهي دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه أحد وأخذ كلها فعل يهود الهند ومجوس الأعاجم. اھ

(۲) وفي الدر المختار ج ۱ ص ۵۶۲ طبع ایچ ایم سعید: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. اھ

جواب:- آپ نے ٹھیک سمجھا ہے، اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تراویح کھڑے ہوکر شروع کرنے کے بعد کسی بھی حالت میں بیٹھ کر پوری کرنا جائز نہیں، وہ دُرست نہیں کہتے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت عذر پر موقوف ہے، اگر عذر شروع ہی سے ہو تو شروع ہی سے بیٹھ کر نماز پڑھے، اور اگر بیچ میں پیش آئے تو بیچ میں بیٹھ جانا بھی جائز ہے۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۹۷۱/۲۸ ج)

تراویح کی رکعتوں کی تعداد

سوال:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ تراویح پڑھی ہیں یا بیس؟ اور بیس تراویح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تراویح کے بارے میں مختلف روایات ہیں، صحابہ کرامؓ کا اس پر اتفاق ہے کہ تراویح بیس رکعتیں پڑھی جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو جاننے والا صحابہؓ سے زیادہ کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے بیس رکعت تراویح پڑھنا چاہئے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

[1] وفي مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج [illegible] ص ۲۲۹: ولو مرض في أثناء الصلوة بنى بما قدر يعني لو شرع في الصلوة صحيحاً قائماً فحدث به مرض يمنعه عن القيام صلى ما بقي قاعداً يركع ويسجد، ولو [illegible] قاعداً يركع ويسجد [illegible] على القيام بنى قائماً عند [illegible] وفي البناية ج [illegible] ص ۲۰: ولو قعد بعد ما افتتحه قائماً جاز عند الامام استحساناً لأنه أسهل من الابتداء ويكره لو بلا عذر عنده ... الخ.

[2] وفي مصنف ابن أبي شيبة ج ۲ ص ۳۹۴ عن ابن عباس أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي في رمضان عشرين ركعة وكذا في المعجم [illegible] ص [illegible] وفي تلخيص الحبير في تخريج أحاديث الرافعي الكبير ج ۲ ص ۵۰۹ حديث أنه صلى الله عليه وسلم صلى بالناس عشرين ركعة ليلتين، فلما كان في الليلة الثالثة اجتمع الناس فلم يخرج إليهم ثم قال من الغد خشيت أن تفرض عليكم فلا تطيقوها. وفي [illegible] فصلى بهم عشرين ركعة ص [illegible] وفي السنن الكبرى للبيهقي ج ۲ ص [illegible] عن يزيد بن خصيفة عن السائب بن يزيد قال كانوا يقومون على عهد عمر بن الخطاب في شهر رمضان بعشرين ركعة. وفي آثار السنن ج ۲ ص ۵۵ عن عبد العزيز بن رفيع وفي موطأ امام مالك ص ۴۰ عن يزيد بن رومان أنه قال كان الناس يقومون في زمن عمر بن الخطاب بثلاث وعشرين ركعة. وفي عمدة القاري ج [illegible] ص [illegible] عن عبد الله بن مسعود كان يصلي عشرين ركعة. وراجع [illegible] فتح الباري ج [illegible] ص:۲۰۹، وآثار السنن ج:۱ ص:۵۵، والشامية ج:۲ ص:۴۵، وغنية المتملي ص:۴۰۲ (طبع سهيل اكيڈمي لاهور) وعمدة [illegible] ص [illegible] والجوهر النقي ج ۲ ص ۴۹۶ وسلسلة [illegible] ج ۱ ص:۶۳۷. (محمد زبیر)

تراویح میں شرکت کے لئے عورتوں کا مسجد جانا

سوال:- یہاں رمضان میں عورتوں کا خیال ہے کہ مسجد میں جاکر حافظ صاحب کا تراویح میں قرآن سنیں، وہاں پردے کا انتظام ہوگا، مردوں کی صفوں کے بعد عورتوں کے لئے پردے کا انتظام ہوگا، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- عورتوں کا مسجد میں جاکر جماعت میں شریک ہونا مکروہ تحریمی ہے، مراس سے کوئی نماز مستثنیٰ نہیں، خاص طور سے مردوں کی تلاوت قرآن سننے کا مقصد موجودہ حالات میں زیادہ تر حسن صوت ہوتا ہے، جو اور زیادہ موجب فتنہ ہے، وکرہ لهن حضور الجماعة الا للعجوز فی الفجر والمغرب والعشاء، والفتوی الیوم علی الکراهة فی کل الصلوة لظهور الفساد، کذا فی الکافی عالمگیریة ج:۱ ص:۹۳۔[1]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱/۲/۱۳۹۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۲۲ الف)

(۱) الهدایة ج:۱ ص:۸۹ (طبع مکتبه حقانیه پشاور) وکذا فی الدر المختار ج ۱ ص ۵۲۵، ۵۲۶

﴿فصل فی الوتر﴾
(وتر سے متعلق مسائل)

وتر کا وقت اور طریقہ

سوال:- وتر کس طرح اور کب پڑھتے ہیں؟ اس کی کتنی رکعتیں ہیں اور ان تمام باتوں کے دلائل کیا ہیں؟

جواب:- وتر کا وقت عشاء کی نماز کے فوراً بعد شروع ہوجاتا ہے، اور فجر سے پہلے کسی بھی وقت پڑھ سکتے ہیں۔[1] اس کی تین رکعتیں ہیں، دو رکعتوں پر قعدہ کرکے التحیات پڑھیں اور کھڑے ہوجائیں، پھر تیسری رکعت میں بھی سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت ملائیں،[2] اس کے بعد کانوں تک ہاتھ اُٹھا کر دُعائے قنوت پڑھیں۔[3]

اور وتر سے پہلے عشاء کی دو رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں[4] اور بعد میں دو رکعت نفل ہیں، اور جو شخص تہجد میں اُٹھنے کا عادی ہو اس کے لئے افضل یہ ہے کہ وتر تہجد کے وقت پڑھے،[5] اور ان تمام باتوں کے دلائل مفصل کتابوں میں موجود ہیں، یہ فتویٰ میں لکھنے کی بات نہیں۔ واللہ اعلم

(فتویٰ نمبر ۱۵۶/۲۸ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب الصلوٰة ج:۱ ص ۳۶۱ (طبع سعید) (و) وقت (العشاء والوتر منه الی الصبح ولکن لا یصح ان (یقدم علیها الوتر)

(۲) وفی تنویر الابصار مع شرحه ج ۲ ص ۵ (طبع سعید) وهو ثلاث رکعات بتسلیمة ویقرأ فی کل رکعة منه فاتحة الکتاب وسورة ... الخ

(۳) وفی آثار السنن باب رفع الیدین عند قنوت الوتر ص ۱۶۹ (مکتبه امدادیه ملتان) عن عبدالله انه کان یقرأ فی آخر رکعة من الوتر قل هو الله احد ثم یرفع یدیه فیقنت قبل الرکعة [illegible] البخاری [illegible] وفی الدر المختار ج ۲ ص ۶ باب الوتر والنوافل (طبع ایچ ایم سعید) ویکبر قبل رکوع ثالثة رافعاً یدیه کما مر [illegible] وقنت فیه

(۴) وفی الدر المختار باب الوتر والنوافل ج ۲ ص ۱۲، ۱۳ (طبع سعید) (وسن) مؤکداً أربع قبل الظهر ورکعتان .... بعد العشاء

(۵) (والمستحب) [illegible] تأخیر الی آخر اللیل لواثق بالانتباه، والا فقبل النوم. الدر المختار کتاب الصلوٰة ج ۱ ص ۳۶۹ (طبع سعید). وفی الشامیة تحته أی یستحب تأخیره، لقوله صلی الله علیه وسلم من خاف أن لا یوتر من آخر اللیل فلیوتر أوله ومن طمع أن یقوم آخره فلیوتر آخر اللیل فان صلوٰة آخر اللیل مشهودة وذلک أفضل رواه مسلم والترمذی وغیرهما وتمامه فی الحلیة، وفی الصحیحین اجعلوا آخر صلاتکم وترا والامر للندب بدلیل ما قبله بحر

شافعی امام کے پیچھے حنفی کے وتر پڑھنے کا حکم

سوال:- شافعی امام کے پیچھے وتر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جائز ہے تو کن شرائط کے تحت؟ براہ کرم تفصیلی طور پر آگاہ فرمائیں۔

جواب:- شافعی کے پیچھے حنفی کی اقتداء چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

۱- حنفی کے مذہب کے مطابق شافعی کی نماز میں کوئی مفسد نماز فعل نہ ہو۔

۲- حنفی مقتدی کو یقین ہو کہ شافعی امام جائز و ناجائز کے ہم مختلف فیہ مسائل میں احتیاط سے کام لیتا ہے، مثلاً بہتے ہوئے خون کے نکلنے سے وضو کر لیتا ہے، اور اگر اسے اس کا یقین ہو کہ امام احتیاط نہیں کرتا تو نماز صحیح نہ ہوگی، اور اگر اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں کہ احتیاط کرتا ہے یا نہیں، تو نماز مکروہ ہوگی۔

۳- وتر میں اقتداء کرنے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ تین رکعتوں کو دو سلاموں کے ساتھ نہ پڑھے (جیسا کہ ان کا مذہب ہے)، اور اس میں مقتدی کو اپنی قنوت "اللّٰھم انا نستعینک الخ" رکوع سے پہلے پڑھنا چاہئے، پہلے نہیں، کیونکہ شافعی امام بھی رکوع کے بعد پڑھے گا، اور اس مسئلے میں اس کی متابعت کرنا ضروری ہے۔

ان تمام مسائل کے دلائل کتب فقہ سے حسب ذیل ہیں:-

۱- درمختار میں ہے: ومخالف کشافعی (یعنی یکرہ الاقتداء به) لکن فی وتر البحر ان تیقن المراعاة لم یکرہ، أو عدمها لم یصح وان شک کرہ. اور علامہ شامیؒ اس کے تحت فرماتے ہیں: ھذا ھو المعتمد، لأن المحققین جنحوا الیه، وقواعد المذھب شاھدة علیه، وقال کثیر من المشائخ ان کان عادته مراعاة مواضع الخلاف جاز والا فلا، ذکرہ السندی (شامی ج ۱ ص ۵۲۶)[1]

(ومثله فی شرح الکنز للعینی ج اوّل ص ۴۲)[2]

۲- درمختار میں ہے: (وصح الاقتداء فیه) (یعنی الوتر) ففی غیرہ أولی ان لم یتحقق منه ما یفسدھا فی اعتقادہ فی الأصح کما بسطه فی البحر (بشافعی) مثلاً (لم یفصله بسلام لا ان فصله (علی الأصح) فیهما للاتحاد وان اختلف الاعتقاد (رد المحتار ج اوّل ص ۶۲۵)[3]

---

(۱) شامی ج ۱ ص ۵۶۲، ۵۶۳ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) رمز الحقائق شرح العینی علی کنز الدقائق باب الوتر والنوافل ج ص ۴۵ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔

(۳) الدر المختار باب الوتر والنوافل ج ص ۲۰۰ (طبع سعید)

۳- في الدر المختار: ويأتي المأموم بقنوت الوتر ولو بشافعي يقنت بعد الركوع، لأنه مجتهد فيه، وقال الشامي تحت قوله (ولو بشافعي ... الخ) أي ويقنت بدعاء الاستعانة لا دعاء الهداية، وقال تحت قوله (لأنه مجتهد فيه ... الخ) والظاهر أن المراد من وجوب المتابعة في قنوت الوتر بعد الركوع المتابعة في القيام فيه لا في الدعاء (شامی ج:۲ ص:۹)[1]

تنبیہ:- جو شرط ہمارے یہاں شافعی کے پیچھے اقتداء میں ہے کہ کوئی مفسد نماز نہ ہو، وہی شرط شافعی حضرات کے یہاں حنفی کے پیچھے نماز پڑھنے میں ہے، جیسا کہ علامہ عینیؒ نے شرح کنز میں لکھا ہے: الشافعي أيضاً يقول مثله في حق الحنفي فيقول: لا يجوز اقتداء الشافعي بالحنفي إلا إذا كان يحتاط في موضع الخلاف۔

پھر چند سطروں کے بعد ہے: يجوز اقتداء الحنفي بالشافعي والشافعي بالحنفي وكذا بالمالكي والحنبلي ما لم يتحقق من إمامه ما يفسد صلوته في اعتقاده (عینی ج:۱ ص:۴۵)[2]۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲۰/۲/۱۳۸۹ھ
۱۴/جون ۱۹۲۰ء[3]

الجواب صحیح
محمد شفیع عفا اللہ عنہ

شافعی کے پیچھے حنفی کا وتر پڑھنا

سوال:- جناب مولانا تقی صاحب! ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے، افریقہ میں اکثر شافعی مسجدیں ہیں، وہاں حنفی مسلک کے لوگ بھی نماز پڑھتے ہیں، جب وتر کا مسئلہ آتا ہے تو حنفی اگر شافعی مسلک کے امام کے پیچھے تراویح کے بعد وتر پڑھیں تو صحیح ہے یا علیحدہ جماعت کرنا ضروری ہے؟ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کا جواب مندرجہ ذیل پتے پر دیں۔ ٹکٹ کے پیسے لفافے کے اندر نہیں بھیجے کیونکہ یہ قانوناً جرم ہے۔

احمد رحمت اللہ
(دار السلام، تنزانیہ)

جواب:- شافعی حضرات چونکہ وتر دو سلاموں کے ساتھ پڑھتے ہیں اور حنفی مسلک میں اس

(۱) شامی ج:۲ ص:۸، ۹ (طبع سعید).
(۲) شرح العینی علی الکنز المسمّٰی برمز الحقائق باب الوتر والنوافل ج:۱ ص:۴۵ (طبع ادارۃ القرآن کراچی).
(۳) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرین [illegible]

طرح نماز نہیں ہوتی،(۱) اس لئے حنفی حضرات کو چاہئے کہ وہ وتر میں ان کے ساتھ شامل نہ ہوں، بلکہ اپنی نماز علیحدہ ادا کریں۔ تراویح ان ہی کے ساتھ ادا کرلیا کریں اور وتر کے وقت علیحدہ ہوجائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۹/۹/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۰۹ / ۳۱ ج)

مسجد میں دو جگہ تراویح ہونے کی بناء پر وتر کی دو جماعتوں کا حکم

سوال:- مسجد میں دو جگہ تراویح، اندر اور چھت پر ہوتی ہیں، سب نمازی اندر والے امام کی اقتداء میں فرض پڑھتے ہیں، البتہ وتر کی جماعتیں اندر اور چھت پر علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں، کیونکہ تراویح کی دونوں جماعتیں الگ الگ وقت پر ختم ہوتی ہیں، کیا اس طرح وتر کی دو جماعتیں کرانا جائز ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں الگ الگ وتر کی جماعتیں جائز ہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۷۳ / ۳۲ ج)

وتر میں دُعائے قنوت بھول جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- وتر میں دُعائے قنوت بھول جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب:- دُعائے قنوت واجب ہے، اگر وہ بھولے سے چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔(۲)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۲/۳ھ

الجواب صحیح

محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰ / ۱۸ الف)

---

(۱) في البحر الرائق ج ۲ ص ۳۹، ۴۰ وظهر بهذا أن المذهب تصحيح صحة الاقتداء بالشافعي في الوتر إن لم يسلم على رأس الركعتين وعدمها إن سلم والله الموفق للصواب. وفي الدر المختار ج ۲ ص ۸۰ وصح الاقتداء فيه بشافعي مثلا لم يفصله بسلام، لا إن فصله على الأصح فيهما للاتحاد وإن اختلف الاعتقاد. وفي رد المحتار (قوله على الأصح فيهما) أي في جواز أصل الاقتداء فيه بشافعي، وفي اشتراط عدم فصله خلافا لما في الإرشاد من أنه لا يجوز أصلا بإجماع أصحابنا .... الخ

(۲) وفي الدر المختار باب الوتر والنوافل ج ۲ ص ۹ (ولو نسيه) أي القنوت ... (سجد للسهو)

فصل فی قضاء الفوائت

(قضا نمازوں سے متعلق مسائل کا بیان)

حیض کی مخصوص صورت کی بناء پر نمازوں کی قضاء

سوال:- ایک عورت کو حیض کا خون ڈھائی دن مسلسل آتا ہے، اس کے بعد معمولی سا آنے لگتا ہے، تین دن کے بعد بالکل بند ہو جاتا ہے، پھر چوتھے دن بالکل خون نظر نہیں آتا، پانچویں دن دوپہر کو تھوڑا سا آکر بند ہو جاتا ہے۔ عورت نماز، روزہ کس طرح ادا کرے؟

جواب - صورت مسئولہ میں یہ پانچوں دن حیض شمار ہوں گے، ان کی نمازیں معاف ہیں اور روزوں کی قضا فرض ہے، اور اگر اس کی ہمیشہ عادت ایسی ہی ہے، تب تو وقت موقوف میں اسے نہ نماز پڑھنی چاہئے، نہ روزہ رکھنا چاہئے، اور اگر ہمیشہ عادت ایسی نہیں، پہلی بار ایسا ہوا ہے تو چونکہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ پاکی کے بعد پھر خون آئے گا، اس لئے اگر وہ غسل کر کے روزہ رکھے گی تو گناہ نہ ہوگا، البتہ یہ روزے معتبر نہ ہوں گے، ان کی قضا لازم ہوگی۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۶۱ / ۲۸ ج)

فوت شدہ نمازوں کی قضا لازم ہے

سوال:- جوانی کے عالم میں، میں دین کی طرف سے غافل رہا اور بہت ساری نمازیں قضا ہوتی رہیں، میں ہر ادا نماز کے ساتھ اسی وقت کی ”قضائے عمری“ کی نیت سے فرض (اور وتر بھی) ادا کرتا رہا ہوں کہ شاید اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں گردن بچ جائے۔

میں حال ہی میں ایک کتاب ”مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت“ جو چار جلدوں پر مشتمل ہے، منگوا کر پڑھ رہا ہوں۔ مرحوم علامہ حبیب الرحمن کاندھلوی اس کے مؤلف ہیں، پہلی جلد کے مقدمے میں ”موضوع حدیث کی معرفت کے اصول“ میں تحریر کیا گیا ہے کہ جس حدیث میں ”قضائے عمری“ کے بارے میں تذکرہ ہو وہ حدیث جھوٹی ہوگی، علامہ حبیب الرحمن صاحب نے یہ بات شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتاب ”عجالہ نافعہ“ سے نقل کی ہے۔ میں پہلی جلد کے مقدمے کے کچھ حصے کی

فوٹو اسٹیٹ کاپی ارسال خدمت کر رہا ہوں (صفحہ ۳۱، پیراگراف ۵) یہ کتاب پڑھنے کے بعد میں نے قضائے عمری پڑھنا موقوف کردیا ہے کہ کہیں یہ بدعت کے زُمرے میں نہ آجائے۔ آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، میں سفر پر ہونے کی وجہ سے جواب قدرے تاخیر سے دے رہا ہوں، اس لئے معذرت خواہ ہوں۔

مولانا حبیب الرحمن صدیقی کاندھلوی صاحب مرحوم اب دنیا میں نہیں ہیں، لہٰذا ان کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے، لیکن دینی ضرورت کی وجہ سے اتنا کہے بغیر چارہ نہیں کہ وہ غیرمتوازن، انتہا پسند ذہن کے حامل تھے، جس کی بنا پر انہیں اپنے انفرادی نظریات پر اتنا اصرار تھا کہ وہ ساری اُمت کے علماء، فقہاء اور محدثین میں سے کسی کو خاطر میں لانے کے لئے تیار نہ تھے، چنانچہ انہوں نے متعدد مسائل میں جمہور اُمت سے الگ راستہ اختیار کیا۔

قضائے عمری کے بارے میں جو بات انہوں نے لکھی ہے، وہ بھی ایسی ہی ہے، اُمت کے جمہور فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ جو نمازیں قضا ہوگئی ہوں حتی الْمقدور ان کی ادائیگی لازم ہے، حدیث میں فوت شدہ نمازوں کے قضا کرنے کا حکم ہے، اور اس میں کم یا زیادہ کی کوئی تفصیل نہیں، یہ بات بھی واضح ہے کہ پچھلے گناہوں سے توبہ کا لازمی حصہ یہ ہے کہ جن غلطیوں کی تلافی ممکن ہو، ان کی تلافی کی جائے، لہٰذا آپ جو قضائے عمری پڑھتے تھے، وہ درست تھی، اور اسے بدعت سمجھ کر چھوڑنا درست نہیں ہے، آپ یہ عمل جاری رکھیں۔ (۱)

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۱/۵/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۴۴۴/۷۷)

قضائے عمری کی شرعی حیثیت

سوال:- ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ درسِ قرآن دیتے ہوئے اس بات پر بہت زور دیتی ہیں کہ ''قضائے عمری'' کا جو مسئلہ لوگوں میں مشہور ہے کہ اگر کسی شخص نے بہت عرصے تک نمازیں نہ پڑھی ہوں، پھر وہ نماز شروع کرے تو اسے قضائے عمری کے طور پر وہ نمازیں قضا کرنی چاہئیں، قرآن وسنت میں اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے، بلکہ پچھلی زندگی میں جو نمازیں قضا ہوگئی ہوں، ان کی تلافی صرف توبہ سے

(۱) قضائے عمری سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ اس کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

ہو جاتی ہے، اتنی ساری نمازیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ براہ کرم یہ واضح فرمائیں کہ کیا شریعت میں پچھلی نمازوں کی قضا واقعی ضروری نہیں ہے؟ اور کیا ائمہ اربعہ یا فقہائے کرام میں سے کسی کا مذہب یہ ہے کہ نمازیں زیادہ قضا ہو جائیں تو ان کی تلافی صرف توبہ سے ہو جاتی ہے، اور قضائے عمری پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے؟ اگر ان صاحب کا بتایا ہوا یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے تو کیا ان کے درس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ نیز اگر قضائے عمری ضروری ہے تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب:- صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے:-

من نسی صلاة فلیصل اذا ذکرها، لا کفارة لها الا ذلک.

جو شخص کوئی نماز پڑھنا بھول جائے تو اس پر لازم ہے کہ جب بھی اسے یاد آئے، وہ نماز پڑھے، اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب المواقیت باب نمبر ۳۷ حدیث نمبر ۵۹۷)[1]

صحیح مسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان الفاظ میں مروی ہے:-

اذا رقد أحدكم عن الصلاة أو غفل عنها فليصلها اذا ذكرها فان الله عز وجل يقول أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ.

جب تم میں سے کوئی شخص نماز سے سو جائے یا غفلت کی وجہ سے چھوڑ دے تو جب بھی اسے یاد آئے وہ نماز پڑھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "اقم الصلوٰۃ لذکری" (میری یاد آنے پر نماز قائم کرو)۔ (صحیح مسلم، آخر کتاب المساجد، حدیث نمبر ۱۵۶۹)[2]

اور سنن نسائیؒ میں مروی ہے:-

سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الرجل يرقد عن الصلاة او يغفل عنها، قال كفارتها أن يصليها اذا ذكرها (سنن النسائی، کتاب المواقیت، باب فیمن نام عن صلاۃ، [illegible])[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نماز کے وقت سو جائے یا غفلت کی وجہ سے چھوڑ دے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب بھی اسے نماز یاد آئے وہ نماز پڑھے۔

ان احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول بیان فرمادیا کہ جب بھی انسان کوئی نماز وقت پر نہ پڑھے تو اس کے ذمے لازم ہے کہ متنبہ ہونے پر اس کی قضا کرے، خواہ یہ نماز

---

(۱) ج:۱ ص:۸۴ (طبع قدیمی کتب خانہ)
(۲) ج:۱ ص:۲۴۱ (ایضاً)
(۳) ج: ص: (ایضاً)

بھول سے چھوٹی ہو، سو جانے کی وجہ سے یا غفلت کی وجہ سے۔ صحیح مسلم اور سنن نسائی کی روایتوں میں اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت قرآن "واقم الصلوٰۃ لذکریٰ"(۱) کا حوالہ دے کر یہ بھی واضح فرمادیا کہ یہ آیت قرآنی نماز کی قضا پڑھنے کے حکم کو بھی شامل ہے، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو اللہ تعالیٰ کا یہ فریضہ ادا کرنے پر تنبیہ ہو، اسے نماز ادا کرنی چاہئے۔

یہ اُصول بیان کرتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں فرمائی کہ اتنی تعداد میں نمازوں کی قضا واجب ہے، بلکہ ایک عام حکم بیان فرمادیا کہ جو نماز بھی چھوٹ جائے اس کی قضا واجب ہے۔ چنانچہ جب غزوۂ خندق کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی نمازیں چھوٹیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کی قضا فرمائی، جس کا واقعہ حدیث کی تمام کتابوں میں تفصیل سے آیا ہے، اس موقع پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر اس سے زیادہ نمازیں چھوٹ جائیں تو ان کی قضا واجب نہیں، یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ قرآن وسنت کی طرف سے جب کوئی عام حکم آجاتا ہے تو اس کے ہر ہر جزئیے کے لئے الگ حکم نہ دیا جاسکتا ہے، نہ اس کی ضرورت ہے، مثلاً قرآنِ کریم نے رمضان کے روزوں کی فرضیت کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمادیا ہے کہ:-

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (۲)

تم میں سے جو شخص مریض ہو یا سفر پر ہو تو دُوسرے دنوں میں اتنی ہی گنتی پوری کرے۔

اس آیت کریمہ میں یہ عام حکم دے دیا گیا ہے کہ جب روزے بیماری یا سفر کی وجہ سے نہ رکھے جاسکے ہوں تو بعد میں ان کی قضا کرلی جائے، اس میں یہ نہیں بتایا گیا، نہ اس کے بتانے کی ضرورت تھی کہ ایک ماہ کے روزے چھوٹنے کا یہ حکم ہے یا دو رمضانوں کے روزے چھوٹنے کا، بلکہ ایک عام حکم دے دیا گیا ہے جو روزے چھوٹنے کی تمام صورتوں کو شامل ہے۔ اب اگر کسی شخص کے دو رمضان کے روزے چھوٹ گئے ہوں اور وہ اس دلیل کا مطالبہ کرے کہ دو رمضان کے روزے چھوٹنے کے لئے کوئی الگ حکم ہونا چاہئے، تو جس طرح اس کا مطالبہ غلط اور جاہلانہ مطالبہ ہوگا، اسی طرح زیادہ نمازوں کی قضا کے لئے الگ دلیل کا مطالبہ بھی اتنا ہی غلط مطالبہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عام حکم سے استثناء کا دعویٰ کرے تو دلیل اس کے ذمے ہے کہ وہ قرآن وسنت کی کسی دلیل سے مستثنیٰ ہونا ثابت کرے، ورنہ جب تک قرآن وسنت میں کوئی استثناء مذکور نہ ہو، عام حکم اپنی جگہ قائم رہے گا۔

چنانچہ نمازیں قضا پڑھنے کا جو حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا احادیث میں دیا

(۱) سورۃ طٰہٰ آیت ۱۴ (۲) سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۴

ہے اس کی بنیاد پر تمام فقہائے امت نے تصریح فرمائی ہے کہ چھوٹی ہوئی نمازیں کتنی زیادہ ہوں، ان کی قضا ضروری ہے، مشہور حنفی عالم علامہ ابن نجیم فقہ حنفی کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

فالأصل فيه أن كل صلاة فاتت عن الوقت بعد ثبوت وجوبها فيه فإنه يلزم قضاؤها، سواء تركها عمدًا أو سهوًا أو بسبب نوم، وسواء كانت الفوائت كثيرة أو قليلة

(البحر الرائق ج:۲ ص:۱۴۱ طبع مكة المكرمة)[1]

اس سلسلے میں اصول یہ ہے کہ جو نماز بھی وقت میں واجب ہونے کے بعد چھوٹ گئی ہو، اس کی قضا لازم ہے، چاہے انسان نے وہ جان بوجھ کر چھوڑی ہو یا بھول کر، یا نیند کی وجہ سے، اور چاہے چھوٹی ہوئی نمازیں کم ہوں یا زیادہ ہوں۔

یہ موقف صرف حنفی علماء کا نہیں ہے، بلکہ شافعی، مالکی، حنبلی تمام مکاتب فکر اس پر متفق ہیں، امام مالکؒ فرماتے ہیں:-

من نسي صلوات كثيرة أو ترك صلوات كثيرة فليصل على قدر طاقته، وليذهب إلى حوائجه، فإذا فرغ من حوائجه صلّى أيضا ما بقي عليه حتّى يأتي على جميع ما نسي أو ترك. (المدونة الكبرى للإمام مالك ج،۱ ص ۲۱۵ طبع دار الكتب العلمية بيروت)

جو شخص بہت سی نمازیں پڑھنا بھول گیا ہو، یا اس نے بہت سی نمازیں چھوڑ دی ہوں، اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق وہ چھوڑی ہوئی نمازیں پڑھے، اور اپنی ضروریات کے لئے چلا جائے، لیکن جب ضروریات سے فارغ ہو تو پھر باقی نمازیں پڑھتا رہے، یہاں تک کہ وہ تمام نمازیں پوری کرلے جو وہ بھول گیا تھا یا اس نے چھوڑ دی تھیں۔

امام مالکؒ کے اس قول کی تشریح اور مزید تفصیل کرتے ہوئے مالکی عالم علامہ دسوقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

فيكفي أن يقضي في اليوم الواحد صلاة يومين فأكثر، ولا يكفي قضاء صلاة يوم في يوم إلا إذا خشي ضياع عياله إن قضى أكثر من يوم في يوم، وفي أجوبة ابن رشد أنه إنما أمر بتعجيل قضاء الفوائت خوف معاجلة الموت، وحينئذ فيجوز التأخير لمدة بحسب يغلب على الظن وفاؤه بها فيها (حاشية الدسوقي على الشرح الكبير ج ص ۲۶۳ طبع دار الفكر بيروت)

تو کافی ہے کہ ایک دن میں دو دن یا زیادہ کی نمازیں قضا کرے، اور یہ کافی نہیں ہے کہ ایک دن میں صرف ایک دن کی نمازیں قضا کرے، الّا یہ کہ اسے ایک دن سے زیادہ نمازیں قضا کرنے

(۱) باب قضاء الفوائت ج ۲ ص ۷۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئته)

کی صورت میں اپنے عیال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو، اور علامہ ابن رشدؒ کے جوابات میں یہ مذکور ہے کہ قضا پڑھنے میں جلدی کرنے کا حکم اس خطرے کی بناء پر دیا گیا ہے کہ موت نہ آجائے، لہٰذا اتنی مدت تک مؤخر کرنا جائز ہے جس میں غالب گمان یہ ہو کہ اس میں نمازیں پوری ہوجائیں گی۔

امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب میں بھی قریب قریب یہی بات کہی گئی ہے، علامہ مرداویؒ جو امام احمدؒ کے مذہب کے قابلِ اعتماد ترین ناقل ہیں، فرماتے ہیں -

ومن فاتته صلوات لزمه قضاؤها على الفور) هذا المذهب نص عليه وعليه جماهير الأصحاب وقطع به كثير منهم قوله "لزمه قضاؤها على الفور" مقيد بما إذا لم يتضرر في بدنه أو معيشته يحتاجها، فإن تضرر بسبب ذلك سقطت الفورية.

(الانصاف للمرداویؒ ج:۱ ص:۴۴۲ طبع احیاء التراث العربی بیروت)

اور جس شخص کی بہت سی نمازیں چھوٹ گئی ہوں، اس پر ان کی فی الفور قضا کرنا واجب ہے، یہی مذہب ہے جس کی تصریح کی گئی ہے، اور حنبلی اصحاب کی بھاری اکثریت کا یہی کہنا ہے (قضا نمازیں فوراً ادا کرنی ضروری ہے)۔ اور بہت سوں نے قطعی طور پر یہی کہا ہے۔ لیکن فوری ادائیگی کا لازم ہونا اس شرط کے ساتھ مقید ہے کہ اس کے نتیجے میں اس کے جسم یا ضروری معیشت میں نقصان نہ ہو، اگر نقصان ہو تو فوری ادائیگی کا حکم ساقط ہوجائے گا (یعنی تاخیر سے ادا کرنا جائز ہوگا)۔

امام شافعیؒ کے یہاں یہ تفصیل ہے کہ اگر نمازیں کسی عذر سے چھوٹی تھیں تو فوری ادائیگی کے بجائے تاخیر سے ادا کرنا جائز ہے، لیکن کسی عذر کے بغیر چھوٹی تھیں تو فوراً ادا کرنا ضروری ہے -

(ومن فاتته) مكتوبة) فالأكثر (قضى) ما فاته بعذر أو غيره، نعم غير المعذور يلزمه القضاء فوراً، ويظهر أنه يلزمه صرف جميع زمنه القضاء ما عدا ما يحتاج لصرفه فيما لا بد منه

(فتح الجواد ج:۱ ص:۲۲۳ طبع شركة مصطفى البابی مصر)

جس شخص کی ایک یا زیادہ فرض نمازیں چھوٹ گئی ہوں، اس پر ضروری ہے کہ جو نمازیں چھوٹی ہیں ان کی قضا کرے، چاہے نمازیں کسی عذر سے چھوٹی ہوں یا بغیر عذر کے، ہاں! جس شخص نے بغیر کسی عذر کے نمازیں چھوڑی ہوں اس پر قضا فوری طور سے واجب ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ اس کو اپنا پورا وقت قضا پڑھنے میں صرف کرنا چاہئے، سوائے اتنے وقت کہ جو اسے اپنی لازمی ضروریات کے لئے درکار ہو۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی فقہاء کرام کے یہ مذاہب نقل کرکے ان سے اتفاق کیا ہے، فرماتے ہیں:-

ومن علیه فائتة فعلیه أن یبادر الی قضاءها علی الفور سواء فاتته عمدًا أو سهوًا عند جمهور العلماء کمالک وأحمد وأبی حنیفة وغیرهم، وکذلک الراجح فی مذهب الشافعی أنها اذا فاتت عمدًا کان قضاؤها واجبًا علی الفور.

(فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیة ج۲۳ ص۲۵۹ مطابع الریاض)

جس شخص کے ذمے کوئی چھوٹی ہوئی نماز ہو اس پر واجب ہے کہ وہ اسے ادا کرنے میں فوری طور سے جلدی کرے، چاہے وہ نماز جان بوجھ کر چھوڑی ہو یا بھول سے، یہی جمہور علماء مثلاً امام مالک، امام احمد اور امام ابوحنیفہ کا موقف ہے، اور امام شافعی کے مذہب میں بھی راجح یہی ہے کہ اگر جان بوجھ کر نماز چھوڑی ہے تو اس کو فوراً ادا کرنا واجب ہے۔

علامہ ابن تیمیہ سے پوچھا گیا کہ:

رجل علیه صلوات کثیرة فاتته، هل یصلیها بسننها؟ أم الفریضة وحدها؟

جس شخص کے ذمے بہت سی نمازیں قضا ہوں، وہ انہیں ادا کرتے ہوئے سنتیں بھی پڑھے؟ یا صرف فرض پڑھے؟

علامہ ابن تیمیہ نے جواب دیا:

المسارعة الی قضاء الفوائت الکثیرة أولی من الاشتغال عنها بالنوافل. وأما مع قلة الفوائت فقضاء السنن معها حسن. (فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیة ج۲۲ ص۱۰۴)

جب چھوٹی ہوئی نمازیں بہت ساری ہوں تو ان کو قضا کرنا نفلوں میں مشغول ہونے سے بہتر ہے، البتہ اگر چھوٹی ہوئی نمازیں کم ہوں تو ان کے ساتھ سنتوں کو قضا کرنا اچھا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فقہائے کرام کے درمیان یہ مسئلہ تو زیرِ بحث آیا ہے کہ چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا تنبہ ہوتے ہی فوراً واجب ہو جاتی ہے یا اس میں تاخیر کر سکتے ہیں؟ اور تاخیر کی صورت میں کتنی نمازیں روزانہ قضا کرنی ضروری ہیں؟ نیز یہ کہ صرف فرض نمازیں قضا کی جائیں یا سنتیں بھی؟ اور قضا کرتے ہوئے نمازوں میں ترتیب کا لحاظ ضروری ہے یا نہیں؟ لیکن اس مسئلے میں معروف فقہائے کرام کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نمازیں خواہ کتنی زیادہ ہوں، ان کی قضا انسان کے ذمے واجب ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق قرآن کریم کی آیت "وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ" کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ تنبہ ہونے پر انسان چھوٹی ہوئی نمازیں قضا کرنے کی فکر کرے، اور قرآن و سنت کی کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو زیادہ نمازوں کو قضا کرنے کی ضرورت نہ ہونے پر دلالت کرتی ہو، یوں بھی یہ عجیب و غریب موقف ہے کہ جو شخص کم نمازیں قضا

کرے کس پر تو ادائیگی واجب ہو، لیکن زیادہ نمازیں چھوڑنے والے پر کچھ واجب نہ ہو؟ پھر کون ہے جو کم نمازوں اور زیادہ نمازوں کی تعداد مقرر کرکے یہ کہے کہ اتنی نمازوں کے بعد قضا واجب نہیں ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب انسان پر بالغ ہونے کے بعد نماز پڑھنا فرض ہوجاتا ہے، اور یہ فریضہ تمام شرعی فرائض میں سب سے زیادہ مؤکد و اہم ہے، اور یہ بھی ایک مسلّم اصول ہے کہ اگر کوئی فریضہ قطعی دلائل سے ثابت ہو تو اسے انسان کے ذمے سے ساقط کرنے کے لئے کم از کم اتنے ہی مضبوط دلائل کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہاں قطعی دلائل تو درکنار، کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی ایک نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ جو نمازیں انسان کے ذمے فرض ہوئی تھیں، اس کی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے ان کی فرضیت ختم ہوگئی ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اگر فوت شدہ نمازیں بہت زیادہ ہوگئی ہوں تو ان کی قضا لازم نہیں، قرآن وسنت کے واضح دلائل اور ان پر مبنی فقہائے امت کے اتفاق کے بالکل خلاف ایک گمراہانہ بات ہے، اور نماز جیسے اہم فریضے کو محض اپنی رائے کی بنیاد پر ختم کردینے کے مرادف ہے، اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ فوت شدہ نمازوں کے لئے بس توبہ کرلینا کافی ہے، اس لئے کہ توبہ کی قبولیت کی لازمی شرط یہ ہے کہ انسان اپنی غلطی کی جتنی تلافی بس میں ہو، وہ تلافی بھی ساتھ ساتھ کرے۔

قضائے عمری کی موضوع احادیث

یہاں یہ وضاحت کردینا بھی مناسب ہے کہ اصول حدیث کی بعض کتابوں میں موضوع احادیث کی علامتیں بیان کرتے ہوئے قضائے عمری کی حدیث کی مثال دی گئی، مثلاً حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موضوع احادیث کی پانچویں علامت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

پنجم آنکہ مخالف مقتضی عقل وشرع باشد وقواعد شرعیہ آں را تکذیب نمایند، مثل قضائے عمری۔

یعنی پانچویں علامت یہ ہے کہ وہ حدیث عقل وشریعت کے تقاضوں کے خلاف ہو اور قواعد شرعیہ اس کی تکذیب کرتے ہوں، مثلاً قضائے عمری کی حدیث۔

(عجالہ نافعہ ص:۲۲، خاتمہ، طبع نور محمد کتب خانہ کراچی)

ہوسکتا ہے کہ کسی ناواقف یا جاہل آدمی کو اس سے یہ مغالطہ ہو کہ پچھلی عمر کی نمازیں قضا کرنا بے اصل ہے، اور اس بارے میں جو احادیث آئی ہیں وہ موضوع ہیں۔ اس لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض غیر مستند وظائف وغیرہ کی کتابوں میں کچھ ایسی موضوع حدیثیں آئی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ کوئی شخص اس دن میں صرف ایک نماز قضا پڑھ لی جائے تو اس سے ستر سال کی نمازیں ادا ہوجاتی

ہیں، محدثین اس قسم کی روایت کو "قضائے عمری" کا نام دیتے ہیں، اور ان احادیث کو انہوں نے موضوع قرار دیا ہے، ملا علی قاریؒ "موضوعات" پر اپنی مشہور کتاب میں لکھتے ہیں:-

حديث "من قضى صلاة من الفرائض في آخر جمعة من شهر رمضان كان ذلك جابرًا لكل صلاة فائتة في عمره إلى سبعين سنة" باطل قطعا، لأنه مناقض للاجماع على أن شيئا من العبادات لا يقوم مقام فائتة سنوات.

یہ روایت کہ "جو شخص رمضان کے آخری جمعے میں ایک فرض نماز قضا پڑھے تو ستر سال تک اس کی عمر میں جتنی نمازیں چھوٹی ہوں، ان سب کی تلافی ہو جاتی ہے" یہ روایت قطعی طور پر باطل ہے، اس لئے کہ یہ حدیث اجماع کے خلاف ہے، اجماع اس پر ہے کہ کوئی بھی عبادت سالہا سال کی چھوٹی ہوئی نمازوں کے قائم مقام نہیں ہوسکتی ہے۔ (موضوعات کبیر ص ۳۵۶ طبع مکتبہ تجاریہ پشاور)

اور علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں:-

حديث "من صلى في آخر جمعة من رمضان الخمس الصلوات المفروضة في اليوم والليلة قضت عنه ما أخل به من صلاة سنته" هذا موضوع لا اشكال فيه

یہ حدیث کہ "جو شخص رمضان کے آخری جمعے میں دن رات کی پانچ فرض نمازیں پڑھے، اس سے اس کے سال بھر کی جتنی نمازوں میں خلل رہا ہو، ان سب کی قضا ہو جاتی ہے" کسی شک کے بغیر موضوع ہے۔ (الفوائد المجموعة للشوكاني ج ۱ ص ۵۴ نمبر ۱۱۵، مطبع السنة المحمدية قاهرة)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی مذکورہ بالا عبارت میں قضائے عمری کی جس روایت کو موضوع قرار دیا گیا ہے، اس سے مراد "قضائے عمری" کے بارے میں اس قسم کی روایات ہیں، جو ایک نماز یا چند نمازوں کو عمر بھر کی نمازوں کے قائم مقام قرار دیتی ہیں، اور علاوہ اس کے کہ اس قسم کی روایات کی کوئی سند نہیں ہے، ان کے موضوع ہونے کی وجہ ملا علی قاری نے یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ ایک یا چند نمازیں سالہا سال کی فوت شدہ نمازوں کی تلافی نہیں کرسکتیں، اور اس پر امت کا اجماع ہے۔ لہٰذا اگر کسی کو ان احادیث کو موضوع قرار دینے سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ "قضائے عمری" کا تصور ہی بے بنیاد ہے اور پچھلی نمازوں کی قضا لازم نہیں تو اس کا [illegible]۔

قضائے عمری کا صحیح طریقہ

قرآن وسنت اور فقہائے کرامؒ کے اتفاق کی روشنی میں یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ جس مسلمان نے اپنی عمر کی جتنی نمازیں اپنی غفلت یا بے پروائی کی وجہ سے نہ پڑھی ہوں اور جن

میں سے متنبہ اور توبہ کی توفیق ہو، اس کے ذمے یہ ضروری ہے کہ اپنی چھوٹی ہوئی نمازوں کا محتاط حساب لگا کر انہیں ادا کرنے کی فکر کرے۔ امام مالک، امام احمدؒ اور امام شافعیؒ تینوں بزرگ تو اس بات پر متفق ہیں کہ اگر نمازیں کسی عذر کے بغیر چھوڑی ہیں تو متنبہ ہونے کے بعد اس کا فرض ہے کہ وہ ان نمازوں کی ادائیگی فوراً کرے، اور صرف ضروری حاجتوں کا وقت اس سے مستثنیٰ ہوگا، لیکن فقہائے حنفیہ نے کہا ہے کہ چونکہ انسان اپنی وسعت کی حد تک ہی کا مکلف ہے اس لئے قضا نماز پڑھنے میں اتنی تاخیر جائز ہے جو انسان کی معاشی اور دوسری حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے درکار ہو، درمختار میں ہے :-

(أو يجوز تأخير الفوائت) وإن وجبت على الفور (لعذر السعي على العيال وفي الحوائج على الأصح).(۱) (ابنِ عابدین ج۱ ص:۵۴۳)

چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا پڑھنے میں تاخیر جائز ہے، اگرچہ ان کا وجوب علی الفور ہوتا ہے، مگر عیال کے لئے معاش کے انتظام اور دوسری حاجتوں کے عذر کی وجہ سے تاخیر کی جا سکتی ہے۔

چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں :-

فيسعى ويقضي ما قدر بعد فراغه ثم وثم إلى أن تتم.(۲)

لہٰذا ایک شخص اپنے کام کرتا رہے اور فارغ ہونے کے بعد جتنی نمازیں پڑھ سکے، قضا کرتا رہے، یہاں تک کہ تمام نمازیں پوری ہوجائیں۔ (ایضاً)

بعض علماء نے مزید آسانی کے لئے یہ طریقہ بتایا ہے کہ انسان روزانہ ہر فرض نماز کے ساتھ اسی وقت کی ایک قضا نماز پڑھ لیا کرے، اس طرح ایک دن میں پانچ نمازیں ادا ہوجائیں گی، البتہ جب موقع ملے اس سے زیادہ بھی پڑھتا رہے، فرماتے ہیں :-

وفوره مع كل فرض فرض، إذ لم يجب في اليوم أداء أكثر من خمس، فكذا القضاء، فإن زاد أو جمع الخمس فحسن (البحر الزخار لأحمد بن المرتضى ج ص ۳۰۱ طبع صنعاء)

اور قضا نمازوں کی فوری ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فرض کے ساتھ ایک فرض پڑھا جائے، کیونکہ ایک دن میں پانچ سے زیادہ نمازیں ادا میں ضروری نہیں تو قضاء کو بھی اس پر قیاس کر لیا جائے، لیکن اگر کوئی زیادہ نمازیں پڑھے یا پانچ نمازیں اکٹھی پڑھے تو اچھا ہے۔

البتہ قضا پڑھنے میں نیت کا خیال رکھا جائے، یعنی واضح طور پر قضا کی نیت کی جائے، مثلاً فجر کی قضا پڑھ رہے ہیں تو یہ نیت کرے کہ میرے ذمے فجر کی جو سب سے پہلی نماز واجب ہے اس کی قضا پڑھ رہا ہوں۔

(۱، ۲) الدر المختار مع رد المحتار باب قضاء الفوائت ج ۲ ص:۷۳

نمازوں کا فدیہ

قرآن کریم میں روزوں کا فدیہ بیان فرمایا گیا ہے، یعنی جو لوگ روزے رکھنے کی بالکل طاقت نہ رکھتے ہوں، نہ آئندہ ان کی طاقت پیدا ہونے کی امید ہو، ان کے لئے قرآن کریم نے حکم دیا ہے کہ وہ ہر روزے کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائیں، لیکن نمازوں کے لئے قرآن کریم یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ایسا کوئی حکم مذکور نہیں ہے، البتہ امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ جس شخص کی نمازیں قضا ہوگئی ہوں اور وہ انہیں ادا نہ کر رہا ہو، اسے چاہئے کہ وہ یہ وصیت کر جائے کہ اگر میں یہ نمازیں ادا نہ کر پایا اور اسی حالت میں میرا انتقال ہوگیا تو میرے ترکے سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کردیا جائے، اور وہ فدیہ بھی روزے کے فدیے کے حساب سے، یعنی ہر ایک نماز کا فدیہ ایک مسکین کا کھانا (یا پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت کا صدقہ) ادا کیا جائے۔ امام محمدؒ نے یہ حکم احتیاط کے طور پر دیا ہے، اور کہا ہے کہ اگرچہ نمازوں کے فدیہ کا ذکر قرآن وسنت میں نہیں ہے مگر روزے پر قیاس کرکے یہ حکم نکالا گیا ہے، لہٰذا امید ہے کہ ان شاء اللہ اس طرح انسان کی ذمہ داری پوری ہوجائے گی۔ (دیکھئے رد المحتار ج ۲ ص ۷۲)[1]

لیکن یاد رہے کہ یہ وصیت ترکے کے ایک تہائی حصے تک نافذ ہوتی ہے، یعنی اگر روزوں یا نماز کا کل فدیہ اس کے کل مال کا ایک تہائی یا اس سے کم ہو تب تو ورثاء کے ذمے واجب ہوگا کہ وہ فدیہ ادا کریں، اگر فدیہ کی مقدار ایک تہائی سے بڑھ گئی تو زائد مقدار میں وصیت پر عمل کرنا ورثاء کے ذمے لازم نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے روزے یا نماز کے فدیہ کی وصیت نہ کی تو ورثاء کے ذمے ضروری نہیں ہے کہ وہ یہ فدیہ ادا کریں، البتہ عاقل و بالغ ورثاء اپنے حصے میں سے رضا کارانہ طور پر فدیہ ادا کریں تو یہ ان کا احسان ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ ان شاء اللہ مرحوم کو معاف فرمادیں گے۔

خلاصہ

یہ ہے کہ انسان سے جو نمازیں چھوٹ گئی ہوں ان کی قضا اس کے ذمے لازم ہے، صرف توبہ کرلینے سے وہ معاف نہیں ہوتیں، خواہ کتنی زیادہ ہوں، البتہ وہ اگر روزانہ پانچ نمازوں کی قضا کرنی شروع کردے اور جب زیادہ پڑھنے کا موقع ہو تو زیادہ بھی پڑھتے، اور ساتھ ہی یہ وصیت بھی کردے کہ جو نمازیں میں اپنی زندگی میں ادا نہ کرسکوں ان کا فدیہ میرے ترکے سے ادا کیا جائے، تو امید ہے کہ ان شاء اللہ اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ قبول فرماکر اس کی کوتاہی کو معاف فرمادیں گے، قضائے عمری کا صحیح

(۱) ج ۲ ص ۷۲، ۷۳۔

طریقہ یہی ہے۔ ورنہ یہ کہنا کہ قضاء عمری پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں، صرف توبہ کافی ہے، گمراہی کی بات ہے، اور جو شخص نماز جیسے بنیادی فریضے میں محض اپنی رائے سے کسی دلیل کے بغیر اس قسم کی گمراہانہ بات کی تلقین اور اس پر اصرار کرے، اس کے درس پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳ر رجب ۱۳۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۰۰/۵۵)

ایام حیض کی نمازوں کی قضا لازم نہیں

سوال:- عورت حیض و نفاس کی حالت میں نماز نہیں پڑھ سکتی، تو کیا از روئے حدیث یا فقہ بعد غسل طہارت از حیض و نفاس اس عورت پر نماز کی قضا واجب ہے یا معاف ہے؟

جواب:- حیض و نفاس کی حالت میں عورت جو نمازیں چھوڑتی ہے اس کی قضا اس پر واجب نہیں بلکہ وہ نمازیں معاف ہیں، البتہ اس حالت میں جو روزے چھوٹے ہوں ان کی قضا واجب ہے۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۵/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵۱/۲۸ ب)

قضا نمازوں کی ادائیگی ضروری ہے

سوال:- زید نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور جب سے بالغ ہوا ہے اس کے بعد اب اس کی عمر تقریباً چوالیس پینتالیس سال ہے، اس دوران فرائض و واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی ہوتی رہی، اس طرح کچھ حقوق العباد بھی اس کے ذمے ہیں، اب زید تلافی کرنا چاہتا ہے، کیا صورت ہے؟

جواب:- حقوق العباد کی کوتاہی کی تلافی تو صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ جن جن لوگوں کے حقوق تلف کئے ہیں ان کے مالی حقوق یا تو ان کو ادا کرے یا ان سے معاف کروائے، اور غیر مالی حقوق بھی معاف کروائے، اور نماز روزوں کا طریقہ یہ ہے کہ جتنے نماز روزے رہ گئے ہیں ان کا ٹھیک ٹھیک حساب کرے، اور اگر ٹھیک ٹھیک حساب ممکن نہ ہو تو محتاط اندازہ لگائے، اور ان کی قضا شروع کردے اور ساتھ ہی یہ وصیت کردے کہ اگر میں ان کی قضا نہ کرسکوں تو ان کا فدیہ میرے ترکے سے ادا کیا جائے، پھر اگر زندگی میں ادائیگی مکمل ہو جائے تو یہ وصیت کاٹ دے۔[2] زکوٰۃ کا بھی اسی طرح حساب لگا کر اس کی ادائیگی کردے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۴۸/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج ۱ ص ۲۹۰: ویمنع صلاۃ مطلقاً ولو سجدۃ شکر وصوماً وجماعاً وتقضیہ دونہا للحرج، وفی الشامیۃ قولہ دونہا ای الصلاۃ ... لسقط الحرج وقولہ وتقضیہ ای الصوم علی التراخی فی الاصح

(۲) مکمل تفصیل سابقہ فتویٰ ص: ۴۷۷ تا ۴۸۷ میں ملاحظہ فرمائیں۔

﴿فصل فی سجود السہو﴾

(سجدۂ سہو کے مسائل کا بیان)

سورۂ فاتحہ، سورۃ اور رکعتوں میں شک کی دو صورتوں کا حکم

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ ہے، طویل عرصے سے مختلف امراض وعوارض میں مبتلا ہے، حرکت کرنے اور چلنے پھرنے سے معذور ہے، بیٹھ کر نماز ادا کرتا ہے، اور غیر معمولی ضعف و نقاہت کی بنا پر قویٰ بہت کمزور ہوگئے ہیں، حافظہ اور یادداشت کی قوت بھی کمزور ہوگئی، نماز میں بہت سہو ہوتا ہے اور اکثر شبہ ہوتا ہے، کبھی رکعتوں کی تعداد میں شبہ ہوتا ہے کہ ایک ہوئی یا دو یا تین ہوئی یا چار، کبھی یہ شبہ ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھی ہے یا نہیں؟ اور پھر سورت ملائی ہے یا نہیں؟ رکوع کیا ہے یا نہیں؟ سجدہ ایک کیا ہے یا دو؟ سجدۂ سہو کیا ہے یا نہیں؟ غرض اس قسم کی مختلف صورتیں پیش آتی ہیں، امکانی سعی اور احتیاط کے باوجود حدیث النفس میں مبتلا اور سہو کی صورت پیش آجاتی ہے، جس پر نہ تو وہ یہ قسم کھا سکتا ہے کہ اس قسم کی غلطی ہوئی، اور نہ یہ قسم کھا سکتا ہے کہ نہیں ہوئی، نہ یقین اور ظنِ غالب ہوتا ہے، البتہ شبہ اور احتمال ترک کا ضرور ہوتا ہے۔

دریافت طلب یہ ہے کہ کیا شبہ اور احتمال کی طرف سے صرف نظر کرلی جائے اور مطلق التفات ہی نہ کیا جائے؟ مثلاً ظہر کی چار سنتوں میں پہلی رکعت میں شبہ ہو کہ پہلی رکعت ہے یا دوسری، تو پہلی رکعت میں دوسری کے احتمال پر اور دوسری رکعت میں دوسری ہی کے شبہ پر اور تیسری رکعت میں چوتھی رکعت کے احتمال پر اور چوتھی رکعت میں چوتھی کے شبہ پر التحیات پڑھے؟ غرض یہ ہے کہ احتیاطاً التحیات پڑھے اور آخر میں سجدۂ سہو کرے۔ اور یہی شبہ ہونے پر کہ سورۂ فاتحہ پڑھی اور سورت ملائی ہے یا نہیں؟ احتیاطاً سورۂ فاتحہ پڑھے اور سورت ملائے؟ اور سجدۂ سہو کرنے کے بعد نہ کرنے کا شبہ ہو تو احتیاطاً سجدۂ سہو کرلے وغیرہ وغیرہ کیا کیا جائے؟

۲- کیا اس قسم کی تمام صورتوں میں اقل کا اعتبار کرکے احتیاطاً دوبارہ سورۂ فاتحہ پڑھے اور سورۃ ملائے اور سجدۂ سہو کرلینے سے نماز صحیح ہوجاتی ہے؟ اور فاسد و مکروہ واجب الاعادہ تو نہیں ہوجاتی؟

جواب ا:- اگر شبہ ایسا ہوتا ہے کہ دونوں احتمال ذہن میں برابر معلوم ہوتے ہیں تو ہر جگہ اقل کا اعتبار کریں، اور ہر اس رکعت پر قعدہ کریں جس کے آخری رکعت ہونے کا احتمال ہو، اور جس رکعت میں قعدۂ اولیٰ ہونے کا محض احتمال ہو، اس پر بیٹھنا ضروری نہیں، مثلاً ظہر کی پہلی رکعت ہی میں شک ہوگیا کہ پہلی ہے یا دوسری؟ تو پہلی سمجھ کر نماز جاری رکھیں، دوسری رکعت پر نہ بیٹھیں، تیسری پر بھی اس لئے بیٹھیں کہ اس کے آخری رکعت ہونے کا احتمال ہے،[۳] پھر آخر میں سجدۂ سہو کریں۔

۲- حتیٰ الامکان دوبارہ فاتحہ پڑھنے اور سورۃ ملانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، البتہ سجدۂ سہو میں یہ تفصیل ہے کہ اگر آخری دو رکعتوں میں ایسا کیا تو سجدۂ سہو بھی واجب نہیں، اسی طرح اگر پہلی دو رکعتوں میں سورت کے بعد سورۂ فاتحہ مکرر پڑھی تو بھی سجدۂ سہو واجب نہیں، ہاں اگر سورت سے پہلے سورۂ فاتحہ مکرر پڑھی تو سجدۂ سہو واجب ہوگا، اور سجدۂ سہو کے بعد نماز درست ہو جائے گی۔ کذا فی رد المحتار[۴] والعالمگیریة (ج:۱ ص ۱۲۶)[۵]۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۶/۱۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۸۰/۳۷ و)

قراءت میں عدمِ ترتیب سے سجدۂ سہو لازم نہیں

سوال:- نماز میں قراءت کے اندر ترتیب قائم نہ رہے تو کیا سجدۂ سہو لازم ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں سجدۂ سہو واجب نہیں۔[۶]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۵۱/۲۸ ج)

---

(۳) وفی الدر المختار ج ۲ ص ۹۳ (طبع سعید) وإن كثر شكه [illegible] عمل بغالب ظنه إن كان له ظن [illegible] وإلا أخذ بالأقل لتيقنه وقعد في كل موضع توهمه موضع قعوده ولو واجبًا لئلا يصير تاركًا فرض القعود أو واجبه. وفي الشامية قوله وإلا أي وإن لم يغلب على ظنه شيء فلو شك أنها أولى الظهر أو ثانيته يجعلها الأولى ثم يقعد لاحتمال أنها الثانية ثم يصلي ركعة ثم يقعد لما قلنا ثم يصلي ركعة ويقعد لاحتمال أنها الرابعة ثم يصلي أخرى ويقعد [illegible] الخ. وفي الهندية ج ۱ ص ۱۳۰ وإن لم يكن له رأي بنى على الأقل لقوله عليه السلام من شك في صلوته فلم يدر أثلاثا صلّى أم أربعا بنى على الأقل .... الخ

(۴) وفي الدر المختار ج ۱ ص ۴۶۰، ۴۶۱ وكذا ترك تكريرها قبل سورة الأوليين، وفي الشامية فلو قرأها في ركعة من الأوليين مرتين وجب سجود السهو لتأخير الواجب وهو السورة [illegible] في شرح المنية فقد [illegible] لأن الاقتصار على مرة في الأخريين ليس بواجب حتى لا يلزمه سجود السهو بتكرارها فيهما سهوًا ولو تعمده لا يكره.

(۵) وفي الهندية ج ۱ ص ۱۲۶ ولو كررها في الأوليين يجب عليه سجود السهو بخلاف ما لو أعادها بعد السورة أو كررها في الأخريين. وفي البحر الرائق ج ۲ ص ۹۹ (طبع سعيد) وذكر قاضي خان وجماعة أنه لو قرأها مرتين على الولاء وجب السجود لأن فيه تأخير السورة لا يجب وصححه في الهداية مع تأخير السورة في الأولى لا في الثاني .... الخ نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۳۶۷، ۳۶۸۔

(۶) وفي الدر المختار ج ۲ ص ۸۰ (طبع سعيد) (ويجب) .... بترك واجب. وفي الشامية قوله بترك واجب [illegible] لا كل واجب إذ لو ترك ترتيب السور لا يلزمه شيء مع كونه واجبًا .... الخ
وكذا في الهندية ج ۱ ص ۱۲۶۔ (محمد زبیر حق نواز)

تسمیہ کے ترک سے سجدۂ سہو لازم نہیں

سوال:- سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد شک ہوتا ہے کہ پوری فاتحہ پڑھی ہے یا کچھ رہ گیا ہے جس کے باعث دوبارہ پڑھا کرتا ہوں جو دیر کا باعث ہوتی ہے، کیا حکم ہے؟

جواب:- ایک مرتبہ فاتحہ دھیان کے ساتھ ادا کریں، بعد میں شک پیدا ہو تو اس کی پرواہ نہ کریں تاوقتیکہ غلطی کا یقین کامل نہ ہو، نماز ہو جائے گی۔

سوال:- نماز کی پہلی رکعت میں اکثر شبہ ہوتا ہے کہ بسم اللہ شریف حمد سے پہلے پڑھی یا نہیں؟ کیا بسم اللہ نہ پڑھنے سے نماز فاسد ہوگی؟ اور بسم اللہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ سجدۂ سہو تو واجب نہ ہوگا؟

جواب:- اگر بسم اللہ سہواً چھوٹ جائے تو نماز ہو جاتی ہے، سجدۂ سہو بھی واجب نہیں ہوتا۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۳ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

تاخیرِ رکن کی وہ مقدار جس سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے

سوال:- "[illegible]" کے شمارے میں زیرِ عنوان "اپنی نماز درست کیجئے" میں ہے مسئلہ نمبر۳:- "اگر آپ غلطی سے پہلی یا تیسری رکعت میں بیٹھ گئے تو فوراً کھڑے ہو جائیں، اگر بیٹھ کر اتنی دیر گزر گئی کہ جس میں تین مرتبہ سبحان اللہ کہا جاسکے تو سجدۂ سہو کرنا ضروری ہے، ورنہ نہیں۔" بحوالہ کتب محقق فرمائیں تاکہ تسلی ہو، کیونکہ بہشتی زیور میں اس کے خلاف کی تصریح ہے، یعنی تین مرتبہ سبحان اللہ کی مقدار کی تاخیر کی قید نہیں ہے۔

عبارت یہ ہے: ولو قام فی الصلوٰة الرباعية الى الركعة الخامسة او قعد بعد رفع رأسه من السجود فی الركعة الثالثة و قام الى الرابعة فی المغرب، أو الثالثة فيه أو فی الفجر او قعد بعد رفعه من الركعة الأولى فی جميع الصلوات يجب عليه سجود السهو بمجرد القيام فی صورة وبمجرد القعود فی صورة لتأخير الواجب وهو التشهد أو السلام فی صورة القيام وتأخير الركن وهو القيام فی صورة القعود، اهـ (۲)

---

(۱) وفی الدر مع الرد ويجب ... بترك واجب سهوًا وفی الشامية ج ۲ ص ۸۰ واحترز بالواجب عن السنة كالثناء والتعوذ ونحوهما. وكذا فی الهندية ج ۱ ص:۱۲۶

(۲) غنية المتملی ص:۴۵۸ (طبع سهيل اكيدمی لاهور)

جواب:- اس مسئلے میں احقر کو بھی شک تھا، اس لئے ایک مرتبہ اس کی تحقیق لکھ کر والد ماجد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی کو دکھا دیا تھا، موصوف نے اس کی تصدیق فرما کر اسے امداد الفتاوی جلد اول (صفحہ ۳۵۲ طبع جدید کراچی) کا جزو بنادیا تھا۔ اس تحقیق کا حاصل یہی ہے کہ مجرد قعود سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا بلکہ مقدار رکن تاخیر سے واجب ہوتا ہے، جس کی تعیین تین تسبیحات سے کی گئی ہے۔

علامہ طحطاویؒ مراقی الفلاح کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں: وهو مقدر بثلاث تسبيحات۔ (ج ص ۲۵۸ طبع نور محمد کتب خانہ) "اس کی مقدار تین بار سبحان اللہ کہنے کو مقرر کیا گیا ہے۔" تفصیل کے لئے تو امداد الفتاوی کے مذکورہ حاشیہ کی طرف رجوع فرمائیں، یہاں علامہ شامیؒ کی ایک تصریح ذکر کر دیتا ہوں، درمختار میں ہے کہ:-

"ويكبر للنهوض على صدور قدميه بلا اعتماد وقعود استراحة ولو فعل لا بأس"

اس کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: قال شمس الأئمة الحلواني الخلاف في الأفضل حتى لو فعل كما هو مذهبنا لا بأس به عند الشافعي ولو فعل كما هو مذهبه لا بأس به عندنا ... ولا ينافي هذا ما قدمه الشارح في الواجبات حيث ذكر منها ترك قعود قبل ثانية ورابعة لأن ذاك محمول على القعود الطويل۔ (رد المحتار ص ۳۴۳ مطبوعہ استنبول)[3] لہٰذا جتنی مقدار شوافع کے یہاں بطور جلسۂ استراحت مستحب ہے، اس سے ہمارے نزدیک سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا۔

والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۱۹ھ

تاخیرِ رکن کی کتنی مقدار سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے؟

(ایک رکن کی مقدار تاخیر سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے یا ایک تسبیح کی مقدار تاخیر سے؟ مفصل تحقیق)

عباراتِ ذیل زیرِ بحث مسئلے میں قابلِ غور ہیں:-

۱- قال في منتقى الأبحر ويجب إن قرأ في ركوع أو قعود أو قدم ركنا أو أخره أو كرره أو غيّر واجبا أو تركه كركوع قبل القراءة وتأخير القيام إلى الثالثة بزيادة على التشهد، وقال شارحه العلامة شيخ زاده واختلفوا في قدر الزيادة فقال بعضهم بزيادة حرف وكلام

(۱، ۲) سجدۂ سہو سے متعلق حضرت والد دامت برکاتہم کی یہ تحقیق اسی فتوی کے بعد آگے ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) الدر المختار مع رد المحتار ج۱ ص ۵۰۲ (طبع سعید)

المصنف يشير الى هذا وقال بعضهم بقدر ركن وهو الصحيح كما في أكثر الكتب (مجمع الأنهر ج:١ ص ١٣٨)[1]

٢ – وقال تحته شارحه العلامة ابن عابدين بقدر ركن (المجموعة المخطوطة)[2]

٣ – قال الامام ظهير الدين المرغيناني لا يجب بقوله اللهم صل على محمد وانما المعتبر مقدار ما يؤدى فيه ركن كذا في الظهيرية (عمدة الرعاية حاشية شرح الوقاية ج ص ١٦٩)[3]

٤ – قال ابن البزاز الكردري سها في صلوته بها الظهر او العصر أو غير ذلك ان تفكر قدر ما يؤدى فيه ركن كالركوع لزمه وان قليلا فان شك في صلوة صلاها ... الخ (الجامع الوجيز على هامش الهندية ج:٣ ص ٤٠)[4]

ان تمام عبارات سے مشترکہ طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تاخیر واجب کی مقدار جسے فقہاء نے یہ قرار دی ہے کہ اتنی دیر تاخیر ہو جائے جس میں کوئی رکن نماز مثلاً رکوع یا سجدہ وغیرہ ادا ہو سکے، اور وہ تین مرتبہ "سبحان ربی العظیم" کہنے کے وقفے میں ہوتا ہے، جیسا کہ صرح الطحطاوی فی حاشیته علی المراقی حیث قال ولم یبینوا قدر الرکن وعلی قیاس ما تقدم ان یعتبر الرکن مع سنته وهو مقدر بثلاث تسبیحات۔ (طحطاوی ج:۱ ص:۲۵۸)[5]

ان قول کے علاوہ بھی بہت سے قول ذکر کئے گئے ہیں جن میں سے یا تو مرجوح ہیں، یا وہ کہ جن کا مآل یہی نکلتا ہے، صاحب تنویر الابصار نے اس مسئلہ کو دو جگہ ذکر کیا ہے اور بظاہر دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، باب صفة الصلوة میں ان کی عبارت یہ ہے (فان زاد عامدا کره) فتجب الاعادة (او ساهیا وجب علیه سجود السهو اذا قال اللهم صل علی محمد) فقط (علی المذهب المفتی به لا لخصوص الصلوة بل لتاخیر القیام (شامی ج:۱ ص:۵۱۰)[6]۔ اس کے تحت علامہ شامی نے کئی اقوال نقل کرنے کے بعد زیلعی، شرح منیہ کبیری، وغیرہ سے اسی کو صحیح قرار دیا ہے، اور علامہ حلبی اور شرح منیہ صغیری سے "وعلی ال محمد" کی زیادتی کا مرجح ہونا ذکر کیا ہے۔

اور باب سجود السهو میں صاحب تنویر فرماتے ہیں وتاخیر قیام الی الثالثة بزیادة علی التشهد بقدر رکن۔ صاحب درمختار نے لکھا وقیل بحرف وفی الزیلعی الاصح وجوبه باللهم

---

(٢) مجمع الانهر شرح ملتقى الأبحر ج ١ ص ٢٢٠ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)
(٣) راجع شرح الوقاية ج:١ ص ١٨٥ (طبع ايچ ايم سعيد)
(٤) الجامع الوجيز على هامش الهندية ج ٣ ص ٢٣ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه)
(٥) (طبع نور محمد كتب خانه)
(٦) الدر المختار ج:١ ص:٥١٠ (طبع ايچ ايم سعيد)

صل علی محمد۔ علامہ ابن عابدینؒ نے اس تعارض کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا (قولہ وفی الزیلعی الخ) جزم بہ المصنف فی متنہ فی فصل اذا أراد الشروع وقال انہ المذہب واختارہ فی البحر تبعاً للخلاصۃ والخانیۃ والظاہر انہ لا ینافی قول المصنف ہنا بقدر رکن تأمل. (شامی ج:۱ ص:۴۹۶)۔[۱] جس سے معلوم ہوا کہ "اللّٰھم صل علی محمد" اور بقدر رکن، دونوں اقوال کا حاصل اور مآل ایک ہی نکلتا ہے، تو گویا جس جس نے "اللّٰھم صل علی محمد" کو مقدار قرار دیا ہے اس نے بقدر رکن کے قول کے منافی کوئی بات نہیں کہی، وبالعکس۔

رہی وہ عبارت جو منیۃ المصلی میں ہے کہ اگر کوئی شخص پہلی یا تیسری رکعت کے آخر میں بیٹھ جائے تو مطلق بیٹھ جانے ہی سے سجدۂ سہو واجب ہو جائے گا، خواہ مقدار رکن بیٹھا ہو یا نہیں، اسی طرح اس میں یہ بھی ہے کہ جلسۂ استراحت سے سجدۂ سہو لازم آ جائے گا (حلبی ص ۴۳۲)، سو اس بارے میں تحقیق وہ ہے جو درمختار اور رد المحتار میں لکھی گئی ہے، وھو ھذا:

۱- قال العلامۃ الحصکفی فی واجبات الصلوۃ: وترک قعود قبل ثانیۃ أو رابعۃ وکل زیادۃ تتخلل بین الفرضین[۲] وقال الشامیؒ وکذا القعدۃ فی آخر الرکعۃ الأولی أو الثالثۃ فیجب ترکھا ویلزم من فعلھا أیضاً تأخیر القیام الی الثانیۃ أو الرابعۃ عن محلہ وھذا اذا کانت القعدۃ طویلۃ اما الجلسۃ الخفیفۃ التی استحبھا الشافعیؒ فترکھا غیر واجب عندنا بل ھو الأفضل. (شامی ج:۱ ص:۴۳۸)[۳]

۲- قال فی الدر المختار: ویکبر للنہوض علی صدور قدمیہ بلا اعتماد وقعود استراحۃ، ولو فعل لا بأس. وقال الشامیؒ تحتہ: قال شمس الأئمۃ الحلوانیؒ: الخلاف فی الأفضل حتی لو فعل کما ھو مذھبنا لا بأس بہ عند الشافعیؒ ولو فعل کما ھو مذھبہ لا بأس بہ عندنا کذا فی المحیط اھ. قال فی الحلبۃ والأشبہ أنہ سنۃ أو مستحب عند عدم العذر ویکرہ فعلہ تنزیھاً لمن لیس بہ عذر اھ وتبعہ فی البحر. أقول: ولا ینافی ھذا ما قدمہ الشارح فی الواجبات حیث ذکر منھا ترک قعود قبل ثانیۃ ورابعۃ لأن ذاک محمول علی القعود الطویل (رد المحتار ج:۱ ص:۴۷۳)[۴]

اس لئے ان عبارات سے معلوم ہوا کہ دو رکعتوں کے درمیان جلسۂ خفیفہ جائز ہے اور

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج ۲ ص ۸۱۰ (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) الدر المختار ج:۱ ص:۴۷۰ (طبع ایچ ایم سعید)
(۳) رد المحتار ج:۱ ص:۴۶۹ (طبع ایچ ایم سعید)
(۴) الدر المختار مع رد المحتار ج ۱ ص ۵۰۶ (طبع ایچ ایم سعید)

شامی کی تصریح کے مطابق ترک قعود جو واجب ہے، وہ قعود طویل ہے، قصیر نہیں، درایت کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کیونکہ یہ فعل عمداً جائز ہے تو سہواً بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہئے، نیز چونکہ یہ قول "بقدر رکن" کی تقدیر کے مطابق ہے اس لئے اسی کو ترجیح ہونا چاہئے، اور جب اس درایت کے ساتھ شامیؒ کی یہ روایت مل گئی تو اس دعویٰ میں مزید قوت پیدا ہوگئی، اور خود علامہ ابراہیم حلبی کی تصریح علامہ شامی نے نقل فرمائی ہے

کما عن شرح المنية انه لا ينبغي ان يعدل عن الدراية أي الدليل اذا وافقتها رواية۔

خلاصہ یہ کہ جو مقدار جلسہ استراحت کی شوافع کے یہاں مسنون ہے، اس مقدار تک بیٹھنے سے سجدۂ سہو لازم نہ آنا چاہئے۔ ھذا ما عندی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
بندہ محمد شفیع عفی عنہ	بندہ رشید احمد عفی عنہ	یکم محرم الحرام ۱۳۸۰ھ
۱/۱/۱۳۸۰ھ	۱۳۸۰/۱/۴ھ	

(از حاشیہ امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۳۵۲)

بھولے سے سلام پھیر لینے کے بعد سجدۂ سہو کب تک کر سکتے ہیں؟

سوال:- نماز میں معمولی غلطی ہوئی، اور سجدۂ سہو کرنا بھول گئے، تو بعد میں نماز کس طرح ادا کریں گے؟ اور نماز کے بعد سجدۂ سہو کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- اگر غلطی ایسی تھی کہ اس کی وجہ سے سجدۂ سہو کرنا واجب تھا تو سلام پھیرنے کے بعد جب تک کوئی مفسد فعل نہ کیا ہو، سجدۂ سہو کر سکتے ہیں، اس کے بعد نماز پوری کر سکتے ہیں، اور اگر کوئی مفسد نماز فعل کر لیا، مثلاً کوئی بات کر لی یا سینے کا رُخ قبلے سے پھیر دیا، تو نماز کا ازسرنو اعادہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
بندہ محمد شفیع عفی عنہ	۲ – ۱۳۹۸ھ

(فتویٰ نمبر ۷۶۲ / ۱۹ الف)

چار رکعت والی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیرنے کی صورت میں سجدۂ سہو کے وجوب سے متعلق فقہاء کی عبارات میں تضاد کی تحقیق

سوال:- حضرت تھانویؒ نے بہشتی زیور میں لکھا ہے "چار رکعت والی نماز میں بھولے سے دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو اب اُٹھ کر اس نماز کو پورا کرے، اخیر میں سجدۂ سہو کر لینے سے نماز ہو جائے گی" اور بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر دونوں طرف سلام پھیر دیا تو سجدۂ سہو نہ کرے بلکہ نماز کا اعادہ کرے۔

کیونکہ پہلا سلام دو چیزوں یعنی نماز سے باہر ہونے اور قوم کی تحیت کے لئے ہے، اور دوسرا سلام صرف باقی نمازیوں کی تحیت کے لئے ہے، اس لئے یہ دوسرا سلام کلام کی مانند ہوا اور کلام منافی نماز ہے، اس لئے سجدہ سہو کو ساقط کرتا ہے، پس اعادہ لازم ہے۔ ان دونوں قولوں میں شدید اختلاف ہے، مفتی بہ قول کون سا ہے؟

جواب:- بہشتی زیور[۱] کا قول ہی مفتی بہ ہے۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۶۹۳ ب)

---

(۱) بہشتی زیور [illegible]

(۲) وفي البحر [illegible] سجود السهو قبيل باب صلوة المريض ج ۲ ص: ۱۱۱ (طبع مكتبه رشيديه كوئته) وان [illegible]

[illegible] (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی سجود التلاوۃ﴾

(سجدۂ تلاوت کے مسائل کا بیان)

امام کے سجدۂ تلاوت کا پتہ نہ چلنے کی بناء پر مقتدی رکوع میں رہ کر اُٹھ گیا تو کیا حکم ہے؟

سوال:- فجر کی نماز میں امام صاحب نے پہلی رکعت میں سجدۂ تلاوت کی آیت پڑھی اور سیدھے سجدہ میں چلے گئے، میں مسجد کی چھٹی صف میں تھا جو کہ مین ہال اور برآمدہ کے باہر چھت اور صحن میں ہے، ادھر کچھ اندھیرا سا بھی تھا، میں اور میرے برابر والے کچھ نمازی رکوع میں چلے گئے، جب امام صاحب سجدے سے فارغ ہوکر قیام میں تکبیر کہتے ہوئے آئے، اس وقت پتہ چلا کہ امام صاحب نے رکوع نہیں کیا بلکہ سجدہ تلاوت کیا ہے، میں بھی رکوع سے اٹھ گیا اور امام صاحب کی قراءت سننے لگا، سجدۂ تلاوت کے فوت ہوجانے سے نماز ہوگئی یا اعادہ کرنا ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی نماز ہوگئی۔

لما في الخانية إذا قرأ الإمام آية السجدة وبعض القوم كان في الزحمة فكبر الإمام للسجدة وحسب من كان في الزحمة أنه كبر للركوع فركعوا ثم قام الإمام من السجدة وكبر فظن القوم أنه رفع رأسه من الركوع فكبروا ورفعوا رؤوسهم إن لم يزيدوا على ذلك لم تفسد صلوتهم لأنهم ما زادوا إلا ركوعا وزيادة الركوع لم تفسد الصلوة. فتاوى قاضي خان على هامش الهندية ج ۱ ص ۱۲۰[۱]. ومثله في خلاصة الفتاوى ج ص ۱۸[۲]، والهندية ج ۱ ص ۱۳۲[۳]

البتہ اگر رکوع میں علم ہوجاتا کہ امام سجدے میں گیا ہے تو رکوع چھوڑ کر سجدے میں چلے جانا چاہئے تھا. لما في البحر ولو قرأ الإمام السجدة فسجد فظن القوم أنه ركع فبعضهم ركع وبعضهم ركع وسجد سجدة وبعضهم ركع وسجد سجدتين فمن ركع ولم يسجد يرفض

(۱ تا ۳) (طبع مکتبہ حقانیہ پشاور)

رکوعه ويسجد للتلاوة. البحر الرائق ج ۲ ص ۲۲۰[1]، ومثله فی الدر المختار مع الشامی۔[2]

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ صورتِ مسئولہ میں مقتدی کا سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوا کیونکہ رکوع میں نیت کے بغیر سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر امام نے سجدۂ تلاوت کے بعد تین آیت پڑھنے سے پہلے رکوع کر دیا ہو تب تو مقتدی کا سجدۂ تلاوت سجدۂ نماز میں بلا نیت بھی ادا ہو جائے گا، اور اگر تین آیت یا اس سے زیادہ قراءت کر کے رکوع کیا ہو تو علامت ما فی الباب مقتدی کا سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوا، لیکن اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

لما فی الدر المختار ولو تلاها فی الصلوة سجدها فيها لا خارجها لما مرّ. وفی البدائع واذا لم يسجد اثم فتلزمه التوبة.[3]

اور صورتِ مسئولہ میں چونکہ سجدۂ تلاوت عذر کی بناء پر چھوٹا ہے، اس لئے امید ہے کہ ان شاء اللہ گناہ بھی نہ ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۲۷/۳۲ ج)

لاؤڈ اسپیکر پر آیتِ سجدہ سننے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوگا

سوال:- تیز آواز والی مجلس کے مائیکروفون میں سجدے کی آیت تلاوت کرنے سے مجلس سے باہر یا گھر کے لوگوں کے سننے سے ان پر سجدہ کرنا واجب ہوگا یا نہیں؟ بر تقدیر اول وہ لوگ اگر سجدہ نہ کریں تو تیز تلاوت کرنے والے یا بانیٔ مجلس پر گناہ عائد ہوگا یا نہیں؟

جواب:- واجب ہوگا۔ اور اگر انہوں نے سجدہ نہ کیا تو اس کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر تیز آواز میں لگانے والے بھی گناہ سے خالی نہ ہوں گے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) البحر الرائق باب سجود التلاوة ج ۲ ص ۱۲۱ (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) الدر المختار ج:۲ ص ۱۱۲ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) الدر المختار ج:۲ ص ۱۱۰ (طبع ایچ ایم سعید)

﴿باب صلوۃ المریض والمسافر﴾
(مریض اور مسافر کی نماز کا بیان)

نمازِ قصر کہاں سے شروع کرے؟
کیا اپنے شہر میں قصر کرسکتا ہے یا نہیں؟

سوال ۱:- زید کراچی سے حیدرآباد شہر جانے کے لئے سفر کو نکلتا ہے، زید اپنے محلے اور بلاک کی حدود سے نکل کر قصر کرے یا کراچی شہر کی ساری حدود سے نکل کر قصر کرے؟

۲:- زید کسی ایسے بڑے شہر میں رہتا ہے جس شہر کی لمبائی تقریباً ۵۰ پچاس، ۵۵ پچپن میل ہے، زید اس شہر کے کونے میں رہتا ہے، زید کو اس شہر کے دوسرے کونے میں جانا ہے جو کہ تین دن کی مسافت پر ہے پیدل جانے کی صورت میں، لہٰذا زید قصر کرے یا پوری چار رکعت پڑھے؟

جواب ۱:- کراچی شہر کی حدود سے نکل کر قصر کرے۔[۱]

۲- صورتِ مسئولہ میں قصر جائز نہیں، اپنا شہر خواہ کتنا ہی طویل وعریض ہو اس میں قصر جائز نہیں۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
۲۲؍۲؍۱۴۰۳ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۴؍۳۳ ب)

زوجہ اور عقار کو وطنیت کا معیار بنانے پر فتح القدیر اور البحر الرائق کی عبارات کی تحقیق

سوال:- زید ایک عالمِ دین ہے، اس کے دو دینی مدارس ہیں، ایک قدیمی ۔۔۔ بہت ہیں،

(۱، ۲) وفی الدر المختار باب صلوۃ المسافر ج ۲ ص ۱۲۱ (من خرج من عمارۃ موضع اقامتہ) من جانب خروجہ وان لم یجاوز من الجانب الآخر وفی الشامیۃ تحتہ (قولہ من خرج من عمارۃ موضع اقامتہ) أراد بالعمارۃ ما یشمل بیوت الأخبیۃ لأن بھا عمارۃ موضعھا قال فی الامداد، فیشترط مفارقتھا ولو متفرقۃ ۔۔۔ وأشار الی انہ یشترط مفارقۃ ما کان من توابع موضع الاقامۃ کربض المصر وھو ما حول المدینۃ من بیوت ومساکن فانہ فی حکم المصر وکذا القری المتصلۃ بالربض فی الصحیح وکذا فی البحر الرائق باب المسافر، الموضع الذی یبتدأ فیہ القصر ج ۲ ص ۱۲۸ (طبع سعید) وغنیۃ المتملی فصل فی صلوۃ المسافر ص ۵۳۶ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور)

جہاں بیس تیس سال سے قیام پذیر ہے، اس کے اہل و عیال بھی وہیں ہیں، اس کے نجی مکانات بھی ہیں، اور مدرسہ مع مالہا وما علیہا ہے۔

۲- عرصہ تین سال سے شہر میں بھی ایک مدرسہ قائم کر رکھا ہے جس میں سلسلۂ تعلیم جاری ہے اور زید کے زیر اہتمام و سرپرستی چل رہا ہے، زید کا شہر میں بھی اپنا نجی مکان ہے جس میں وہ رہتا ہے اور اس کے عیال کے بعض افراد مثلاً بیٹے، بہو وغیرہ بھی یہاں پر ہیں، خود زید حسبِ ضرورت دونوں جگہ قیام کرتا ہے، مدارس کے کام کے سلسلے میں جتنے دن شہر میں رہنے کی ضرورت پڑتی ہے وہاں رہتا ہے، پھر دوسرے مدرسہ میں جتنے دن یا مدرسہ کا کام ہوتا رہتا ہے، مگر اکثر و بیشتر سابقہ دیہاتی مکان میں قیام ہوتا ہے، یاد رہے کہ زید کی دونوں ولادت گاہیں نہیں ہیں، کیا یہ دونوں جگہیں وطنِ اصلی شمار ہوں گی؟ اور جب بھی وہاں پہنچ جائے تو مقیم شمار ہوگا۔ ۱- لأن بعضا من عياله هنا وبعضا منه هنا، ۲- ولأن له عقارا ودورا في كليهما، ۳- ولأن له توطنا بلا ترجيح واستقرار حسب الضرورة بكليهما، یا ان میں سے ایک وطنِ اصلی شمار ہوگا بخلاف آخر؟ مکانات و زمین پر وطنِ اصلی کا مدار معتبر ہے یا زوجہ کی رہائش کی جگہ کو ترجیح ہے؟

فقہاء کی بعض عبارات تنقیح طلب ہیں، مثلاً شامی نے وطنِ اصلی کی تعریف میں لکھا ہے: هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه (بطل بمثله) پھر تأہل کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فإن ماتت زوجته في أحدهما وبقي له فيها دور وعقار قيل لا يبقى وطنا له إذ المعتبر الأهل دون الدار۔ مگر آگے لکھتے ہیں: وقيل يبقى، پھر آگے لکھتے ہیں: قال في البحر ولو نقل أهله ومتاعه وله دور في البلاد لا تبقى وطنا له، جس سے یوں مترشح ہوتا ہے کہ اعتبار اہل و عیال کا ہے، لیکن پھر لکھ رہے ہیں: وقيل تبقى كذا في المحيط، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دور و عقار کو بھی وطنیت اصلی میں دخل ہے۔

بہرحال مسئلہ منقح نہیں ہو رہا ہے، مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد جو جواب ہو، مدلل اور باحوالہ ارشاد فرمائیں۔ (مولانا) حسین احمد شرودی، کوئٹہ، بلوچستان

جواب:- آپ نے رد المحتار سے دور اور عقار کے مسئلے میں جو عبارت نقل کی ہے، اس کے متعلق اس کے بارے میں دو قول ہیں، اور یہی دو قول عالمگیریہ[۱] اور بحر[۲] میں بھی نقل کئے ہیں، اور کوئی ترجیح یا تطبیق نہیں دی، البتہ امداد الفتاوی میں حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ نے اس مسئلے پر جو

(۱) فتاوی عالمگیریۃ ج:۱ ص:۱۴۲ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

(۲) البحر الرائق باب المسافر ج:۲ ص:۱۳۱ (طبع سعید)، وغنیۃ المستملی ص:۵۴۳ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور)

گفتگو فرمائی ہے اس سے حقیقتِ مسئلہ واضح ہوجاتی ہے، ان کی عبارت یہ ہے:-

''صورت مذکورہ میں دونوں قول ہیں، اور یہی دونوں قول فتح القدیر اور البحر الرائق میں بھی نقل کئے ہیں، اور بحر میں دونوں قول کی دلیلیں بھی نقل کی ہیں، اور فتح القدیر میں دونوں کی تطبیق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اور میرے نزدیک تطبیق ہی مختار ہے، چنانچہ اس صورت میں امام محمدؒ کا قول هذا حلي وأنا أرى القصر إن نوى ترك وطنه، نقل کرکے لکھا ہے الا ان أبا يوسف كان يتم بها لكنه يحمل على أنه لم ينو ترك وطنه اهـ[1]

خلاصہ تطبیق کا یہ ہوا کہ اگر اس دوسرے شہر میں کچھ بطور وطن رہنے کا ارادہ نہیں ہے جس طرح پہلے رہتا تھا تب تو وطن نہ رہا، وہاں جاکر قصر کرے گا جب مسافت سفر طے کرکے آئے، اور اگر اب بھی اسی طرح رہنے کا ارادہ ہے تو وہ بھی وطن ہے، پس اس شخص کے دو وطن ہوجاویں گے۔

(امداد الفتاویٰ ج ١ ص ٣٩٣-٣٩٢)[2]

اور اس مجموعہ سے احقر کی سمجھ میں جو بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں اصل مدار مبتلیٰ بہ کی نیت کا ہے اور زمین کا ہونا یا دور وغیرہ کا ہونا اس نیت کی علامات ہیں، اصل مدار مسئلہ نہیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر آپ نے دیہات کے وطن کو چھوڑے بغیر شہر میں بھی بطور وطن رہنے کا اس طرح ارادہ کیا ہے کہ کبھی یہاں تو طن رہے گا اور کبھی وہاں تو یہ دونوں مقامات آپ کے لئے وطن اصلی ہیں، اور بحر کی ایک عبارت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے هذا جواب واقعة ابتلينا بها وكثير من المسلمين المتوطنين في البلاد ولهم دور وعقار في القرى البعيدة منها يصيفون بها بأهلهم ومتاعهم، فلا بد من حفظها أنهما وطنان له لا يبطل أحدهما بالآخر (البحر الرائق ج ٢ ص ١٤٧)[3]۔

ہاں اگر نیت شہر کو وطن بنانے کی نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ کام کی غرض سے وہاں جانا ہوگا اور کام ختم ہوتے ہی اپنی اصلی جگہ واپس آجایا کریں گے، تو پھر دیہات وطن اصلی اور شہر وطن اقامت ہوگا، هذا ما ظهر لي والعلم عند الله العليم الخبير۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

١٣٩٧ھ

(فتویٰ نمبر ٢٥٣٥/٢٧ و)

---

(١) فتح القدیر باب صلوٰۃ المسافر ج ٢ ص ١٨ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

(٢) امداد الفتاویٰ ج ١ ص ٣٩٣

(٣) البحر الرائق باب المسافر ج ٢ ص ١٣٦ (طبع ایچ ایم سعید) وکذا فی فتح القدیر ج ٢ ص ١٨ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت کا معیار (فارسی)

سوال – چہ می گویند علماء دریں مسئلہ کہ دریں دیار بوقت فصل خرما خوری اہالیان شہر (الف) کہ وطن اصلی ایشان است با اہل وعیال نقل مکانی کردہ بشہر (ب) میروند وخاص غرض ومقصد ایشان خرما خوری است وعزم ایشان بعد از انقطاع فصل خرما کہ مدت سہ چہار ماہ باشد ارتحال وکوچیدن باز بسوئے وطن اصلی خود کہ شہر (الف) ہست میباشد ودر حال برائے خرما خوری اہل وعیال خود را در شہر (ب) میگزارند، وخود در شہر (ب) ارادہ سکونت کمتر از پانزدہ روز دارند پس اکنون قابل دریافت چند امور است اوّل آنکہ ایں جا شہر (ب) ہست وطن اقامت صورت بندد یا نہ؟ دوم اینکہ ایں جا در شہر (ب) نمازہائے چارگانی قصر کنند یا اتمام؟ بینوا توجروا.

جواب – جواب صورت مسئولہ از ایں قبیل است کہ اہل وعیال در شہر (ب) بحکم مقیم ہستند واتمام صلوٰۃ برایشان واجب، زیرا کہ نیت قیام زائد از پانزدہ روز کردہ اند، اما سرپرست آنہا کہ نیت قیام کمتر از پانزدہ روز کردہ است دراں شہر قصر خواہد کرد، پس شہر (ب) درحق اہل وعیال وطن اقامت ہست، ودرحق سرپرست وطن سفر، واگر سرپرست ہم نیت قیام پانزدہ روز کند او ہم اتمام خواہد کرد، وجوابے کہ منسلک بسوال است، اگر مراد این است کہ ہر شہرے کہ دراں اہل باشند، خواہ بہ نیت قیام عارضی، آن وطن اقامت می تواند شد، این جواب درست نیست کہ ازاں لازم می آید کہ ہر سفرے کہ دراں اہل وعیال ہمراہ باشند دراں نیت اقامت درست نشود، وھذا لم یقل به أحد من الفقہاء، بہر حال دریں مسئلہ نوشتہ اند کہ "والمعتبر نية المتبوع لأنه الأصل لا التابع كمرأة مع زوج" (درمختار مع الشامی ج ۱ ص ۵۳۳، ۵۳۴)۔[1]

پس معلوم شد کہ اگر شخصے در شہرے ہمراہ زوجہ خود اقامت کند وطن اقامت می گردد، واقول فقہاء کہ "ووطن الاقامة ما ينوي فيه الاقامة خمسة عشر يوما فصاعدا ولم يكن مولده له ولا له به اهل كما في الكبيري ص ۵۰۲"[2] پس مراد او مجرد وجود اہل نیست، بلکہ وطن اہل است، واز ینجا است کہ بعض فقہاء در تعریف وطن اقامت "ولا له به اهل" ذکر نمی کردہ اند چنانکہ علامہ شامیؒ گوید

"وهو ما خرج اليه بنية اقامة نصف شهر سواء كان بينه وبين الأصلي مسيرة السفر أو لا"۔ (شامی ج ۱ ص ۵۳۲)۔[3]

---

(۱) الدر المختار باب صلوة المسافر ج ۲ ص ۱۳۳ (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) غنیة المتملی ص ۵۴۳ (طبع سهیل اکیدمی لاهور)
(۳) رد المحتار باب صلوة المسافر ج ۲ ص ۱۳۲ (طبع سعید)

پس خلاصہ ایں است کہ شہر (ب) درحق اہل وعیال وطن اقامت ہست ودرحق مرد اگر نیت اقامت کمتر از پانزدہ روز است منزل سفر ہست وبیش ازاں وطن اقامت، هذا ما عندي۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۹/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲/۷/۲۹ ب)

وطن اصلی سے مکمل طور پر منتقل ہو جانے کے بعد دوبارہ وطن آنے کی صورت میں قصر کا حکم

سوال ۱ – زید موضع قادر بخش بستی کوٹ چاندنہ کا رہنے والا ہے اور وہ اس کا آبائی وطن ہے، کسی وجہ سے زید اپنے آبائی وطن سے مستقل نقل مکانی کر کے ریاست بہاولپور ضلع رحیم یار خان میں اپنا تاھل رکھتا ہے، جو اس کے آبائی وطن سے تقریباً چار سو میل کے فاصلے پر واقع ہے، حسب ارشادِ گرامی حضور صلی اللہ علیہ وسلم من تأھل فی بلد فلیصل صلوۃ المقیم، نماز قصر نہ کرے گا، لیکن اگر کبھی اپنے آبائی وطن میں کسی کام سے آنا ہو اور وہاں پندرہ دن سے کم رہنے کا ارادہ ہو تو وہاں صلوۃ مقیم ادا کرے گا یا قصر؟

۲ – اگر زید اپنے آبائی وطن میں آیا اور اس نے پندرہ دن وہاں قیام کرنے کا ارادہ بھی کر لیا، تو اب وہ وہاں قصر نہیں کرے گا، بلکہ صلوۃ مقیم ادا کرے گا، پندرہ دن کے اندر وہ قریب دو تین میل یا بارہ، تیرہ میل یعنی اڑتالیس میل کے اندر اندر تین دن کے لئے سفر کا ارادہ کرے یا نہ بھی کرتا ہو تب بھی دیہات کے دوران کے سفر میں وہ اپنی قیام گاہ یعنی آبائی وطن میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ راستے کی نمازیں اور قیام گاہ کی نمازیں قصر کرے گا؟

جواب ۱:- صورت مسئولہ میں اگر آپ کا ارادہ اپنے آبائی وطن (کوٹ چاندنہ) میں بطور وطن رہنے کا نہیں ہے تو اب یہ بستی آپ کی وطن اصلی نہیں رہی، لہذا آپ جب مسافت سفر طے کر کے یہاں آئیں تو قصر کریں گے، بشرطیکہ یہاں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ ہو، کیونکہ اس صورت میں اسے وطن اصلی نہیں کہا جائے گا، لما فی رد المحتار ولو نقل أهله ومتاعه وله دور في البلد لا تبقى وطنا له وقيل تبقى[1] ووجه القول الثاني في فتح القدير بأنه محمول على ما إذا عزم على القرار به وطنا وهذا التوجيه اختاره الشيخ في امداد الفتاوى ج:۱ ص:۳۶۳[2]۔

---

(۱) رد المحتار باب صلوۃ المسافر ج ۲ ص:۱۳۲ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) امداد الفتاوی ج ۱ ص ۳۹۲، ۳۹۳ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی). وفي الهداية ج ۱ ص ۱۶۷ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان) ومن كان له وطن فانتقل عنه واستوطن غيره ثم سافر فدخل وطنه الأول قصر لأنه لم يبق وطنا له ألا ترى أنه عليه السلام بعد الهجرة عد نفسه بمكة من المسافرين وهذا لأن الأصل أن الوطن الأصلي يبطل بمثله دون السفر ووطن الإقامة يبطل بمثله وبالسفر وبالأصلي... الخ

۲- جب کوٹ چاندنہ آپ کا وطن اصلی نہیں ہے تو آپ صرف اس وقت وہاں اتمام کریں گے جب چودہ دن سے زائد قیام کی نیت کی ہو، اس کے بعد اگر آپ کسی دوسری بستی میں جائیں تو اگر یہ بستی وہاں سے اڑتالیس میل دور ہو تو آپ وہاں بھی قصر کریں گے، اور وہاں سے کوٹ چاندنہ ایک دو رات کے لئے آئیں گے تو وہاں بھی قصر کریں گے، لیکن جس بستی میں آپ گئے ہیں اگر وہ کوٹ چاندنہ سے اڑتالیس میل سے کم ہے تو بدستور تمام کرتے رہیں، لأن وطن الاقامة يبطل بالسفر وقال في رد المحتار: والحاصل أن انشاء السفر يبطل وطن الاقامة اذا كان منه، أما لو أنشأه من غيره فان لم يكن فيه مرور على وطن الاقامة أو كان ولكن بعد سير ثلاثة ايام فكذلك ولو قبله لم يبطل الوطن .... الخ. ج:۱ ص:۵۳۳۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۳۷ ج)

فوج کی پوسٹنگ کی تبدیلی کی بناء پر نمازِ قصر سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال ۱:- شہر کے قریب فوجیوں کا کیمپ ہے، جب شہر میں اذانِ جمعہ ہوجاتی ہے تو وہاں اس کیمپ میں آواز سنائی دیتی ہے، مگر افسرانِ بالا کی طرف سے حکم ہے کہ کوئی فوجی شہر میں جمعہ کے لئے نہ جائے، اس صورت میں اس کیمپ میں نمازِ جمعہ درست ہوگی؟ یہ بات بھی ہے کہ اس کیمپ میں مستقل کوئی مسجد نہیں ہے، پانچوں نمازیں ایک کمرے میں پڑھتے ہیں جو وقتِ ضرورت خالی بھی کرنا پڑتا ہے، کیا ایسے کمرے میں دیگر نمازیں جمعہ کے علاوہ پڑھنا جائز ہے؟

جواب ۱:- یہ کیمپ شہر سے کتنی دور ہے؟ کیا شہر کی حدود اور اس کے کیمپ کے درمیان کچھ غیر آباد علاقہ ہے، جو شہر کا حصہ شمار نہ کیا جاتا ہو، اس کا جواب آنے پر اصل مسئلے کا جواب دیا جاسکے گا۔

سوال ۲:- جو آفیسر اپنے ماتحت یونٹوں کی دیکھ بھال کے لئے دور جاتے ہیں، یعنی تقریباً اڑتالیس میل کی مسافت طے کرتے ہیں تو کیا یہ لوگ قصر کریں گے؟

جواب ۲:- اگر پوسٹ جس کی چیکنگ کے لئے جارہا ہے شہر کی آخری حدود سے اڑتالیس میل دُور ہے تو قصر کرسکتا ہے۔

سوال ۳:- ایک آفیسر فوجیوں والے اگر جب دور دراز کے علاقوں میں جاتے ہیں، وہاں قیام کا کوئی پتہ نہیں ہوتا، جب کسی آفیسر سے دریافت کیا جاتا ہے تو بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ

(۱) رد المحتار باب صلوٰة المسافر ج:۲ ص:۱۳۲ (طبع ایچ ایم سعید)

فون میں تو فون ہے کہ قیام کی مدۃ کی کونہیں بتایا جاتا، تو اس صورت میں قصر کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب۳:- مذکورہ صورت میں فوجیوں کو قصر کرنا چاہئے، جب تک پندرہ دن قیام کرنے کا عزم نہ ہو قصر ہی کیا جائے گا، خواہ اس غیر یقینی حالت میں کئی مہینے گزر جائیں۔[1]

سوال۴:- اگر یہ چھوٹے چھوٹے یونٹوں والے سپاہی اور نوکر وغیرہ ہیڈکوارٹر کو پندرہ دن سے کم مدت کے لئے گئے تو کیا یہ سپاہی قصر کریں گے یا اتمام؟

جواب۴:- اگر یونٹ سے ہیڈکوارٹر کے شہر کا فاصلہ اڑتالیس میل ہے تو قصر کریں گے۔

سوال۵:- اگر ایک امام مسافر ہو اور کسی جگہ یہ جماعت پڑھاتا ہے تو مقتدی کی نیت اور امام کی نیت میں کچھ فرق ہوگا یا نہیں؟ اگر امام ہیڈکوارٹر کو جائے تو اس کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ میں وہاں کتنا قیام کروں گا؟ اگر وہ امام وہاں نماز پڑھائے گا تو کیسے پڑھے گا؟

جواب۵:- مسافر امام دو رکعتوں کی نیت کرے گا، اور مقتدی چار رکعتوں کی، پھر امام جب دو رکعتوں پر سلام پھیر دے تو مقتدی کھڑے ہوکر اپنی نماز پوری کریں،[2] مگر اس میں قراءت نہ کریں، بلکہ جتنی دیر میں سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے اتنی دیر خاموش کھڑے رہ کر رکوع میں چلے جائیں۔ قصر کا مسئلہ وہی ہے جو نمبر۳، نمبر۲ میں گزر گیا ہے۔

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

شرعی معذور کی نماز کا حکم

سوال:- ہماری مسجد میں ایک صاحب نماز پڑھتے ہیں، وضو کرکے نماز میں شریک ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رکوع میں جب جاتا ہوں تو ہوا خارج ہوجاتی ہے، ہر نماز میں یہی حالت ہوتی ہے، کیا نماز پڑھنا چھوڑ دیں یا کیا صورت اختیار کی جائے؟

جواب:- اگر ان صاحب کو چار رکعتیں بھی بغیر وضو ٹوٹے پڑھنے پر قدرت نہیں ہے، تو شرعاً وہ معذور ہیں، اور ان کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ ہر نماز کا وقت شروع ہونے پر وضو کرلیا کریں اور

---

(۱) وفی الدر المختار ج ۲ ص ۱۳۳ (طبع سعید) (ولا بد من علم التابع بنیة المتبوع فلو نوی المتبوع الاقامة ولم یعلم التابع فهو مسافر حتی یعلم علی الاصح) وفی ... کما فی المحیط وغیره ... مصر ...

(۲) وفی الدر المختار ج ۲ ص ۱۲۹، ۱۳۰ وصح اقتداء المقیم بالمسافر فی الوقت وبعده فاذا قام المقیم الی الاتمام لا یقرأ ولا یسجد للسهو فی الاصح، لانه کاللاحق والقعدتان فرض علیه وقیل لا. قوله وندب للامام ... وفی شرح الارشاد ینبغی ان یخبرهم قبل شروعه والا فبعد سلامه ان یقول بعد التسلیمتین فی الاصح اتموا صلوتکم فانی مسافر. الخ

اسی وضو سے نماز پڑھتے رہیں، جب تک اس نماز کا وقت باقی رہے گا اس وقت تک وضو ریح خارج ہونے سے نہیں ٹوٹے گا، ہاں! جب وہ وقت ختم ہوگا اور اگلا وقت شروع ہوگا تو نیا وضو کر لیں اور اس سے نماز پڑھتے رہیں، جب تک یہ عذر باقی رہے اس وقت تک ایسا کرتے رہیں، جب عذر ختم ہو جائے تو حسب معمول وضو کیا کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۲ الف)

معذور کی نماز کا حکم

سوال:- کبھی کبھی ثقیل یا بادی چیز کھانے کی وجہ سے مرض کا زور ہوتا ہے، تو رفع حاجت کے بعد مسے زیادہ متورم اور سخت ہو جاتے ہیں، اور چند نفس بیٹھنے اور دبانے کے باوجود داخل نہیں ہوتے، اس صورت میں مرہم مسوں پر لگا کر اور پھر مرہم کے نیچے گدی لگا کر پٹی رکھ کر لنگر باندھنا پڑتا ہے، رطوبت اور بعض دفعہ خون بھی جو مسوں سے خارج ہوتا ہے گدی میں جذب ہوتا رہتا ہے، بعض مرتبہ صرف ایک یا دو روز کے بعد اور بعض مرتبہ ہفتہ عشرہ کے بعد سابقہ حالت بحال ہوتی ہے، مجبوراً اس حالت میں نماز ادا کرنی پڑتی ہے، کیا اس حالت میں نماز کی ادائیگی میں کوئی نقص واقع ہوتا ہے؟ اگر ہے تو اس کے ازالے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ خصوصاً اگر یہ حالت حج کے موقع پر پیدا ہو کر پیش آجائے تو مناسک حج کی ادائیگی کے لئے کیا احکام ہیں؟ اور کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟

جواب:- اگر خون یا رطوبت کا اخراج اتنے تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے کہ باوضو چار رکعت نماز کی ادائیگی اس اخراج کے بغیر نہیں ہو سکتی تب تو حکم یہ ہے کہ ہر وقت کی ابتداء میں وضو کر لیا جائے اور اس سے فرض ونفل وغیرہ ادا کرتے جائیں، یہ وضو مذکورہ اخراج سے نہیں ٹوٹے گا، پھر جب دوسرا وقت آئے تو نیا وضو کر لے۔[1] کپڑے کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اس پر لگنے والی نجاست ایک گلٹ کے روپیہ کے برابر ہو یا اس سے کم ہو تو اس حالت میں نماز ہو جاتی ہے، اور اگر نجاست اس سے زائد ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ اگر کپڑے کو پاک کیا گیا تو نماز سے فارغ ہونے سے پہلے کپڑے کو پھر روپیہ سے زائد نجاست لگ جائے گی تو دھونا واجب نہیں، اس حالت میں نماز ہو جائے گی، اور اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو

(۱) وفی تنویر الابصار وشرحہ ج ۱ ص ۳۰۵، ۳۰۶: وصاحب عذر من بہ سلس بول لا یمکنہ امساکہ او استطلاق بطن او انفلات ریح او استحاضۃ ... ان استوعب عذرہ تمام وقت صلوٰۃ مفروضۃ بان لا یجد فی جمیع وقتہا زمنا یتوضأ ویصلی فیہ خالیا عن الحدث ولو حکما ... وحکمہ الوضوء لکل فرض ... ثم یصلی بہ فیہ فرضا ونفلا فاذا خرج الوقت بطل

دھونا واجب ہے، اور اگر رطوبت یا خون کا اخراج اتنے تسلسل کے ساتھ نہیں ہوتا جس کا ذکر پہلے فقروں میں کیا گیا ہے تو ہر اخراج کے بعد نماز کے لئے وضو کرنا بھی ضروری ہے اور کپڑے دھونا بھی۔

مناسک حج میں طواف کے لئے وضو ضروری ہے، اس لئے اس کا حکم نماز کا سا ہے، باقی ارکان بلا وضو ادا کرنے سے ادا ہو جاتے ہیں، بہتر یہ ہے کہ یہ مسائل آپ کسی عالم سے زبانی بھی سمجھ لیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۳۰-۲-۱۳۸۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۰/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

معذور کے لئے وضو کا حکم

سوال:- زید کو کافی عرصے قبض کی شکایت رہی جس کی بناء پر ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور قضائے حاجت کے قدرتی راستے کو بند کر کے دوسری جگہ سے قضائے حاجت کا راستہ بنا دیا، اس بناء پر زید کو ریح اور قضائے حاجت پر قابو نہیں ہے، ایک کامل نماز کے دوران کم از کم تین چار بار غیر اختیاری طور پر ریح خارج ہو جاتی ہے، اور زید کو بار بار وضو کرنے سے تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، اس بناء پر زید معذورین میں شمار ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر واقعۃً ایک کامل نماز بھی بغیر خروجِ ریح کے ادا نہیں ہو سکتی تو زید شرعاً معذور ہے، اور وہ ایک وقت کے شروع میں وضو کر کے اس سے جتنی چاہے نماز پڑھ سکتا ہے، اور وقت کے دوران خروجِ ریح سے اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا۔[۲]

واللہ اعلم

۱۴۰۵/۱۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲۶/۳۶ و)

شرعی معذور کی تعریف اور عذر کا معیار

سوال:- میری عمر ۴۹ سال ہے، ۲۰ سال کی عمر میں میں نے نماز شروع کی، جن دنوں میں نے نماز شروع کی وہ میری گوناگوں امراض و بیماری کا زمانہ تھا، اس وقت مجھ کو یہ تکلیف یہ بھی تھی کہ میری ریح نہیں ٹھہرتی تھی، یہ تکلیف کم و بیش لگی رہتی تھی جس کے متعلق علماء حضرات سے دریافت کیا

(۲) دیکھئے سابقہ ص ۵۰۵ کا حاشیہ نمبر ۲۔

ہوگا، میرے ذہن میں ہے کہ انہوں نے فرمایا ہوگا کہ تم ریح کے معذور ہو، تم ہر وقت وضو کرو، لہٰذا میں اس طرح کرتا رہا۔

اب سے ایک ماہ پیشتر تک یہی کرتا رہا ہوں، اور جو میرے ذمہ چھ سالوں کی قضا نمازیں تھیں وہ بھی اسی طرح ادا کرتا رہا ہوں، اور سردیوں میں موزے بھی وقت کے اندر پہن لیا کرتا تھا، ایک دن بہشتی زیور میری نظر سے گزری، تو وہاں مولانا صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ معذور آدمی اس وقت موزہ پہنے جب کہ طہارت کاملہ میں ہو تو پہنے تو پھر وہ مسح کرسکتا ہے، اور میں تو یہ سمجھتا رہا ہوں کہ وقت کے اندر میں پاک ہوں اس طرح مجھ سے غلطی ہوچکی ہے اور متواتر کئی سالوں سے ہو رہی ہے، پھر میں نے اپنے عذر ریاح کی تحقیق کی تو اس میں یہ معلوم ہوا کہ میں با تکلیف طہارت سے نماز ادا کرسکتا ہوں، یعنی پریشانی تو ہوتی ہے مگر جان روکنے سے نماز ادا ہوجاتی ہے، کیونکہ تقریباً ایک ماہ میں صرف دو تین دفعہ نمازوں میں دو، دو وضو کرنے پڑے، اب کتاب نور الایضاح وغیرہ جب دیکھی تو اس میں معذور کے متعلق جو حکم ہے کہ پہلی مرتبہ اس کو اتنا وقت نہ ملے کہ وہ نماز پڑھ سکے، مگر میری یہ حالت نہ تھی، تکلیف تو تھی مگر اتنی شدید نہ تھی، بہرحال تکلیف میں نماز ادا کرسکتا تھا ... میں معذور ہوں یا نہیں؟

جواب:- ''معذور'' ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ابتداء میں عذر کی کیفیت یہ ہو کہ ایک نماز بھی طہارت کے ساتھ نہ پڑھی جاسکے اور جتنی دیر میں وضو کرکے ایک فرض نماز پڑھی جائے اتنی دیر تک ریح نہ رُک سکے، چونکہ آپ کی یہ کیفیت نہ تھی جیسا کہ آپ نے بیان فرمایا ہے، اس لئے آپ پر معذور کے احکام جاری نہیں ہوسکتے۔ اب آپ کو چاہئے کہ گزشتہ سالوں کی نمازیں جس حد تک آپ کو قدرت ہو قضا کرتے رہیں، باقی کے لئے توبہ و استغفار بھی کریں، اور وصیت بھی لکھ دیں کہ آپ کے بعد آپ کے ترکہ سے چھوٹی ہوئی نمازوں کا فدیہ ادا کردیا جائے، تاکہ جو نمازیں بوجہ عذر قضا نہ کی جاسکیں ان کی تلافی فدیہ کے ذریعہ ہوجائے۔[2]

موزوں پر مسح کے بارے میں یہ مسئلہ یاد رکھئے کہ آپ اگر معذور ہوتے تب بھی ایک دن ایک رات تک مسح کرنا آپ کے لئے اس وقت تک جائز ہوتا جبکہ آپ نے حقیقی وضو کرکے واقعۃً باوضو ہونے کی حالت میں پہنا ہوتا، اور اگر کوئی معذور ریح خارج ہونے کے بعد موزے پہنے تو وہ صرف وقت ختم ہونے تک مسح کرسکتا ہے اس کے بعد نہیں۔ فی الدر المختار ومعذور فانه يمسح في

---

(۱) ... سابقہ ص ۵۰۵ کا حاشیہ ۲۔

(۲) نمازوں کے فدیہ سے متعلق احکامات ... کا تفصیلی فتویٰ سابقہ ص ۴۸۶ میں ملاحظہ فرمائیں۔

الوقت فقط، الا اذا توضأ ولبس على الانقطاع الصحيح (شامی ص ۲۵۰، والتفصيل فی رد المحتار)۔[۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳ ۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

قطرے کا مریض کپڑا دیکھے بغیر نماز پڑھے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- زید قطرے کا مریض ہے، شبہ پر جب دیکھتا ہے تو بعض مرتبہ قطرہ آیا اور بعض مرتبہ نہیں آیا، یہ مریض بغیر کپڑا دیکھے سابقہ وضو سے نماز پڑھے تو جائز ہے؟ یا تجدید وضو کرے؟

جواب:- اگر قطرہ نکلنے کا گمان غالب ہو تو چاہے قطرہ نظر آئے یا نہ آئے وضو کرنا واجب ہے، اور اگر محض شبہ یعنی کسی طرف گمان غالب نہ ہوتا ہو تو دیکھ کر اطمینان کرلینا چاہئے، اور اگر اس صورت میں قطرہ نظر نہ آئے تو نیا وضو کئے بغیر نماز پڑھنا جائز ہے، شبہ کی صورت میں اگر کسی عذر کی وجہ سے دیکھنے کا موقع نہ ملے تو بغیر دیکھے اور بغیر تجدید وضو کئے نماز پڑھ لینے سے نماز ہو جائے گی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۹/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳ ۱۹ الف)

الجواب صحیح

محمد شفیع

(۱) الدر المختار مع رد المحتار باب المسح علی الخفین ج ۱ ص ۲۷۱ (طبع سعید)

فصل فی الجمعۃ
(جمعہ کے متعلق مسائل کا بیان)

حنفیہ کے نزدیک نمازِ جمعہ کے لئے شہر کا وجود ضروری ہے

سوال — جمعہ کی نماز کے لئے احناف کے نزدیک شہر کا وجود ضروری ہے یا نہیں؟

جواب — حنفیہ کے نزدیک جمعہ صرف شہر، قصبے یا ایسے بڑے گاؤں میں ہوسکتا ہے جہاں ضروریاتِ زندگی عام طور پر ملتی ہوں، بازار ہو، گلیاں ہوں، اور وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے شہر کے ساتھ مشابہ ہو، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں ہے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۱/۱۴ھ

دورانِ خطبہ تشہد کی ہیئت پر بیٹھ کر ہاتھ باندھنا

سوال — ہمارے ہاں مسجد میں رواج ہے کہ جمعہ کی نماز کے خطبے میں تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھ کر ہاتھ باندھ لیتے ہیں اور جب خطیب درمیان خطبہ کے بیٹھتا ہے تو آخری خطبے میں ہاتھ زانوں پر رکھ لیتے ہیں، کیا ایسا کرنا فرض، واجب یا سنت ہے؟ جو ایسا نہ کرے کیا وہ گنہگار ہے؟

جواب — خطبہ جمعہ میں اصل یہ ہے کہ اس کو دھیان سے سننا واجب ہے، اور خطبے کے دوران کوئی بات چیت یا ایسا عمل ممنوع ہے جس سے سننے میں خلل واقع ہو،(۲) لیکن تشہد کی ہیئت میں بیٹھنا، ہاتھ باندھنا اور خاص وقت پر ہاتھ چھوڑنا سنت نہیں، ادب کے خیال سے دو زانو بیٹھنے میں کچھ

---

(۱) وفی الدر المختار ج ۲ ص ۱۳۷: ویشترط لصحتها سبعة أشیاء: الأول المصر ... وظاهر المذهب أنه کل موضع له أمیر وقاض ینفذ الأحکام ویقیم الحدود. وفی الشامیة: عن أبی حنیفة أنه بلدة کبیرة فیها سکک وأسواق ولها رساتیق وفیها وال یقدر علی إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غیره یرجع الناس إلیه فیما یقع من الحوادث وهذا هو الأصح ... الخ. وکذا فی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۵۱، نیز دیکھئے امداد الاحکام ج ۱ ص ۷۵۲۔

(۲) وفی الدر المختار ج ۲ ص ۱۵۹ طبع ایچ ایم سعید: وکل ما حرم فی الصلوٰة حرم فیها، أی فی الخطبة. خلاصة وغیرها، فیحرم أکل وشرب وکلام ولو تسبیحًا أو رد سلام أو أمر بمعروف بل یجب علیه أن یستمع ویسکت.

حرج نہیں، بلکہ بہتر ہے، لیکن مذکورہ التزامات اگر واجب یا سنت سمجھ کر کئے جائیں تو بدعت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۱۳/ ۲۷ ج)

خطبے کے دوران نفل نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک شخص دوران خطبہ آیا اور بیٹھ گیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: کیا تم نے دو رکعت نماز پڑھ لی؟ اس نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا اٹھو اور پہلے دو رکعت نماز پڑھو۔ یہ شاید بخاری کی حدیث ہے، اہل سنت والجماعت کا خطبے کے دوران عمل اس سے مختلف ہے؟

جواب:- بخاری شریف ہی کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ جمعہ کے دوران کلام کرنے سے یہاں تک کہ دوسرے کو خاموش کرنے سے بھی منع فرمایا۔ (بخاری ج۱ ص ۱۲۷، ۱۲۸)[1]۔ نیز معجم طبرانی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ امام کے خطبہ دیتے وقت جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو نہ نماز جائز ہے نہ بات کرنا۔ (بحوالہ اعلاء السنن ج۲ ص ۶۷)[2]۔ نیز حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ (عمدۃ القاری ج۶ ص ۲۳۲)[3]۔ لہٰذا بخاری شریف میں جو واقعہ حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ کا آیا ہے، وہ حضرت سلیک کی خصوصیت تھی، چنانچہ سنن دارقطنی اور ابوبکر بن ابی شیبہ نے اسی واقعے میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیک کو نماز کا حکم فرما کر خود خاموش ہوگئے تھے، اور جب تک وہ نماز سے فارغ ہوگئے آپ رکے رہے، امسک عن الخطبة حتى فرغ من ركعتيه ثم عاد الى خطبته (عمدۃ القاری ج۶ ص ۲۳۲)[5]۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں، بعض دوسرے دلائل کی روشنی میں بھی یہ حضرت سلیک کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۷ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۹۵/۱۱۹ الف)

---

(۱) وفي الهندية ج۱ ص ۱۴۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) اذا شهد الرجل عند الخطبة ان شاء جلس محتبيًا او متربعًا او كما تيسر لأنه ليس بصلوة عملا وحقيقةً، كذا في المضمرات ويستحب أن يقعد فيها كما يقعد في الصلوة كذا في معراج الدراية (۲) (طبع قديمى كتب خانه)

(۳) اعلاء السنن باب كراهة الصلوة والكلام اذا خرج الامام للخطبة يوم الجمعة (... شرح ...) ج ۲ ص ۶۷ (طبع ادارة القرآن كراچى)

(۴) باب اذا رأى الامام رجلا جاء وهو يخطب أمره أن يصلي ركعتين (طبع دار الفكر)

(۵) دیکھئے حوالہ مذکورہ حاشیہ نمبر۴۔ (محمد زبیر حق نواز)

خطبے کے دوران خاموش رہنا واجب ہے

سوال:- خطیب صاحب دوران خطبہ یہ آیت کریمہ تلاوت کریں "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ" الآیۃ، تو درود شریف بآواز بلند پڑھنا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- خطبے کے دوران بالکل خاموش رہنا واجب ہے،(۱) اور یہ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص بول رہا ہو تو اسے چپ کرانے کے لئے بولنا بھی ناجائز ہے۔(۲) لہٰذا جب امام آیت کریمہ "اِنَّ اللہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ" الآیۃ(۳) پڑھے تو مقتدیوں کو دل دل میں درود شریف پڑھنا چاہئے، زبان سے پڑھنا درست نہیں، خطبے کے دوران نماز پڑھنا بھی ناجائز ہوجاتا ہے تو درود پڑھنا بدرجۂ اولیٰ نادرست ہوگا۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۷۴/۱۹ الف)

جمعہ کی اذانِ ثانی امام اور منبر کے سامنے دینی چاہئے

سوال:- جمعہ کے خطبے کے لئے نماز جمعہ امام صاحب منبر رسول پر بیٹھتے ہیں تو مؤذن صاحب امام کے بالکل سامنے کھڑے ہوکر اذان دینی چاہئے؟ اور کیا یہ طریقہ بدعت ہے؟ یا دائیں بائیں ہٹ کر اذان دینی چاہئے؟

جواب:- خطبے کے وقت اذان امام اور منبر کے بالکل سامنے ہونی چاہئے، دائیں یا بائیں ہٹ کر نہیں، اور اذان کے اس طریقے کو بدعت قرار دینا درست نہیں، کما صرح بہ الفقہاء(۴) وتمام دلیلہ فی امداد الفتاویٰ۔(۵)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱۴/۲۹ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج ۲ ص ۱۵۹ (طبع سعید) وکل ما حرم فی الصلوۃ حرم فیھا ای فی الخطبۃ خلاصۃ وغیرھا فیحرم اکل وشرب وکلام ولو تسبیحا او رد سلام او امر بمعروف بل یجب علیہ ان یستمع ویسکت
وکذا فی امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۵۷، ۴۵۸ (طبع دار العلوم کراچی)

(۲) وفی صحیح البخاری ج [illegible] ص [illegible] (طبع قدیمی کتب خانہ) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اذا قلت لصاحبک یوم الجمعۃ انصت والامام یخطب فقد لغوت

(۳) سورۃ الأحزاب: ۵۶

(۴) وفی الدر المختار ج ۲ ص [illegible] ویؤذن ثانیا بین یدیہ ای الخطیب. وفی الشامیۃ تحتہ قولہ ویؤذن ثانیا بین یدیہ ای علی سبیل السنۃ کما یظھر من کلامھم، رملی الخ وکذا فی فتح القدیر ج ۲ ص ۳۱ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) وفتاوی دار العلوم دیوبند ج ۵ ص ۵۸

(۵) دیکھئے امداد الفتاویٰ ص ۴۷۳ تا ۴۸۱ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

جمعہ کے دن نماز سے قبل تقریر کرنے کا حکم

سوال:- جمعہ کے دن نماز سے قبل تقریر کرنی چاہئے یا بعد نماز؟ سنت طریقہ کون سا ہے؟ اور کیا خطبے سے پہلے وعظ کہنا بدعت ہے؟

جواب:- خطبے سے پہلے اور جمعہ کے بعد دونوں وقت وعظ کہنا جائز ہے، جس صورت میں مسلمانوں کا زیادہ فائدہ اور سہولت ہو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے، اور خطبے سے پہلے وعظ کہنے کو بدعت قرار دینا غلط ہے، ہاں اسے مباح ہے، خاص اس وقت کے وعظ کو مسنون یا واجب قرار دینے سے بدعت ہوجائے گا۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۱ھ

جمعہ کا خطبہ اور نماز الگ الگ اشخاص پڑھائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ہمارے محلّہ کی مسجد کے امام صاحب حافظ نہیں ہیں، تراویح ایک دوسرے حافظ صاحب پڑھاتے ہیں جو قاری بھی ہیں، آخری جمعۃ الوداع کو میں نے امام صاحب سے کہا کہ آپ خطبہ پڑھ دیں حافظ صاحب جمعہ پڑھا دیں گے، امام صاحب نے انکار کردیا اور کہا کہ خطبہ اور جمعہ ایک ہی شخص پڑھا سکتا ہے۔ اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب:- امام صاحب نے ٹھیک کہا، جمعہ کا خطبہ اور نماز ایک ہی شخص کو پڑھنا چاہئے، افضل طریقہ یہی ہے اور اس کے خلاف کرنا مناسب نہیں، تاہم کوئی عذر ہو، بغیر عذر کے ایسا کرنا خلافِ اَوْلیٰ ہے۔

لما فی الدر المختار: لا ینبغی ان یصلّی غیر الخطیب لأنهما کشئ واحد فان فعل بأن خطب صبی بإذن السلطان وصلّی بالغ جاز (شامی ص ۵۵۲)[2] ومثله فی امداد الفتاوی ج:۱ ص:۴۴۰۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۴۲۶۸/۲۰ د)

---

(۱) وکذا فی فتاوی دار العلوم دیوبند ج ۵ ص:۶۷ (سوال ۲۳۸۵) وامداد الأحکام ج:۱ ص:۷۷۲ نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۳۳۸ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

(۲) الدر المختار ج:۲ ص ۱۶۲ (طبع سعید)

(۳) امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۴۴۶ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔ نیز دیکھئے امداد الاحکام ج ۱ ص ۷۳۵ (طبع مکتبہ دار العلوم)۔

بستی میں جمعہ فرض نہ سمجھنے والے امام کے لئے کسی دُوسرے شخص سے نمازِ جمعہ پڑھوانا

سوال:- زید ایک مسجد کا خطیب ہے، بسبب عدمِ جوازِ جمعہ فی القریٰ نماز نہیں پڑھاتے، خود جمعہ کو تقریر کرتے ہیں اور بکر کو کہہ دیتے ہیں کہ تم نمازِ جمعہ پڑھا دو، زید نفل کی نیت باندھ کر بکر کے پیچھے نماز پڑھتا ہے جمعہ نہیں پڑھتا، کیا زید کا یہ رویہ از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر وہ موضع فی الواقع ایسا قریہ ہے جو شہر کی تعریف میں نہیں آتا تو زید کے لئے نہ خود جمعہ کی امامت جائز ہے اور نہ کسی دوسرے سے جمعہ کی نماز پڑھوانا درست ہے، شرعی حکم سب کے لئے ہوتا ہے۔[1]

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۲ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۶۵۷ الف)

قریۂ کبیرہ میں نمازِ جمعہ

سوال:- ہمارے گاؤں میں ڈاک خانہ اور یونین کونسل کا دفتر موجود ہے، اور ہمارا علاقہ میرٹھ سے چودہ میل دور ہے، سرکاری اعداد مردم شماری چار ہزار ہے، روزمرہ کی زندگی کے ساز و سامان بھی مل رہے ہیں۔۔۔ الخ۔ کیا جمعہ ایسی جگہ جائز ہے؟

جواب:- سوال میں بستی کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان کے پیشِ نظر اس بستی میں نمازِ جمعہ دُرست ہے۔[2]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۱۹/۳۰۲ الف)

قریۂ صغیرہ میں جمعہ کا حکم (فارسی)

سوال:- یک قریہ است کہ تقریباً ۷۰۰ ہفت صد نفوس مشتمل است قاضی ہم دارد و ضروری

---

(۱) وفی الدر المختار ج ۲ ص ۱۶۷: صلوٰۃ العید فی القریٰ تکرہ تحریماً أی لأنہ اشتغال بما لا یصح لأن المصر شرط الصحۃ. وفی الشامیۃ تحتہ قولہ صلوٰۃ العید ومثلہ الجمعۃ ح. وکذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۵ ص ۳۰۔

(۲) تفصیل اور دلائل کے لئے دیکھئے امداد الاحکام ج ۱ ص ۷۵۶ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

احکام شرع نکاح، طلاق، تقسیم میراث وغیرہ در فیصلہ کنند وضروریات زندگی مہیا می شوند تقریباً ۳ عدد دوکان دارد کہ قبل از دو سال پیشتر ہم نبود و یک مسجد دارد کہ پنج وقت نماز با جماعت گزاشتہ شود و دیگر یک مسجد در موضع نخلہا و باغات موجود است کہ بقاعدہ نماز با جماعت نمی شود اگر آمیان فرادی نماز میخوانند، نہ امام دارد نہ مؤذن، جامع مسجد ہم مؤذن ندارد و تقریباً از ۲۵ سال جمعہ وعیدین قائم کردند بغیر اذن سلطان اہل محلہ قبل از ۲۵ سال جمعہ نبود ۴ رکعت احتیاطی ہم میخوانند، و دیگر در اطراف دہ جانب قبلہ فاصلہ یک میل انگریزی یک قریہ واقع است مشتمل بر ۱۵۰ یک صد وپنجاہ نفوس و جانب مشرق فاصلہ دو میل یک قریہ مشتمل بر ۲۲۰ نفوس و یک قریہ در جانب شمال مشتمل بر ۴۰۰ چہار صد نفوس ہم موجود است درین صورت جمعہ وعیدین جائز است یا نہ؟

جواب:- احوال قریہ کہ در سوال مذکور شدہ اند، دلالت می کنند کہ وے بحکم مصر نیست و جمعہ دران جائز نیست زیرا کہ تعریف مصر یا قریہ بحکم مصر اینست، بلدة كبيرة فيها سكك واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم ...الخ[1] كما حققه فی امداد الفتاویٰ ج۱ ص ۳۸۸[2] ودر قریہ مسئول عنہا اسواق موجود نیستند وموجودگی سہ دوکانہا قریہ را عرفاً بحکم مصر نمی گرداند وباید دانست کہ در جمعہ عدد سکان مقرر نیست واصل اینست کہ اگر آن قریہ را در عرف شہر یا قصبہ می فہمیدند وبحکم مصر است ورنہ بحکم قریہ ونماز جمعہ دراں جائز نیست۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲۲.۵.۱۳۹۱ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۵۹۹/۱۹ الف)

خطبۂ جمعہ کے دوران ہاتھ میں عصا لینے کی شرعی حیثیت

سوال:- اگر کوئی امام خطبے میں عصا نہ لے اور خطبہ پڑھے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر عصا یا کمان ہاتھ میں لے کر خطبہ دیتے تھے، اس لئے اگر کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں ایسا کرے تو سنت ہے، لیکن یہ خطبے کی کوئی لازمی شرط نہیں ہے، عصا کے بغیر بھی خطبہ بلا کراہت دُرست ہے، اور اس کو خطبے کی لازمی شرط قرار دینا التزام مالا یلزم کی بنا پر بدعت ہے، بعض لوگ چونکہ اس کو خطبے کا لازمی جزء سمجھنے لگے تھے اس لئے بعض علماء نے اس کو ترک کرنے کا اہتمام کیا، بلکہ بعض نے اسے بدعت تک کہا ہے، لیکن حقیقت وہی ہے جو

---

(۱) رد المحتار باب الجمعة ج ۲ ص ۱۳۷ (طبع سعید)
(۲) دیکھئے امداد الفتاویٰ ج۱ ص ۳۱۵، ۳۱۶۔

اوپر عرض کی گئی کہ یہ عمل اصلاً سنت ہے، بشرطیکہ اسے واجب نہ سمجھا جائے، واجب سمجھ کر کرنا بدعت ہوجائے گا۔

قال في الدر المختار وفي الخلاصة ويكره أن يتكئ على قوس أو عصاء وقال الشامي استشكله في الحلية بأنه في رواية أبي داؤد أنه صلى الله عليه وسلم قام أي في الخطبة متوكئًا على عصاء أو قوس اهـ ونقل القهستاني عن عبدالمحيط ان اخذ العصاء سنة كالقيام (شامي ج:۱ ص:۵۵۳ باب الجمعة)۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۳۹/۲۷ و)

امروٹ شریف میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:- پاکستان کے دیہات میں اکثر علماء خواہ دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہوں یا بریلوی سے، قریۂ صغیرہ میں نمازِ جمعہ بلاجھجک پڑھتے ہیں، حالانکہ حنفی مسلک میں دیہات میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی، مندرجہ بالا حضرات یہ جواب دیتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک قریۂ صغیرہ میں نمازِ جمعہ جائز ہے اور ان کا مسلک قوی ہے۔

سندھ کے بڑے اکابر میں سے حضرت مولانا تاج محمود صاحب امروٹی، امروٹ شریف میں جمعہ کی نماز پڑھتے تھے جبکہ جمعہ کی اکثر شرائط پوری نہیں ہوتیں، ان کے جانشین کا بھی یہی عمل ہے، دوسرے حضرت مولانا حماد اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہالیجی شریف ہیں۔ اس لئے جو علماء حنفی مسلک پر کاربند ہیں وہ دیہات میں درس و تدریس اور خطابت بغیر جمعہ کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتے، عوام تو صرف یہ کہتے ہیں کہ یا تو اکابر کو یہ کہو کہ ناحق پر ہیں، اگر حق پر ہیں تو ان کی طرح نمازِ جمعہ تم بھی پڑھاؤ، یک سال سے تدریسی خدمات انجام دے رہا ہوں لیکن چونکہ ہمارا گاؤں ستر، اسّی (۷۰، ۸۰) گھروں پر مشتمل ہے، چھ سات دکانیں بھی ہیں، ڈاکٹری اور دیگر ضروریات کافی حد تک پوری ہوجاتی ہیں، شہر سے تقریباً سات آٹھ میل دور ہے، جس بستی میں رہائش پذیر ہوں وہ ہماری برادری کی بستی ہے، اس کے اردگرد اور بھی کئی بستیاں ہیں جو مختلف مقامات سے آکر یہاں آباد ہوئی ہیں۔

اور ہماری بستی کے بیچ میں کی زیرِنگرانی اکٹھے کئی ہزار ایکڑ زمین خریدی گئی تھی، اگر ایک جگہ گاؤں بناتے تھے تو بہت سے آدمی اپنی زمین سے بہت دور ہوجاتے تھے، اس لئے ہر ایک نے اپنی

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج ۲ ص ۱۶۳ (طبع سعید) نیز دیکھئے امداد الاحکام ج ۱ ص ۴۳۶، ۴۵۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

سہولت کے لئے اپنی اپنی زمینوں سے قریب گھر بنا لئے اور ان میں جو سرکردہ لوگ تھے ان کے نام سے وہ گاؤں مشہور ہوگیا، جبکہ پٹہ میں سب کا ایک ہی ہے۔ حنفی مسلک کی شرائط کیا ہیں؟ اور ان کا ماخذ قرآن وسنت سے کیا ہے؟ اور حنفی مسلک کی مالکی مسلک پر وجۂ ترجیح کیا ہے؟ ہماری اس بستی میں نمازِ جمعہ ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- عزیز محترم سلمہ اللہ تعالیٰ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا سوال غور سے پڑھا اور تمام حالات پر غور کیا، لیکن آپ نے اپنی بستی کا جو حال لکھا ہے اس کے پیشِ نظر اسے قصبہ، قریۂ کبیرہ یا شہر کہنا مشکل ہے، اور حنفیہ کی تمام کتابیں متون، شروح، فتاویٰ جمعہ کے لئے مصر یا قریۂ کبیرہ کی شرط کو ضروری قرار دیتی ہیں۔ مالکیہ اور شافعیہ کے یہاں بڑے گاؤں میں بھی جمعہ ہوجاتا ہے، لیکن کسی ایک مسئلے میں مالکیہ یا شافعیہ کے قول کو لینا اور باقی نماز حنفیہ کے طریقے پر پڑھنے میں "تلفیق" کا اندیشہ ہے، جو باجماعِ فقہاء باطل ہے، اور اس سے کسی کے نزدیک نماز صحیح نہیں ہوتی، لہٰذا مالکیہ یا شافعیہ کے مسلک پر عمل کرکے جمعہ ادا کرنے کی گنجائش درست نہیں، حنفیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ کے جواز کی صرف ایک صورت ہے، وہ یہ کہ امام المسلمین وہاں جمعہ پڑھنے کا حکم دیدے، یہ صورت بھی ہمارے ملک میں مفقود ہے۔

اور یہ جو احقر نے عرض کیا کہ آپ کی بستی میں قریۂ کبیرہ کی تعریف صادق نہیں آتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ قریۂ کبیرہ وہ چیز ہے جسے ہمارے عرف میں قصبہ کہتے ہیں، اس کی تعریف جامع ومانع فقہاء نے نہیں کی، بلکہ اس کا مدار عرف پر رکھا ہے کہ جس بستی کو عرفاً قصبہ کہا جاتا ہو اس میں جمعہ جائز ہے۔ اس کی علامات یہ ہیں کہ اس میں ایسا بازار ہو جس میں روزمرہ کی ضروریات مل جاتی ہوں، آبادی اتنی ہو کہ اسے قصبہ کہا جاسکے، یا جس میں سڑکیں وغیرہ ہوں اور حکومت کی طرف سے عدالت، تحصیل یا تھانہ وغیرہ ہو، آپ کی بستی میں کل ستر، اسّی (۸۰،۷۰) گھر ہیں جن کی آبادی بہت سے بہت آٹھ سو کے قریب ہوگی، دکانیں چھ سات ہیں، جسے بازار کہنا مشکل ہے، ڈاک خانہ، تحصیل وغیرہ نہیں ہے، اس لئے اس کو قصبہ نہیں کہہ سکتے، ہاں! اردگرد کی جن دوسری بستیوں کا تذکرہ آپ نے کیا ہے اگر وہ ملی ہوئی ہوں کہ دیکھنے والا ان سب کو ایک سمجھتا ہو اور ان کا مجموعی نام بھی ایک ہو تو اس کی مزید تفصیل لکھ کر سوال دوبارہ پوچھ لیجئے۔ فی الحال تو وہاں جوازِ جمعہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اوّل تو آپ لوگوں کو امداد الفتاویٰ، فتاویٰ دار العلوم وغیرہ فتاویٰ کی کتابیں نیز موجودہ مفتیوں کے فتاویٰ دکھا کر مسئلہ نرمی سے سمجھائیں، اگر اس طرح بات بن جائے تو اچھا، ورنہ اگر فتنے کا اندیشہ ہو تو اگر لوگ جمعہ پڑھتے ہوں تو خود مقتدی بن کر نماز بہ نیتِ نفل پڑھ لیجئے، پھر تنہا ظہر کی نماز ادا کرلیجئے۔ رہا

یہ مسئلہ کہ حنفیہ کے اس مسلک کے قرآن وسنت سے کیا دلائل ہیں؟ سو یہ ایک طویل الذیل موضوع ہے، اوّل تو یہ بات مجتہدین کے سوچنے کی ہے، ہم مقلدوں کے سوچنے کی نہیں۔ دوسرے اس پر مفصل رسائل حنفیہ نے لکھ دیئے ہیں، جن میں علامہ نیموی، حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہند رحمہم اللہ وغیرہ کے رسائل معروف ومشہور ہیں، حضرت شیخ الہند کا رسالہ ''اوثق العری فی تحقیق الجمعة فی القری'' سب سے زیادہ مفصل ہے۔

تیسری مختصر بات یہ ہے کہ بخاری اور ابوداؤد وغیرہ کی معروف حدیث کے مطابق مدینہ طیبہ کے بعد سب سے پہلا جمعہ ''جواثی'' نامی قلعے میں پڑھا گیا ہے، (۱) جو بحرین کی تجارتی منڈی تھی، حالانکہ بحرین کی فتح سے پہلے بیشمار دیہات مسلمان ہوچکے تھے، وہاں کہیں بھی جمعہ پڑھنا ثابت نہیں بلکہ جمعہ نہ پڑھنا ثابت ہے۔

نیز صحیح بخاری میں مروی ہے کہ عوالی بستیوں کے صحابہ کرامؓ باری باری جمعہ پڑھنے کے لئے مدینہ طیبہ آیا کرتے تھے، (۲) اگر وہیں جمعہ جائز ہوتا تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات میں جمعہ کے دن ظہر کی نماز پڑھائی ہے، جس پر تمام روایات متفق ہیں، یہ تمام دلائل اس قدر قوی ہیں کہ حنفیہ کے مسلک کو ضعف دلیل کی بنیاد پر چھوڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (۳)

جہاں تک امرت شریف اور [illegible] شریف کا تعلق ہے، مجھے وہاں کے حالات کا علم نہیں ہے کہ وہ کیسی بستیاں ہیں؟ بہتر ہوگا کہ آپ وہاں کے بزرگوں سے بھی اس مسئلے میں رجوع کرکے معلوم کرلیں کہ ان کے جمعہ پڑھنے کی وجہ کیا ہے؟

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۸۶ ج)

صحت جمعہ کے لئے شہر یا قریۂ کبیرہ ہونا ضروری ہے

سوال:- جمعہ کی نماز کے لئے احناف کے نزدیک شہر کا وجود ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- حنفیہ کے نزدیک جمعہ صرف شہر، قصبے یا ایسے بڑے گاؤں میں ہوسکتا ہے جہاں ضروریات زندگی عام ملتی ہوں، بازار ہوں، سڑکیں ہوں اور وہ اپنی خصوصیت کے لحاظ سے شہر کے

---

(۱) دیکھئے: بخاری ج ۱ ص ۱۲۲ (طبع قدیمی کتب خانہ) وابوداؤد ج ۱ ص ۱۲۰ (طبع مکتبہ حقانیہ ملتان)۔
(۲) ایضاً ص ۱۲۳۔
(۳) دلائل کی تفصیل کے لئے امداد الاحکام ج ۱ ص ۷۲۹، ۷۳۰ و ۷۳۹ ملاحظہ فرمائیں۔

ساتھ مشابہ ہو، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳/ ۱۳۹۸ھ
(فتویٰ نمبر ۴۶ ۲۹ الف)

گھر میں نمازِ جمعہ پڑھانے کا حکم

سوال:- ایک امام صاحب کسی مسجد میں عرصے سے خطیب تھے، مسجد کی انتظامیہ سے اختلاف کی بدولت الگ ہوگئے، اب انہوں نے مسجد کے مقابلے میں اپنے گھر میں جمعہ کی نماز پڑھانی شروع کردی ہے، جبکہ اس گاؤں میں بھی بہت سی مسجدیں ہیں، کیا ایسی صورت میں جمعہ گھر پر جائز ہے؟

جواب:- جس جگہ لوگوں کو جمعہ کے لئے آنے کی عام اجازت ہو وہاں جمعہ ادا تو ہوجاتا ہے، لیکن مسجد کو چھوڑ کر گھر میں جمعہ قائم کرنا مکروہ اور نہایت ناپسندیدہ اقدام ہے۔ اس سے مسجد کی فضیلت بھی حاصل نہیں ہوتی اور یہ مساجد میں تقلیلِ جماعت کا سبب بھی ہے، چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں بھی جمعہ کرنے کو علماء نے پسند نہیں کیا، گھروں میں تو بطریقِ اولیٰ ناپسندیدہ ہے۔

وفی الدر المختار فلو دخل امیر حصناً أو قصره وأغلق بابه وصلّی باصحابه لم تنعقد ولو فتحه وأذن للناس بالدخول جاز وکره وقال الشامیؒ لأنه لم یقض حق المسجد الجامع. (شامی)۔ (۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳/ ۶/ ۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۶۳/ ۲۸ ج)

کراچی سے اٹھائیس میل دُور قصبہ ''کاٹھور آباد'' میں جمعہ کا حکم

سوال:- کراچی سے ۲۸ میل پر ایک قصبہ بنام ''کاٹھور آباد'' ہے، جس میں میر کی طرح باغات ہیں اور ملحقہ قریہ جات کی بھی آبادی تقریباً چھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے، بازار اور دکانیں بھی ہیں، جس میں ضروریاتِ زندگی کی تمام اشیاء میسر ہیں، اسکول، ہسپتال، بینک، پوسٹ آفس اور بجلی اور ٹیلیفون کی لائن بھی ہے، بس سروس بھی جاری ہے، صرف تھانہ موجود نہیں ہے۔

تفصیلات قریہ جات اور دکانات حسبِ ذیل ہیں -

	نام قریہ	تعداد مکانات	تعداد دُکانات
۱:-	سراج احمد گوٹھ	ایک سو پچیس	۳

(۱) تفصیل کے لئے امداد الاحکام ج. ص ۷۲۶ تا ۷۳۰ اور ص ۷۳۹ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج ص ۱۵۲ (طبع سعید)

۲:-	کمال گوٹھ	۱۰ مکان	!
۳:-	ابراہیم گوٹھ	۵۰	×
۴:-	موریا گوٹھ	۵۰	!
۵:-	کھوسہ گوٹھ	۵۰	×
۶:-	سوفن گوٹھ	۵۰	!
۷:-	دین محمد گوٹھ	۲۰	
۸:-	دریاخان گوٹھ	۲۵	!
۹:-	ماچھی گوٹھ	۵۰	!
۱۰:-	کاچھیو گوٹھ	۲۰	
۱۱:-	میانداد گوٹھ	۵	×
۱۲:-	رند گوٹھ	۶	×
۱۳:-	علو گوٹھ	۱۵	×
۱۴:-	نواز علی گوٹھ	۲۰	×
۱۵:-	حسن لشکری گوٹھ	۲۰	×
۱۶:-	روزی گوٹھ	۲۰	×
۱۷:-	مراد گوٹھ	۲۰	×
۱۸:-	نیک محمد گوٹھ	۱۰	×
۱۹:-	فقیر گوٹھ	۱۵	×
۲۰:-	ہاشم گوٹھ	۱۰	×
۲۱:-	گبول گوٹھ	۱۰	×

دُکانوں میں راشن ہے اور حجام کی دُکان، لوہار کی دُکان اور ہوٹلیں بھی ہیں، جن کی تعداد تقریباً ۲۵ ہوتی ہے، ہسپتال تین ہیں، دو اسکول ہے اچھے، کیا مذکورہ قصبے میں نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ جواب اثبات میں ہو یا نفی میں، دونوں صورتوں میں حوالہ کتب ضرور دیا جائے۔

۱ - کالونی پچیس دُکانیں، مکانات کچھ نہیں۔ ۲ - سراج احمد گوٹھ اور پہلوان گوٹھ چار فرلانگ درمیانی فاصلہ۔

(جواب از حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ)

جواب:- سوال میں کاٹھور کے جن دیہات کا ذکر ہے، ان کی صحیح صورتِ حال سمجھنے کے لئے ہم نے ان مقامات کا مفصّل معائنہ کیا، اس معائنے کے نتیجے میں جو بات سامنے آئی وہ یہ ہے کہ کاٹھور کسی ایک قصبے یا بستی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ چھوٹی چھوٹی مختلف بستیوں پر مشتمل ایک قصبہ ہے، اور سوال میں قصبے کے نام سے اس کے جو اوصاف ذکر کئے گئے، وہ کسی ایک بستی کے اوصاف نہیں ہیں، بلکہ پورے علاقے کاٹھور کے مجموعے کے اوصاف ہیں، اور صورتِ حال یہ ہے کہ:-

مختلف لوگوں نے اپنی اپنی سہولت کے مطابق چھوٹی چھوٹی بہت سی بستیاں آباد کر رکھی ہیں جو الگ الگ گوٹھوں کے نام سے موسوم ہیں، اور ہر گوٹھ سے دوسرے گوٹھ تک آبادی متصل نہیں ہے بلکہ دونوں کے درمیان کہیں کھیتوں کا، کہیں جنگلوں کا فاصلہ ہے۔ چند گوٹھ ایسے بھی ہیں جن کے ایک سرے پر کھڑے ہوکر دوسرے گوٹھ کا منظر آتا ہے، لیکن بیشتر ایسے ہیں کہ ایک گوٹھ سے دوسرا گوٹھ نظر نہیں آتا، اور بیچ میں دو میل سے لے کر ایک فرلانگ تک کے فاصلے پائے جاتے ہیں جو زرعی زمینوں یا جنگلوں پر مشتمل ہیں۔

۲- ان گوٹھوں میں سے کوئی گوٹھ بھی ایسا نہیں ہے جس پر مصر یا قریۂ کبیرہ کا اطلاق درست ہو یا جس میں اس کی علامت پائی جائے، عام طور سے آبادیاں، جھونپڑیوں یا کچے مکانات پر مشتمل ہیں، کچھ مکانات پکے بھی ہیں۔ ان گوٹھوں میں سب سے بڑا گوٹھ "مرزا محمد گوٹھ" ہے، جو تقریباً سوا سو مکانات پر مشتمل ہے، لیکن اس میں بھی گلی، کوچے، بازار وغیرہ نہیں ہیں، البتہ تین متفرق دُکانیں اور دو ہوٹل ہیں، اور نہ مصریت کی کوئی علامت پائی جاتی ہے، جب سب سے بڑے گوٹھ کی حالت یہ ہے تو دُوسرے چھوٹے گوٹھوں کا معاملہ اور زیادہ واضح ہے۔

۳- البتہ ان تمام گوٹھوں کے تقریباً وسط میں ایک بازار واقع ہے، جو کسی بھی گوٹھ کا جزو نہیں ہے، بلکہ ایک مستقل علاقہ ہے، اسی کو "کاٹھور کا کوئی بازار" کہتے ہیں، اس میں سڑک وسوق موجود ہیں اور ضروریاتِ زندگی ملتی ہیں، اس میں بینک، مڈل کے اسکول، ہسپتال، ڈاک خانہ وغیرہ ہے، لیکن یہاں رہائشی مکان صرف ایک ہے، مختلف گوٹھوں کے لوگ بھی یہاں دن میں دُکان داری کرتے ہیں اور رات کو اپنے اپنے گوٹھ میں چلے جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا تحقیقات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ تمام بستیاں مستقل الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں، اور ان میں سے کسی میں بھی جمعے کے جواز کی شرائط موجود نہیں ہیں، اور ان کے مجموعے کا نام کاٹھور ہونے سے اس مجموعے کا مصر یا قریۂ کبیرہ ہونا لازم نہیں آتا

کیونکہ ان بستیوں کے درمیان انفصال کافی ہے، اور جس طرح متعدد بستیوں کے مجموعے پر ضلع کے نام کا اطلاق کیا جاتا ہے، اسی طرح ان بستیوں کے مجموعے کو کاٹھور کہتے ہیں۔

لہٰذا مذکورہ بستیوں میں سے کسی بستی میں بشمول ''سراج احمد گوٹھ'' جمعہ جائز نہیں، البتہ کاٹھور بازار میں جمعہ کا مسئلہ زیر غور ہے، اور چونکہ وہ خالص بازار ہے، رہائشی بستی نہیں ہے، اس لئے اس کی مصریت بھی محل نظر ہے، البتہ اگر علاقے کے حاکم یا ڈپٹی کمشنر سے جمعہ قائم کرنے کی اجازت لے لی جائے تو پھر سراج گوٹھ اور کاٹھور کالونی بازار میں جمعہ پڑھنا درست ہو جائے گا، اور جن بستیوں میں چالیس یا اس سے زائد مکان ہیں ان میں بھی جمعہ جائز ہوگا، لأن هذا مجتهد فيه۔

لما في رد المحتار: وإذا اتصل به الحكم صار مجمعًا عليه (شامی ج ص ۵۴۰)۔[1]

رشید احمد
دارالافتاء اشرف المدارس
ناظم آباد کراچی
۱۳۹۹/۱/۸ھ

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

ويشترط لصحتها سبعة أشياء الأول المصر ... وظاهر المذهب أنه كل موضع له أمير وقاض يقدر على اقامة الحدود (الدر المختار مع الشامي ج ص ۵۳۶)۔[2]

وفي رد المحتار عن أبي حنيفة أنه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الأصح. (شامي ج ۱ ص ۵۳۶)۔[3]

وفي البحر الرائق فقال المصر في ظاهر الرواية أن يكون فيه مفت وقاض يقيم الحدود وينفذ الأحكام وبلغت أبنيته أبنية منى (البحر الرائق ج ۲ ص ۵)۔[4]

مندرجہ بالا حوالوں کی روشنی میں مذکورہ بالا جواب درست ہے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	ولی حسن	۱۳۹۹/۱/۱۱ھ
۱۳۹۹/۱/۱۱ھ	جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی	(فتویٰ نمبر ۳۰/۹۴ الف)

---

(۱) ج:۲ ص:۱۳۸ (طبع سعید)

(۲، ۳) الدر المختار مع رد المحتار باب الجمعة ج ۲ ص:۱۳۷، ۱۳۸

(۴) البحر الرائق باب صلوة الجمعة ج ۲ ص:۱۴۰ (طبع سعید)

کیا صحراء میں جمعہ فرض ہے؟

سوال:- محترم المقام حضرت مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

باعث تحریر یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں ایک شخص ہے، اس کا مسئلہ جمعہ میں مندرجہ ذیل نظریہ ہے:-

۱:- نمازِ جمعہ ہر جگہ حتیٰ کہ صحراء میں بھی فرض ہے۔

۲:- بغیر جماعت کے اکیلے بھی اس کو پڑھنا جائز ہے۔

۳ - ائمہ اربعہ کی شروط قرآن کے خلاف ہیں، کیونکہ قرآن میں جمعہ مطلق اور عام ہے، اس کا کوئی مقید اور مخصص موجود نہیں ہے۔

۴ - جو علماء نمازِ جمعہ کو چھوٹے گاؤں اور صحراؤں میں منع کرتے ہیں وہ خطاکار اور مکروہ وحرام کے مرتکب ہیں۔

۵ - یہ شخص لوگوں کو ایسے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں جمعہ جاری کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے جہاں چاروں مذہب میں جمعہ ناجائز ہے، چنانچہ بعض جگہوں میں جاری ہو بھی گیا ہے۔

الغرض الف:- از روئے شرع محمدی اس شخص کا کیا حکم ہے؟

ب:- مسئلہ جمعہ میں صحیح مسلکِ حنفی کیا ہے؟

ج:- علاقے کے علماء کو شخص مذکور کے گاؤں کے جمعوں کے متعلق کیا موقف اختیار کرنا چاہئے؟

جواب:- الف - مذکورہ شخص کا نظریہ ائمہ اربعہ کے خلاف ہے، چاروں ائمہ میں سے کسی کا بھی وہ مسلک نہیں ہے جو وہ بیان کرتا ہے، بالخصوص ائمہ اربعہ اور ان کے مقلدین کو اس بارے میں مکروہ یا حرام کا مرتکب بتانا سخت گمراہی کی بات ہے، اس کی بات قابلِ شنوائی نہیں۔

ب - حنفی مسلک میں جمعہ صرف اس بستی میں جائز ہے جسے عرفاً شہر یا قصبہ سمجھا جاتا ہو یا بہت بڑا گاؤں یا قصبہ ہو جس میں گلی کوچے اور بازار وغیرہ ہوں اور ضروریاتِ زندگی عام طور پر ملتی ہوں، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔ (۱)

---

(۱) وفی الشامیۃ ج ۲ ص ۱۳۷: ویشترط لصحتها سبعة أشياء: الأول: المصر ... وظاهر المذهب أنه كل موضع له أمير وقاض يقدر على إقامة الحدود. وفي الشامية عن أبي حنيفة أنه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها والٍ يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غيره يرجع الناس إليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الأصح. الخ وكذا في البحر الرائق ج ۲ ص ۱۵۱. نیز دیکھئے امداد الاحکام ج ۱ ص ۵۲۔

لوگوں کو حنفی مسلک پر عمل کرنا چاہئے، اور مذکورہ شخص کی بات پر عمل کرنا ہرگز جائز نہیں۔

واللہ اعلم

۲۲/۹/۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۸۰/۳۱ د)

ایک قصبے میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:- قصبہ شاریاں جس کو اپنے قرب و جوار میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، تجارتی مرکز جرنیلی سڑک پر واقع ہے، یونین کونسل کا سینٹر بھی ہے، جس میں ماہوار ایک دو اجلاس ہوتے ہیں، ایک مڈل اسکول، ایک ڈسپنسری، گرلز پرائمری اسکول، ڈاک خانہ وغیرہ ہونے کی وجہ سے اچھی خاصی شہرت اور رونق ہے۔ عرصہ دراز سے یہاں جمعہ ہوتا ہے، اب کچھ لوگ منع کرتے ہیں کہ یہاں جمعہ نہیں ہوتا، نمازِ جمعہ میں اچھی خاصی تعداد لوگوں کی جمع ہو جاتی ہے، اگر لوگوں کو منع نہ کیا جائے تو اچھی خاصی تعداد میں لوگ جمع ہو جائیں۔ اس میں جمعہ درست ہے یا نہیں؟

جواب:- جو حالات سوال میں بیان کئے گئے ہیں اگر وہ درست ہیں تو اس قصبے میں نمازِ جمعہ درست ہے،[1] ڈاک خانہ، تجارتی مرکز اور پھر یونین کونسل کا دفتر ہونا اسے قریہ کی تعریف سے نکال کر مصر کی تعریف میں داخل کرنے کے لئے کافی ہے جو لوگ منع کرتے ہیں ان کی وجہ معلوم ہوتی تو اس پر کچھ کہا جاتا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۳/۱/۱۳۸۸ھ

جیلوں، چھاؤنیوں اور ایئرپورٹ پر نمازِ جمعہ

(اہم وضاحت از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

(میں نے اپنے یمن کے سفرنامے میں جو "البلاغ" کے ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ شمارے میں شائع ہوا ہے، برسبیل تذکرہ دبئی ایئرپورٹ پر نمازِ جمعہ ادا کرنے کا ذکر کیا تھا، اور ساتھ ہی یہ لکھا تھا کہ "اذنِ عام" کی جو شرط فقہائے کرام نے صحتِ جمعہ کے لئے ضروری قرار دی ہے، اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس بڑے علاقے میں نماز ادا کی جا رہی ہے وہاں کے لوگوں کو جمعہ میں شرکت کی عام اجازت ہو، خواہ اس بڑے علاقے میں باہر کے لوگوں کو انتظامی یا دفاعی اسباب کی بناء پر داخلے کی عام اجازت نہ ہو۔

اس سفرنامے کے شائع ہونے کے بعد بعض حضرات نے مجھے خط میں لکھا کہ اس مسئلے کی تفصیلی وضاحت شائع ہونی چاہئے، میں نے کئی سال پہلے ایک فتویٰ اس موضوع پر لکھا تھا جو ابھی تک شائع نہیں ہوا، اس موقع پر مناسب معلوم ہوا کہ اسے شائع کر دیا جائے کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ، چنانچہ ذیل میں وہ فتویٰ

(۱) دیکھئے ص:۵۲۲ کا حاشیہ۔

شامل کیا جا رہا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اس فتوے کا اطلاق صرف ایسے ایئرپورٹ پر ہوتا ہے جو شہر کے اندر واقع ہو اور اتنا بڑا ایئرپورٹ ہو جس میں لوگوں کی ایک بڑی جماعت ہر وقت موجود رہتی ہو، دبئی کا ایئرپورٹ ایسا ہی ہے۔)

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں کہ جیل خانوں میں قیدی نماز جمعہ ادا کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اس مسئلے میں متعدد باتیں سامنے آئی ہیں، اس لئے مسئلے کی تحقیقی وضاحت مطلوب ہے، بینوا توجروا۔

جواب:- جیل میں جمعے کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں فقہائے متقدمین کی کتابوں میں کوئی صریح جزئیہ مذکور نہیں، اسی بناء پر اس مسئلے میں علمائے عصر کے فتوے بھی مختلف رہے، اصل اشکال کی وجہ یہ ہے کہ فقہائے حنفیہ نے جمعے کے جواز کی شرائط میں اذنِ عام کو بھی ذکر فرمایا ہے، اور چونکہ جیل میں داخلے کا اذنِ عام نہیں ہوتا، اس لئے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جمعہ جائز نہیں، ہمارے زمانے میں یہ مسئلہ صرف جیل کا نہیں، بلکہ ان تمام فوجی چھاؤنیوں، صنعتی آبادیوں اور ایئرپورٹوں کا بھی ہے جہاں عام لوگوں کو داخلے کی اجازت نہیں ہوتی، اس لئے یہ تحقیق ضروری ہے کہ ''اذنِ عام'' کی شرط کس درجے کی ہے؟ اور اس کا مفہوم کیا ہے؟

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ ''اذنِ عام'' کی شرط اس وقت تھی جب پورے شہر میں جمعہ ایک ہی جگہ ہوتا تھا، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ کسی کا جمعہ فوت نہ ہو، لیکن جب ایک شہر میں کئی جگہ جمعہ پڑھنے کا جواز ثابت ہو گیا اور متعدد جگہوں پر جمعہ ہونے لگا تو اب چونکہ اس بات کا اندیشہ نہیں رہا کہ ''اذنِ عام'' کی عدم موجودگی کی وجہ سے کسی کا جمعہ فوت ہو جائے گا، اس لئے اب یہ شرط باقی نہیں رہی، یہ حضرات دلیل میں علامہ شامی کی مندرجہ ذیل عبارت پیش کرتے ہیں:

وكذا السلطان إذا أراد أن يصلي بحشمه في داره فإن فتح بابها وأذن للناس إذناً عاماً جازت صلاته شهدتها العامة أولا وإن لم يفتح أبواب الدار وأغلق الأبواب وأجلس البوابين ليمنعوا عن الدخول لم تجز لأن اشتراط السلطان للتحرز عن تفويتها على الناس وذا لا يحصل إلا بالإذن العام. قلت: وينبغي أن يكون محل النزاع ما إذا كانت لا تقام إلا في محل واحد، أما لو تعددت فلا، لأنه لا يتحقق التفويت كما أفاده التعليل. تأمل

(شامی ج ۲ ص ۱۵۲ طبع سعید)

لیکن اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اگر ''اذنِ عام'' کی شرط کی وجہ صرف تفویتِ جمعہ کا خوف ہو تو جس شہر میں متعدد مقامات پر جمعہ ہوتا ہو وہاں اگر کوئی شخص اپنے ذاتی گھر میں دروازہ بند

کرکے جمعہ کی جماعت کرے تو وہ بھی جائز ہونا چاہئے، اور یہ کہ جب سے تعدد جمعہ کا رواج ہوا ہے اس وقت سے "اذن عام" کی شرط کو کتب فقہ سے بالکل خارج ہو جانا چاہئے تھا، یا اگر یہ شرط مذکور ہوتی تو ساتھ یہ تصریح بھی ذکر کرنی چاہئے تھی کہ اب یہ شرط واجب العمل نہیں، حالانکہ فقہاء تعدد جمعہ کے رواج کے باوجود اس شرط کو ذکر کرتے چلے آرہے ہیں، یہ اشکال خاصا قوی ہے لیکن کتب فقہ کی مراجعت کے بعد جو صورتِ حال نظر آتی ہے، وہ مندرجہ ذیل ہے:-

۱- اذن عام کی شرط ظاہر الروایۃ میں موجود نہیں، چنانچہ علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں -

وذكر في النوادر شرطا آخر لم يذكره في ظاهر الرواية وهو اداء الجمعة بطريق الاشتهار حتى ان أميرًا لو جمع جيشه في الحصن و غلق الأبواب وصلّى بهم الجمعة لا تجزئهم (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۶۹ طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

چنانچہ صاحبِ ہدایہ نے بھی اذنِ عام کو "شرط" کے طور پر ذکر نہیں فرمایا، اسی طرح متعدد فقہاء نے اس شرط کو ذکر نہیں کیا، جن میں شمس الائمہ سرخسی کے استاذ علامہ سغدی بھی داخل ہیں، (ملاحظہ ہو: النتف فی الفتاویٰ ج ۱ ص ۹۰ مطبعۃ الارشاد بغداد)۔

۲- نوادر کی اس روایت کے مطابق فقہائے متاخرین نے یہ شرط اپنی کتابوں میں ذکر فرمائی ہے، لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ اذن عام کے مفہوم میں فقہائے کرام کا کچھ اختلاف رہا ہے، بعض حضرات نے تو اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ہر وہ شخص جس پر جمعہ فرض ہوا سے اس مقام پر آنے کی اجازت ضروری ہے، چنانچہ علامہ شامی برجندی وغیرہ سے نقل کرتے ہیں: ای أن یأذن للناس اذنًا عامًا بأن لا يمنع أحدا ممن تصح منه الجمعة عن دخول الموضع الذي تصلّى فيه وهذا مراد من فسر الاذن العام بالاشتهار۔ (شامی ج ۲ ص ۱۵۱ طبع سعید)

دوسری طرف بعض حضرات فقہاء کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "اذن عام" کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جس آبادی میں جمعہ پڑھا جارہا ہے اس آبادی کے لوگوں کو وہاں آنے کی پوری اجازت ہو، خواہ باہر کے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ ہو، چنانچہ علامہ بحر العلوم تحریر فرماتے ہیں -

وفي فتح القدير ان اغلق باب المدينة لم تجز وفيه نظر فانه لا ينفي الاذن العام لمن في البلد وأما من في خارج البلد فالظاهر انهم لا يجيئون لاقامة الجمعة بل ربما يجيئون للشر والفساد. (رسائل الارکان ص ۱۱۵ طبع قدیم مطبع یوسفی فرنگی محل لکھنؤ)

نیز درمختار میں کہا گیا ہے کہ:-

فلا يضر غلق باب القلعة لعدو او لعادة قديمة لأن الاذن العام مقرر لأهله وغلقه لمنع

العدو لا المصلّی نعم لو لم یغلق لکان أحسن کما فی مجمع الأنهر

(الدر المختار ج:۲ ص:۱۵۲ طبع سعید)

مجمع الانہر میں ہے:-

وما یقع فی بعض القلاع من غلق أبوابه خوفا من الأعداء أو کانت له عادة قدیمة عند حضور الوقت فلا بأس به لأن الاذن العام مقرر لأهله ولکن لو لم یکن لکان أحسن کما فی شرح عیون المذهب وفی البحر والمنح خلافه لکن ما قررناه أولی لأن الاذن العام یحصل بفتح باب الجامع وعدم المنع ولا مدخل فی غلق باب القلعة وفتحه ولأن غلق بابها لمنع العدو لا لمنع غیره تدبر. (مجمع الانہر ج:۱ ص ۲۳۶ طبع بیروت)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات فقہائے کرام نے ''اذن عام'' کی شرط کو تفویت جمعہ کے خوف پر مبنی قرار دیا ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ ''اذن عام'' کا پہلا عام مفہوم جس علت کے ساتھ معلول تھا جو تعدد جمعہ کی صورت میں باقی نہیں رہا، لیکن دوسرا مفہوم اب بھی کافی ہے کیونکہ وہ اس علت پر مبنی نہیں تھا، بلکہ بقول صاحب بدائع ''اذا نودی للصلوة من یوم الجمعة الخ'' کے اشارۃ النص پر مبنی تھا، چنانچہ علامہ شرنبلالیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

قلت أطلعت علی رسالة للعلامة ابن الشحنة وقد قال فیها بعدم صحة الجمعة فی قلعة القاهرة لأنها تقفل وقت صلاة الجمعة ولیست مصرا علی حدتها وأقول فی المنع نظر ظاهر لأن وجه القول بعدم صحة صلاة الامام بقلعة قصره اختصاصه بها دون العامة والعلة مفقودة فی هذه القضیة فان القلعة وان قفلت لم یختص الحاکم فیها بالجمعة لأن عند باب القلعة عدة جوامع فی کل منها خطبة لا یفوت من منع من دخول القلعة الجمعة بل لو بقیت القلعة مفتوحة لا یرغب فی طلوعها للجمعة لوجودها فیما هو اسهل من التکلف بالصعود لها وفی کل محلة من المصر عدة من الخطب فلا وجه لمنع صحة الجمعة بالقلعة عند قفلها

(مراقی الفلاح مع الطحطاوی ص:۲۷۸ قدیمی کتب خانہ)

اگرچہ علامہ طحطاویؒ نے اس کے تحت علامہ شرنبلالیؒ کی اس بات پر اعتراض فرمایا ہے، لیکن علامہ شرنبلالی کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعدد جمعہ کی صورت میں ''اذن عام'' کا وہ عام مفہوم باقی کی ضرورت نہیں جس کے تحت ہر وہ شخص جس پر جمعہ واجب ہو اس کو وہاں آنے کی اجازت ہو، بلکہ اگر کوئی ایسی آبادی موجود ہو جس میں شہر کے رہنے والوں کی قابلِ لحاظ تعداد موجود ہو اور اس آبادی کے تمام لوگوں کو وہاں جمعہ کے لئے آنے کی اجازت ہو تو یہ بات ''اذن عام'' کے تحقق کے لئے کافی

ہے، بشرطیکہ اس آبادی کے باہر کے لوگوں کو آنے سے ممانعت کرنے کی وجہ نماز سے روکنا نہ ہو، بلکہ کسی دفاعی یا انتظامی وجہ سے مجرد داخلے سے روکنا ہو۔

اگر علامہ شرنبلالیؒ کی مذکورہ بالا عبارت کا یہ مفہوم لیا جائے تو اس پر وہ اعتراض وارد نہیں ہوگا جو علامہ طحطاویؒ نے وارد فرمایا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تعددِ جمعہ کی صورت میں ''اذنِ عام'' کی شرط فقہائے حنفیہ کے نزدیک بالکلیہ ختم تو نہیں ہوئی بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس آبادی میں (نہ کہ کسی انفرادی گھر میں) جمعہ پڑھا جارہا ہے اس آبادی کے لوگوں کو وہاں آنے کی اجازت ہو، اگر آبادی سے باہر کے لوگوں کو دفاعی یا انتظامی مصالح کے پیشِ نظر اس آبادی میں داخلے سے روکا گیا ہو تو یہ ''اذنِ عام'' کے منافی نہیں، بشرطیکہ روکنے کا اصل محرک نماز سے روکنا نہ ہو بلکہ کوئی دفاعی یا انتظامی ضرورت ہو اور اس آبادی سے باہر کے لوگ اس پابندی کی بنا پر جمعہ سے محروم نہ ہوتے ہوں۔

اس پر صرف یہ اشکال باقی رہتا ہے وہ یہ کہ فقہائے کرام نے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ مسجونین کے لئے جمعہ کے دن اپنی علیحدہ ظہر کی جماعت کرنا مکروہ ہے (ملاحظہ ہو فتح القدیر ج ۲ ص ۳۵ طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجونین کے لئے جمعہ جائز نہیں، ورنہ ان کو ظہر کی جماعت کی حاجت ہی نہ ہوتی۔

لیکن اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ علامہ شامی اور علامہ شرنبلالی رحمہما اللہ کی عبارتوں کی روشنی میں یہ حکم اس دور کا ہے جب جمعہ ایک ہی جگہ سلطان کی قیادت میں ہوتا تھا اور سلطان کی طرف سے دوسری جگہ اقامتِ جمعہ کی اجازت نہیں ہوتی تھی، اس کے علاوہ قید خانے بھی مختلف نوعیتوں کے ہوتے تھے، ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ قید خانہ ہو جو کسی ایک کمرہ یا ایک ہی احاطے پر مشتمل ہو اور اس پر کسی مستقل آبادی کا اطلاق نہ ہوسکتا ہو۔ ایک اور اشکال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''بدائع'' میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ:-

السلطان اذا صلّى في قهندزه والقوم مع امراء السلطان في المسجد الجامع قال ان فتح باب داره وأذن للعامة بالدخول في قهندزه جاز وتكون الصلوة في موضعين ولو لم يأذن للعامة وصلّى مع جيشه لا تجوز صلوة السلطان وتجوز صلوة العامة

(بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۶۹ طبع رشیدیہ کوئٹہ)

یہ مسئلہ تعددِ جمعہ کی صورت میں مفروض ہے، اس کے باوجود سلطان کے ''اذنِ عام'' نہ دینے کی صورت میں نمازِ جمعہ کو غیر منعقد قرار دیا گیا ہے۔

لیکن بظاہر اس صورت سے مراد یہ ہے کہ سلطان اپنے محل میں صرف اپنے نوکروں اور سپاہیوں کے ساتھ نماز پڑھ لے، اور باقی لوگوں کو وہاں آنے کی اجازت نہ ہو، چنانچہ مذکورہ عبارت میں "ان فتح باب داره ۔۔۔ الخ" کا لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ بلکہ یہاں ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ سلطان کا محل اس کی اپنی انفرادی جگہ ہے، اور پیچھے گزر چکا ہے کہ انفرادی مقامات پر اس وقت تک جمعہ جائز نہیں ہوتا جب تک اسے عام لوگوں کے لئے کھول نہ دیا گیا ہو، لیکن اگر کوئی ایسی آبادی ہے جس میں معتد بہ لوگ رہتے ہیں تو اس کو اس جزئیہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:-

۱- اگر کسی شہر میں جمعہ کی اجازت حاکم کی طرف سے صرف ایک جگہ پڑھنے کی ہو تو جمعہ کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ ہر وہ شخص جس پر جمعہ ہے اس کو وہاں آکر جمعہ پڑھنے کی عام اجازت ہو، ایسی عام اجازت کے بغیر جمعہ صحیح نہیں ہوگا۔

۲:- اسی طرح اگر کسی کا کوئی انفرادی گھر، محل یا دُکان ہو تو اس میں بھی جمعہ پڑھنا اس وقت تک جائز نہ ہوگا جب تک اس گھر، محل یا دکان میں عام لوگوں کو آنے کی اجازت نہ دے دی گئی ہو، خواہ شہر میں دُوسری جگہ بھی جمعہ ہوتا ہو۔

۳:- اگر کوئی آبادی ایسی ہے جس میں معتد بہ لوگ رہتے ہیں اور وہ شہر کے اندر بھی ہے لیکن دفاعی، انتظامی یا حفاظتی وجوہ سے اس آبادی میں ہر شخص کو آنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ وہاں کا داخلہ ان وجوہ کی بنا پر کچھ خاص قواعد کا پابند ہے تو اس آبادی کے کسی حصے میں ایسی جگہ جمعہ پڑھنا جائز ہے جہاں اس آبادی کے افراد کو آکر جمعہ پڑھنے کی اجازت ہو، مثلاً بڑی جیلیں، فوجی چھاؤنی، بڑی فیکٹریاں، ایسے بڑے ایئرپورٹ جو شہر کے اندر ہوں اور ان میں سینکڑوں لوگ ہر وقت موجود رہتے ہیں، لیکن ان میں داخلے کی اجازت مخصوص قواعد کی پابند ہے، تو ان تمام جگہوں پر جمعہ جائز ہوگا بشرطیکہ وہ شہر میں داخل ہوں اور اس جیل، چھاؤنی، بڑی فیکٹری، ایئرپورٹ یا ریلوے اسٹیشن کے تمام افراد کو نماز کی جگہ آکر نمازِ جمعہ پڑھنے کی کھلی اجازت ہو۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۲/۵/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷/۲۹۴ ھ)

ائمۂ حرمین کی اقتداء میں کھلے میدانوں میں پڑھی جانے والی جمعہ کی نمازوں کا حکم

سوال:- مسجد نبوی کے امام کے پیچھے پاکستان میں کئی لوگوں نے جمعۃ المبارک کی نماز پڑھی ہے، ان کی نماز ہوئی یا نہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔

جواب:- حرمین شریفین کے اماموں کے پیچھے کھلے میدانوں میں جمعہ کی جو نمازیں پڑھی گئیں وہ بلاشبہ ہوگئیں، جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ان کے پیچھے نمازیں نہیں ہوئیں، وہ بالکل غلط کہتے ہیں، اللہ انہیں ہدایت دے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۲۳/۲۷ د)

خطبۂ جمعہ میں کسی بزرگ کا مقولہ شامل کرنا

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ سکھر شہر کے ایک بزرگ کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، ان کے انتقال کے بعد ان کی مسجد کے امام صاحب نے خطبۂ جمعہ میں یہ طرز اختیار کیا ہے کہ پہلے خطبے میں تحمید، تسبیح اور چند احادیث پڑھنے کے بعد ان بزرگ کے چند ملفوظات عربی میں ترجمہ کرکے "قال شفیق الأمة" کے عنوان سے پڑھتے ہیں، اس میں خلجان یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہمارے اکابرؒ کا انتقال ہوا ہے، مگر کوئی صورت، مذکورہ صورت حال کی طرح منظور ومسموع نہیں ہوئی۔ شاید جواز کی کوئی صورت نکل آئے، لیکن فی نفسہٖ مذکورہ طرزِ عمل پر قلب مضطرب ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ فعل آئندہ چل کر غلو فی الدین کا ذریعہ نہ بن جائے اور کہیں یہ طریقہ سلف سے ہٹ کر کسی بدعت کا ذریعہ نہ بن جائے، اس لئے برائے کرم اس کی قابلِ اطمینان حیثیت مدلل طور پر متعین فرماکر ممنون فرمائیں، نیز یہ بھی وضاحت فرمادیں کہ یہ طرزِ عمل لائقِ اتباع وعمل ہے یا نہیں؟

جواب:- اگرچہ خطبۂ جمعہ میں کسی بزرگ کا کوئی مفید مقولہ بیان کرنا شرعاً جائز ہے، لیکن ہر خطبے میں کسی ایک ہی شخص کے ملفوظات بیان کرنے کا التزام کرنے سے یقیناً غلو کا اندیشہ ہے، ہذا اسے حکمت اور نرمی سے روکنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۱/۴/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۶/۴۲۸)

پنج وقتہ نماز کے لئے بنائی گئی جگہ میں جمعہ کا حکم

سوال:- جن مقتدیوں کی نماز میت، امام نہیں پڑھتا، ان لوگوں نے ایک الگ جگہ بنائی ہے جس میں پانچ وقتی نماز پڑھتے ہیں اور جمعہ دوسری جگہ جاکر پڑھتے ہیں، کیا اس مسجد میں نماز جمعہ ان کے لئے جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- ہر وہ مسجد جہاں جمعہ کی نماز شرعی شرائط کے مطابق ہوتی ہو، وہاں جمعہ کی نماز پڑھی جاسکتی ہے، لہٰذا ان حضرات کا دوسری مسجد میں جمعہ پڑھنا درست ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۸۸/۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۰/۱۹ الف)

ترکِ سعی کے گناہ سے بچنے کے لئے
اذانِ اوّل کو تقریر سے مؤخر کرنے کا حکم

(سب سے پہلے اس موضوع سے متعلق حافظ سعید احمد صاحب کے ایک سوال کے جواب میں دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے درج ذیل فتویٰ جاری کیا گیا۔)

جمعہ کی اذانِ اوّل کے متعلق ایک استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ:-

۱- جمعہ کے دن اذانِ اوّل کے بعد فقہائے کرام کے نزدیک "سعی الی الجمعۃ" واجب ہے، جس کا مطلب سب کے نزدیک یہ ہے کہ نمازی مسجد کی طرف چل پڑے اور مسجد کی طرف چلنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہئے، الّا یہ کہ جمعہ کی تیاری میں مشغول ہو، یعنی غسل کر رہا ہو، کپڑے تبدیل کر رہا ہو، تیل، سرمہ یا عطر لگا رہا ہو، اور پھر اس سے فارغ ہوتے ہی مسجد کی طرف چل پڑے۔

نیز اگر کبھی اذانِ اوّل سے قبل جمعہ کی مذکورہ تیاری سے فارغ نہ ہوسکا ہو یا تیاری شروع نہ کرسکا ہو تو اذانِ اوّل پر فوراً تیاری میں مشغول ہوجائے بشرطیکہ خطبہ کی اذان سے قبل فارغ ہوکر مسجد میں پہنچ سکے کہ بہ سہولت سنتیں ادا کرسکے، اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر جمعہ کی تیاری (غسل وغیرہ) کی سنتوں کو موقوف کرکے واجب (مسجد) کی طرف چل پڑے۔

نیز مصلّی کے لئے ضروری ہے کہ وہ جمعہ کی مذکورہ تیاری، اذانِ اوّل کے ساتھ شروع کرنے کی عادت نہ بنائے اور یہ جانے کہ تیاری کی صرف اذانِ اوّل کے بعد اجازت ہے، اور اصل یہ ہے

کہ اذانِ اوّل کے بعد سعی الی الجمعہ کے تحت فوراً مسجد کی طرف چل پڑے کہ یہ عمل واجب ہے اور تاخیر سے واجب کی ادائیگی میں تاخیر کا گناہ ہوگا۔

۲- یہ بات بھی سب فقہائے کرام کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ اذانِ اوّل سے قبل یا اذانِ اوّل کے ساتھ کوئی مصلی تیاری سے فارغ ہوکر بجائے مسجد میں آنے کے گھر میں ہی صلوٰۃ التسبیح، نوافل ادا کرتا ہے یا تلاوت میں مشغول ہوتا ہے یا دُرود شریف یا دیگر اوراد و وظائف میں یا مطالعے میں مشغول ہوتا ہے یا گھر کے کام میں مشغول ہوتا ہے تو یہ مشغولی ناجائز ہے۔

اب جواب طلب امر یہ ہے کہ اکثر مساجد میں اذانِ اوّل اور اذانِ خطبہ کے درمیان نصف گھنٹہ تا زائد از ایک گھنٹہ بھی وقفہ ہوتا ہے، جس کے دوران تقاریر ہوتی ہیں، جن کے اندر سننے والوں کے لئے پسند و ناپسند کی بہت سی وجوہ رکھتے ہیں، اسی وجہ سے تقریر کے سننے اور نہ سننے میں نمازیوں کا ذوق و مزاج مختلف ہوتا ہے، اس لئے اکثر نمازی اس تقریر کے جانے والے وقت کو دیگر اعمال میں گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں اور بہت سے اس وقت کو خرید وفروخت کے علاوہ دیگر اپنے نجی کاموں کو پورا کرنے میں صَرف کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

آیا صورتِ مذکورہ میں اس بات کی گنجائش ہے کہ نمازی، جمعہ کی تیاری سے فارغ ہوکر گھر میں ہی تلاوت، صلوٰۃ التسبیح وغیرہ میں مشغول رہیں؟ یا گھر کے یا نجی کاموں میں شامل رہے اور سنتیں بھی گھر ہی میں ادا کرے اور خطبے کی اذان سے قبل یا خطبے کی اذان کے ساتھ ساتھ مسجد میں پہنچ جائے؟ اگر اس کی گنجائش نہیں تو ایسا کرنے والا کس درجے کا گناہگار ہوتا ہے؟ جواب سے جلد مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

المستفتی صغیر احمد
احسان منزل امیر معاویہ روڈ راج گڑھ
چوبرجی، لاہور ۵۴۰۰۰
۱۹ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ

(اس استفتاء کا دارالافتاء دارالعلوم کراچی کی جانب سے یہ جواب دیا گیا جو ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی کے شوال ۱۴۱۵ھ کے شمارے میں بھی شائع ہوا۔)

جواب:- جن لوگوں پر جمعہ کی نماز فرض ہے ان کے لئے جمعہ کے دن جمعہ کی پہلی اذان سے لے کر نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے تک مفتیٰ بہ قول کے مطابق خرید وفروخت کرنا، سونا، کسی سے باتوں میں مشغول ہونا، یہاں تک کہ بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور کسی کتاب وغیرہ کا مطالعہ کرنا وغیرہ ذالک، غرض وہ سارے کام اور مشاغل جو جمعہ کی طرف جانے کے اہتمام میں مخل ہوں سب کے

سب مکروہ تحریمی یعنی ناجائز ہیں۔ صرف کھانے کے مسئلے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کھانے کی طرف رغبت اتنی غالب ہو کہ نماز کے دوران دل اس میں لگا رہنے کا اندیشہ ہو اور نماز سے فراغت تک کھانا بے لذت ہو جانے کا خطرہ ہو تو کھانا کھایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ خطبۂ جمعہ کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اس کے علاوہ جمعہ کی تیاری کے متعلق جو کام ہیں وہ کئے جا سکتے ہیں، جیسے غسل کرنا، وضو کرنا، لباس پہننا وغیرہ، لیکن قصداً ان کاموں کو اذانِ اوّل تک مؤخر نہ کرنا چاہئے۔

البتہ ایک اہم بات جو توجہ طلب ہے وہ یہ کہ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زوالِ شمس کے جلد بعد نمازِ جمعہ پڑھ لیتے تھے اور ایسا ہی حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانے میں بشمول خلفائے راشدینؓ نمازِ جمعہ زوال کے بعد جلد پڑھی جاتی تھی، لہٰذا جب حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اذانِ اوّل شروع ہوئی تو اس اذانِ اول اور خطبے کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں ہوتا تھا، لیکن آج کل نمازِ جمعہ عموماً زوال کے بعد تاخیر سے ادا کی جاتی ہے اور پھر خطبۂ جمعہ سے قبل تقریر کا دستور ہو جانے کی وجہ سے خطبہ و نمازِ جمعہ میں مزید تاخیر ہو جاتی ہے اور اذانِ اول اور خطبے کے درمیان بہت وقفہ ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر یہ غفلت پائی جاتی ہے کہ لوگ اذانِ اوّل کے بعد سعی الی الجمعہ کا اہتمام نہیں کرتے کہ ابھی خطبے میں بہت وقت ہے، لوگوں کے اس گناہ میں مبتلا ہونے کا ایک سبب ان کی اپنی کوتاہی اور سستی کے علاوہ مساجد کے منتظمین بھی ہیں، اس لئے منتظمین کو چاہئے کہ وہ اذانِ اول کے بعد جلدی جمعہ ادا کرنے کا اہتمام کریں، کیونکہ اگرچہ نمازِ جمعہ کا اصل وقت (یعنی ابتداء اور انتہاء کے اعتبار سے) ظہر والا ہی ہے، لیکن ظہر کی نماز کی طرح جمعہ میں ابراد کرنا اولیٰ نہیں ہے، بلکہ جمعہ میں تعجیل افضل ہے، چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ میں ہے کہ:-

جمعہ و ظہر کا وقت ایک ہے، مگر جمعہ کو ذرا پہلے پڑھنا کہ لوگ سویرے سے آئے ہیں ان کو جلد فراغت ہو جائے تو بہتر ہے، فقط۔ (فتاویٰ رشیدیہ ص ۳۵۳)

اسی طرح مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب قدس اللہ سرہٗ اپنے فتاویٰ عزیز الفتاویٰ میں اس سوال کے جواب میں کہ جمعہ سوا بجے پڑھنے والے فضیلت پر ہیں یا ڈھائی بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں؟ لکھتے ہیں کہ:-

جمعہ میں تعجیل افضل ہے، ایک بجے، سوا بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں۔

(عزیز الفتاویٰ ص ۲۰۷)

اور دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

حنفیہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ جمعہ میں تعجیل مستحب ہے، برخلاف تاخیر جو کہ ظہر کی نماز میں

موسم گرما میں مستحب ہے وہ جمعہ میں نہیں ہے، بلکہ جمعہ کو جلد ادا کرنا مستحب ہے، اور احادیث سے بھی جمعہ کی تعجیل ہی ثابت ہوتی ہے، پس زوال کے بعد مثلاً ساڑھے بارہ بجے اذان جمعہ ہونی چاہئے، پھر دس پندرہ منٹ بعد خطبہ اور اس کے بعد نماز ہونی چاہئے مثلاً ایک بجے تک یہ سب کام ہوجائیں یا کچھ قدر کم وبیش ہو۔ (عزیز الفتاویٰ ص:۲۹۸)

لہٰذا منتظمین کو چاہئے کہ وہ زوال کے بعد جلدی جمعہ ادا کیا کریں اور نیز اذانِ اوّل اور خطبے کے درمیان زیادہ وقفہ نہ کیا کریں، اور اس کی صورت یہ ہے کہ اذانِ اوّل کے کافی دیر بعد تقریر شروع کرنے کے بجائے اذانِ اوّل کے فوراً بعد تقریر شروع ہوجائے اور مختصر تقریر کے بعد خطبے کے لئے اذان دی جائے، اور پھر خطبہ اور نماز پڑھی جائے یا اذانِ اوّل، تقریر کے فوراً بعد ہو، اور اس کے بعد صرف اتنا وقت ہو کہ جو لوگ ابھی مسجد میں نہیں آئے وہ مسجد میں آکر سنتیں پڑھ سکیں اور اس کے بعد اذانِ ثانی اور خطبہ ونماز ہو۔

لیکن چونکہ یہ طریقہ آج کل معروف نہیں ہے، اس لئے اس کو شروع کرنے سے پہلے لوگوں کو مسئلہ بتا کر ذہنی طور پر تیار کیا جائے تاکہ وقت پر لوگوں کو تشویش نہ ہو، لیکن بہرحال اذانِ اوّل کے بعد گھر کے کام کاج یا گھر میں رہ کر تلاوت یا صلوٰۃ، تسبیح وغیرہ میں مشغول ہونا، جائز نہیں ہے، اور یہ کرنے والا مکروہِ تحریمی کا مرتکب ہوگا۔

قال الله تعالى "يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ"۔[1]

وفي تنوير الأبصار ج ۲ ص ۱۶۱ (طبع سعيد) ووجب سعي إليها وترك البيع بالأذان الأوّل وفي الشامية تحت (قوله وترك البيع) أراد به كل عمل ينافي السعي وخصه اتباعًا للآية نهر.

وفي بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۶۵ (طبع ايج ايم سعيد) لما روي عن عمرؓ أنه كان يخطب يوم الجمعة فدخل عليه عثمان فقال له أية ساعة هذه؟ فقال ما زدت حين سمعت النداء يا أمير المؤمنين! على أن توضأت، فقال والوضوء أيضًا وقد علمت أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أمر بالاغتسال.

وفي الدر المختار ج ۲ ص ۱۶۳ (طبع سعيد) سمع النداء وهو يأكل تركه إن خاف فوت جمعة أو مكتوبة لا جماعة رستاقي وفي الشامية والأكل أي الذي تميل إليه

---

(۱) سورة الجمعة ۹

نفسه ويخاف ذهاب لذته عذر في ترك الجماعة كما مرّ في بابها لكن يشكل ما مرّ من وجوب السعي الى الجمعة بالأذان الأوّل وترك البيع ولو ماشيا والمراد به كل عمل ينافي السعي فتأمل

وفي تقريرات الرافعي تقييد ما مرّ بما هنا يدفع الاشكال وذلك لأن حضور الأكل المذكور حيث كان عذرا في سقوط واجب الجماعة لشغل بال المصلّي يكون عذرا في سقوط واجب السعي اذ لا فرق بين واجب وواجب بخلاف ما اذا خاف فوت الجمعة أو الوقت لفوات الفرض لا لواجب، انتهى.

وفي صحيح البخاري ج ١ ص ١٢٣ (طبع قديمي كتب خانه) عن أنس بن مالكؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلّي الجمعة حين تميل الشمس، وعنه أيضا قال: كنا نبكر بالجمعة ونقيل بعد الجمعة

وفي مصنف لعبد الرزاق (ج ٣ ص ١٧٥ رقم الحديث ٥٢١٣)[1] عن عطاء قال: بلغني أن عثمان كان يجمع ثم يقيل الناس بعد الصلوة

وفي مصنف لابن ابي شيبة (٢/١٠٢)[2] أخبرنا محمد بن سعد الأنصاري عن أبيه قال: كنا نجمع مع عثمان بن عفانؓ ثم نرجع فنقيل.

وفيه ايضا (١٠٢/٢)[3] عن ابي رزين قال: كنا نصلي مع عليّ الجمعة فأحيانا نجد فيئا وأحيانا لا نجده.

وفي الدر المختار (ج ١ ص ٣٦٠)[4] (وجمعة كظهر أصلا واستحبابا) في الزمانين لأنها خلفه.

وفي الشامية (قوله: أصلا) أي من جهة أصل وقت الجواز وما وقع في آخره من الخلاف (وقوله استحبابا في الزمانين) أي الشتاء والصيف ح، لكن جزم في الأشباه من فن الأحكام انه لا يسن لها الابراد وفي جامع الفتاوى لقارئ الهداية قيل انه مشروع لأنها تؤدى في وقت الظهر وتقوم مقامه وقال الجمهور ليس بمشروع لأنها تقام بجمع عظيم فتأخيرها

---

(١) مصنف عبدالرزاق باب وقت الجمعة ج:٣ ص:١٧٥ (طبع المكتب الاسلامي بيروت)

(٢) مصنف ابن ابي شيبة باب من كان يقيل بعد الجمعة ويقول هي اول النهار رقم الحديث [illegible] ج [illegible] ص:٣٣٣ (طبع مكتبة الرشد، رياض)

(٣) مصنف ابن ابي شيبة باب من كان يقول وقتها زوال الشمس وقت الظهر رقم الحديث [illegible] ج [illegible] ص [illegible] (طبع مكتبة الرشد، رياض)

(٤) (طبع ايچ ايم سعيد)

مفضٍ الی الحرج ولا کذلک الظهر وموافقة الخلف لأصله من کل وجه لیس بشرط اهـ

واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	عبیداللہ انور میرپوری
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ	سحبان محمود	دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴
			۱۴۱۵/۶/۲۳ھ
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
بندہ محمود اشرف غفراللہ لہ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	محمد عبدالمنان عفی عنہ	اصغر علی ربانی

(ان ہی دنوں میں اس مسئلے سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں جناب مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب نے ایک فتویٰ تحریر فرمایا جو رجب ۱۴۱۵ھ کے رسالہ ''انوارِ مدینہ'' میں شائع ہوا، یہ فتویٰ درج ذیل ہے۔)

جمعہ کی اذانِ اول کے بعد بیع وشراء وغیرہ ممنوع کاموں کے ارتکاب سے لوگوں کو بچانے کے لئے کیا اذانِ اول کو مؤخر کرنا جائز ہے؟

سوال:- جمعہ کی اذانِ اول کے بعد خرید وفروخت اور نماز کے منافی ہر کام کو چھوڑ کر مسجد میں آنا واجب ہے، لیکن چونکہ لوگوں میں اس کا اہتمام بہت کم ہے کہ اذانِ اول کے وقت مسجد میں آجائیں اس لئے ترکِ واجب کے مرتکب ہوتے ہیں، لوگ اس معصیت سے بچ جائیں اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ اذانِ اول کو تاخیر سے کہا جائے اور دونوں اذانوں کے درمیان فقط اتنا وقفہ کیا جائے کہ لوگ سنتیں پڑھ لیں، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ مثلاً دوسری اذان سوا ایک بجے ہو اور پہلی اذان ایک بجے یا ایک بج کر پانچ منٹ پر کہی جائے جبکہ زوال کا وقت سوا بارہ بجے ہو، اردو میں تقریر اذانِ اول سے پہلے ہی ہو جائے اس طرح بہت زیادہ لوگ اذانِ اول کے وقت مسجد میں موجود ہوں گے، بعض مساجد میں اس طریقے پر عمل ہو رہا ہے۔

جواب:- جمعہ کی اذانِ اول کا وقت زوال کے متصل بعد ہے، اسی پر عملی توارث چلا آرہا ہے، کتبِ حدیثیہ وفقہیہ میں بھی اس کی تصریح ہے۔

۱:- المغنی لابن قدامہؒ میں ہے:-

ویبدأ وجوب السعی الیها ... وعند الحنفیة بالأذان الاول عند الزوال (بحوالہ الفقه الاسلامی وأدلته ج:۲ ص ۲۶۲)۔[1]

(۱) (طبع دار الفکر)

(ترجمہ - حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے سعی کا وجوب زوال کے وقت اذانِ اوّل سے شروع ہوتا ہے۔)

۲:- معارف السنن میں مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

وبالجملة فهذا الأذان كان قبل الأذان بين يدي الخطيب وكان في أول وقت الظهر متصلًا بالزوال. (ج:۳ ص ۳۹۶)۔[1]

(ترجمہ - اذانِ اوّل خطیب کے سامنے اذان سے پیشتر ہوتی تھی اور ظہر کے اوّل وقت میں زوال کے ساتھ متصل ہوتی تھی۔)

۳:- مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر میں ہے:-

(ويجب السعي وترك البيع بالأذان الأول) عقيب الزوال (ج ص ۱۷۱)۔[2]

(ترجمہ - جمعہ کے لئے سعی اور ترکِ بیع، زوال کے بعد اذانِ اوّل سے واجب ہوتی ہے۔)

۴:- عمدۃ القاری میں علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

قوله زاد النداء الثالث انما سمي ثالثًا باعتبار كونه مزيدًا لأن الأول هو الأذان عند جلوس الامام على المنبر والثاني هو الاقامة للصلوة عند نزوله والثالث عند دخول وقت الظهر. (ج ۶ ص ۲۱)۔[3]

(ترجمہ - پہلی اذان کو جو تیسری اذان کہا گیا تو اس اعتبار سے کہ اس کو زیادہ کیا گیا تھا، کیونکہ پہلی اذان وہ ہے جو امام کے سامنے ہوتی ہے جب وہ منبر پر بیٹھ ہوتا ہے، اور دوسری سے مراد نماز کے لئے اقامت ہے جو امام کے منبر سے اترنے پر ہوتی ہے، اور تیسری اذان وہ ہے جو ظہر کا وقت شروع ہونے پر ہوتی ہے۔)

۵:- فتح الباری میں علامہ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں -

وتبين بما مضى ان عثمان أحدثه لاعلام الناس بدخول وقت الصلوٰة الخ (ج ۲ ص ۳۹۴)۔[4]

(ترجمہ - سابقہ کلام سے ظاہر ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے۔)

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج ۱ ص ۲۵۳ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)
(۳) (طبع دار الفكر)
(۴) (طبع دار نشر الكتب الاسلاميه لاهور)

۶:- تبیین الحقائق میں علامہ زیلعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

وقال بعض العلماء یجب السعی وترک البیع بدخول الوقت لأن التوجه الی الجمعة یجب بدخول الوقت وان لم یؤذن لها أحد ولهذا لا یعتبر الأذان قبل الوقت (ج: ۱ ص:۲۲۳)۔[1]

(ترجمہ:- بعض علماء نے کہا ہے کہ سعی اور ترکِ بیع کا وجوب، جمعہ کا وقت شروع ہونے سے ہوتا ہے، کیونکہ جمعہ کی طرف توجہ کا وجوب، وقت شروع ہونے سے ہوتا ہے، اگرچہ کسی نے بھی اس کے لئے اذان نہ کہی ہو، اسی لئے وقت سے پیشتر اذان کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔)

۷:- تفسیراتِ احمدیہ میں حضرت ملّا جیون رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

وقال الامام الزاهد المراد بالنداء دخول الوقت اذ به یحرم البیع دون الأذان نفسه (ص:۷۲۵)۔[2]

(ترجمہ:- امام زاہد نے کہا کہ "نداء" سے مراد وقت کا شروع ہونا ہے کہ اس سے بیع حرام ہوتی ہے اور عین اذان مراد نہیں ہے۔)

۸:- احکام القرآن میں مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں -

قوله تعالی وذروا الْبَيْعَ اختلف السلف فی وقت النهی عن البیع فروی عن مسروق والضحاک ومسلم بن یسار أن البیع یحرم بزوال الشمس، وقال مجاهد والزهری یحرم بالنداء وقد قیل ان اعتبار الوقت فی ذلک أولی اذا کان علیهم الحضور عند دخول الوقت فلا یسقط ذلک عنهم تأخیر النداء ولما یکن للنداء قبل الزوال معنی دل ذلک علی أن النداء الذی بعد الزوال انما هو بعد ما قد وجب اتیان الصلوة (ج ۵ ص ۲۳)۔[3]

(ترجمہ:- ارشادِ باری تعالیٰ "وذروا الْبَيْعَ" بیع سے ممانعت کے وقت کے بارے میں سلف میں اختلاف ہوا ہے، مسروق، ضحاک اور مسلم بن یسار رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ زوالِ آفتاب سے ہی بیع حرام ہو جاتی ہے، مجاہد اور زہری رحمہما اللہ کا قول ہے کہ اذان سے حرام ہوتی ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس بارے میں وقت کا اعتبار کرنا اولیٰ ہے کیونکہ وقت شروع ہونے پر لوگوں کے ذمے جمعہ کے لئے حاضری واجب ہوتی ہے، لہٰذا اذان کو مؤخر کرنا ان سے اس واجب کو ساقط نہیں کرے گا ...الخ۔)

اس عبارت سے درج ذیل باتیں سامنے آئیں:-

---

(۱) (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)

(۲) تفسیرات احمدیة سورة الجمعة ص:۷۰۵، ۷۰۶ (مطبع الکریمی، بمبئی)

(۳) (طبع ادارة القرآن کراچی)

الف - جمعہ کی اذان اول کا وقت زوال سے متصل بعد کا ہے۔

ب - بعض علماء کے نزدیک بیع وشراء وغیرہ کی حرمت کا تعلق وقت زوال سے ہے، تنہا اذان سے نہیں، اگر زوال کے وقت ہی اذان ہو تب تو وقت اور اذان دونوں کے ساتھ حکم ممانعت کا تعلق ہوا، اور اگر اذان زوال کو تاخیر سے کہا گیا تو حکم ممانعت کا تعلق وقت زوال کے ساتھ ثابت ہوگا، اذان کہے جانے تک موخر نہیں ہوگا، ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھیں تو یہ سمجھنا دشوار نہیں ہوگا کہ اصلاح احوال کے لئے جس صورت کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے انتہائی غیر مناسب ہے کہ اس میں ترک واجب کے ارتکاب سے بچا کو تو کیا ہوتا الٹا عملی توارث اور ایک حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، یعنی اذان اول کی اس کے اصل وقت سے تاخیر۔

جن مساجد میں اذان اول کو موخر کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، ضروری ہے کہ وہاں اس طریقے کو ختم کر دیا جائے۔

اصلاح احوال کی متبادل صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اذان اول کو اپنے وقت پر رکھتے ہوئے اذان ثانی کو جہاں تک ہو سکے مقدم کیا جائے۔ لیکن اس میں بھی اتنا وقفہ ضرور رکھا جائے کہ لوگ اذان اول کو سن کر مسجد میں جمع ہو جائیں اور فرضوں سے پہلے سنتیں پڑھ سکیں، کیونکہ ایک روایت میں ہے

فأحدث عثمان الثالثة على الزوراء ليجتمع الناس (عمدۃ القاری ج ۲ ص ۲)۔[1]

(حضرت عثمانؓ نے زوراء پر تیسری اذان شروع کرائی تاکہ لوگ اکٹھے ہو جائیں۔)

اور ایک اور روایت میں ہے فأذن بالزوراء قبل خروجه ليعلم الناس ان الجمعة قد حضرت. (فتح الباری ج ۲ ص ۳۹۴)۔[2]

(اپنے نکلنے سے پیشتر زوراء پر اذان دلوائی تاکہ لوگوں کو علم ہو جائے کہ جمعہ کا وقت ہو گیا ہے۔)

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہماری رائے میں یہ وقفہ آدھ گھنٹہ کا تو ضرور ہونا چاہئے، یعنی اذان اول تو زوال ہوتے ہی کہہ دی جائے اور آدھ گھنٹے بعد اذان ثانی کہہ دی جائے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	عبد الواحد غفرلہ
محمد قاسم	عبد الحمید	جامعہ مدنیہ لاہور

---

(۱) (طبع دار الفکر) (۲) (طبع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور)

(اس فتوی کی اشاعت کے بعد حافظ صغیر احمد صاحب کی طرف سے جناب ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کو درج ذیل تحریر بھیجی گئی۔)

محترم ومکرم حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب زید مجدہٗ! سلامِ مسنون

عرض یہ ہے کہ جناب کے علم میں ہے کہ بندہ ایک کوشش میں مشغول ہے کہ نماز جمعہ ادا کرنے والے مسلمان (بالعموم) اذان اول اور اذان ثانی کے درمیانی وقفے پر سعی الی الجمعہ کے منافی اُمور میں مشغول رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ترک واجب کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، اسی سلسلے میں ایک استفتاء مرتب کرکے پاکستان کے اہم اہم مدارس سے جواب بھی منگایا، اور جناب کے ہاں سے بھی جواب موصول ہوا تھا، مگر "انوار مدینہ" کے جلد ۳ شمارہ ۳۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۵ھ (دسمبر ۱۹۹۴ء) میں اسی ذیل میں ایک مضمون (استفتاء اور اس کا جواب) دیکھنے کے بعد خیال ہوا کہ حضرات مفتیان کرام کی خدمت میں اس کو روانہ کرکے رہنمائی چاہوں اور اس کی تیاری بھی کرلی (تیاری کا ایک صفحہ بھی لف ہے) مگر ایک مشفق ومحب عالم نے یہ رہنمائی فرمائی کہ اپنے اشکال کے حل کے لئے جناب کی خدمت میں پہلے عرض کردوں، خدا کرے جناب کی توجہ فرما کر حل فرمادیں، اشکال یہ ہے کہ:-

یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ زوال سے نماز جمعہ کا وقت شروع ہوجاتا ہے، اور فضیلت بھی اسی میں ہے کہ اس سے یعنی زوال سے بھی قبل یا زوال پر تیاری شروع کرے، مگر فتوی کی رو سے کہ وجوب سعی الی الجمعہ کا اطلاق زوال کے فوراً بعد ہوگا یا جہاں (جس مسجد میں) جس نمازی نے نماز پڑھنی ہے وجوب کا اطلاق اس نمازی پر اس مسجد کی پہلی اذان سے ہوگا؟ اگر وجوب کا اطلاق زوال سے ہوگا تو پھر سارے عام مسلمانوں کو اس گناہ کبیرہ سے بچانے کی سعی کیا ہو؟

اُمید ہے جناب والا مفتی بہ قول کی روشنی میں رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں گے، جزاکم اللہ تعالیٰ۔ (صغیر احمد)

جواب:- (از مفتی عبدالواحد صاحب)

جناب کی جانب سے پہلے جو سوال نامہ آیا تھا اس کا اور جواب کا حاصل یہ تھا کہ اذان اول کے بعد سعی الی الجمعہ واجب اور دنیوی کاموں میں لگنا یا ایسے شغل میں مشغول ہونا جس سے سعی الی الجمعہ میں خلل آتا ہو، ناجائز ہے۔

لیکن ایک بات قابل غور تھی، اور وہ یہ کہ اذان اول کا وقت کیا ہے؟ کیا زوال ہوتے ہی کہی جائے یا جب مناسب خیال کیا جائے کہی جائے؟ خواہ زوال کے پندرہ منٹ بعد یا ایک گھنٹے بعد یا اس سے بھی زیادہ تاخیر سے۔

اس بات سے نہ تو جناب کے سوال نامے میں کچھ تعرض تھا اور نہ ہی اس کے جواب میں اس سے کچھ بحث کی گئی تھی، "انوارِ مدینہ" میں اسی بات کے بارے میں تحقیق پیش کی گئی تھی۔

حوالہ جات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اذانِ اوّل کا وقت زوال ہوتے ہی ہے (بلکہ اذانِ اوّل کے وقت کے بارے میں یہی مفتی بہ قول ہے) فتح الباری کے حوالے سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی تاکہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہو جائے، معارف السنن کے حوالے سے معلوم ہوا کہ دورِ سلف میں اسی وقت اذان ہوتی تھی اور اسی پر توارثِ عملی چلا آرہا ہے۔

ایک متوارث عمل کو تبدیل کرنا جبکہ:-

۱- اذانِ اوّل اس لئے شروع ہوئی کہ لوگوں کو جمعہ کے وقت کے شروع ہونے کا علم ہو جائے۔

۲:- اذانِ اوّل کا وقت زوال ہوتے ہی ہے۔

۳:- بعض حضرات کے نزدیک بیع وغیرہ کی حرمت زوالِ شمس سے ہے (اور اس قول کے قوی ہونے کا علم اس سے ہوتا ہے کہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے تبیین[1] میں اور مولانا ادریس کاندھلوی نے احکام القرآن[2] میں یہ قول نقل کرکے نہ تو اس کی تضعیف کی اور نہ ہی اس کے خلاف کیا)۔

۴- جو مصلحت جناب کے پیشِ نظر ہے، اس کی تفصیل کا متبادل طریقہ موجود ہے، جو کہ "انوارِ مدینہ" ہی میں ذکر کیا گیا ہے۔

ایک غیر مناسب اور قابلِ ترک بلکہ واجب الترک اور واجب الاحتراز طریقہ ہے۔

یہ تو ایک اتفاقیہ بات (Accidental) ہوگی کہ اذانِ اوّل زوال ہوتے ہی نہ کہی گئی بلکہ کچھ تاخیر سے کہی گئی ہو اس وقت یہ اختلاف سامنے آتا ہے کہ وجوبِ سعی زوال سے ہو یا اذان سے؛ لیکن اس اتفاقیہ بات کو ہم عملی معمول نہیں بنا سکتے، عملی معمول وہی ہوگا جو حوالہ جات سے ثابت ہو کہ زوال ہوتے ہی اذانِ اوّل کہی جائے اور اس طرح عملاً (Practically) وجوبِ سعی، زوال اور اذانِ اوّل دونوں ہی کے ساتھ مقترن ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

عبدالواحد غفرلہٗ

۲۰ر شعبان ۱۴۰۵ھ

---

(۱) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ج　ص ۲۲۳ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)

(۲) احکام القرآن، المسئلۃ السابعۃ ج ۵ ص ۲۳ (طبع ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی)

(اس کے بعد ماہنامہ "البلاغ" اور ماہنامہ "نوائے مدینہ" میں شائع ہونے والی تحریرات ایک سوال کے ساتھ حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب کی خدمت میں پیش کی گئیں تو حضرت موصوف نے اس کا درج ذیل جواب تحریر فرمایا۔)

جواب:- (از حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی رحمہ اللہ)

جمعہ کے خطبے سے پہلے تقریر کا متعدد صحابہ کرامؓ سے ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ جمعہ کے دن خطبے سے پہلے اپنی تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان کیا کرتے تھے، جب امام خطبے کے لئے آتے تو وہ اپنی تقریر موقوف کر دیا کرتے تھے۔ (مستدرک حاکم ج:۱ ص:۱۰۸ و ج:۳ ص:۵۱۲)۔[1]

قال الحاکم والذھبی صحیح۔[2] (از راہِ سنت مولانا محمد سرفراز خان صاحب)۔[3]

اسی طرح اس مستدرک میں حضرت عبداللہ بن بسرؓ سے جمعہ کے دن خطبے سے قبل وعظ کہنا منقول ہے،[4] اور اصابہ فی تذکرۃ الصحابہ ج:۱ ص ۱۸۴[5] میں ہے کہ حضرت تمیم داریؓ کے اصرار پر حضرت عمرؓ نے ان کو اجازت دے دی تھی کہ جمعہ کے دن اس سے قبل کہ میں خطبہ کے لئے آؤں، تقریر کر سکتے ہو۔

مستدرک حاکم اور اصابہ میں ذکر کردہ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ کا معمول خطبۂ جمعہ سے پہلے تقریر و وعظ کہنے کا تھا۔

اور یہ بھی صحیح احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زوالِ شمس کے بعد جلد نماز جمعہ ادا کر لیتے تھے اور یہی طریقہ خلفائے راشدینؓ کا تھا کہ نماز جمعہ زوال کے بعد جلد پڑھی جاتی تھی۔

صحیح بخاری میں ہے: عن أنس بن مالکؓ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی

---

(۱) وفي المستدرك على الصحيحين كتاب معرفة الصحابة ج ۳ ص ۵۱۲ طبع دار الكتب العلمية بيروت، عن عاصم بن محمد عن أبيه قال رأيت أبا هريرة يخرج يوم الجمعة فيقبض على رمانتي المنبر قائما ويقول حدثنا أبو القاسم رسول الله الصادق المصدوق صلى الله عليه وسلم فلا يزال يحدث حتى إذا سمع فتح باب المقصورة لخروج الامام للصلوة جلس، هذا حديث صحيح الاسناد ... الخ

(۲) دیکھئے حاشیہ نمبر ۱۔

(۳) راہ سنت ص ۱۳۰ (طبع [illegible])

(۴) دیکھئے مستدرک حاکم، کتاب الجمعة ج ۱ ص ۳۲۵، ۳۲۶ طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔

(۵) [illegible] راہ سنت ص ۱۳۰ [illegible]

[illegible]

الجمعة حين الشمس وعنه أيضًا قال: نبكر بالجمعة ونقيل بعد الجمعة (ج ص ۱۲۳)[1] وفي مصنف لعبد الرزاق (ج ۳ ص ۱۸۵)[2] عن عطاء قال بلغني أن عثمان كان يجمع ثم يقيل الناس بعد الصلوٰة وفي مصنف لابن أبي شيبة (ج ۲ ص ۱۰۲)[3] أخبرنا محمد بن سعد الأنصاري عن أبيه قال كنا نجمع مع عثمان بن عفان ثم نرجع فنقيل وفيه أيضًا (ج ۲ ص ۱۰۸)[4] عن أبي رزين قال: كنا نصلي مع عليّ الجمعة فأحيانًا نجد فيئًا وأحيانًا لا نجده

اور فقہائے کرام کی عبارات سے بھی راجح یہی معلوم ہوتا ہے۔

وفي الشامية لكن جزم في الأشباه من فن الأحكام أنه لا يسن لها الإبراد وفي جامع الفتاوى لقارئ الهداية قيل انه مشروع لأنها تؤدي في وقت الظهر وتقوم مقامه وقال الجمهور ليس بمشروع لأنها تقام بجمع عظيم فتأخيرها مفض إلى الحرج ولا كذلك الظهر وموافقة الخلف لأصله من كل وجه ليس بشرط. (ج۱ ص:۳۶۷)۔[5]

اب یہ تو ظاہر ہے کہ جب تک اذانِ اوّل جس کی ابتداء حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی ہے، اس وقت تک تو یہ تقریر اور وعظ یقیناً اذان اور خطبے سے پہلے ہی ہوتی تھی کیونکہ اذانِ ثانی اور خطبے کے درمیان تقریر و وعظ کی نفی صراحۃً اُوپر کی روایات سے ہورہی ہے، ان میں تصریح ہے کہ جب امام خطبے کے لئے آتا تھا تو یہ تقریر و وعظ موقوف کردیا جاتا تھا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں جمعہ میں تبکیر کا لحاظ بھی بہت تھا، اکثر لوگ جمعہ میں تبکیر کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے صبح سے ہی مسجد میں آجاتے تھے، تو ان کے لئے وعظ و تقریر اذان سے پہلے ہی مناسب تھی، لیکن جب لوگوں میں سستی ہوئی تو اذانِ اوّل، زوال کے وقت لوگوں کو وقتِ جمعہ بتلانے کے لئے شروع کی گئی تو اب کہ جب زوال کے وقت اذانِ اوّل کی ابتداء زوراء پر ہوئی اور اذانِ ثانی عند المنبر خطبے سے قبل ہونے لگی تو معلوم نہیں اس وقت یہ تقریر و وعظ اذان علی الزوراء سے پہلے ہوتی تھی یا بعد میں؟

لوگوں کے تکاسل اور سستی پر نظر کرتے ہوئے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریر و وعظ اذان علی الزوراء کے بعد ہوتی ہوگی کہ اب تبکیر کی فضیلت کی تحصیل پر لوگ اتنے حریص نہیں رہے تھے

---

(۱) (طبع قديمي كتب خانه)

(۲) مصنف عبدالرزاق باب وقت الجمعة ج ۳ ص ۱۷۵ (طبع المكتب الاسلامي بيروت)

(۳) مصنف ابن أبي شيبة باب من كان يقيل بعد الجمعة ويقول هي أول النهار رقم الحديث: ۵۱۴۳ ج ۱ ص ۴۴۴ (طبع مكتبة الرشد، رياض)

(۴) مصنف ابن أبي شيبة باب من كان يقول وقتها زوال الشمس وقت الظهر رقم الحديث: ۵۱۴۴ ج ۱ ص ۴۴۵ (طبع مكتبة الرشد، رياض)

(۵) (طبع ايچ ايم سعيد)

کہ اذان سے پہلے خود بخود جمع ہو جاتے ہوں، اس لئے ان کو جمع کرنے اور وقت جمعہ کے ایذان کے لئے ہی تو یہ اذان علی الزوراء مشروع ہوئی۔

جب لوگوں کا اجتماع اذان کے بعد ہی ہوتا ہو تو پھر اجتماع سے پہلے تقریر و وعظ کا کوئی فائدہ متصور نہیں ہے اور اذان سے پہلے اجتماع کا معمول جب زمان خیر القرون میں کم ہو گیا تھا تو اب اس کے لئے لوگوں کو تیار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا۔

اس لئے ''ابدع'' کی یہی تجویز متعین اور سلف کے عمل کے موافق ہے کہ ''اذانِ اوّل کے فوراً بعد تقریر شروع ہو جائے اور مختصر تقریر کے بعد خطبے کے لئے اذان دی جائے اور پھر خطبہ اور نماز پڑھ لی جائے۔'' (۵۳)

دُوسری تجویز کہ ''اذانِ اوّل تقریر کے فوراً بعد ہو اور اس کے بعد صرف اتنا وقت ہو کہ جو لوگ ابھی مسجد میں نہیں آئے وہ مسجد میں آ کر سنتیں پڑھ سکیں، اور اس کے بعد اذان ثانی اور خطبہ و نماز ہو''، یہ طریقہ علاوہ اس کے کہ معروف نہیں اور اس پر ہر جگہ اور ہر مسجد کے لوگوں کو جمع کیا جانا مشکل ہے، اذانِ اوّل سے پہلے لوگوں کا مسجد میں آنا اس حرص اور دُنیا میں انہماک کے زمانے میں ازبس دُشوار ہے، سلف کے معمول کے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے، اور اذانِ اوّل کی مشروعیت سے جو ایذان اور جمعہ کی دعوت تھی اس کے بھی خلاف ہے۔

جمعہ کے لئے اصل داعی اذان ہی ہے، اور ''اذا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃ'' پر ہی ''فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللہ'' مرتب ہے، اس تجویز ثانی میں اصل داعی وعظ و تقریر ہوگی، لوگ اس کے لئے جمع ہوں گے پھر اس صورت میں تقریر و وعظ کا اذان اوّل کے ساتھ اتصال ہوگا، جو معمولِ سلف کے خلاف ہے، ان کا معمول تقریر و وعظ کا اذانِ خطبہ سے پہلے اور اس کے ساتھ اتصال کا تھا، پھر اس صورت میں اذان کا اپنے اصل وقت سے مؤخر کرنا ہے کیونکہ اس کا اصل وقت ''عند الزوال'' ہے، اس تجویز میں پہلے تقریر ہوگی اس کے بعد اذان اوّل ہوگی، اذانِ اوّل کو اپنے وقت زوال پر ہی کہنا چاہئے، اس کو اپنی جگہ سے ہٹانا نہیں چاہئے، جمعہ کی اذانِ اوّل کا وقت زوال سے متصل بعد ہے، اسی پر عملی توارث چلا آ رہا ہے، کتبِ حدیثیہ وفقہیہ میں بھی اس کی صریح موجود ہے۔

المغنی لابن قدامہ میں ہے:-

۱ -ویبدأ وجوب السعی الیها عند الحنفیة بالأذان الأوّل عند الزوال (بحوالہ الفقه الاسلامی وأدلته ج:۲ ص:۲۶۲)۔[1]

(۱) (طبع دار الفکر)

حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے سعی کا وجوب زوال کے وقت اذانِ اوّل سے شروع ہوتا ہے۔

۲- مجمع الأنہر شرح ملتقی الأبحر میں ہے (ویجب السعی وترک البیع بالأذان الأوّل) عقیب الزوال. (ج:۱ ص:۱۷۱)۔[1]

جمعہ کے لئے سعی اور ترکِ بیع، زوال کے بعد اذانِ اوّل سے واجب ہوتی ہے۔

۳:- فتح الباری میں علامہ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں:-

وتبین بما مضی أن عثمان أحدثہ لإعلام الناس بدخول وقت الصلوٰۃ (ج ۲ ص ۳۹۴)۔[2]

سابقہ کلام سے ظاہر ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے۔

۴:- معارف السنن میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:-

وبالجملۃ فہذا الأذان کان قبل التأذین بین یدی الخطیب وکان فی أول وقت الظہر متصلًا بالزوال. (ج:۴ ص:۳۹۶)۔[3]

اذانِ اوّل خطیب کے سامنے اذان سے پیشتر اور ظہر کے اوّل وقت میں زوال کے ساتھ متصل ہوتی تھی۔ (از "نورِ مدینہ" لاہور)

مذکورہ بالا حوالہ جات میں فتح الباری کی عبارت سے واضح ہے کہ اذانِ اوّل کی مشروعیت کی غرض ہی یہ بتلائی گئی ہے کہ لوگوں کو نمازِ جمعہ کے داخل ہونے کی اطلاع ہوجائے، اور دُوسرے حوالوں میں بھی اس اذان کو "عند الزوال"، "عقب الزوال" کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، جس سے واضح ہو رہا ہے کہ اس اذان کا اصل وقت زوال کے فوراً بعد متصل ہی ہے، کیونکہ عرف میں "عند" اور "عقب" کو گھنٹے کے بعد کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا، اور علامہ بنوریؒ نے تو "فی أوّل وقت الظہر متصلًا بالزوال" لکھ کر کسی دُوسرے احتمال کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

اس لئے جن مساجد میں اذانِ اوّل کو اس کے اصل وقت سے مؤخر کرکے کہنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کو ختم کردینا ضروری ہے، کیونکہ یہ عمل توارث اور تصریحاتِ سلف کے خلاف ہونے کے ساتھ اس اذان کی غرضِ مشروعیت کے بھی خلاف ہے، کما مرّ۔

اس لئے پہلی تجویز پر عمل کرنا چاہئے، اذانِ اوّل ظہر کے وقت شروع ہوتے ہی کہہ دی جایا

---

(۱) مجمع الأنہر ج [illegible] ص ۱۵۳ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)
(۲) (طبع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور)
(۳) (طبع ایچ ایم سعید)

کرے اور پندرہ بیس منٹ کا وقفہ نمازیوں کے مسجد میں آنے اور وضو وغیرہ کے لئے مختص کر دینے کا اعلان کر دیا جائے، اس کے بعد آدھ گھنٹہ مختصر ضروری وقتی مسائل پر مشتمل وعظ ہو جایا کرے، پھر اذانِ ثانی، خطبہ اور نماز ہو جایا کرے، لمبی چوڑی تقریروں اور بے ضرورت مضامین بیان کرنے کا جو رواج ہوگیا ہے اس کی اصلاح کرنے کی طرف توجہ کرنے اور توجہ دلانے کی ضرورت ہے، نہ یہ کہ اصل وعظ و تقریر ہی کو بند کر دیا جائے یا عمل توارث سلف سے ہٹ کر نیا طریقہ جاری کیا جائے۔

آج کل تعلیم یافتہ طبقہ اور مغربی تہذیب کا دلدادہ گروہ چاہتا ہے کہ ہفتہ میں جو کلمۂ خیر تمام مسلمانوں کے کانوں میں خطبۂ جمعہ سے پہلے پڑ جاتا ہے اس کا موقع نہ رہے، حالانکہ ان مواعظ سے بہت بڑے طبقے کی اصلاح ہو رہی ہے اور بکثرت مسلمان اس سے استفادہ کر کے اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کرتے ہیں اور یہ بھی ہفتہ وار تبلیغ عام اور عوامی اصلاح کا پروگرام ہے، البتہ اس میں حدودِ شریعت کی پابندی اور اعتدال کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور غلو سے احتیاط لازم ہے، خطباء اور مبلغین و واعظین کو اپنے منصب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اگر حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے ہمارے خطباء اس پر عمل کریں تو یہ یتخولنا بالموعظة پر امتثال کا ذریعہ ہوسکتا ہے، آزاد طبقہ اس کو ختم کرنا چاہتا ہے اور اس قسم کے حضرات سنت سے اس عمل خیر پر قدغن لگانا چاہتے ہیں، اصل یہ ہے کہ وہ وعظ کے کرنے اور خطبے میں ان باتوں کو گوارا نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائیں اور ہمیں اپنی اور اصلاح کی توفیق نصیب فرمائیں۔ واللہ اعلم

سید عبدالشکور ترمذی عفی عنہ
جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا
۱۲ شوال ۱۴۱۵ھ

(یہ تمام تحریرات حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کی گئیں، حضرت دامت برکاتہم نے ان سب تحریرات کے ملاحظہ کے بعد ذیل کا جواب تحریر فرمایا، جس پر حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بھی تائیدی دستخط فرمائے۔)

جواب:- (از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد

احقر نے اس موضوع پر مرسلہ تمام تحریروں کا مطالعہ کیا، ان تمام تحریروں میں [illegible] سے حرف بہ حرف متفق ہے جو دار الافتاء دار العلوم کراچی سے جاری ہوئی اور البلاغ میں شائع ہوئی۔

خرابی یہاں سے پیدا ہوئی ہے کہ جمعہ کو اس کے وقت مستحب (تعجیل) سے بہت مؤخر کردیا گیا ہے، اوّلاً اس بات کی ترغیب کی ضرورت ہے کہ تعجیل جمعہ کی سنت کو زندہ کیا جائے۔

دُوسرے اذانِ اوّل اور اذانِ ثانی کے درمیان طویل فصل نہ ہو، جس کی صورت یا تو یہ ہے کہ تقریر زوال سے پہلے کی جائے، یا زوال کے متصل بعد اذانِ اوّل اور دس پندرہ منٹ کے بعد اذانِ ثانی ہو، یا پھر تقریر اذانین کے درمیان ہو تو وہ پندرہ، بیس منٹ سے زائد نہ ہو، اور مفصل تقریر جمعہ کے بعد یا زوال سے پہلے ہو، اذانِ اوّل سے پہلے اُردو تقریر کے بارے میں یہ اندیشہ کہ لوگ تقریر سننے نہیں آئیں گے، تجربے سے دُرست ثابت نہیں ہوا۔

جو لوگ تقریر سننا چاہتے ہیں وہ پہلے بھی آجاتے ہیں، اور جو سننا نہیں چاہتے وہ محض اذانِ اوّل کی وجہ سے مجبور نہیں ہوتے بلکہ اذانِ ثانی کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور گنہگار ہوتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۶/۲/۱۴۰۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۳ ۹ـ۱)

مذکورہ بالا تحریر ناچیز کی رائے میں درست ہے، اور دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء سے جو فتویٰ جاری ہوا اور "البلاغ" میں شائع ہوا ہے وہ بھی درست ہے، البتہ احقر کے نزدیک اذانین کے درمیان وقفہ اگر نصف گھنٹے کا بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں، جس میں بیس پچیس منٹ تقریر اور دس منٹ سنتوں کے لئے مل سکتے ہیں، اور لوگوں کے لئے اس میں ان شاء اللہ دشواری بھی نہیں ہوگی، اور جو گناہ سے بچنا چاہے گا وہ دُشواری کے بغیر بچ سکے گا۔

سحبان محمود

واللہ اعلم
ناچیز محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
۲۳/۲/۱۴۰۵ھ

٭فصل فی العیدین٭
(عیدین کے متعلق مسائل کا بیان)

نمازِ عید کے بعد دُعا مانگی جائے یا خطبے کے بعد؟

سوال:- نماز عید کے متصل اگر دُعا نہ مانگی جائے تاکہ ایک ہی دُعا تاخیر سے خطبے کے بعد مانگی جائے تو کیا یہ جائز ہے؟ بعد خطبے کے یہ اعتقاد رکھ کر بعد میں دعا مانگی جائے تو کوئی قباحت تو نہ ہوگی؟

جواب:- دعا، نماز کے متصل بعد ہی مسنون ہے، خطبے کے بعد اجتماعی صورت سے دُعا مانگنا کہیں سے ثابت نہیں۔ (۱)

فقط واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵۰/۱۸ الف)

تکبیراتِ تشریق کے بارے میں امام اعظمؒ اور صاحبینؒ میں اختلاف کی تحقیق

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ ان تکبیرات تشریق کے بارے میں امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اختلاف ہے، اس مسئلے میں مفتیٰ بہ قول امام صاحب کا ہے یا صاحبینؒ کا؟

جواب:- دراصل تکبیرات تشریق کے سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہ اور صاحبینؒ کے درمیان دو مسئلوں میں اختلاف ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ تکبیرات تشریق کب تک جاری رہیں گی؟ اس میں امام صاحبؒ کا مسلک یہ ہے کہ یوم عرفہ کی فجر سے یوم النحر کی عصر تک جاری رہیں گی۔ اور صاحبینؒ ایام تشریق کے آخری دن (یعنی ۱۳ ذی الحجہ) کی عصر تک واجب کہتے ہیں۔ اس مسئلے میں تو فقہائے حنفیہ

(۱) اس کی تفصیل کے لئے اسی فصل میں ص: ۵۵۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۳ ملاحظہ فرمائیں۔

[illegible] پر فتویٰ دیا ہے۔[1] اور شیخ علامہ ابن ہمامؒ[2] اور صاحب بدائع[3] [illegible]

[illegible] عثمانی [illegible]

مطابق اسی کے قائل ہیں کہ اس مسئلے میں فتویٰ صاحبین [illegible]

بھی اسی پر چلا آتا ہے، اور [illegible]

[illegible]

[illegible] عورت، مسافر اور گاؤں

[illegible]

[illegible]

ہو) اور گاؤں والوں پر تکبیر [illegible]

[illegible] مسئلے میں بھی صاحبین کے قول پر

فتویٰ [illegible] امام صاحب کے قول کو اختیار کیا

[illegible]

[illegible]

(۵) [illegible] ص ۱۲۵ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)

[illegible] طبع ادارۃ القرآن کراچی [illegible]

تو اس پر بھی نکیر درست نہیں، بالخصوص جبکہ بعض فقہاء نے عدم وجوب کی تصریح بھی کی ہے۔

واللہ اعلم

۳۰/ ۱ /۱۴۰۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۲۳/ ۳۷ و)

۱-عرب امارات میں عید پڑھ کر آنے والے کے لئے پاکستان میں دوبارہ نماز عید پڑھنے کا حکم

۲:- اور ایسا شخص شوال کے نفلی روزے کب سے شروع کرے؟

سوال:- جناب گرامی قدر .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مشکور ہوں گا اگر مندرجہ ذیل سوالات کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب دیں، جوابی لفافہ شامل ہذا ہے۔

۱- سائل ماہ رمضان میں عرب امارات گیا تھا، وہاں عید کا چاند ایک دن پہلے نظر آیا (یعنی عید ایک دن پہلے کی تھی)، عید کی نماز پڑھ کر امارات سے کراچی (بذریعہ ہوائی جہاز) پہنچا، کراچی میں اگلے دن عید تھی۔ پوچھنا یہ ہے کہ کیا سائل کو یہاں بھی عید کی نماز پڑھنی ضروری تھی یا نہیں؟

۲- دوسری بات یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ رمضان ختم ہونے کے بعد چھ روزے رکھنے چاہئیں تو اس کا بہت ثواب ہے، اور پورے سال روزے رکھنے کا ثواب ملتا ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ سائل نے عید کی نماز امارات میں ادا کی تھی، اب کراچی میں اسے یہ چھ دن کے روزے امارات میں عید کے دن سے رکھنے چاہئیں یا کراچی میں عید کا دن گزار کر بعد میں؟ کہا جاتا ہے کہ عید کے دن صرف شیطان روزہ سے ہوتا ہے۔

جواب ۱:- صورت مسئولہ میں سائل کو کراچی پہنچ کر بھی عید کی نماز میں شامل ہونا چاہئے، اور نماز عید ہی کی نیت کرنی چاہئے، کیونکہ اس صورت کا کوئی صریح حکم تو فقہ کی کتب میں نہیں ملا، لیکن اصول یہ ہے کہ آدمی جس شہر میں ہو اسی کے احکام کا اعتبار ہوتا ہے۔ لہٰذا کراچی پہنچنے کے بعد اس کے حق میں یہ عید ہی کا دن ہے، اس بات کا تقاضا یہ ہے کہ عید کی نماز اس کے لئے ضروری ہے۔ لیکن دوسری طرف دو مرتبہ عید کی نماز پڑھنا پڑتا ہے، اس کا لحاظ کیا جائے تو ضروری نہیں۔ دونوں احتمالات پر عمل کی محتاط شکل یہی ہے کہ وہ عید کی نماز میں بہ نیت عید شامل ہو جائے، تاکہ واجب ہونے کی صورت میں واجب ادا ہو جائے، ورنہ وہ نفل بن جائے گی۔

۲:- شش عید کے روزوں کا متصل ہونا ضروری نہیں،(۱) لہٰذا وہ روزے کراچی کے لحاظ سے ۲ شوال سے شروع کرے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۲/۴/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۷۲/۳۸۴)

حنفیوں کا غیر مقلد کی اقتداء میں نمازِ عید پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک میدان میں پہلے سے مغربی جانب اہل حدیث نماز عید پڑھتے ہیں، اب حنفی بھی ایک مشرقی جانب پڑھنے لگے ہیں، اب حنفی کہتے ہیں کہ ہمارے پیچھے پڑھو، وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارے ہاں بارہ تکبیریں پڑھی جاتی ہیں اور تمہارے ہاں چھ تکبیریں ہوتی ہیں، لہٰذا تمہارے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ کیا حنفی ان کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں؟ تاکہ باہمی جھگڑے ختم بھی ہو سکیں۔

جواب:- نماز عید میں جس طریقے کا ذکر کیا گیا ہے وہ طریقہ مناسب نہیں، چونکہ اہل حدیث حضرات اطمینان سے اپنی نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں، اس لئے حنفی حضرات کو چاہئے کہ وہ کسی دوسری جگہ نماز پڑھیں، یا چند منٹ کے بعد اسی میدان کے کسی دوسرے حصے میں نماز ادا کرلیں، اور اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو باہمی نزاع سے بچنے کے لئے بارہ تکبیروں کے ساتھ نماز عید ادا کریں، اگرچہ حنفیہ کے نزدیک خلاف اَولیٰ ہے۔

ولو زاد تابعه الى ستة عشر لأنه مأثور، وقال الشامي في حر: مطلب تجب طاعة الامام فيما ليس بمعصية، وذكر في البحر ان الخلاف في الأولوية ونحوه في الحلية (الدر المختار)(۲)۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۷ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۳/۱۸ الف)

ایک ہی مقام پر عید کی دو جماعتیں کرانے کی دو صورتوں کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں کہ ہم لوگ پاکستان

---

(۱) وفي البحر الرائق كتاب الصوم ج ۲ ص ۲۵۸ طبع سعيد: ومنها صوم ستة من شوال عند أبي حنيفة مفرقا كان أو متتابعا وعن أبي يوسف كراهته متتابعا لا مفرقا، لكن عامة المتأخرين لم يروا به بأسا

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج ۲ ص ۱۷۳ طبع سعيد، وفي الهندية باب صلاة العيدين ... عشر في صلوة العيدين ج ۱ ص ... طبع ... قال محمد رحمه الله في الجامع ... الى ... مع الامام في صلوة العيد ... فكبر الامام غير ذلك ... الامام ... يكبر ما يكبره احد من الفقهاء فحينئذ لا يتابعه كذا في المحيط (محمد زبیر حق نواز)

جیسے مزدور اپنی اپنی شفٹ میں کام کرتے ہیں، اور ایک شفٹ کی ڈیوٹی سے فراغت کے نصف گھنٹے بعد دوسری شفٹ ڈیوٹی پر حاضر ہوتی ہے، اس مناسبت سے ہمارے ہاں عیدین کی نمازیں بھی دو مرتبہ ایک ہی جگہ ادا کی جاتی ہیں، جس کی صورت مندرجہ ذیل ہے:-

۱- ایک ہی جگہ میں ایک مسجد میں دو مرتبہ صلوٰۃ عید نصف، نصف گھنٹے اور وقفے کے بعد ایک امام کی اقتداء میں ادا کی جاتی ہے، جبکہ امام ایک ہے اور مقتدی پہلی صلوٰۃ میں ایک شفٹ کے لوگ ہوتے ہیں اور دوسری مرتبہ اقتداء کرنے والے دوسری شفٹ کے لوگ ہوتے ہیں۔

۲- ایک ہی جگہ اور ایک مسجد میں دو مرتبہ جماعت عیدین اس طرح ہوتی ہے کہ اوّل مرتبہ پہلی شفٹ ایک امام کی اقتداء میں اور دوسری شفٹ دوسرے امام کی اقتداء میں ادا کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک جگہ اور ایک مقام میں صلوٰۃ عیدین کی جماعت اولیٰ اور جماعت ثانیہ ایک ہی امام کی اقتداء میں جائز ہے یا ناجائز؟ جبکہ پہلی صورت میں مقتدی تبدیل ہوگئے لیکن امام ایک ہی ہے، اور دوسری صورت میں امام بھی مختلف اور مقتدی بھی مختلف ہیں، لیکن عیدگاہ وجائے نماز ایک ہے، تو کیا ایک عیدگاہ میں جماعت ثانیہ سے صلوٰۃ عیدین جائز ہوگی یا نہیں؟ اور ان دونوں میں سے کون سی نماز صحیح ہوگی؟

جواب:- مسئولہ دو صورتوں میں پہلی صورت یعنی ایک ہی امام کے پیچھے دو الگ الگ جماعتیں بالکل جائز نہیں اور اس صورت میں دوسری جماعت کے لوگوں کی نماز بھی نہیں ہوگی،(۱) اور دوسری صورت بھی بغیر شدید اور ناگزیر مجبوری کے اختیار کرنی درست نہیں،(۲) لہٰذا یا تو ایک ہی امام کے پیچھے تمام افراد کے ایک وقت نماز ادا کرنے کا انتظام کیا جائے یا اگر دو جماعتیں کسی وجہ سے ناگزیر ہوں تو دو الگ الگ مسجدوں یا عیدگاہوں میں دو الگ الگ اماموں کے پیچھے ادا کی جائیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۶/۱۲/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۸۱/۳۷ و)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۷۹، ۵۹۰ (ولا یصح اقتداء) .... مفترض بمتنفل .... الخ
نیز دیکھئے فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۵ ص ۲۲۳ (سوال نمبر ۲۶۸۷)۔

(۲) ایک جگہ میں متعدد صلوٰۃ عید جائز نہیں۔ وفی البحر الرائق باب العیدین ج ۲ ص ۱۶۲: وقد وقعت مع الامام ومکنه ان یذهب الی مکان آخر فیه یصلی فیه لانه یجوز تعددها فی مصر واحد فی موضعین واکثر اتفاقاً
نیز دیکھئے امداد الاحکام ج ۱ ص ۷۳۳۔ (محمد زبیر حق نواز)

جگہ کی تنگی کی بناء پر ایک ہی جگہ عید کی دو جماعتوں کا حکم

سوال:- ایک مسجد میں عیدین کے موقع پر جگہ کی تنگی کی وجہ سے اور مستقل الگ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ انتظام کرنے کی وجہ سے عید کی نماز اس مسجد میں جہاں پہلی جماعت ہوتی ہے، دوسری جماعت مذکورہ شکایت کی بناء پر جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جگہ کی تنگی کی بناء پر اگر ایک ہی جگہ عید کی دو جماعتیں کرلی جائیں تو عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں، حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: "ظاہر عبارات فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدد نماز عید مطلقاً جائز ہے، ایک موضع میں ہو یا دو مواضع میں، جیسا کہ طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں لکھتے ہیں: ولو قدر بعد الفوات مع الامام علی ادراکها مع غیره فعل، للاتفاق علی جواز تعددها"(١) (مجموعة الفتاوی ج ١ ص ٣٤٩)۔(٢)

واللہ اعلم
٦/٥/١٣٠٦ھ
(فتویٰ نمبر ٢٧٠/٣٧ ب)

نمازِ عید کے بعد دُعا ہو یا خطبے کے بعد؟

سوال:- عید الفطر سے قبل ایک عالم صاحب نے جو کہ عالم بھی ہیں، اثناء تقریر میں کہا کہ عیدین کی نمازوں کے بعد دعا مانگنا ثابت نہیں، اس بات کی تحقیق میں علم الفقہ دیکھی، اس میں یہ عبارت درج تھی: "بعد نماز عیدین کے یا بعد خطبے کے دعا مانگنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب سے منقول نہیں، اگر ان حضرات نے بھی دعا مانگی ہوتی تو ضرور نقل کی جاتی، لہٰذا بغرض اتباع دعا نہ مانگنا بہتر ہے۔" (ص ٢٩٠) یہ عبارت مولوی صاحب کی تائید کے لئے کافی ہے۔ بہشتی زیور میں اس کے برعکس عبارت مذکور ہے کہ "گو نبی اور صحابہ و تابعین سے منقول نہیں مگر چونکہ ہر نماز کے بعد دعا مسنون ہے اس لئے عیدین میں بھی دعا مانگنا مسنون ہوگا" اس کی وضاحت فرمادیں تاکہ اطمینان ہو۔

جواب:- ان مولوی صاحب نے جو بات کہی ہے وہ صحیح ہے، عیدین میں نماز کے بعد دعا مانگنا مسنون ہے، خطبے کے بعد مسنون نہیں، حقیقت وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھی ہے کہ اگرچہ خاص عیدین میں نماز کے بعد دعا مانگنا روایت سے ثابت نہیں، لیکن چونکہ ہر نماز کے بعد دعا کرنا ثابت

---

(١) حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص ٣٩٢ طبع نور محمد کتب خانہ۔
(٢) [illegible]
(٣) [illegible]

ہے اس لئے اس میں عیدین بھی شامل ہیں، اور خطبے کے بعد دعا کرنے کا ثبوت نہیں ملتا، اور اکابر دیوبند کا معمول بھی یہی رہا ہے، اور بہشتی زیور فقہی اعتبار سے "علم الفقہ" کے مقابلے میں زیادہ مستند اور معتبر کتاب ہے۔

واللہ اعلم

۲۶/۳/۱۳۹۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۳۵۷ ب)

نمازِ عید میں تکبیرات چھوڑ کر امام سورۂ فاتحہ شروع کر دے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- عید الفطر کی نماز میں امام صاحب نے نیت باندھ کر ثناء پڑھ کر الحمد شریف پڑھنا شروع کر دیا، اس کے بعد پیچھے سے کسی نے لقمہ دیا، لقمہ ملنے پر امام صاحب نے الحمد شریف وہاں روک کر دو زائد تکبیریں کہہ کر پھر سے الحمد شریف شروع کی، ایک تکبیر پھر بھی رہ گئی، کیا اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں؟

جواب:- عید کی تکبیرات زائدہ واجب ہیں، اگر امام بھول جائے اور انہیں چھوڑ کر سورۂ فاتحہ شروع کر دے تو جب تک قراءت مکمل نہ ہوئی ہو یاد آنے یا کسی کے لقمہ دینے پر تکبیریں کہنی چاہئیں اور تکبیروں کے بعد قراءت از سرِ نو کرنی چاہئے، لہٰذا امام صاحب نے یہ کام تو ٹھیک کیا کہ سورۂ فاتحہ روک کر تکبیریں کہیں، لیکن ایک تکبیر چھوڑ دی، قاعدے سے اس پر سجدۂ سہو لازم ہونا چاہئے تھا، لیکن عیدین میں سجدۂ سہو لازم نہیں ہوتا، اس لئے مذکورہ نماز ہوگئی۔

فی رد المحتار: ان بدأ الامام بالقراءة سهوا فتذكر بعد الفاتحة والسورة يمضي في صلاته، وان لم يقرأ الا الفاتحة كبّر وأعاد القراءة لزوما۔[1]

وفيه ايضا: ان العود الى التكبير قبل تمام القراءة ليس لاجل المستحب الذي هو الموالاة، بل لاجل استدراك الواجب الذي هو التكبير (شامی باب العیدین)۔

وفي الدر المختار: والسهو في صلوة العيد والجمعة والمكتوبة والتطوع سواء، والمختار عند المتأخرين عدمه في الاوليين لدفع الفتنة كما في جمعة البحر واقره المصنف وبه جزم في الدر (شامی باب سجود السهو)۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم

۵/۱۰/۱۳۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۵۳/۲۷ و)

(۱، ۲) رد المحتار ج:۲ ص:۱۷۳ (طبع سعید)

(۳) رد المحتار ج:۲ ص:۹۲ (طبع سعید) (محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہ)

فصل فی المسائل الجدیدة والمتفرقة المتعلقة بالصلوٰة

(نماز سے متعلق جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

نماز میں اسپیکر کا استعمال

سوال:- احقر کی مسجد میں جمعہ کے دن قریبی خطیب سے شدید آواز تقریر کی سخت مشوش ہے، احباب خصوصی کی رائے ہے کہ اگر صرف اندرونِ مسجد کا ہارن استعمال کیا جائے تو تمام نمازیوں کی نماز سکون سے ادا ہوگی۔ ورنہ تمام نمازی خطیب صاحب کی تقریر سے پریشان رہتے ہیں، بعض بزرگانِ دین نماز اور خطبے میں اندرونِ مسجد کا ہارن استعمال کرنا بھی پسند نہیں کرتے، اس لئے احقر بھی نماز اور خطبے میں یہاں آلہ مکبر الصوت کا استعمال نہ کرتا تھا، لیکن تمام نمازیوں کے اضطراب اور تشویش کے پیش نظر آپ سے مراجعت ہے کہ اندرونِ مسجد کے ہارن سے اگر خطبہ اور نماز جمعہ ادا کی جائے تو کیا کوئی شرعی قباحت ہے؟ جبکہ احتیاطاً مکبرین کا انتظام بھی رکھا جاتا ہے کہ اگر خدانخواستہ بجلی فیل ہو تو نماز میں خلل نہ ہو، اور آلہ مکبر الصوت وہ ہے جو منبر کے پاس لگا دیتے ہیں۔ والسلام

(المستفتی مولانا) حکیم محمد اختر (صاحب مدظلہم)
خانقاہ امدادیہ اشرفیہ، گلشن اقبال کراچی

جواب:- نماز میں آلہ مکبر الصوت کا استعمال جائز ہے، اور اس سے نماز فاسد بھی نہیں ہوتی، تاہم اگر کوئی بعض علماء کے اختلاف کی بناء پر احتیاط کرے تو اچھا ہے، لیکن استعمال کرنے والوں پر نکیر نہ کرنی چاہئے، بشرطیکہ وہ حدود کے اندر استعمال کرتے ہوں۔ مسئلے کی علمی تحقیق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی کتاب "آلاتِ جدیدہ" میں موجود ہے۔(۱)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اندر کا مکبر الصوت کھولنے میں شرعی قباحت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۲/۵/۱۴۰۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۸/۸۰۹ ج)

---

(۱) مزید وضاحت کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے آرہا ہے۔ (از مرتب عفی عنہ)

کیا لاؤڈ اسپیکر پر نماز ہوجاتی ہے؟

سوال:- آلۂ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) پر فرض نماز جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کیوں؟ کریم آباد بلاک نمبر ۴ کی مسجد میں یہ مسئلہ نزاعی صورت اختیار کرگیا ہے، دو گروہوں میں شدید کشیدگی ہے۔

جواب:- لاؤڈ اسپیکر پر نماز فرض جائز ہے اور بلاکراہت ہوجاتی ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ ضرورت کے بغیر لاؤڈ اسپیکر استعمال نہ کیا جائے، اس مسئلے کے تفصیلی دلائل مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے ''آلۂ مکبر الصوت'' میں موجود ہیں، یہ رسالہ ''آلات جدیدہ'' میں طبع ہوا ہے، تفصیل کے لئے اس کو دیکھ لیا جائے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۳۱ /۲۷ د)

کیا لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھنے میں زیادہ ثواب ہے؟

سوال:- کیا جہری نمازیں لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا زیادہ ثواب ہے جبکہ آواز دور دور تک جاتی ہے؟

جواب:- جب تک ضرورت نہ ہو نماز بغیر لاؤڈ اسپیکر کے پڑھنی چاہئے، لاؤڈ اسپیکر پر نماز کا جواز تو ضرورت کی حالت میں ہے، بلا وجہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال پسندیدہ نہیں، بالخصوص جبکہ اس سے دور دور آواز جاتی ہو جہاں لوگ نیند یا دوسرے کاموں میں مشغول ہوں، تو اس کے استعمال کی کراہت اور بڑھ جاتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۲ /۲۸ ج)

مسجد میں خانۂ کعبہ ومسجدِ نبوی کی تصاویر آویزاں ہوں تو ایسی صورت میں نماز کا حکم

سوال:- اکثر مسجدوں میں کعبہ شریف اور مدینہ منورہ کی تصویریں آویزاں ہوتی ہیں، اس حالت میں نماز میں کوئی نقص تو نہیں ہوگا؟

جواب:- نماز تو ہوجاتی ہے، لیکن ان کی تصویریں نمازی کے سامنے ہونا کچھ بہتر نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ

---

(۱) اور خود حضرت والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے آرہا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کے شرعی احکام

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ آلۂ جبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) تراویح کے لئے اس قدر تیز استعمال ہوتا ہے کہ پورے محلے میں اس کی آواز پہنچ جاتی ہے، جس میں حسب ذیل قباحتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱- محلے کی خواتین کو نماز پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

۲- محلے کے مریض اور ضعیف جن کو علاج جلد سونا ضروری ہو، نہیں سو سکتے۔

۳:- تلاوت کو ادب سے سماعت کا اہتمام محلے والوں سے نہیں ہوتا۔

۴:- سجدۂ تلاوت کا اگر وجوب لاؤڈ اسپیکر سے ہوتا ہے تو اہل محلہ کے ضعفاء اور خواتین پر سجدۂ تلاوت واجب کرنا اور ان کی طرف سے اس کی ادائیگی سے اہتمام و فقدان یا مشکل ہونا۔

اس سلسلے میں شریعت کے احکامات سے آگاہ و مستفیض فرمائیے۔ والسلام مع الاکرام۔

المعروض

(مولانا) حکیم محمد اختر صاحب مدظلہ

مدرسہ اشرف المدارس، گلشن اقبال، کراچی

جواب:- تراویح میں لاؤڈ اسپیکر اس قدر اونچی آواز سے استعمال کرنا کہ جس سے سوال میں مذکورہ قباحتیں لازم آتی ہوں، جائز نہیں۔ چنانچہ فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ذکر اللہ اتنی آواز سے کرنا کہ جس سے کسی کی عبادت یا نیند میں خلل آتا ہو، جائز نہیں، نیز مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات باہر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت عمر نماز پڑھ رہے ہیں اور بہت بلند آواز سے تلاوت فرما رہے ہیں، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ بھی نماز میں ہیں اور آہستہ آواز سے تلاوت فرما رہے ہیں، پھر جب دونوں حضرات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق سے فرمایا کہ میں تمہارے پاس سے گزرا تو تم نماز میں تھے اور آہستہ تلاوت کر رہے تھے، حضرت ابوبکر صدیق نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے اس ذات کو سنا دیا جس سے میں سرگوشی کر رہا تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میں تمہارے پاس سے گزرا تو تم نماز میں تھے اور بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے، حضرت عمر نے عرض کیا کہ میں اونگھنے والوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکر! تم اپنی آواز (تھوڑی) بلند کرو اور حضرت

عمرؓ سے فرمایا اپنی آواز کچھ پست کرو۔ (مشکوٰۃ شریف ج۱ ص [illegible] باب ما یقول اذا قام اللیل)[1]

اس حدیث شریف سے بھی معلوم ہوا کہ اتنی بلند آواز سے تلاوت کرنا کہ جس سے بیماروں کے آرام اور خواتین کی نمازوں میں خلل ہوتا ہو صحیح نہیں، اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے، اور لاؤڈ اسپیکر کا استعمال بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت کرنا چاہئے۔

قال الشامی: وفی حاشیة الحموی عن الامام الشعرانی: اجمع العلماء سلفا وخلفا علی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرها الا ان یشوش جهرهم علی نائم او مصل او قارئ. اهـ (ج۱ ص ۶۶۰)[2]۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی
۲۱/ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ[3]

نماز میں (آلۂ مکبر الصوت) اسپیکر کے استعمال کی شرعی حیثیت

سوال:- نومبر ۱۹۹۰ء کے رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماع میں شرکت کی، ایک چیز نے مجھ کو بڑا متفکر کیا، وہ تھی نماز کے دوران لاؤڈ اسپیکر کا عدم استعمال۔ اس سے اتنی خرابیاں پیدا ہوئیں کہ لاکھوں نہیں تو ہزاروں لوگوں کی نمازیں خراب ہوئیں، تین دن تک آخری لوگوں کے سامنے زیادہ تر یہی موضوع زیر بحث رہا کہ بھائی میں سجدے میں تھا، اور میں رکوع میں تھا، اور پتہ نہیں کہ امام صاحب اس وقت کس حالت میں تھے؟ کافی لوگوں نے دوسری اوقات کی نمازیں لوٹائیں، مزید یہ کہ خشوع جو نماز کی جان ہے سارے کے سارے مجمع کی آواز نہ پہنچنے کی وجہ سے مفقود ہو جاتا تھا، میرے سمیت اکثر حضرات سجدہ اور رکوع میں کان لگائے رہتے کہ تکبیر سن سکیں۔ اکثر حضرات کو امام سے پہلے سر اٹھا کر دیکھتے بھی دیکھا گیا، وہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اگلی صف کا کیا حال ہے؟ اتنے بڑے اجتماع میں لاؤڈ اسپیکر اگر دوران نماز استعمال کر لیا جائے تو کیا نماز زیادہ بہتر طریقے پر ادا نہیں ہوگی؟ کیا یہ شرعی رخصت کی حیثیت میں نہیں ہے؟ اگر ہے تو اس سے اجتناب کیوں؟

جواب:- نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے مسئلے پر مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کا مستقل رسالہ ”آلۂ مکبر الصوت کے شرعی احکام“ شائع ہو چکا ہے، جس میں حضرت

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانہ)
(۲) رد المحتار فی رفع الصوت بالذکر ج۱ ص ۶۶۰ طبع سعید
(۳) [illegible]
(۴) [illegible] شرعی احکام [illegible]

قدس سرہ نے یہ تحقیق فرمائی ہے کہ آلۂ مکبر الصوت پر نماز پڑھنے سے نماز بلا کراہت ہو جاتی ہے، اور پاکستان و ہندوستان کے دوسرے جلیل القدر علماء نے جن میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی وغیرہ بھی داخل ہیں، اسی فتویٰ کی تصدیق فرمائی ہے۔ البتہ ساتھ ہی حضرت مفتی اعظم قدس سرہ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ نماز جتنی سادگی سے ادا کی جائے اور اس میں خارجی آلات کا استعمال جتنا کم سے کم کیا جائے، اور بندے کا براہ راست تعلق اپنے اللہ سے جتنا بلا واسطہ ہو اتنا ہی بہتر ہے، نیز آلۂ مکبر الصوت کے استعمال سے لاؤڈ اسپیکر کے خراب ہونے وغیرہ کی صورت میں بعض مفاسد بھی سامنے آگئے تھے، اس لئے مذکورہ رسالے میں مشورہ یہی دیا گیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے اس کے بغیر نماز پڑھنی چاہئے، تاہم اگر نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہو جائے گی۔ بعض دوسرے اہل فتویٰ مثلاً حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ نے اپنی تحریر میں مزید وضاحت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ”تکبیر امام کی آواز سامعین و مقتدیوں تک پہنچانا ہو تو ان تک آواز پہنچانا غیر مقصود نہیں، بلکہ تحصیل مقصود ہے، بالخصوص جبکہ تحصیل مقصود آسانی ہو، دشواری سے نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ آلۂ مکبر الصوت سے آواز کا بلند ہونا اور دور دور تک پہنچنا، بناء محراب و بناء گنبد سے زیادہ آسان ہے، اور بناء محراب و بناء گنبد بلا نکیر مدت مدیدہ سے رائج ہے، اور اس سے بھی رفع صوت امام مقصود ہے۔ مگر نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال دو شرطوں سے جائز ہے، ایک یہ کہ لاؤڈ اسپیکر اسی قسم کا ہو کہ امام کو اس کی طرف منہ کرنے کی ضرورت نہ ہو کہ توجہ الی غیر اللہ مقصود صلوٰۃ کے منافی ہے، دوسرے مکبرین کا انتظام مکمل ہو، تاکہ میکروفون فیل ہو جائے تو نماز میں گڑبڑ نہ ہو۔“　　(آلات جدیدہ ص ۷)

اس تشریح سے واضح ہوا کہ آلۂ مکبر الصوت کا استعمال نماز میں ان شرطوں کے ساتھ جائز ہے، البتہ جہاں مکبرین سے کسی انتشار کے بغیر کام چل سکتا ہو، وہاں زیادہ بہتر اور مناسب یہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر استعمال نہ کیا جائے، تاکہ علماء کے قول پر کسی ادنیٰ کراہت کے بغیر نماز ہو جائے۔ لیکن جو صورت آپ نے سوال میں لکھی ہے، اگر وہ صحیح ہے کہ مجمع کی کثرت کی وجہ سے لاؤڈ اسپیکر کے بغیر زیادہ انتشار پیدا ہوتا، تو جہاں ایسا اندیشہ ہو، وہاں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال یقیناً زیادہ مناسب اور بہتر ہوگا اور اس کے ساتھ نماز کے بلا کراہت درست ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۱/۷/۸ھ

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۰ / ۷ ۱۴۱۱ھ)

تراویح میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا حکم اور اسپیکر میں تراویح کے دوران آیتِ سجدہ آنے والی ہو تو کیا کیا جائے؟

سوال:- میں جس مسجد میں قرآن سنا رہا ہوں وہ مسجد چھوٹی ہے، اور امام کی آواز مقتدیوں تک بآسانی پہنچ جاتی ہے، اس کے باوجود آٹھ سال سے اس مسجد میں لاؤڈ اسپیکر پر تراویح ہو رہی ہے اور اکثریت کی رائے ابھی یہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر حسبِ سابق تراویح ہوتی رہے لیکن ایک دو آدمی اس کے مخالف ہیں، اور وہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے تراویح پڑھانے پر زور دیتے ہیں۔

اسی اثناء میں ایک دو روز لاؤڈ اسپیکر خراب رہا تو متصل کی دُکانوں اور ہوٹل سے ریکارڈنگ کی آوازیں اس قدر آتی رہیں کہ تراویح پڑھنا دُشوار ہوگیا، منع کرنے کے بعد بھی وہ نہ مانے، اس کے علاوہ اگر لاؤڈ اسپیکر پر نماز نہ پڑھی جائے تو قریب کی مسجد کی آوازیں بھی خلل انداز ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے، اگر ہم اپنی مسجد میں حسبِ سابق لاؤڈ اسپیکر پر تراویح پڑھتے رہیں، تو ان خللوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں، لیکن ایک دو آدمی جھگڑا کرتے ہیں کہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے تراویح پڑھو، کل رات تو اس پر جھگڑے کی نوبت زیادہ آگئی تھی، ان حالات میں شرعاً کیا حکم ہے؟

۲- آیتِ سجدہ اگر تراویح کی رکعتوں میں آجائے تو کیا لاؤڈ اسپیکر بند کرکے پڑھنی ہوگی یا حسبِ سابق دُوسری رکعتوں کے، یہ بھی لاؤڈ اسپیکر پر پڑھی جاتی رہے؟

جواب ۱:- سوال میں آپ نے جو حالات لکھے ہیں ان کے پیشِ نظر لاؤڈ اسپیکر پر تراویح پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں[1]، البتہ بہتر یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز اتنی پست رکھی جائے کہ مسجد سے باہر دُور تک آواز نہ جائے۔

۲- اگر مسجد کے باہر آواز نہ جاتی ہو یا بہت ہلکی جاتی ہو تب تو آیتِ سجدہ بھی لاؤڈ اسپیکر پر پڑھ لیں، ورنہ آیتِ سجدہ پڑھتے ہوئے یا اپنی آواز بہت پست کردے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو جن دو رکعتوں میں آیتِ سجدہ آنے والی ہو لاؤڈ اسپیکر بند کردیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۹۱ /۲۸ ج)

ریل میں دورانِ سفر نماز کیسے پڑھی جائے؟

سوال:- ریل میں دورانِ سفر نماز کیسے پڑھی جائے؟ نیز اگر کھڑے ہوکر، نیز یہ بتائیے کہ

(۱) تفصیل اگلے فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

دورانِ سفر اگر قبلے کی طرف رُخ صحیح نہ ہو تو کیا نماز ہو جائے گی؟

جواب:- کھڑے ہو کر ہی پڑھنا واجب ہے،[1] اور قبلے کی طرف رُخ کرنا فرض ہے، اس کے بغیر نماز نہ ہوگی۔ اگر رُخ معلوم نہ ہو تو معلوم کرنے کے لئے اپنی سی پوری کوشش کریں، اور جس طرف گمان غالب ہو، ادھر رُخ کر کے نماز پڑھ لیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۸/۱/۱۴۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۶۵/۵۸)

ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنا جائز ہے

سوال:- ہوائی جہاز میں سفر کے دوران نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ جہاز میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جائز ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۸/۱/۱۴۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۶۵/۵۸)

بے نمازی کا حکم

سوال:- بے نمازی کا کیا حکم ہے؟ سنا ہے بے نمازی کتے سے بھی بدتر ہے؟ کیا اس کا جھوٹا جائز ہے؟

جواب:- بے نمازی فاسق ہے، لیکن کسی مسلمان کو کتے سے بدتر کہنا درست نہیں۔[3]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۱/۲/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی تنویر الأبصار ج ۱ ص ۴۴۴، ۴۴۵ (طبع سعید) من فرائضها ومنها القيام فی فرض لقادر عليه

(۲) تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۳۹۴ تا ۳۹۶ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفی مشكوة المصابيح، باب حفظ اللسان والغيبة والشتم ج ۲ ص ۴۱۱ (طبع قديمی كتب خانه) سباب المسلم فسوق وقتاله كفر

کتاب الجنائز

(نمازِ جنازہ اور تجہیز و تکفین کے مسائل)

۱:- نمازِ جنازہ پڑھانے میں کس امام کو مقدم کیا جائے گا؟
۲:- مرد نہ ہونے کی صورت میں کیا عورت پر نمازِ جنازہ پڑھنا لازم ہے؟

سوال:- هل امام الجمعة مقدم على امام مصلى العيد لصلوة الجنازة أم امام مصلى العيد مقدم على امام الجمعة؟ مع الحوالة.

جواب:- لم أر من صرح بهذا والذي ينبغي أن يقدم امام الجمعة لان الرضاء به اتم واكثر من امام مصلى العيد وهو العلة في التقديم في صلوة الجنازة، والله اعلم

سوال:- اذا نقل الميت من موضعه الى موضعة أخرى لضرورة فأيها أحق بالامامة؟ امام موضعة الميت أم امام موضعة الذي نقل فيها الميت؟

جواب:- امام الحيّ الذي كان يسكنه الميت أولى من امام الحيّ الذي انتقل اليه لأن علة تقدم امام الحيّ ان الميت رضي بالصلوة خلفه حال حياته فينبغي ان يصلي عليه بعد وفاته كما صرح به الشاميّ في رد المحتار[1] والحلبيّ في شرح المنية (ص ۵۸۱)[2] وهذه العلة انما توجد في امام الحيّ الذي كان الميت يسكنه دون الحيّ الذي انتقل فيه

سوال:- اذا مات الرجل في نساء ليس فيها أحد من الرجال فعلى المرأة صلوة الجنازة أم لا؟

جواب:- نعم لا مانع من وجوب صلوة الجنازة على النساء اذا لم يكن في الحيّ رجال غير أنه لا يجوز لهن غسله وانما عليهن التيمم. لما في الدر المختار ماتت بين رجال أو هو بين نساء يممه المحرم فان لم يكن فالأجنبي بخرقة (شامی)[3] واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۳/۱۹ الف)

---

(۱) وفي الدر المختار ج ۲ ص ۲۲۰ طبع ايج ايم سعيد: امام الحي وفي الشامية تحته: ... وانما كان أولى لان الميت رضي بالصلوة خلفه في حال حياته فينبغي ان يصلى عليه بعد وفاته الخ

(۲) غنية المتملي ص ۵۸۵ (طبع سهيل اكيدمي لاهور)

(۳) الدر المختار ج ۲ ص ۲۰۱ (طبع سعيد)

جنازہ لے جاتے وقت چالیس قدم گن کر میّت کو ایصالِ ثواب کرنے کا حکم

سوال:- میت کا جنازہ اٹھاتے وقت ہمارے ہاں عوام میں یہ مروج ہے کہ چالیس قدم تک گنے جاتے ہیں اور میت کو ان کا ثواب پہنچایا جاتا ہے، کیا شرعی طور پر اس کا کوئی جواز ہے؟

جواب:- اس طرح قدم گننے اور ان کا ثواب پہنچانے کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں، یہ رسم واجب الترک ہے۔

واللہ اعلم

۲۲/۱۰/۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۹۶/۳۲ ن)

مردے کو دو مرتبہ غسل دینے کی رسم

سوال:- ہمارے یہاں رواج ہے کہ مردے کو دو مرتبہ غسل دیا جاتا ہے، ایک غسل انتقال کے وقت فوراً قرآن پڑھنے کے لئے دیا جاتا ہے، اور دوسرا غسل جنازہ اٹھاتے وقت، اور اوّل غسل ٹھیک ہوا بھی ہو، کوئی نجاست وغیرہ ظاہر نہ بھی ہو، تب بھی دوسرا غسل ضرور دیتے ہیں، شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- مردے کو صرف ایک مرتبہ غسل دینا مشروع ہے اور یہ کام وفات کے بعد جلد از جلد ہونا چاہئے،(۱) دو مرتبہ غسل دینے کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں ہے، یہ طریقہ واجب الترک ہے۔

واللہ اعلم

۱۲/۶/۱۳۹۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹۱/۲۹ ب)

بیوی کے انتقال کے بعد شوہر کے لئے اس کا چہرہ دیکھنا کیسا ہے؟

سوال:- ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہوجائے تو کیا اس کا خاوند بعد از وصال اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ اور جنازہ بھی اُٹھا سکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح عورت اپنے خاوند کے چہرے کو دیکھ سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- شوہر کے لئے اپنی بیوی کا چہرہ مرنے کے بعد دیکھنا بالاتفاق جائز ہے، البتہ اسے چھونے یا غسل دینے سے فقہائے حنفیہ نے منع کیا ہے، اور بیوی اپنے شوہر کے مرنے کے بعد اسے

---

(۱) وفی الدر المختار ج ۲ ص ۲۳۹ (طبع ایچ ایم سعید) یندب دفنه فی جهة موته وتعجیله وفی الشامیة تحته (قوله وتعجیله) ای تعجیل جهازه عقب تحقق موته ... الخ

دیکھ بھی سکتی ہے اور غسل بھی دے سکتی ہے۔

لما في الدر المختار: ويمنع زوجها من غسلها ومسها لا من النظر إليها على الأصح، وهي لا تمنع من ذلك. (شامي)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۲/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۷/۲۹ الف)

مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال:- ہماری نگری کی مدینہ مسجد کو تعمیر ہوئے ۱۵ سال تقریباً ہوگئے، تب سے جنازے کی نماز مسجد کے میدان میں ہوا کرتی تھی، امام صاحب کی امامت کے آخری ایام میں محراب کے بیچ میں کھڑکی توڑ کر دروازہ بنادیا گیا اور محراب کے باہر چار فٹ اونچا چبوترہ بنایا گیا، اب چبوترے پر جنازہ رکھ دیا جاتا ہے اور محراب کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، جنازوں کی نماز مسجد میں پڑھی جاتی ہے، نئے امام صاحب نے جنازے کی نماز کا یہ طریقہ بند کردیا ہے اور پہلے کی طرح نماز کھلے میدان میں ہونے لگی ہے، مولانا مفتی محمد اسماعیل صاحب نے گجراتی کتاب میں جو فتویٰ کی کتاب ہے، لکھا ہے کہ جنازے کی نماز کی حالت میں مسجد میں پڑھنا مذہب حنفی میں مکروہ تحریمی ہے۔ اب کون سا طریقہ درست تھا؟ بہشتی گوہر میں مسئلہ یہ لکھا ہے؟ اور کہا جاتا ہے کہ حرمین میں مسجد میں نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے، آپ واضح فرمائیں کیا حکم ہے؟

جواب:- میت کو محراب سے باہر رکھ کر اگر نماز جنازہ مسجد کے اندر پڑھی جائے تو راجح قول کے مطابق یہ صورت بھی مکروہ ہے، البتہ اگر آس پاس نماز جنازہ پڑھنے کے لئے کوئی اور جگہ نہ ہو تو مجبوراً فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن چونکہ صورت مسئولہ میں مسجد کے ساتھ مسجد ہی کا کھلا میدان موجود ہے اس لئے جس مسجد کے بارے میں سوال ہے وہاں مسجد کے اندر بلاعذر نماز پڑھنا مکروہ ہے، نئے امام صاحب کا طریقہ درست ہے جو نماز جنازہ کھلے میدان میں پڑھتے ہیں، یہی کرنا چاہئے،

لما في الدر المختار: واختلف في الخارجة عن المسجد وحده أو مع بعض القوم والمختار الكراهة مطلقًا خلاصة. وهو الموافق لإطلاق حديث أبي داؤد من صلّى على ميّت في المسجد فلا صلوة له. (وقال الشامي: إنما تكره في المسجد بلا عذر فإن كان فلا. شامي)۔[2]

بہشتی گوہر[3]، امداد الفتاویٰ[3] وغیرہ سب میں مسئلہ اسی طرح ہے، اور جب مسجد کے ساتھ کھلی جگہ

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۱۹۸ (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) الدر المختار مع رد المختار ج:۲ ص ۲۲۵، ۲۲۶ (طبع سعید)
(۳) بہشتی گوہر ص ۹۳ مسئلہ نمبر ۱۷ (طبع میر محمد کتب خانہ)۔ (۳) امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۵۳۳، ۵۳۴۔

موجود ہے تو مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی کی بحث میں نہیں پڑنا چاہئے، باہر ہی نماز پڑھنی چاہئے۔ حرمین شریفین کے امام صاحب، مذہب میں حنبلی ہیں، اور حنبلی مذہب کے اندر مسجد میں نماز جنازہ جائز ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۳/۲۸ ب)

مسجد میں نمازِ جنازہ کا حکم (فارسی)

سوال:- در صحن مسجد شیخ وقتی یا در صحن جامع مسجد بصورت خیمہ معقد نماز جنازہ جائز بلا کراہت است یا نہ؟

جواب:- نمازِ جنازہ در مسجد جائز نیست کذا فی کتب الفقہ۔[2]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۳۲۶/۱۹ الف)

لحد گر جانے کی وجہ سے دوبارہ قبر بنانے کا حکم

سوال:- میت کو دفن کر کے لحد میں رکھ دیا، اور لحد میت کے اوپر گر گئی، اب اکثر لوگ چاہتے ہیں کہ لحد صاف کر دیں یا کوئی اور قبر کھود کر دفن کریں، اس میت کے بارے میں غسل اور دوبارہ کفن کا کیا حکم ہے؟

جواب:- غسل تو دوبارہ نہیں دیا جائے گا، لیکن لحد گر جانے کی وجہ سے دوبارہ قبر بنانے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر قبر پر مٹی نہیں ڈالی گئی تھی تب تو مردے کو نکال کر دوبارہ قبر بنانے کی اجازت ہے۔

لأنه ليس نبش كما في البدائع، ولو وضع لغير القبلة فإن كان قبل اهالة التراب عليه وقد سرّحوا اللبن ازالوا ذلك لأنه ليس نبش وإن اهيل عليه التراب ترك ذلك لأن النبش حرام. (بدائع ج:١ ص:٣١٩)۔[3]

اور اگر مٹی ڈال دی گئی تھی تو مردے کو منتقل نہ کیا جائے بلکہ اس کو وہیں باقی رکھتے ہوئے لحد کی مرمت کر دی جائے۔

(۱) وفي المغني لابن قدامة مع الشرح الكبير ج ۲ ص ۳۵۸ (طبع دار الكتاب العربي بيروت) ولا بأس بالصلوة على الميّت في المسجد اذا لم يخف تلويثه ... الخ

(۲) حوالے کے لئے دیکھئے پچھلے فتوے کا حاشیہ نمبر ۲، وامداد المفتیین ص ۴۲۵۔ (محمد زبیر)

(۳) (طبع ایچ ایم سعید).

لما فی الدر المختار ولا یخرج منه بعد اهالة التراب الا لحق آدمی۔[1]

وفی ردّ المحتار وأما نقله بعد دفنه فلا مطلقاً (شامی ج ص ۲۰۲)۔[2]

اور مرمت کے لئے قبر کو کچھ کھودنا پڑے تو اس کی اجازت ہے، لما فی تنقیح الحامدیة -

سئل فیما اذا قرر القاضی زیدا المعماری فی حفر قبور الموتی وتعمیرها واصلاحها للاحتیاج لذلک لأهلیته واتقانه، ویرید بعض الحفارین منعه من ذلک بلا وجه شرعی فهل یمنع المعارض (الجواب) نعم یمنع (تنقیح الحامدیة ج ۱ ص ۸)۔[3]

واللہ اعلم

۲۲/ /۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۶/۲۸ الف)

میّت کو غسل دینے کے بعد جسم سے خون نکلنے کی صورت میں شرعی حکم

سوال – میّت کو غسل دینے کے بعد اگر کان سے خون نکل آئے تو روئی کا فوس کان میں خون کے بند ہونے کے لئے رکھنا جائز ہے؟ اسی طرح بدن کے دُوسرے اجزاء میں بھی؟

جواب – غسل دینے کے بعد اگر جسم کے کسی حصے سے خون وغیرہ نکلے تو چونکہ غسل کا لوٹانا واجب نہیں ہے،[4] اس لئے اسے محض صاف کردینا کافی ہے، تاہم اگر کان وغیرہ میں روئی رکھ دی جائے تو کچھ حرج نہیں۔ ولا بأس بجعل القطن علی وجهه وفی مخارقه کدبر وقبل وأذن وفم. (الدر المختار علی هامش الشامی ج:۱ ص ۸۵۳)۔[5]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۹ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۷۳/۱۹ الف)

میّت کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم

سوال:- بہت ساری دُشواریوں اور مشکلات کے پیشِ نظر ہر علاقے سے تعلق رکھنے والوں نے اپنی انجمنیں اور رفاہی سوسائٹیاں بنائیں اور انجمن یا سوسائٹی کے ہر رکن پر باقاعدگی سے ماہوار

---

(۱) الدر المختار ج ۲ ص ۲۳۷، ۲۳۸ (طبع سعید)

(۲) شامی ج ۲ ص ۲۳۹ (طبع ایچ ایم سعید)

(۳) طبع المکتبة الحبیبیة کوئٹہ وفی التاتارخانیة ج ۲ ص ۱۷۰ اذا خربت القبور فلا بأس بتطیینها لما روی ان النبی صلی اللہ علیه وسلم مر بقبر ابنه ابراهیم فرای فیه حجرا سقط منه فسده وصححه ثم قال من عمل عملاً فلیتقنه وفی حاشیة علاء الشامی ج ۸ ص ۲۶۶ طبع دار الفکر نقلاً عن المغنی لابن قدامة عن ابن عمر انه کان یتعاهد قبر عاصم بن عمر قال نافع توفی ابن له وهو غائب فقدم فسأل عنه فدللناه علیه فکان یتعاهد القبر ویأمر باصلاحه

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص ۱۹۷ (طبع ایچ ایم سعید) ولا یعاد غسله ولا وضوءه بالخارج منه

(۵) الدر المختار ج ۲ ص:۹۸ (طبع مذکور)

چندہ مقرر کردیا جو باقاعدگی سے دیا اور لیا جاتا ہے، اور ہر انجمن کے سالانہ انتخابات ہوتے ہیں جس میں انتظامیہ کے ممبر چنے جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اب تمام گاؤں کی سوسائٹیوں اور انجمنوں کو ملا کر پورے علاقے کے نام سے یہاں کراچی میں ایک فیڈریشن بنائی گئی ہے، جس کا نام ''یونائیٹڈ سٹی ویلفیئر فیڈریشن'' ہے، فیڈریشن کو چلانے کے لئے ہر ایک سوسائٹی سے ممبران لئے جاتے ہیں جن کا باقاعدہ کوٹہ مقرر ہے، اور ہر سوسائٹی فیڈریشن کو مقررہ چندہ ماہانہ دیتی ہے اور اس طرح فیڈریشن کا نظام بطریقہ احسن چلتا ہے، بعض وقت فیڈریشن متعلقہ سوسائٹیوں سے ہنگامی چندہ یا رقوم بھی وصول کرتی ہے۔

اب مندرجہ ذیل دو مسئلے اس کی روشنی میں عنایت فرمادیں۔

ا- ہماری فیڈریشن کی زیر نگرانی اور خرچ پر اگر خدانخواستہ ہمارے علاقے کا کوئی شخص یہاں کراچی میں حادثاتی یا طبعی موت مرا ہو اور فیڈریشن میں شامل کسی بھی سوسائٹی کا باقاعدہ ممبر اور رکن ہو اور متعلقہ سوسائٹی اس کی تصدیق کرے تو اسے شخص کی لاش کو ہماری فیڈریشن پورے کفن اور ضروری چیزوں کے ساتھ اہتمام سے بذریعہ ہوائی جہاز گھر پہنچانے کا انتظام کرتی ہے، اور اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی لاش کی دیکھ بھال اور گھر پہنچانے کے لئے بھیجا جاتا ہے تاکہ لاش اس کے لواحقین کے پاس بحفاظت پہنچائی جائے، یاد رہے کہ ہمارے علاقے کا یہاں سے فاصلہ کم از کم ایک ہزار میل ہے، مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے:-

الف:- کیا یہاں کراچی سے اتنی دور متوفی کے آبائی گاؤں میں اس کے لواحقین کے پاس لاش کو پہنچانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

ب:- اگر ہے تو شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

ج:- اگر نہیں ہے تو بھی شرعاً اس کی حیثیت کیا ہے؟

جواب دیتے وقت لاش بھیجنے کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو مدنظر رکھا جائے، چونکہ بعض اوقات جب علاقے اور قوم کا کوئی شخص یہاں طبعی یا حادثاتی موت کا شکار ہوجاتا تھا تو اپنے کسی شخص یا علاقے کے آدمی سے کوئی رابطہ نہ ہونے کی بنا پر وہ متوفی لاوارث قرار پاتا اور لاوارث سمجھ کر یہاں ہی دفن کردیا جاتا اور اس کے لواحقین کو کچھ خبر بھی نہ ہوتی۔

نیز علاقے سے متعلق کئی نئے حضرات بسلسلہ روزگار یہاں کراچی آتے ہیں، لیکن تعلق کا کوئی آدمی نہ ملا یا ملازمت نہ ملی تو بہت پریشانی ہوتی ہے، اپنا آدمی یا کوئی رفاہی ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے ایسے لوگوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے، دریافت طلب یہ ہے کہ اتنے دور اپنے علاقے میں اپنے گاؤں

کے نادار اور غریب لوگوں کی مدد اس طریقے سے شرعاً جائز ہے؟

جواب:۔ مردے کو دفن سے پہلے موت کی جگہ سے اٹھا کر دوسرے شہر لے جانا مکروہ ہے، البتہ بعض فقہاء نے اس کو جائز بھی کہا ہے، لہٰذا اس عمل کو عام معمول بنالینا درست نہیں کہ فتویٰ کراہت ہی پر ہے، البتہ کسی خاص واقعے میں کوئی شدید ضرورت داعی ہو تو بعض دوسرے فقہاء کے قول پر عمل کرکے میت کو منتقل کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ قال في شرح المنية ويستحب في القتيل والميت دفنه في المكان الذي مات فيه في مقابر أولئك القوم وإن نقل قبل الدفن قدر ميل أو ميلين فلا بأس به، قيل هذا التقدير من محمد يدل على أن نقله من بلد إلى بلد لا يجوز أو مكروه ولأن مقابر بعض البلدان ربما بلغت هذه المسافة ففيه ضرورة ولا ضرورة في النقل إلى بلد آخر وقيل يجوز ذلك ما دون السفر ولا يكره في مدة السفر أيضاً (كبيرى جنائز متفرقات)[١] وقال الشامي (قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قيل مطلقاً وقيل إلى ما دون مدة السفر وقيده محمد بقدر ميل أو ميلين، لأن مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد، قال في النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر (شامی)۔[٢]

واللہ اعلم
۱۳۸۹/۸/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۱۷ ج)

نمازِ جنازہ شروع کرنے سے پہلے امام کا نیت وغیرہ بتانا

(دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے ایک صاحب کے فتویٰ پر مستفتی کا اشکال اور اس کا جواب)

سوال:۔ آپ کا فتویٰ ۱۴/ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ کو ملا جس میں یہ لکھا تھا کہ:۔

"اس فعل کو اگر سنت سمجھ کر کیا جائے تو وقعتہ بدعت ہے، اس لئے کہ خیر القرون میں اس کا ثبوت نہیں ملا، لیکن اس زمانے میں دین کی طرف رغبت بالکل نہیں ہے، لوگوں کو نمازِ جنازہ اور عیدین وغیرہ کی نیت تک نہیں آتی، اس لئے انہیں بتادینے میں کوئی حرج نہیں۔" اگر کسی کو مسئلہ بتانے کے لئے تیمم کرکے دکھلایا لیکن دل میں اپنے تیمم کرنے کی نیت نہیں ہے بلکہ اس کو دکھانا مقصود ہے اس کا تیمم نہ ہوگا، کیونکہ تیمم ہونے میں تیمم کرنے کا ارادہ ہونا ضروری ہے، جب ارادہ نہ ہو صرف بتانا اور دوسرے کو دکھانا مقصود ہو تو تیمم نہ ہوگا، سائل نے لکھا تھا کہ امام کا نیت نمازِ عیدین و جنازہ بتلادینا تلقین من الخارج ہے، اس لئے نماز فاسد ہوتی ہے، اور نیت نماز شروع کرنے سے پہلے بتلائی جاتی

(١) غنية المتملي ص:۶۰۷ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور)

(٢) فتاوی شامیہ ج ۲ ص ۲۳۹ (طبع ایچ ایم سعید) میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کا مفصل ومدلل فتویٰ آگے ص ۵۷۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

ہے، اگر نیت بتلانا جماعت کی مصلحت ہے تو کوئی حرج نہیں رکھتا تو پانچ وقت کی نمازوں میں بھی بتلانا چاہئے، جبکہ خیر القرون اور صحابہ کرام سے اس کا ثبوت نہیں کہ عیدین و جنازہ کی نماز میں مسلمانوں کو امام نے نیت جہر اور بلند آواز سے پڑھ کر سنائی ہو، بلکہ نیت کے الفاظ حدیث سے ثابت نہیں ہیں، مجھے آپ کا جواب تسلی بخش نظر نہ آیا۔ (خلاصہ از سوال و جواب مستفتی)

جواب:- آپ کی تحریر غور سے بار بار پڑھی لیکن گزشتہ فتویٰ میں جو بات لکھی تھی اس میں تبدیلی نہیں ہوئی، جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت ہونے کا تعلق ہے، ثابت تو زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا بھی نہیں ہے، اس کے باوجود فقہاء نے تلفظ بالنیۃ کو نہ صرف جائز بلکہ بہتر قرار دیا ہے۔

في الدر المختار[1] والتلفظ بها مستحب هو المختار وقيل سنة يعني احبه السلف او سنة علمائنا، اذ لم ينقل عن المصطفى ولا الصحابة ولا التابعين بل قيل بدعة.

اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: وقد يقال ظهور العمل به في كثير من الاعصار في عامة الامصار فلا حرج ولعله ذهب في المبسوط والهداية والكافي الى انه ان فعله ليجمع عزيمة قلبه فحسن فيندفع ما قيل انه يكره (شامی ج ۱ ص ۴۱۶)[2] اور جب تلفظ بالنیۃ کو جائز کہا گیا تو اگر امام مقتدیوں کو نیت بتادے تو اس میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں، ہاں اگر اسے سنت موکدہ یا واجب و لازم سمجھ لیا جائے تو وہ بدعت ہو جائے گا، لیکن محض اس خیال سے کہ لوگوں کو الفاظِ نیت معلوم ہو جائیں اگر امام بتادے تو کچھ حرج نہیں، اور امام جب نیت کے الفاظ بتارہا ہو تو ان الفاظ سے امام کی نیت متحقق نہ ہوگی، بلکہ نماز کے وقت اسے باقاعدہ نیت کرنی پڑے گی، لہٰذا تیمم کی جو مثال آپ نے دی ہے، وہ اس صورت میں صادق نہیں آتی، ھذا ما عندی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۳/۲۸ الف)

میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم

سوال:- اگر کسی شخص کا کراچی میں انتقال ہو تو میت کو پنجاب لیجانا جائز ہے؟

---

(۱) ج ۱ ص ۴۱۵، ۴۱۶ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) شامی بحث النیۃ ج ۱ ص ۴۱۶ (طبع سعید) وفي اعلاء السنن ج ۲ ص ۱۶۹ (طبع ادارة القرآن كراچی) [illegible] عن عمر [illegible] فعله فهو محسن [illegible] صلى الله عليه وسلم [illegible] وكره [illegible] وفي الهداية ج ۱ ص ۹۶ ولا عبرة للذكر باللسان فان فعله لتجتمع عزيمة قلبه فهو حسن كذا في الكافي

جواب:- دفن سے پہلے میت کو ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرنے کے بارے میں فقہائے حنفیہ میں اختلاف ہے، بعض حضرات اسے جائز کہتے ہیں اور بعض مکروہ تحریمی بتاتے ہیں، لہٰذا شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

قال في شرح المنية: ويستحب في القتيل والميت دفنه في المكان الذي مات فيه في مقابر أولئك القوم وإن نقل قبل الدفن قدر ميل أو ميلين فلا بأس به قيل هذا التقدير من محمد يدل على أنّ نقله من بلد إلى بلد لا يجوز أو مكروه ولأن مقابر بعض البلدان ربما بلغت هذه المسافة ففيه ضرورة ولا ضرورة في النقل إلى بلد آخر وقيل يجوز ذلك ما دون السفر لما روي أن سعد بن أبي وقاص مات في قرية على أربعة فراسخ من المدينة فحمل على أعناق الرجال إليها وقيل لا يكره في مدة السفر أيضاً. كبيري ص ٦٠٣، مسائل متفرقة من الجنائز۔(١)

واللہ اعلم
۵-۱۳۸۹ھ

میّت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر منتقل کرنے کا حکم

اور مجتہد فیہ اُمور میں نکیر کے درجات

(حضرت مولانا صدیق احمد باندوی کی تدفین سے متعلق تفصیلی فتویٰ)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

بقیۃ السلف عارف باللہ محی السنۃ برکۃ العصر محترم المقام واجب الاحترام حضرت والا ہردوئی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بعدہٗ معروض خدمت اقدس میں نہایت عاجزانہ اور پُرخلوص گزارش یہ ہے کہ حضرت ہر انسان کا مقدر دُنیا میں آنے سے قبل لکھا جاچکا ہے، یہاں تک کہ بقول علمائے حضرات کے ہر انسان کی روح قبض ہونے کا وقت ومقام اور جہاں انسان کو دفن ہونا ہے وہاں کی مٹی بھی مقرر ہے، چاہے انسان دُنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، اس کی موت وہاں اس کو کھینچ کر لے جاتی ہے جہاں دفن ہونا ہے اور وہاں کی مٹی اس کو وہاں کھینچ لے جاتی ہے۔ اس کی تائید وتصدیق حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی کے وصال سے ہوتی ہے، حضرت کو باندہ (باندہ) سے جب لکھنؤ لے جانے کا فیصلہ ہوا تو حضرت نے انکار فرمایا اور فرمایا یہ موت کی تکلیف ہے، آپ نے یہ فرمایا [illegible] ملنے والوں کو ہدایت اور سب

---

(۱) غنیۃ المستملی ص:۶۰۷ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) تفصیل کے لئے اگلا مفصل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

مل کر مدرسہ کا خیال رکھنا۔ اتنا فرما کر ذکر میں مشغول ہوگئے یہاں تک کہ آپ کو لکھنؤ لے جایا گیا، وہاں تھوڑی ہی دیر کے بعد روح کو اپنے پیدا کرنے والے کے سپرد کردیا۔ (انا لله وانا الیه راجعون) پھر وہاں سے حضرت والا کو بھتورہ لانے کی تیاری ہونے لگی، اس موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم نے انکار فرمایا کہ حضرت کو یہیں دفن کردیا جاوے، اور حضرت والا نے بھی اس بات پر اصرار فرمایا ہے کہ حضرت کو بھتورہ نہ لے جایا جائے، ہزار کوششوں کے باوجود ایسا نہیں ہوسکا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ موت اور مٹی کو اپنے مقام پر کھینچنے میں دخل ہے، ان تمام باتوں پر یقین کے باوجود پھر کوئی انسان اس ضد پر اڑ جائے کہ جہاں روح قبض ہوئی ہے وہیں دفن کیا جائے گا تو میں جنازہ میں شریک ہوں گا ورنہ نہیں، اور اس بات پر قسم کھا لینا کہ میں اس مقام پر کبھی نہیں جاؤں گا جہاں اس کو دفن کیا ہے، اس ضد پر اڑے رہنا کیا یہ صحیح ہوگا؟ حضرت والا سے مؤدبانہ، عاجزانہ التماس ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہم لوگوں کی رہبری فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ خدا حافظ۔ تاتی موقف

محتاج دعا عبدالخالق

جامع مسجد رکل ۔۔۔ چھاپ

مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی کی طرف سے جواب

جواب:- ہر مسلمان کے لئے جیسے تقدیری اُمور پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح تشریعی اُمور پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، البتہ بندوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ذریعہ صرف تشریعی اُمور کا مکلف بنایا ہے، تکوینی اُمور کا مکلف نہیں بنایا ہے، "لا یکلف الله نفسا الا وسعها"، لہٰذا کسی مسلمان کی موت کہاں ہونی یا کہاں ہونی چاہئے؟ مسلمان اس کا مکلف نہیں ہے، البتہ موت واقع ہوجانے کے بعد میت کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہئے؟ اس کو علمائے کرام سے معلوم کرنے کے بعد اس کے موافق معاملہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ فتاویٰ محمودیہ ج:۲ ص:۴۰۳ (طبع کتب خانہ مظہری) یعنی فتاویٰ حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی علیہ الرحمۃ میں ہے: اصل یہ ہے کہ آدمی کا جس بستی میں انتقال ہو اسی بستی میں اس کو دفن کیا جاوے، اگر اس نے وصیت کی ہو کہ مجھ کو فلاں جگہ دفن کرنا تو اس وصیت پر عمل کرنا لازم نہیں، یہ وصیت باطل ہے۔ یسن دفنه فی جهة موته ای فی مقابر اهل المکان الذی مات فیه او قتل (شامی ج:۱ ص ۶۰۲)۔[۲]

حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کو انتقال کے بعد دوسرے مقام پر لے جاکر دفن کیا گیا، جہاں

---

(۱) سورة البقرة ۲۸۶

(۲) فتاوی شامية مطلب فی دفن المیت ج ۲ ص ۲۳۹ (طبع سعید)

انتقال ہو وہاں دفن نہیں کیا گیا تو حضرت عائشہؓ ایک سفر میں جاتے ہوئے جب ان کی قبر پر گزریں تو فرمانے لگیں اگر میرا بس چلتا تو تم یہیں دفن نہ کئے جاتے، بلکہ جہاں انتقال ہوا تھا وہیں دفن ہوتے۔ تاہم اس مسئلے میں اتنی تنگی نہیں ہے، امام محمد علیہ الرحمۃ نے میل دو میل کی مسافت سے حسب مصالح دوسری جگہ دفن کرنے کی گنجائش بتائی ہے، ولا بأس بنقله قبل دفنه قيل مطلقا وقيل الى ما دون مدة السفر وقيده محمد بقدر ميل او ميلين لان مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد قال في النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر (فتاویٰ شامی ج ۱ ص ۲۰۲)[1]۔

نیز فتاویٰ دارالعلوم میں حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب مفتی اعظم علیہ الرحمۃ نے اس سوال کے جواب میں کہ نقل میت کیا حرام ہے یا مکروہ تحریمی یا تنزیہی ہے؟ عبارات فقہیہ نقل کرکے لکھا ہے کہ ان عبارات سے واضح ہے کہ قبل دفن نقل میت میں اختلاف ہے، بعض جائز کہتے ہیں، اور بعض ناجائز اور مکروہ، اور ظاہر ہے کہ مکروہ سے مراد ان کی مکروہ تحریمی ہے، اور صاحب نہر کا قول و هو الظاهر کہنا اس کی ترجیح کو مقتضی ہے (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۵ ص ۳۹۰ طبع دارالاشاعت کراچی)۔

اور احسن الفتاویٰ میں فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب کراچی میں تصریح ہے کہ نقل میت مکروہ تحریمی ہے، نیز آگے چل کر ارشاد ہے: وقال شمس الأئمة السرخسي وقول محمد في الكتاب لا بأس أن ينقل الميت قدر ميل أو ميلين بيان ان النقل من بلد الى بلد مكروه،[2] قاله قاضي خان وقال العلامة الطحطاوي رحمة الله عليه مكروه أي تحريما[3] وقد جزم في التاجية بالكراهة وفي التجنيس وذكر أنه اذا مات في بلدة يكره نقله الى أخرى لأنه اشتغال بما لا يفيد وفيه تأخير دفنه وكفى بذلك كراهة (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۵)[4]۔

نقل میت میں تاخیر تدفین و خطرۂ فساد میت کے علاوہ آج کل مزید مندرجہ ذیل مفاسد پیدا ہوگئے ہیں -

۱- اس کا التزام ہونے لگا ہے۔ ۲- مصرف کثیر و مشقت شدیدہ کا تحمل۔ ۳- آبائی قبرستان میں دفن کرنے کا التزام اور اس پر اصرار سے یہ عقیدہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مقام میں دفن ہونے والی اموات کی آپس میں ملاقات ہوتی ہے، حالانکہ یہ عقیدہ غلط ہے۔ ۴- جنازے کو منتقل کرنا تو نماز جنازہ کے تکرار کا سبب بنتا ہے جو ناجائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ ج ۴ ص ۲۱۸)[5]۔

---

(۱) فتاوی شامية مطلب في دفن الميت ج ۲ ص ۲۳۹ (طبع سعيد)
(۲) شرح السير الكبير رقم ۳۰۴ ج ۱ ص ۲۳۱ (طابع مولانا نصر الله منصور)
(۳) حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ص ۳۳۷ (طبع نور محمد كتب خانه)
(۴) منحة الخالق على هامش البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۵ (طبع ايج ايم سعيد)
(۵) احسن الفتاوی باب الجنائز ج ۴ ص ۲۰۸، ۲۰۹ (طبع ايج ايم سعيد)

اور بہشتی زیور میں مذکور ہے کہ قبل دفن کے نعش کا ایک مقام سے دوسرے مقام میں دفن کرنے کے لئے لے جانا خلاف اولیٰ ہے، جبکہ دوسرا مقام ایک دو میل سے زیادہ نہ ہو، اور اگر اس سے زیادہ ہو تو جائز نہیں، اور بعد دفن کے نعش کھود کر لے جانا تو ہر حال میں ناجائز ہے (بہشتی زیور ج ۱۱ ص ۱۰۲)۔

نیز مشکوٰۃ شریف میں ہے: عن جابرؓ قال لما كان يوم أحد جاءت عمتي بأبي لتدفنه في مقابرنا فنادى منادي رسول الله صلى الله عليه وسلم ردوا القتلى الى مضاجعهم۔[1]

اور اسی طرح سنن ابوداؤد شریف میں ج ۲ ص ۱۰۲ پر ہے۔[2]

(وقال في شرح هذا الحديث) وكذا من مات في موضع لا ينقل الى بلد آخر قاله بعض علمائنا وقال في الأزهار الأمر في قوله صلى الله عليه وسلم ردوا القتلى للوجوب۔ مرقات شرح مشکوٰۃ شریف ج ۲ ص ۳۷۴،[3] وبذل المجهود ج ۴ ص ۱۹۰۔[4]

ان مذکورہ بالا کتابوں سے واضح ہوا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ میت کو منتقل کرنا ناجائز اور منکر شرعی ہے، اس کی اصلاح کی کوشش ہر ایک کے ذمہ بشرط قدرت ہے، جس کی توضیح بھی حضرات فقہاء نے فرمائی ہے، اگر عامی شخص ہے تو بشرط قدرت کرے اور صبر کرے، اگر مقتداء ہے تو نکیر کے ساتھ علیحدگی اختیار کرے، اصلاح کی خاطر ترک کلام اور ترک تعلق بھی کرسکتا ہے اور اس پر قسم بھی کھا سکتا ہے۔ وفي الهداية فان قدر على المنع منعهم وان لم يقدر يصبر وهذا اذا لم يكن مقتدى فان كان ولم يقدر على منعهم يخرج ولا يقعد لأن في ذلك شين الدين وفتح باب المعصية على المسلمين الى لقوله تعالى فلا تقعد بعد الذكرى مع القوم الظالمين، وهذا كله بعد الحضور ولو علم قبل الحضور لا يحضر. هداية ج ۴ ص ۴۵۵ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان)۔

اور حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی علیہ الرحمۃ اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: قوله في ذلك شين الدين لأن المقتدى امام في الدين وفعل امام الدين على خلاف الدين استخفاف بالدين في نظر الناظرين. هامش الهداية ج ۴ ص ۴۵۵ (طبع مذکور)۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہراتؓ سے ...

---

(۱) مشكوة المصابيح باب دفن الميت الفصل الثاني ج:۱ ص ۱۴۸ (طبع قديمي كتب خانه)

(۲) سنن أبي داؤد ج:۲ ص:۹۵ (طبع مكتبه حقانيه ملتان)

(۳) مرقاة المفاتيح شرح مشكوة المصابيح رقم الحديث ... ج ۴ ص ۹۳ (طبع مكتبه ...)

(۴) بذل المجهود كتاب الجنائز ج ۱۳ ص:۱۳۲ (طبع دار الريان للتراث قاهرة)

اصلاح کی خاطر ایک دفعہ ایک ماہ تک ترکِ تعلق رکھا،[1] اور ابو داؤد شریف جلد دوم ص ۲۳۳[2] میں ہے کہ حضرت زینبؓ نے حضرت صفیہؓ کو ایک سخت جملہ کہہ دینے کی وجہ سے ان کی اصلاح کی خاطر دو ماہ سے بھی زائد ترکِ تعلق رکھا، اور بخاری شریف جلد دوم ص ۸۹۷[3] میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ایک جملہ کہہ دینے کی وجہ سے حضرت عائشہؓ نے زندگی بھر کلام نہ کرنے کی قسم کھالی تھی، اور پھر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ان کی بہت خوشامد کی اور دوسرے حضرات سے سفارش کرائی تب حضرت عائشہؓ نے ان کو معاف کیا اور قسم کے خلاف کرنے کی وجہ سے چالیس غلام آزاد کئے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے بیٹے سے ایک بات کی وجہ سے جس سے حدیث کی مخالفت کا وہم ہوتا تھا، ترکِ تعلق کرلیا، پھر تاحیات ان سے کلام نہیں فرمایا، مشکوٰۃ شریف ج:۱ ص:۹۷۔[4] پس کسی پر شرعی نکیر کرنا اور ان سے ترکِ تعلق کرنا یا اس کی قسم کھالینا جبکہ وہ اس کے مقتدی بھی ہوں اور امید ہو کہ وہ اپنی اصلاح کرلیں گے، بلاشبہ درست ہے بلکہ بعض صورتوں میں ضروری اور لازم ہے، کما لا یخفی، اور قسم کھا کر پھر مصلحت کی بناء پر اس کے توڑنے اور اس کے کفارہ ادا کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے، اور یہ حدیث مذکور سے ثابت ہے۔

تنبیہ – ضد کہتے ہیں ناحق پر اڑنے کو، اور کسی دینی مسئلے پر اڑنا ضد نہیں بلکہ عین اتباعِ شریعت ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

العبد شفقت اللہ

۷/ شعبان ۱۴۱۸ھ

الجواب صحیح
منظور احمد المظاہری
مفتی مدرسہ جامع العلوم کانپور

الجواب صحیح
ابرار الحق
۸/ شعبان ۱۴۱۸ھ

صح الجواب بلا ارتیاب
محمد حنیف غفرلہ

الجواب صحیح
محمد انعام اللہ
مفتی مدرسہ امدادیہ مرادآباد

الجواب صحیح
سہیل احمد غفرلہ

الجواب صحیح
فہیم احمد نگینوی
نائب مفتی مدرسہ اشرف المدارس

الجواب صحیح
محمد فاروق غفرلہ
مفتی [illegible]

واصاب المجیب فیما اجاب
الجواب صواب
محمد عبداللہ پھولپوری

احقر کو اس جواب سے حرف بحرف اتفاق ہے، فقط واللہ اعلم
العبد نظام الدین مفتی دار العلوم دیوبند

بندہ کو اس جواب کے ہر ہر جزء سے اتفاق ہے
مقصود احمد انبیٹھوی مظاہر العلوم سہارنپوری

(۱) الصحيح البخاري باب قول النبي صلى الله عليه وسلم [illegible] رقم الحديث ۱۹۱۰ و ۱۸۱۲ ج ۲ ص:۶۷۵ (طبع دار ابن كثير يمامة بيروت)
(۲) ابو داؤد باب ترک السلام على أهل الأهواء ج:۴ ص:۱۹۹ (طبع دار الفكر)
(۳) صحيح بخاری شريف باب الهجرة ج ۲ ص:۸۹۷ (طبع قديمی كتب خانه)
(۴) مشكوة المصابيح قبيل باب تسوية الصفوف ج ۱ ص:۹۷ (طبع مذكور)

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کا فتویٰ

حامداً و مصلیاً و مسلماً، اما بعد! یہ کہ جواب استفتاء امر منکر پر تنبیہ کرنے کی حد تک مدلل اور اقرب الی التحقیق ہے، البتہ میت کے دفنانے کے بعد اس مقام پر نہ جانے کا حلف اٹھانا محتاج دلیل ہے، اس لئے کہ منکر کا سبب میت نہیں، میت کی تدفین کے بعد مقام دفن پر نہ جانے کی قسم سے ضد کا شائبہ ہوسکتا ہے۔

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ

کتبہ
محمد عبدالمجید دین پوری عفی عنہ
دارالافتاء، جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی
۲۶/۱۱/۱۴۱۸ھ

دارالافتاء والارشاد ناظم آباد کا فتویٰ

الجواب باسم ملہم الصواب، بنوری ٹاؤن سے لکھا ہوا جواب صحیح ہے، بنوری ٹاؤن کے جواب میں جو ضد کے شائبہ کو ظاہر کیا گیا ہے وہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ حلف کا مقصد میت سے دشمنی اور اس کے مدفن سے ضد نہیں بلکہ اہل میت کو اس منکر کے ارتکاب پر تنبیہ کرنا اور ان کے غم میں شریک نہ ہونے کا اظہار ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
احمد

الجواب صحیح
موسیٰ

عبدالواحد
دارالافتاء والارشاد ناظم آباد
۳/ذوالحجہ ۱۴۱۸ھ

فتویٰ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

(دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)

(مذکورہ بالا تمام فتاویٰ کی نقول حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کیے گئے، حضرت والا دامت برکاتہم نے اس کا جو جواب لکھا وہ درج ذیل ہے۔) (مرتب)

جواب:- سب سے پہلے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم بحیثیت مسلمان تکوینی امور کے مکلف نہیں، بلکہ احکام شریعت کے مکلف ہیں، لہذا اگر کسی شخص کے بارے میں یہ مقدر ہو کہ وہ فلاں جگہ پر دفن ہوگا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس جگہ دفن کرنا شرعاً جائز یا مناسب تھا، لہذا صورت مسئولہ میں یہ استدلال درست نہیں ہے کہ چونکہ حضرت مولانا صدیق احمد باندوی اس شہر میں دفن نہیں کیے گئے جہاں ان کی وفات ہوئی بلکہ دوسرے شہر لے جایا گیا، لہذا شرعاً بھی یہی ہونا چاہئے تھا۔ البتہ اصل درد مدراس

بات پر ہے کہ شرعاً میت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر لے جاکر دفن کرنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے، خود فقہائے حنفیہ کے بھی اس میں مختلف اقوال ہیں، بعض حضرات اس کو جائز کہتے ہیں اور بعض مکروہ، جن میں سے بعض نے اس کے مکروہ تحریمی ہونے کی بھی تصریح کی ہے، لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ میت کو اسی شہر کے قبرستان میں دفن کرنا چاہئے جہاں اس کا انتقال ہوا ہو، اور بلاعذر دُوسرے شہر کی طرف منتقل نہیں کرنا چاہئے، لہٰذا اگر کسی بزرگ نے اس شرعی مسئلے پر عمل کے لئے میت کو دُوسرے شہر لے جانے سے منع کیا، جبکہ ہمارے زمانے میں اس نقل مکانی پر دُوسرے متعدد مفاسد بھی مرتب ہونے لگے ہیں تو اس کو موردِ طعن بنانا ہرگز دُرست نہیں، بالخصوص جبکہ اس بزرگ کی حیثیت ایک مقتدا کی ہو اور وہ لوگوں کی اصلاح اور تربیت کی خاطر ایسا کرے، یہ اور بات ہے کہ شریعت میں نکیر کے بھی مختلف درجات ہوتے ہیں اور کسی غلط بات پر نکیر اس کی نکارت اور مفاسد کے بقدر ہی ہونی چاہئے۔

صورتِ مسئولہ میں نکیر کے لئے جو نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار اور میت کی قبر پر نہ جانے کی قسم کھانا مذکور ہے، اس میں کوئی بات شرعاً ناجائز نہیں، کیونکہ نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے، اس لئے کسی کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہ کرنے کو جبکہ دُوسرے لوگوں نے اس کی نماز پڑھی ہو، ناجائز نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کسی قبر پر جانا کوئی واجب نہیں ہے، اس لئے وہاں نہ جانے کا عزم ظاہر کرنا یا اس پر قسم کھانا ایسا امر ہے کہ اس کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔ رہی یہ بات کہ اس مسئلے میں نکیر جس درجے کی کی گئی وہ زیادہ مناسب تھی یا اس سے کم درجے کی نکیر بھی کافی ہوسکتی تھی؟ تو اس میں آرا مختلف ہوسکتی ہیں، اور مختلف حالات میں اس کا جواب مختلف ہوسکتا ہے، لہٰذا جس درجے کی نسبتاً سخت نکیر سوال کے پہلے جواب میں مذکور ہے اس کو بھی شرعاً ناجائز نہیں کہا جاسکتا، اور اس سے نرم درجے کی نکیر بھی اُصولاً جائز اور کافی ہے، جیسا کہ درج ذیل دلائل سے واضح ہے۔

ایک شہر سے دُوسرے شہر لے جانے کا شرعی حکم
اور مجتہد فیہ مسائل میں نکیر کے درجات

ورأينا هٰذا مبني على ما يأتي:-

۱ - ان المسئلة فيها اقوال مختلفة للفقهاء الحنفية فضلا عن غيرهم من المالكية والحنابلة كما هو ظاهر من العبارات الملحقة.

۲ - من ذهب الى الكراهة فالظاهر من عبارات القوم انه أراد التنزيهية ولم يصرح

سکوبها تحریمیة الا الطحطاوی فی حاشیته علی مراقی الفلاح ولعله أخذ ذلک باطلاق الکراهة وقد صرح من هو أقدم منه بکونه خلاف المستحب کما یظهر من العبارات المنقولة

۳ - ولئن سلم أن الکراهة تحریمیة ولا شک أن العمل به أحوط فلا اقل من أن المسئلة محل خلاف بین الفقهاء الحنفیة ومثل هذه الأمور المجتهد فیها لا تستحق التشدد فی الانکار کما تستحقه المحرمات القطعیة

۴ - الانکار ینبغی أن یکون علی من یرتکب المنکر وینبغی أن یتوجه التأدیب الیه ولا شک أن فی الصورة المسئولة نما نقل المیت اهله فلا انکر علی المیت فترک الصلوة علیه أو الحلف علی عدم الذهاب الی قبره متوجه الی المیت الذی هو بریٔ عن عهدة نقله ولا سیما اذا کان عالما ورعا یقتدی به الناس ومن المعروف أن الحلف لا یصار الیه الا عند الضرورة قال فی المحیط الافضل فی الیمین بالله تعالی تقللها وفی تکثیر الیمین المضافة الی المستقبل تعریض اسم الله تعالی للهتک

(طحطاوی علی الدر ج ۲ ص ۳۲۴، طبع مکتبة عربیه کوئٹه، وبهشتی زیور ج ۳ ص ۲۶۷)

۵ - وقد أنکرت عائشة علی نقل أخیها عبدالرحمن بن ابی بکرؓ الی غیر المکان الذی توفی فیه لکنها زارت قبره ولم تترک الزیارة لأجل نقله الی ذلک المکان

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۹/۲/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳ ۳۰۹)

الجواب صحیح
سحبان محمود

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

اختلاف العلماء فی جواز نقل المیّت

المالکیة والحنابلة صرحوا بجواز نقل المیت من بلد الی آخر قال الدردیر فی شرحه لمختصر خلیل الشرح الصغیر "وجاز نقله ای المیت من مکان الی آخر وان من بلد لآخر قبل دفنه أو بعده لمصلحة کان یخاف علیه ان یأکله البحر او السبع وکرجاء برکة للمکان المنقول الیه او زیارة اهله أو لدفنه بین أهله ونحو ذلک (ان لم تنتهک حرمته) بانفجاره أو نتانته (ج ۱ ص ۵۲۶، طبع دار المعارف مصر)

وقال ابن قدامة فی المغنی -

وقال أحمد ما أعلم بنقل الرجل یموت فی بلده الی بلد آخر بأساً، وسئل الزهری

عن ذلک فقال قد حمل سعد بن أبي وقاص وسعيد بن زيد من العقيق الى المدينة وقال ابن عيينة مات ابن عمر هنا فأوصى أنه لا يدفن ههنا وأن يدفن بسرف. (ج ۲ ص ۳۹۰)[1]

وأما مذهب الشافعية فما جاء في شرح الاقناع:-

ويحرم نقل الميت قبل دفنه من محل موته الى محل أبعد من مقبرة محل موته ليدفن فيه الا أن يكون بقرب مكة أو المدينة أو بيت المقدس.

وفي حاشيته -

المراد بالقرب مسافة لا يتغير الميت فيها قبل وصوله والمراد بمكة جميع الحرم ولا ينبغي التخصيص بالثلاثة بل لو كان بقرب مقابر أهل الصلاح والخير فالحكم كذلك لأن الشخص يقصد الجار الحسن (أوجز المسالک ج ۴ ص ۲۵۳ طبع ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان) ومثله في تحفة المحتاج لابن حجر هيتمي. (ج ۳ ص:۲۰۲، ۲۰۳)

اختلاف الأقوال فيما بين الحنفية:

قال في الدر المختار:-

ولا بأس بنقله قبل دفنه.

وقال ابن عابدين تحته:-

(قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قيل مطلقًا وقيل الى ما دون مدة السفر وقيده محمد بقدر ميل أو ميلين لأن مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد قال في النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر. (ج۲ ص:۲۳۹ طبع سعيد)

تحقيق كراهة النقل:

قد مرّ عن رد المحتار أنه يكره نقل الميت قبل الدفن وذكر الطحطاوي في حاشيته على مراقي الفلاح (ص ۳۳۷ طبع نور محمد کتب خانه) أنها تحريمية ولكن الظاهر أنه فهم التحريم من اطلاق لفظ الكراهة ولكن يظهر من كتب الفقهاء الحنفية أنهم انما أرادوا الكراهة التي هي ضد المستحب ويظهر ذلک من العبارات الاتية

قال العلامة بحر العلوم رحمه الله في رسائل الأركان:-

النقل بعد نبش القبر كما هو المتعارف اليوم مكروه تحريما أشد الكراهة لأن نبش القبر واخراج الميت لا يجوز لأنه قد سلم الى الله تعالى واما قبل النبش فمكروه والأفضل أن

---

(۱) المغني لابن قدامة ج:۳ ص ۴۴۳ (طبع دار عالم الكتب، رياض)

لا ینقل.　　(رسائل الأرکان ص:۱۵۹ طبع قدیم مطبع یوسفی فرنگی محل لکھنؤ)

فصرح العلامة رحمه الله بان النقل بعد الدفن مکروه تحریمًا ثم ذکر مسألة النقل قبل الدفن فأطلق الکراهة ولم یقیدها بالتحریم فظهر أنه أراد به ما هو دون الکراهة التحریمیة ولذلک أعقبه بقوله: "الأفضل أن لا ینقل".

وانما ذکروه من انه حیث أطلق الکراهة فالمراد به التحریمیة لیست بکلیة قال ابن عابدینؒ نقلا عن البحر:-

المکروه فی هذا الباب نوعان أحدهما ما کره تحریمًا وهو المحمل عند اطلاقهم الکراهة　ثانیهما المکروه تنزیها ومرجعه الی ما ترکه اولی وکثیرا ما یطلقونه کما فی شرح المنیة فحینئذ اذا ذکروا مکروها فلا بد من النظر فی دلیله فان کان نهیا ظنیا یحکم بکراهة التحریم الا لصارف للنهی عن التحریم الی الندب فان لم یکن الدلیل نهیا بل کان مفیدًا للترک الغیر الجازم فهی تنزیهیة.

(رد المحتار ج:۱ ص:۱۳۲ طبع سعید، قبیل مطلب فی الاسراف فی الوضوء)

وانما استدل علی کراهة النقل اولا بما روی عن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال فی شهداء أحد "ردوا القتلی الی مضاجعهم"　رواه احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی

ولکن قال الامام السرخسی رحمه الله فی شرح هذا الحدیث:-

وهذا حسن لیس بواجب وانما صنع هذا رسول الله صلی الله علیه وسلم لأنه کره المشقة علیهم بالنقل مع ما اصابهم من القرح (شرح السیر الکبیر ج:۱ ص:۲۳۴ فقره نمبر ۳۰۱)

والدلیل الثانی للکراهة هو حدیث عائشة حیث قالت عند زیارة قبر اخیها عبدالرحمن ابن ابی بکر الذی نقل من الحبش الی مکة "والله لو حضرتک ما دفنت الا حیث مت" وقد علق علیه الامام السرخسیؒ بقوله:-

وفیه دلیل أن الاولی أن یدفن القتیل والمیت فی المکان الذی مات فیه فی مقابر اولئک القوم.　　(شرح السیر الکبیر ج:۱ ص:۲۳۶ رقم:۳۰۳)

واستدل الامام السرخسیؒ بحدیث عائشة علی أن الأولی عدم النقل والنقل خلافه فهو مکروه تنزیهًا.

وانما أخذ الفقهاء الحنفیة الکراهة من قول الامام محمد فی السیر الکبیر ولو نقل میلا أو میلین او نحو ذلک فلا باس به فاستنبطوا من هذا القول أن النقل الی ما زاد مکروه

ولذلک قال السرخسی رحمه الله:-

وفي هذا بيان أن النقل من بلد الى بلد مكروه لأنه قدر المسافة التي لا يكره النقل فيها بميل أو ميلين وهذا لأنه اشتغال بما لا يفيد فالأرض كلها كفات للميت قال الله تعالى. أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا. إلا أن الحي ينتقل من موضع الى موضع لغرض له في ذلك وذلك لا يوجد في حق الميت ولو لم يكن في نقله الا تأخير دفنه أيا ما كان كافيا في الكراهة. (شرح السير الكبير ج:۱ ص:۲۳۶، ۲۳۷ فقره نمبر۳۰۴)

وقد سبق أن الامام السرخسيؒ جعل عدم النقل أولى فظاهر أن مراده من الكراهة هنا التنزيهية وما يدل على كون الكراهة تنزيهية أن كثيرًا من الفقهاء صرحوا بعدم الإثم في النقل ومن مقدمتهم صاحب الهداية كما ذكره ابن الهمامؒ عنه فقال:-

قال المصنف في التجنيس: في النقل من بلد الى بلد لا اثم، ثم ذكر عن صاحب الهداية نفسه أنه قال:-

اذا مات في بلدة يكره نقله الى أخرىٰ لأنه اشتغال بما لا يفيد

(فتح القدير ج:۲ ص:۱۰۱، ۱۰۲ طبع مكتبه رشيديه كوئٹه)

فظهر بهذا أن المراد بالكراهة ما يجتمع مع عدم الاثم وهو الكراهة التنزيهية لذلك ذكر كثير من الفقهاء عدم الإثم بدون التصريح بالكراهة وانما ذكروا أن المستحب أن يدفن في المكان الذى مات فيه

قال ابن نجيمؒ:-

ولم يتكلم المصنف على نقل الميت من مكان الى آخر قبل دفنه قال في الواقعات والتجنيس القتيل أو الميت يستحب لهما أن يدفنا في المكان الذى قتل أو مات فيه في مقابر أولئك القوم لما روى عن عائشة رضى الله عنها أنها زارت قبر أخيها عبدالرحمن بن أبي بكرؓ وكان مات بالشام وحمل من هناك فقالت: لو كان الأمر فيك بيدى ما نقلتك ولدفنتك حيث مت. لكن مع هذا اذا نقل ميلًا أو ميلين أو نحو ذلك فلا بأس وان نقل من بلد الى بلد فلا إثم فيه. (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۹۵ طبع رشيديه كوئٹه)

وقال العلامة الافندى في مجمع الأنهر:-

ويستحب في القتيل والميت دفنه في المكان الذى مات في مقابر أولئك المسلمين وان نقل قبل الدفن إلى قدر ميل أو ميلين فلا بأس به وكذا لو مات في غير بلده

يستحب تركه فان نقل الى مصر آخر فلا بأس به. (مجمع الأنهر ج ١ ص ١٨٧)[١]

وراجع أيضًا فتاوى تاتارخانية ج ٢ ص ١٧٥ (طبع ادارة القرآن) وتعليق الشيخ أبي الوفاء الأفغاني على كتاب الآثار ج:٢ ص.٢٠٣.[٢]

ولقد أطال الشيخ عليّ القارى رحمه الله وأحسن في التوفيق بين العبارات بعبارة نوردها بتمامها:-

أما اذا أرادوا نقله قبل الدفن أو تسوية اللبن فلا بأس بنقله نحو ميل أو ميلين قال في التجنيس لأن المسافة الى المقابر قد تبلغ هذا المقدار وقال السرخسيّ قول محمد بن سلمة ذلك دليل على أن نقله من بلد الى بلد مكروه والمستحب أن يدفن كل في مقبرة البلدة التي مات بها. ونقل عن عائشة أنها قالت حين زارت قبر أخيها عبدالرحمن وكان مات بالشام وحمل منها: ولو كان الأمر فيك اليّ ما نقلتك ولدفنتك حيث مت ثم قال في التجنيس في النقل من بلد الى بلد لا اثم لما نقل أن يعقوب عليه الصلوة والسلام مات بمصر ونقل عنه الى الشام وموسى عليه الصلوة والسلام نقل تابوت يوسف عليه الصلوة والسلام بعد ما أتى عليه زمان من مصر الى الشام ليكون مع آبائه ولا يخفى أن هذا شرع من قبلنا ولم تتوفر فيه شروط كونه شرعًا لنا إلا انه نقل عن سعد بن أبي وقاص أنه مات في ضيعة على أربعة فراسخ من المدينة فحمل على أعناق الرجال اليها وفيه أنه نقل حين موته لا بعد دفنه فلا دخل له في القضية ويمكن أن يحمل نقل يعقوب ويوسف عن عذر وأيضًا فلا تنافي بين الإثم والكراهة اذا الكراهة محمولة على التنزيه وهو خلاف الأولى الا لعارض قال صاحب الهداية وذكر أن من مات في بلدة يكره نقله الى اخرى لأنه اشتغال بما لا يفيد بما فيه تأخير دفنه وكفى بذلك كراهة قلت فاذا كان يترتب عليه فائدة من نقله الى أحد الحرمين أو الى قرب قبر أحد من الأنبياء أو الأولياء أو ليزوره أقاربه من ذلك البلد وغير ذلك فلا كراهة إلا ما نص عليه من شهداء أحد أو من في معناهم من مطلق الشهداء والله اعلم (مرقات ج ٣ ص ٣ــ)[٣]

مسئلة النكير على الأمور المجتهد فيها

قد صرح غير واحد من الفقهاء والمحدثين بأنه لا ينبغي التشدد في النكير على الأمور التي اختلف فيها الفقهاء في الأحكام السلطانية للماوردى ص.٣١٥ -[٤]

---

(١) مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج ١ ص ٢٧٢ (طبع دار الكتب العلمية، بيروت)
(٢) (طبع مذكور)
(٣) مرقاة شرح مشكوة ج ٣ ص١٨٣، ١٨٤ (طبع مكتبه حقانيه پشاور)
(٤) ص٣٠ ٢٥ (طبع دفتر تبليغات اسلامى حوزه علميه قم)

أما المعاملات المنكرة كالزنا والبيوع الفاسدة وما منع الشرع منه مع تراضي المتعاقدين به اذا كان متفقًا على حظره فعلى والي الحسبة انكاره والمنع منه والزجر عليه وأمره في التأديب مختلف بحسب الأحوال وشدة الحظر وأما ما اختلف الفقهاء في حظره واباحته فلا مدخل له في إنكاره إلا أن يكون مما ضعف الخلاف فيه وكان ذريعة إلى محظور متفق عليه كربا النقد فالخلاف فيه ضعيف وهو ذريعة إلى ربا النساء المتفق على تحريمه فهل يدخل في انكاره بحكم ولايته أو لا" على ما قدمناه من الوجهين وفي معنى المعاملات وان لم تكن منها عقود المناكح المحرمة ينكرها ان اتفق العلماء على حظرها ولا يتعرض لإنكارها ان اختلف الفقهاء فيها الا أن يكون مما ضعف الخلاف فيه وكان ذريعة إلى محظور متفق عليه كالمتعة فربما صارت ذريعة إلى استباحة الزنا.

وفي المرقاة ج ٨ ص ٨٦٣ (طبع مكتبه حقانيه پشاور) وما يتعلق بالاجتهاد لم يكن للعوام مدخل فيه لأن انكاره على ذلك للعلماء ثم العلماء انما ينكرون ما أجمع عليه الأئمة وأما المختلف فيه فلا انكار فيه لأن على أحد المذهبين كل مجتهد مصيب وينبغي للامر والناهي أن يرفق ليكون أقرب الى تحصيل المطلوب

وفي شرح مسلم للنووي ج ١ ص ٥١ (طبع قديمي كتب خانه): ثم انه انما يأمر وينهى من كان عالما بما يأمر به وينهى عنه وذلك يختلف باختلاف الشيء فان كان من الواجبات الظاهرة والمحرمات المشهورة كالصلوة والصيام والزنا والخمر ونحوها فكل المسلمين علماء بها وان كان من دقائق الأفعال والأقوال ومما يتعلق بالاجتهاد ولم يكن للعوام مدخل فيه ولا لهم انكاره بل ذلك للعلماء ثم العلماء انما ينكرون ما أجمع عليه أما المختلف فيه فلا انكار فيه لأن على أحد المذهبين كل مجتهد مصيب وهذا هو المختار عند كثير من المحققين أو أكثرهم وعلى المذهب الاخر المصيب واحد والمخطئ غير متعين لنا والإثم مرفوع عنه لكن ان ندبه على جهة النصيحة إلى الخروج من الخلاف فهو حسن محبوب مندوب إلى فعله برفق فان العلماء متفقون على الحث على الخروج من الخلاف اذا لم يلزم منه اخلال بسنة أو وقوع في خلاف آخر وذكر أقضى القضاة أبو الحسن الماوردي البصري الشافعي في كتابه الأحكام السلطانية خلافا بين العلماء في أن من قلده السلطان الحسبة هل له أن يحمل الناس على مذهبه فيما اختلف فيه الفقهاء اذا كان المحتسب من أهل الإجتهاد أم لا يغير ما كان على مذهب غيره والأصح أنه لا يغير لما ذكرناه ولم يزل الخلاف

في الفروع بين الصحابة والتابعين فمن بعدهم رضي الله عنهم أجمعين ولا ينكر محتسب ولا غيره على غيره وكذلك قالوا ليس للمفتي ولا للقاضي أن يعترض على من خالفه إذا لم يخالف نصًا أو إجماعاً أو قياساً جلياً، والله تعالىٰ أعلم

وفي إكمال إكمال المعلم ج ۱ ص ۵۴ (طبع دار الكتب العلمية بيروت): ثم ما اشتهر حكمه كالصلوة وحرمة الربا يستوي في القيام به العلماء وغيرهم وما دق من الأفعال والأقوال فإنما يقوم به العلماء ثم العلماء لا يغيرون إلا ما اتفق عليه ولا يغيرون في مسائل الخلاف لأنه إن كان كل مجتهد مصيبًا فواضح وكذلك على أن المصيب واحد لأن المخطئ غير آثم نعم يندب إلى الخروج من الخلاف للاتفاق على رجحان الخروج منه

وفي أصول الفقه الاسلامي للزحيلي ج ۲ ص ۱۰۹۲ (طبع دار احسان دمشق) قد أجمع الصحابة على ترك النكير على من خالف منهم في المسائل الفقهية كإرث الجد مع الإخوة ومسألة العول ونحوها من مسائل الفرائض وغيرها فكانوا يتشاورون ويفترقون مختلفين ولا يعترض بعضهم على بعض ولا يمنع أحدهم الآخر من افتاء العامة ولا يمنع العامة من تقليده ولا يمنعه من الحكم باجتهاده وهذا كما قال الغزالي. متواتر تواترا لا شك فيه مع انهم كانوا فيما قام عليه الدليل القاطع يبالغون في التأثيم والتشديد كما فعلوا في تخطئة الخوارج.

وفي الهندية ج ۵ ص ۳۵۳ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) ويقال الأمر بالمعروف باليد على الأمراء وباللسان على العلماء وبالقلب لعوام الناس وهو اختيار الزندويسي كذا في الظهيرية: الأمر بالمعروف يحتاج إلى خمسة أشياء، أوّلها العلم لأن الجاهل لا يحسن الأمر بالمعروف، والثاني أن يقصد وجه الله تعالى وإعلاء كلمته العليا، والثالث الشفقة على المأمور فيأمر باللين والشفقة، والرابع أن يكون صبورًا حليما، والخامس أن يكون عاملا بما يأمره كيلا يدخل تحت قوله تعالى لِمَ تَقُوْلُوْنَ ما لا تَفْعَلُوْن، ولا يجوز للرجل من العوام أن يأمر بالمعروف للقاضي والمفتي والعالم الذي اشتهر لأنه اساءة في الأدب ولأنه ربما كان به ضرره في ذلك والعامي لا يفهم ذلك كذا في الغرائب.

اسی طرح منکر میں وہ تمام برائیاں اور مفاسد داخل ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ناجائز قرار دینا معلوم و معروف ہے، اس مقام پر واجبات اور معاصی کے بجائے معروف و منکر کا عنوان اختیار کرنے میں شاید یہ حکمت بھی ہو کہ روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف ان مسائل میں ہوگا جو

اُمت میں مشہور و معروف ہیں اور سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں، اجتہادی مسائل جن میں اُصولِ شرعیہ کے ماتحت مختلف رائیں ہوسکتی ہیں، ان میں یہ روک ٹوک کا سلسلہ نہ ہونا چاہئے، افسوس ہے کہ عام طور پر اس حکیمانہ تعلیم سے غفلت برتی جاتی ہے اور اجتہادی مسائل کو جدال کا میدان بنا کر مسلمانوں کی جماعت کو ٹکڑے کیا جاتا ہے، اور اس کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا جاتا ہے، اور اس کے بالمقابل متفق علیہ معاصی اور گناہوں سے روکنے کی طرف توجہ بہت کم دی جاتی ہے۔ (از معارف القرآن ج ۲ ص ۱۴۱)

واللہ سبحانہ اعلم

پیدائش کے فوراً بعد مرنے والے بچے کے نام رکھنے، نمازِ جنازہ اور تجہیز و تکفین کے احکام

سوال ۱:- ایک عورت کا پانچ ماہ کا حمل ساقط ہوگیا، پیدائش کے بعد دائی بتاتی ہے کہ بچے نے سانس لیا اور فوراً ہی فوت ہوگیا، بچے کے اعضاء درست تھے، جس سے مذکر و مؤنث کی شناخت ہوتی تھی، مگر بہت ہی کمزور و ناتواں تھا۔ زید کہتا ہے کہ اس بچے نے دُنیا میں آکر سانس لیا ہے لہٰذا اس کے سب کام انجام دیئے جائیں، مثلاً غسل، کفن، نمازِ جنازہ اور قبر بھی بنائی جائے۔

۲- جب غسل کے لئے آدمی آیا تو اس نے اپنے تجربے کی بناء پر کہا کہ اس نے سانس ہرگز نہیں لیا، اس کی ہیئت اور حالت ایسی نہیں کہ اس میں جان پڑی ہو، اگر اس کے سب کام کئے تو آپ گنہگار ہوں گے، لہٰذا اس بچے کو بغیر غسل اور بغیر نماز کے قبرستان کے ایک گوشے میں گڑھا کرکے دبادیا جائے۔

۳- اگر یہ سب کام ضروری تھے تو اب چونکہ اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی تو کیا اس کی غائبانہ نماز پڑھی جائے جبکہ نمازِ جنازہ میں میت کا سامنے ہونا شرط ہے؟ اور سنتے ہیں کہ بڑے لوگوں کی نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھی جاتی ہے، اور اس سلسلے کی ایک بات یہ ہے کہ ایسے بچوں کا نام رکھنا ضروری ہے؟ بکر کہتا ہے کہ نام رکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ حشر میں نام سے پکارا جائے گا، خواہ ولادت مردہ ہو یا زندہ، نام رکھنا ضروری ہے۔ آپ ان سب باتوں کے بارے میں اَحکام بیان فرمائیں۔

جواب ۱:- بچے نے سانس لیا ہو یا نہ لیا ہو، جب اس کے تمام اعضاء بن چکے تھے تو اسے غسل تو ہر حالت میں دینا چاہئے تھا اور اس کا نام بھی رکھنا چاہئے تھا، البتہ سانس نہ لینے کی صورت میں نماز ضروری نہیں تھی، لیکن جب قابلِ اعتماد دائی گواہی دے رہی ہے کہ بچے نے سانس لیا ہے تو اس کی گواہی معتبر ہے، اور اس کے بعد اس کو غسل دینا، نام رکھنا، کفن دینا، نمازِ جنازہ پڑھنا سب ضروری تھا

اور قبر بھی بہر حالت میں ضرور بنانی چاہئے تھی، کما فی رد المحتار: ولو شهدت القابلة او الأم على الاستهلال تقبل في حق الغسل والصلوة عليه لأن خبر الواحد في الديانات مقبول اذا كان عدلا (شامی ج:۱ ص:۵۹۴) وفي الدر المختار ومن ولد فمات يغسل ويصلّى عليه۔

۲:- دائی اگر قابلِ اعتماد تھی تو اس کے مقابلے میں غسل دینے والے کا قول معتبر نہیں تھا۔

۳- اگر دفن کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور تجربہ کار لوگ یہ بتاتے ہیں کہ غالب گمان یہ ہے کہ میت پھولی پھٹی نہ ہوگی تو اس کی قبر پر نماز جنازہ پڑھنا واجب ہے، قبر پر جاکر اس طرح نماز پڑھیں جس طرح میت کو سامنے رکھ کر نماز پڑھی جاتی ہے، اور اگر زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور غالب گمان یہ ہے کہ میت پھٹ گئی ہوگی تو پھر نماز نہ پڑھیں۔

لما في الدر المختار (وان دفن) واهيل عليه التراب (بغير صلوة) أو بها بلا غسل أو ممن لا ولاية له (صلّى على قبره) استحسانا ما لم يغلب على الظن تفسخه من غير تقدير هو الأصح.(۲) وفي رد المحتار (قوله صلّى على قبره) أي افتراضا في الأوليين وجوازا في الثالثة۔

۴:- جی ہاں! نام رکھنا ضروری ہے جیسا کہ نمبر۱ میں گزرا۔　　واللہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۹ ۲۹ الف)

دار الحرب میں مرنے والے مسلمان پر شرعی اَحکام جاری ہوں گے

سوال:- ایک آدمی نے دار الحرب میں اسلام قبول کیا، مگر وہ وہاں کوئی ایسے آدمی کو نہیں پاتا کہ جو اسے قرآن پڑھائے اور فرائض وواجبات سکھائے، اسی حالت میں چھ ماہ گزرنے کے بعد وہ شخص مرجاتا ہے، آیا اس پر دین کے احکام جاری ہوں گے یا نہیں؟ اور اگر جاری ہوں گے تو اس کو کس طرح ادا کیا جائے؟

جواب:- اس صورت میں اس شخص کو چاہئے تھا کہ وہ دار الحرب سے ہجرت کرکے ایسی جگہ اقامت اختیار کرنے کی کوشش کرتا جہاں دینی معلومات حاصل ہوسکتی ہوں، بہرحال وہ مسلمان ہے اور اسلامی اَحکام اس پر جاری ہوں گے، اب جبکہ اس نومسلم کا انتقال ہوچکا ہے اس سے ہمدردی رکھنے

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۲۲۷، ۲۲۸ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۲۲۳، وفي الهندية ج:۱ ص:۱۶۵ (طبع مكتبه ماجديه) الفصل الخامس كتاب الجنائز، ولو دفن الميت قبل الصلوة أو قبل الغسل فإنه يصلى على قبره إلى ثلاثة أيام والصحيح أن هذا ليس بتقدير لازم بل يصلّى عليه ما لم يعلم أنه قد تفرق ... الخ (مرتب)

والوں کو چاہئے کہ جس قدر ہو سکے اسے ایصالِ ثواب کریں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۴۶۷/۲۲ الف)

دفن کے وقت کفن کی گرہ کھولنے کی حکمت میں حاشیہ شرح وقایہ اور دیگر فقہاءؒ کی عبارات میں تضاد کی تحقیق

سوال:- شرح وقایہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ کفن کی گرہ کھولنے میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سوال و جواب کے وقت آسانی سے مردہ بیٹھ سکے، درایۃً اور روایۃً یہ کہاں تک صحیح ہے؟ لحد ہو یا شق، حقیقی طور پر بیٹھنا تو اس میں ممکن ہی نہیں، آپ واضح فرمائیں۔

جواب:- حاشیہ شرح وقایہ[1] کے اس بیان کا مأخذ معلوم نہیں ہو سکا، تمام فقہائے کرامؒ اس حکم کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ گرہ باندھنا انتشار کے خوف سے تھا، اور اب یہ خوف نہیں رہا، اس لئے کھول دی جائے، کذا فی شرح الوقایۃ،[2] والهدایۃ،[3] والدر المختار۔[4]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۳/۱۹ الف)

---

(۱) وفي حاشية شرح الوقاية ج ۱ ص ۲۱۰ (طبع ایچ ایم سعید) ويحل للاستغناء فانه انما عقد خيفة انتشار الكفن ليسهل عليه الجلوس في القبر عند سؤال الملكين
(۲) وفي شرح الوقاية ج ۱ ص ۲۱۰ (طبع سعيد) ويحل العقدة اى العقدة التي على الكفن خيفة الانتشار
(۳) وفي الهداية فصل في الدفن ج ۱ ص ۱۸۲ (طبع مكتبه شركت علميه) ويحل العقدة لوقوع الأمن من الانتشار
(۴) وفي الدر المختار ج ۲ ص ۲۳۶ (طبع سعيد) وتحل العقدة للاستغناء عنها وفي الشامية (قوله للاستغناء عنها) لأنها تعقد لخوف الانتشار عند الحمل

﴿فصل فی إیصال الثواب﴾
(ایصالِ ثواب سے متعلق مسائل کا بیان)

سوال:- جو لوگ گھر میں پر قرآن خوانی کراتے ہیں ان کو قرآن کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ پھر اس مردے کے لئے جس کے لئے قرآن خوانی کرائی ہے اسے ثواب ملے گا یا نہیں؟

اگر اللہ کے نام پر کچھ دیا پیسہ دیا جائے، ہماری نیت اس مردے کی روح کو ثواب پہنچانے کی ہو تو کیا اسے ثواب ملے گا یا نہیں؟ ہم روزانہ تلاوت قرآن پاک یا درود شریف، کلمۂ طیبہ پڑھ کر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تمام انبیاء تک اور تمام مسلمانوں کو جو رحلت کر چکے ہیں ان کو ایصالِ ثواب کریں تو کیا ان کو ثواب ملے گا یا نہیں؟

۲- اگر کسی شخص کا ذاتی کاروبار یا مکان کا کرایہ آتا ہو، وہ اسے چھوڑ کر انتقال کر جائے تو اس شخص کے لئے یہ اثاثہ جو اس کی اولاد استعمال کرتے ہیں، کیا یہ صدقۂ جاریہ ہوگا یا نہیں؟

جواب ۱:- نفلی عبادات، خواہ وہ تلاوتِ قرآن ہو یا نفلی نماز ہو یا صدقہ ہو، اس کا ثواب کسی مردے کو پہنچایا جا سکتا ہے اور اس کو ثواب پہنچتا بھی ہے،[۱] اور خود ایصالِ ثواب کرنے والے کو بھی ثواب ملتا ہے،[۲] لیکن اس کے لئے طریقہ ایسا اختیار کرنا چاہئے جس میں نام ونمود اور دکھاوا وغیرہ نہ ہو۔ آج کل گھروں پر باقاعدہ لوگوں کو جمع کر کے جو قرآن خوانی کی جاتی ہے اس میں اکثر نام ونمود ہوتا ہے اور ناجائز رسمیں ہوتی ہیں، اس لئے اس سے پرہیز کر کے میت کو ثواب پہنچا دیں، روزانہ جو تلاوت یا تسبیح وغیرہ پڑھتے ہیں اس کا ثواب تمام وفات شدہ مسلمانوں کو پہنچایا جا سکتا ہے،[۳] اس میں کوئی حرج نہیں،

(۱تا۳) یہ ایصالِ ثواب کے ثبوت کے لئے چند قرآنی آیات ہیں - فاعلم انه لا اله الا الله واستغفر لذنبك وللمؤمنين والمؤمنات (سورة محمد ۱۹) وفی سورة الحشر ۱۰ والذین جاؤا من بعدهم یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انك رؤف رحیم. وفی سورة نوح ۲۸ رب اغفر لی ولوالدیّ ولمن دخل بیتی مؤمنا وللمؤمنین والمؤمنات

کتب تفاسیر میں درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں - روح المعانی ج ۲۷ ص: ۶۲ تا ۶۵ (طبع مکتبہ رشیدیہ لاہور)، معارف القرآن ج ۸ ص ۲۱۹، وفی صفوة التفاسیر ج ۳ ص ۳۲۳ (طبع مکتبہ فاروقیہ پشاور) رب اغفر لی، دعا لنفسه ثم لابویه ثم عمم لجمیع المؤمنین والمؤمنات لیکون ذلك ابلغ واجمع. وفی کشف الخفاء ومزیل الالباس ج ۲ ص ۳۷۱ رقم ۲۶۳۰ (طبع مؤسسة الرسالة بیروت) من مر بالمقابر فقرأ احدی عشرة مرة قل هو الله احد ثم وهب اجره للاموات اعطی من الاجر بعدد الاموات ... ح ... [illegible]

بلکہ ان شاء اللہ موجبِ ثواب ہوگا۔

(گزشتہ سے پیوستہ)......اور چند احادیث مبارکہ یہ ہیں:-

وفی الصحیح للبخاریؒ باب اذا قال داری صدقة .... الخ رقم: ۲۷۰۵ ج:۳ ص:۱۰۱۳ (طبع دار ابن کثیر یمامة بیروت) عن ابن عباسؓ أن سعد بن عبادةؓ توفیت أمه وهو غائب عنها فقال: یا رسول الله! ان أمی توفیت وأنا غائب عنها أینفعها شیء ان تصدقت به عنها؟ قال: نعم! قال: فانی أشهدک ان حائطی المخراف صدقة علیها.

وفی مشکوة المصابیح ج:۱ ص:۱۴۱ (طبع قدیمی کتب خانه) عن معقل بن یسار قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اقرؤا سورة یٰسین علی موتاکم. رواه أحمد وأبوداؤد. وفی شرح الصدور للسیوطیؒ ص:۱۳۵ (مطابع الرشید مدینة المنورة) أخرج أبو القاسم سعد بن علی الزنجانی فی فوائده عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من دخل المقابر ثم قرأ فاتحة الکتاب و قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ و أَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ ثم قال: اللّٰهم انی قد جعلت ثواب ما قرأت من کلامک لأهل المقابر من المؤمنین والمؤمنات کانوا شفعاء له الی الله تعالٰی. وفیه أیضًا ص:۱۳۵ عن أنسؓ أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: من دخل المقابر فقرأ سورة یٰسین خفف الله عنهم وکان له بعدد من فیها حسنات. وفیه أیضًا ص:۱۳۲ أخرج الطبرانی فی الأوسط والبیهقی فی سننه عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الله لیرفع الدرجة للعبد الصالح فی الجنة فیقول: یا ربّ أنّی لی هٰذه؟ فیقول: باستغفار ولدک لک. ولفظ البیهقی: دُعاء ولدک لک. وأخرجه البخاری فی الأدب عن أبی هریرةؓ موقوفًا. وفیه أیضًا ص:۱۳۵ عن أحمد بن حنبلؒ قال: اذا دخلتم المقابر فاقرؤا بفاتحة الکتاب والمعوذتین و قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ واجعلوا ذٰلک لأهل المقابر فانه یصل الیهم.

وفی الصحیح للامام مسلمؒ باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته رقم: ۱۶۳۱ ج:۳ ص:۱۲۵۵ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) عن أبی هریرةؓ أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: ثم اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الّا من صدقة جاریة أو علم ینتفع بها أو ولد صالح یدعو له. وراجع أیضًا مرقاة المفاتیح ج:۴ ص:۸۳ (طبع مکتبه امدادیه ملتان).

وفی شرح العقائد ص:۱۷۲ (طبع قدیمی کتب خانه) وفی دعاء الأحیاء للأموات وصدقتهم أی صدقة الأحیاء عنهم أی عن الأموات نفع لهم أی للأموات خلافًا للمعتزلة.

ان آیاتِ قرآنیہ اور احادیث وکتبِ عقائد کی عبارات کی بناء پر حضرات فقہائے کرامؒ نے اس عقیدۂ ایصالِ ثواب کو دُرست قرار دیا ہے، اور نہ صرف اس کا اثبات فرمایا بلکہ اسے مستحسن قرار دیا، چنانچہ کتبِ فقہ میں ہے:-

وفی الهدایة، باب الحج عن الغیر ج:۱ ص:۲۹۶ (طبع مکتبه شرکت علمیه) ان الانسان له أن یجعل ثواب عمله لغیره صلٰوة أو صومًا أو صدقة أو غیرها عند أهل السنة والجماعة.

وفی الشامیة ج:۲ ص:۲۴۳ مطلب فی القراءة للمیت واهداء ثوابها له، صرح علمائنا فی باب الحج عن الغیر بأن للانسان أن یجعل ثواب عمله لغیره صلٰوة أو صومًا أو صدقة أو غیرها کذا فی الهدایة .... الأفضل لمن یتصدق نفلًا أن ینوی لجمیع المؤمنین والمؤمنات لأنها تصل الیهم ولا ینقص من أجره شیء هو مذهب أهل السنة والجماعة (وفیه بعد أسطر) وفی البحر: من صام أو صلّی أو تصدق وجعل ثوابه لغیره من الأموات والأحیاء جاز، ویصل ثوابها الیهم عند أهل السنة والجماعة، کذا فی البدائع.

وفی معارف السنن ج:۵ ص:۲۸۶ (طبع ایچ ایم سعید) وقد تعرض فی الهدایة الی مسألة الاثابة واهداء الثواب فقال الأصل فی هٰذا الباب أن الانسان له أن یجعل ثواب عمله لغیره صلٰوة أو صومًا أو صدقة وغیرها عند أهل السنة والجماعة. وفیه أیضًا ج:۵ ص:۲۹۱ ثم ان الشافعیؒ لا یجوز اهداء ثواب تلاوة القراٰن ولا یصح عنده الاثابة فیما عدا الدعاء والصدقة ولکن الشافعیة أفتوا بایصال ثواب التلاوة ویجوز عندنا اهداء ثواب کل شیء .... وتبین أن مذهب أبی حنیفة فی هٰذا الصدد أوسط المذاهب .... الخ. (محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہما)

۲:- اگر کسی شخص نے اس نیت سے کمایا ہو کہ یہ میرے بچوں یا عزیزوں کے کام آئے تو ان شاء اللہ اس پر صدقۂ جاریہ کا ثواب ملنے کی اُمید ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۰۳ ج)

ایصالِ ثواب کے لئے صدقۂ جاریہ میں کون سی چیز بہتر ہے؟

سوال ۱:- صدقۂ جاریہ کے لئے مندرجہ ذیل چیزوں میں سے کون سی بہتر ہے؟

الف:- مسجد کی تعمیر میں حصہ لینا، ب:- دینی مدرسہ کی امداد کرنا، ت:- کنواں تعمیر کرنا، ج:- یا اور کوئی کام جس سے مرحوم کو ثواب دارین حاصل ہو۔

۲:- لوگ کہتے ہیں کہ انسان سے گناہِ کبیرہ اور صغیرہ سرزد ہوں تو ۹۰ ہزار مرتبہ کلمہ شریف یعنی "لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ" پڑھ کر مرحوم کو اس کا ثواب دے دیں یا بخش دیں تو اس کے سارے گناہ اللہ معاف کر دیتا ہے، اور اسے عذابِ دوزخ سے نجات دیتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

۳:- ثواب سے کیا مراد ہے؟ قرآن پڑھ کر ثواب مرحوم یا مرحومہ کو پہنچا دینے سے عذاب ختم ہو جاتا ہے؟

۴:- مجھے پڑھنے کے لئے ایسی چیز بتا دیں کہ اس کو پڑھوں اور عذابِ قبر سے محفوظ رہوں۔

۵:- کلامِ پاک یا تیس پارے مسجد میں رکھوا دیں تو کیا مرحومہ کو ثواب ہوگا؟

۶:- میری اہلیہ ہارٹ فیل ہونے سے اللہ کو پیاری ہوگئی، نمازِ تہجد ادا کرنے کے بعد نمازِ فجر کے وقت نماز کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ اس کا انتقال ہوگیا، ایسی عورت کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- یہ تمام اُمور خیر ہی خیر ہیں، اور صدقۂ جاریہ کے لئے ایسے کام کا انتخاب کرنا بہتر ہے جس کی ضرورت بھی زیادہ ہو اور جس کا فائدہ عرصے تک لوگ اُٹھاتے رہیں، اپنے حالات کے لحاظ سے اس کا فیصلہ ہر شخص کو خود کرنا چاہئے۔

۲:- سارے کے سارے گناہ معاف ہونے کی تو کوئی ضمانت نہیں، لیکن کلمۂ طیبہ یا قرآن شریف پڑھ کر جتنا زیادہ سے زیادہ ثواب میت کو پہنچا سکتے ہوں، بہتر ہے۔[1]

۳:- اس کا جواب بھی وہی ہے، تلاوتِ قرآن کا ایصالِ ثواب کیا جائے تو ہر حرف پر دس نیکیاں میت کو ملتی ہیں، لہٰذا جتنا زیادہ سے زیادہ ایصالِ ثواب کیا جائے گا میت کے نامۂ اعمال میں اضافہ ہوگا،[2] اور عذاب میں کمی ہوتی چلی جائے گی، لیکن عذاب سے رہائی کی مکمل ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔

(۱،۲) دلائل اور حوالے کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

۴:- قرآن مجید کی تلاوت جتنی زیادہ ممکن ہو، کریں، خاص طور سے سورۂ ملک (یعنی "تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ") روزانہ پڑھا کریں، حدیث میں ہے کہ یہ سورت عذابِ قبر سے انسان کو محفوظ رکھنے میں مددگار ہوتی ہے، نیز "سُبْحَانَ اللہِ وَالْحَمْدُ لِلہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَاللہُ اَکْبَرُ" اور استغفار کثرت سے کیا کریں، اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

۵:- دونوں سے ثواب حاصل ہوگا۔[1]

۶:- آپ کی اہلیہ کی وفات جس انداز سے ہوئی وہ قابلِ رشک ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہی اُمید رکھنی چاہئے کہ اِن شاء اللہ وہ جنتی ہیں، لیکن ساتھ ہی ایصالِ ثواب میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱/۲۹ الف)

عقیدۂ ایصالِ ثواب

سوال:- قرآن میں اس بات کی وضاحت ہے کہ ہر انسان کے نیک عمل کا جو ثواب ہوگا اس کا صرف کرنے والا حق دار ہے، وہ دُوسرے کو نہیں دیا جاسکتا، لیکن مسلمان دھڑلے سے ایصالِ ثواب کر رہے ہیں، یہاں تک کہ حج بدل بھی کرتے یا کرالیتے ہیں، کیا ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے؟

جواب:- قرآنِ کریم نے یہ فرمایا ہے کہ: ''انسان کو بطورِ حق صرف اسی عمل کا اَجر ملے گا جو اس نے خود کیا ہو''۔[2] لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کے استحقاق سے زائد کوئی اَجر اپنی رحمت سے دے دیں تو یہ اس کے خلاف نہیں،[3] چنانچہ احادیث میں جو ایصالِ ثواب کا ثبوت ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی اسی رحمت کی بنیاد پر ہے، احادیث چونکہ قرآنِ کریم کی تفسیر ہیں اور قرآنِ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا معلّم بناکر بھیجنے کا ذکر فرمایا ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تفسیر مستند ترین تفسیر ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۲۲/۸/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۵۰۵/۱۰)

---

(۱) صفحہ نمبر ۵۸۸ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) "وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" (سورۃ النجم: ۳۹)۔

(۳) وفی شرح الصدور للسیوطیؒ باب فی قراءۃ القرآن للمیت أو علی القبر ص: ۱۳۴ (طبع مطابع الرشید مدینۃ المنورۃ) لیس للانسان الا ما سعی، من طریق العدل فأما من باب الفضل فجائز أن یزیدہ اللہ تعالٰی ما شاء قالہ الحسین بن الفضل، وکذا فی مرقاۃ المفاتیح ج:۴ ص:۸۲ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)۔ نیز ایصالِ ثواب سے متعلق مزید تفصیل اور خاص طور پر آیتِ مذکورہ کے مفہوم کے لئے مذکورہ کتاب شرح الصدور للسیوطیؒ باب فی قراءۃ القرآن للمیت أو علی القبر ص: ۱۳۴ اور سابقہ فتویٰ اور حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)